مجاہدِ ملّت

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ

ایک سیاسی مُطالِعہ

مُرتّب:
ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

مجاہدِ ملّت

مولانا حفظ الرحمٰنؒ سیوہاروی

ایک سیاسی مُطالعہ

مُرتّب:
ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

زیر اہتمام
جمعیۃ پبلیکیشنز
متصل مسجد پائلٹ ہائی سکول ٥ وحدت روڈ لاہور

نام کتاب ——— مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ

اشاعت اول ——— مئی ۲۰۰۱ء

ناشر ——— محمد ریاض درانی

سرورق ——— جمیل حسین

کمپوزنگ ——— رشید احمد صدیقی

——— جمعیۃ کمپوزنگ سنٹر وحدت روڈ، لاہور

مطبع ——— اشتیاق اے مشتاق پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت ——— -/۲۰۰ روپے

عرض ناشر

حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی سوانح کے مطالعہ سے یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ حضرت مجاہد ملت کا شمار ایسے عبقری انسانوں میں ہوتا ہے جن کو محض انسانیت کی خدمت کے لیے پیدا کیا جاتا ہے۔

تعلیم و تعلم ہو یا تصنیف و تالیف کا شعبہ۔ دکھی انسانیت کی خدمت ہو یا برصغیر کی ہنگامہ خیز سیاست کوئی میدان ایسا نہیں جس میں حضرت مجاہد ملتؒ قیادت کرتے ہوئے نظر نہ آتے ہوں۔

ضرورت اس امر کی تھی کہ حضرت مجاہد ملتؒ کی ان ہمہ جہت خدمات کو اکٹھا کر دیا جائے تاکہ ایک تاریخی ضرورت کے پورا ہونے کے ساتھ ساتھ آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ کا کام دے۔ اللہ جزائے خیر عطا فرمائے ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کو کہ انہوں نے وقت کی اہم ضرورت کو پورا کر دیا۔

ڈاکٹر صاحب حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ پر اس نوعیت کا کام کر کے اہل علم و تحقیق سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ مگر حضرت مجاہد ملت کی جامع جہات شخصیت پر کیا جانے والا کام اپنی مثال آپ ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ''مجاہد ملت ایک سیاسی مطالعہ'' اہل علم کے لیے تحقیق کے نئے راستے کھولے گی تاکہ پاکستان کی نوجوان نسل سے دانستہ پوشیدہ رکھے گئے ماضی کے اصل حقائق سے پردہ اٹھایا جاسکے۔

ہماری خوش بختی ہے کہ اس تحقیقی کام کی اشاعت کے لیے جمعیۃ پبلی کیشنز کا انتخاب کیا گیا۔ ہماری کوشش ہوگی کہ حضرت مجاہد ملت کی خدمات جلیلہ کو بہتر سے بہتر انداز میں طبع کر کے عوام کے سامنے پیش کیا جائے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک علماء حق سے وابستہ رکھے۔ آمین

محمد ریاض درانی

ربیع الاول ۱۴۲۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جدة : ۱۲ شوال المکرم

فہرست

پیش لفظ

جمعیت علماے ہند کے رہنماؤں پر چھوٹی بڑی، مختصر و ضخیم ہر طرح کی کتب اور رسائل و اخبارات کے نمبروں کی صورت میں کثیر لٹریچر فراہم ہو گیا ہے۔ چوں کہ یہ کتب یا رسائل و اخبارات میں مقالات اہل قلم نے اپنے ذوق و مشاہدات اور افکار و معلومات کے مطابق لکھے ہیں اور ان میں ہر طرح کے مباحث زیر قلم آئے ہیں۔ اس لیے ہر تالیف میں کوئی نہ کوئی ایسی خوبی ضرور نظر آ جاتی ہے جو اسے دوسری تالیف سے ممتاز کرتی ہے اور قاری کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

ان خوبیوں کی وجہ سے ہم کسی چھوٹی سے چھوٹی تالیف یا مقالے کو بھی اپنے مطالعے میں نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہ ان تالیفات کی اہمیت ہے، جس کے اعتراف کے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ لیکن اس تیز رفتار اور ہنگامہ خیز زمانے میں جب کہ انسان کی مصروفیات بہت بڑھ گئی ہیں ہر شخص کے لیے اپنے نظام الاوقات میں مطالعے کے لیے وقت نکالنا بہت دشوار ہو گیا ہے۔ اور اگر وہ وقت نکال بھی لیں تو علوم و فنون کی کثرت کی وجہ سے نیز اشاعت کی سہولتوں کی بدولت کتب و رسائل اور اخبارات کے ہجوم میں زندگی کے کاروبار میں مصروف لوگوں کے لیے سب کچھ پڑھ لینا ممکن نہیں رہا ہے۔ ان کے لیے یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ وہ اپنے مطالعے کو اپنی ضرورت یا اپنے خاص ذوق تک محدود کر لیں۔

ذوق اور ضرورت مطالعے کی دو جہات یا محرکات ہیں:

۱۔ ایک تو یہ کہ ایک شخص کو کسی خاص علم یا صنف ادب سے یا کسی خاص فن سے دل چسپی ہے اور وہ اپنے ذوق کی تسکین کے لیے مطالعہ کرتا ہے۔

۲۔ ضرورت کے دو پہلو ہیں:

(الف) ایک پہلو یہ ہے کہ ہر شخص کو تعلیم و تزکیہ، تہذیبِ اخلاق، تشکیلِ سیرت کی ضرورت

سے چند چیزیں ضرور پڑھنی چاہییں بلکہ چند چیزیں یا بعض خاص قسم کی کتب ہمیشہ اس کے مطالعے میں رہنی چاہییں۔ یہ ضرورت مطالعے کا ناگزیر عنصر ہے۔ خواہ اس کا جی چاہے خواہ نہ چاہے۔ اس مطالعے کے بغیر نہ تو اس کی اپنی شخصیت کی تکمیل ہوسکتی ہے اور نہ وہ شخص اپنی اولاد اور زیردستوں کی تعلیم و تربیت کے بہترین فرائض سے عہدہ برآ ہوسکتا ہے۔ مثلاً: ایک مسلمان کے لیے بنیادی دینی تعلیم لازمی ہے۔ اس کی تہذیب وتزکیہ کے لیے' ایمان میں رسوخ' قلب کے اطمینان اور سیرت کی پختگی کے لیے ناگزیر ہے کہ ایسا ادب ہمیشہ اس کے مطالعے میں رہے' جس سے یہ مقصد پورا ہوتا ہے۔

ایک حد تک تفسیر' سیرت' کتبِ مسائل' اخلاقیات' حکایاتِ صالحین' وغیرہ کا مطالعہ زندگی کے کسی ایک دور کی ضرورت نہیں۔ زندگی بھر مطالعے کا لازمی حصہ ہے۔ اس میں خواہش اور ذوق کا ہرگز لحاظ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا زندگی اور صحت کے لیے غذا اور اس کا اچھا ہونا۔

دینیات و اخلاقیات ہی کی طرح اسلامی اور قومی وملی تاریخ' رہنماؤں کے تذکرے' اسلافِ کرام کے ایثار اور قربانیوں کے قصے' ان کے کارناموں اور ان کی پاکیزہ سیرت کا بیان' تہذیبِ فکر وخیال اور اخلاق و ذوق کی اصلاح وتربیت اور قومی' ملی اور اسلامی فکر وسیرت کی تشکیل کے نہایت موثر ذرائع ہیں۔ قومی وملی نقطۂ نظر سے ایسی کتب کا مطالعہ جو اس مقصد کی برآری میں مفید ہو' فرض کے درجے میں اور ہر فردِ ملت اور قوم کے لیے لازم ہے۔ لازمی مطالعے کا یہ اخلاقی جز ہے۔

(ب) لازمی مطالعے کا دوسرا پہلو سماجی اور معاشی ضرورت کے تحت آتا ہے۔ مختلف علوم و فنون اور ٹیکنولوجیز کے علم اور مطالعے کے بغیر ہم اپنی معاش کے حصول اور قومی تعمیر اور انسانی خدمت کے فرائض سے کما حقہ عہدہ برآ نہیں ہوسکتے۔ مفید علوم وفنون کا مطالعہ ہر شخص کی اہم سماجی ضرورت ہے۔ مطالعے کے حوالے سے ان سے ہمیشہ تعلق استوار رکھنا چاہیے۔

اگر ایک استاد کسی کلیہ یا جامعہ میں کسی علم وفن کا استاد ہے تو یہ اس کی پیشہ ورانہ ہی نہیں قومی اور اخلاقی ضرورت بھی ہے کہ وہ اپنے مضمون کی تاریخی' نصابی کتب اور مضمون سے متعلق ہر نئی آنے والی کتب کے مطالعے کا شائق رہے۔ اگر اس کا دل اس شوق سے خالی ہے تو وہ کبھی

22246

ایک اچھا استاد نہیں بن سکتا۔ اگر اس کا قلب شوقِ مطالعہ سے نا آشنا ہے تو وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرے گا۔

مطالعہ و تعلیم کا ذریعہ کتاب' اخبار' رسالہ' ریڈیو' ٹیلی ویژن' انٹرنیٹ وغیرہ کچھ بھی ہو سکتا ہے' یہ ایسی ضرورتیں ہیں کہ کوئی سوسائٹی ان سے صرف نظر نہیں کر سکتی۔ لیکن موجودہ دورِ ہنگامہ و عہدِ مسائل میں انسان کی مصروفیات اور اشاعت و فروغ علوم و فنون میں کتب کی کثرت و ضخامت اور مضامین و مباحث کی وسعت و طوالت نے انسان کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ ذوق و ضرورتِ مطالعہ کے خاص دائروں میں بھی انتخاب سے کام لے۔ اگر کوئی شخص ادب' تاریخ' سیاست' مذہب' شریعت' طریقت وغیرہ میں ہمہ جہت و ہمہ صفت ہے یا کوئی علم و فن مختلف الجہات اور کثیر الفروع ہے تو اس موضوع کے فروع اور اس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر الگ الگ کتب مرتب کر دی جائیں تا کہ مطالعے کے شائقین اور ضرورت مند اپنی فرصت کے کم سے کم لمحات کے لیے اپنے ذوق اور ضرورت کے مطابق کوئی کتاب منتخب کر لیں۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ کسی شائق مطالعہ کو مضمون کے تمام فروع اور شخصیت کے تمام پہلوؤں سے یکساں دل چسپی اور مطالعے کا شوق نہیں ہو سکتا!

اس احساس کے تحت خاکسار کا ایک مدت سے خیال تھا کہ اکابر جمعیت علمائے ہند کے سیاسی نقطۂ نظر' اندازِ فکر اور مقاصد و خدمات کے بارے میں الگ الگ تالیفات مرتب کر دی جائیں تا کہ وہ اصحابِ ذوق جنھیں تاریخ' سیاستِ ملی سے دل چسپی اور علمائے حق کے افکار و کردار کے مطالعے کا شوق ہے' ان کے لیے اوسط ضخامت کی الگ الگ کتب مہیا ہو جائیں جو ان کے ذوق کی تسکین' صحیح معلومات میں اضافے اور موضوع علیہ شخصیت کے افکار اور خدمات سیاسی کے بارے میں ایک صحیح اور متوازن رائے کے قیام میں معاون اور رہنما ثابت ہوں۔

اس کا آغاز خاکسار نے "شیخ الہند مولانا محمود حسن ۔۔۔ ایک سیاسی مطالعہ" کی تالیف سے کیا تھا۔ اگرچہ اس میں کئی نقائص تھے' اس کے باوجود شائقین نے اسے پسند کیا اور اس کے کئی ایڈیشن نکل گئے۔ اب اس کے نئے اور جامع ایڈیشن کے لیے بہت سا مواد جمع کر لیا ہے۔ ان شاء اللہ جلد ہی اس پر نظر ثانی اور تالیف و تدوین جدید پر توجہ دی جائے گی۔

اس سلسلے کی دوسری تالیف "شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی ۔۔۔ ایک سیاسی مطالعہ" ہے۔ حضرت مدنی کی شخصیت پر مختصر موضوعاتی کتب سے لے کر نہایت جامع تحقیقی اور

ضخیم کتب تک پچاسوں تصنیفات و تالیفات اور متعدد رسائل کے خصوصی شماروں کا نہایت قیمتی ذخیرہ موجود ہے اور اس میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن حضرت کی شخصیت' افکار و خدمات اور سیرت کے خصائص میں جو چیز نکتہ چینوں اور نقادوں کی نظر و بحث کا سب سے زیادہ موضوع بنی ہے اور بنتی رہتی ہے۔ خصوصاً پاکستان میں' وہ حضرت کی سیاسی زندگی اور سیاسی افکار ہیں اور اگرچہ حضرت کے سیاسی افکار اور نظریات میں بے شمار تقاریر' خطبات' رسائل' خطوط' بیانات وغیرہ خود حضرت کے قلم سے سیکڑوں صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں اور دوسرے اہل علم اور اصحابِ نظر کے قلم سے حضرت کے افکار و سیرت اور نظریات اور سیاسی موقف کے دفاع' وضاحت و بیان اور رفعِ شکوک میں سیکڑوں صفحات موجود ہیں لیکن کوئی ایک تصنیف یا مجموعۂ مقالات ایسا موجود نہ تھا' جس کے مطالعے سے حضرت کے سیاسی افکار ان کے مختلف پہلو' ان کا تاریخی و فکری پس منظر اور خصائص کا علم اور ان پر اعتراضات کے جوابات معلوم ہو جاتے! خاکسار نے اس ضرورت کو محسوس کر کے ایک مختصر ضخامت کا مجموعۂ مقالات مرتب کر دیا' جو انتخاب کے نقص اور ترتیب و تدوین کی متعدد خامیوں کے باوجود خاصا مقبول ہوا اور توسیع اشاعت کی کسی سعی اور تحریک کے بغیر اب تک اس کے بھی دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

میرا منصوبہ ان دو بزرگوں کے مطالعے ہی پر ختم نہ ہو گیا تھا۔ ان میں چند اور بزرگ بھی شامل تھے' مثلاً:

۱۔ حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ شاہ جہان پوری ثم دہلوی جو حضرت شیخ الہند کے تلمیذِ رشید' فقیہِ امت' مفتیِ اعظم' مدبر وقت' جمعیت علماے ہند کے پہلے صدر (۴۰۔۱۹۱۹ء) اپنے علم و فضل' ذہانت و فطانت اور وقت کی نبض شناسی میں وہ اپنے عہد کی ایک یادگار اور ناقابل فراموش شخصیت تھے۔

۲۔ سحبان الہند مولانا سعید احمد دہلوی۔ جو جمعیت علماے ہند کے پہلے سیکرٹری تھے' نائب صدر اور قائم مقام صدر بھی رہے تھے۔ عالم دین تھے' مفسر قرآن تھے' خطیب و ادیب تھے' بے شمار خوبیوں کے مالک اور دہلوی تہذیب کی ایک نمایندہ شخصیت تھے۔ انھوں نے علوم و فنون کے مختلف میدانوں میں اپنی تصنیفات و تالیفات اور کارنامے یادگار چھوڑے ہیں۔

۳۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی نے اپنی سیاسی زندگی کے آغاز ہی میں جمعیت

علماے ہند کے دائرہ خدمات کو اپنا میدان عمل بنایا تھا اور آخر دم تک وہی ان کا سب سے بڑا میدان عمل رہا۔ مولانا احمد سعید دہلوی کے بعد وہی جمعیت کے سیکرٹری جنرل مقرر ہوئے تھے اور اپنی وفات (۱۹۶۲ء) تک وہی سیکرٹری جنرل رہے' اس حیثیت سے ان کا دورِ خدمت بیس سال سے زیادہ عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ علماے دیوبند کے راسخین فی العلم اور اصحابِ عزیمت میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں قلم و زبان اور عمل کی بہترین صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ ان کی ذاتِ گرامی ذہانت' ہوش اور عقل و بصیرت کی تصویر تھی جراٗت' بہادری' بے خوفی' جوشِ عمل' ذوقِ خدمت اور اسلامی سیرت کی اعلیٰ صفات انسانی پیکر میں ڈھل گئی تھیں۔ انھوں نے اپنے ذوق علم و عمل اور حسنِ خدمت کی بہترین مثالیں تاریخ میں یادگار اور اپنی سیرت کے بہترین نقوش وقت کے رہنماؤں' شائقینِ خدمت' کارکنانِ قوم اور خدمت گزارانِ ملت کے لیے رہنما چھوڑے ہیں۔

سابق و اوّل اور ان سب بزرگوں سے مجھے ان کے خصائص علم و عمل' حسنِ سیرت و اخلاق اور افکار حقہ اور خدماتِ ملی کی وجہ سے عقیدت ہے۔ یہ میرے آئیڈیل ہیں۔ ان بزرگوں کا سیاسی مطالعہ تو میں نے اپنے ذوق کی بنا پر پیش کیا ہے' لیکن ایسا نہیں ہے کہ سیاست کے سوا ان کی شخصیت کا کوئی دوسرا پہلو پیش ہی نہ کیا ہو۔ ان میں ان کے علمی و تصنیفی کارناموں اور ان کی اسلامی دینی خدمات اور سیرت و اخلاق کے دوسرے پہلوؤں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان جائزوں میں ایک مکمل اسلامی زندگی کے تمام احوال اور خصائص آگئے ہیں۔ اس کا اندازہ حضرت مجاہد ملت کے پیش نظر مطالعے سے بہ خوبی ہو جاتا ہے۔

بہ ظاہر یہ مطالعہ مختلف اہل قلم کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ لیکن انھیں ایسے طریقے سے مرتب کیا گیا ہے کہ اس کے مضامین اور ابواب میں ایک فطری ربط اور فنی ترتیب قائم ہوگئی ہے۔ نیز زوائد و تکرار' مباحث سے احتراز نے اسے تالیف و تدوین کے ایک نئے سانچے میں ڈھال کر جامع اور مربوط تصنیف بنا دیا ہے۔

یہ مطالعہ پانچ ابواب میں مرتب کیا گیا ہے۔ اس آئینے میں بچپن سے لے کر آخری دورِ حیات و وفات تک ان کی شخصیت کے نشو و ارتقا' تعلیم و تربیت' عروج و بلوغ کمال' علمی و تصنیفی فتوحات اور ایک پرجوش مجاہدانہ زندگی اپنی تمام ہنگامہ خیزیوں اور معرکہ آرائیوں کے ساتھ

حقیقی رنگوں میں اپنے تمام خط و خال کے ساتھ صاف دیکھی جا سکتی ہے۔

پہلا باب خاندان اور خاندان کے بزرگوں کے حالات، گھر کے ماحول، بچپن کے احوال اور طالب علمانہ زندگی کے تذکرے میں ہے۔ اس باب کے لکھنے والے حضرت مجاہدِ ملت سے دوستی یا رشتہ داری کا تعلق رکھنے والے ہیں۔ ان کے خاندان، بچپن اور تعلیم و تربیت کے دور پر ان سے زیادہ مستند لکھنے والے کوئی اور موجود نہیں تھے۔

دوسرے باب میں ان کی شخصیت و سیرت کا عمومی مطالعہ ہے۔ اس میں ان کی زندگی کے مختلف پہلو اور خصائص زیرِ بحث آئے ہیں۔ اس میں ان کا علم، عمل، سیرت، اخلاق، اخلاص، جوشِ خدمت، بے خوفی، بہادری، بے باکی، حق گوئی اور بہت سی خوبیاں زیرِ قلم آئی ہیں۔ لیکن کوئی بات کتابی مطالعے پر مبنی اور سنی سنائی نہیں، تمام بیانات مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہیں۔ اس باب کے مطالعے سے ایک بھرپور علمی و عملی زندگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے لکھنے والے تمام معروف اشخاص اور ذمہ دار اہلِ قلم ہیں۔ ان کے ذاتی علم اور مشاہدات کے حوالے سے ایک جامع جہات اور متنوع خصائص و محاسن کی شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے۔

تیسرا باب خدماتِ جلیلہ کے عنوان سے ہے، اس کے لکھنے والے صرف دو حضرات ہیں۔ ایک بزرگ کا تعلق جمعیت علمائے ہند کے دائرۂ فکر و عمل سے ہے۔ جمعیت کے دائرے میں ان کی حیثیت لسانِ جمعیت یا اس کے ترجمان کی تھی۔ جمعیت کے موقف کی وضاحت اور خدمات کے تعارف میں ان کے مساعی کو سب پر ترجیح حاصل ہے۔ اس کے بزرگوں کے افکار کی ترجمانی اور ان کے دفاع میں وہ سب سے زیادہ پرجوش اور ان کا قلم سب سے زیادہ سرگرم رہا تھا۔ ان کا دماغ حقیقت آشنا، زبان حقیقت ترجمان اور قلم حقیقت رقم تھا۔ اس خصوصیت میں جمعیت کے دائرۂ فکر و عمل میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہ تھا۔

اس باب کے دوسرے مقالہ نگار الجمعیۃ کے شعبۂ ادارت سے وابستہ تھے۔ وہ حضرت مجاہد ملت کے سفر و حضر میں شریک رہے۔ مجلس کے مصاحب اور خلوت کے راز دان تھے، جلسوں کے رپورٹر اور پارلیمنٹ کے مبصر تھے۔ انھوں نے مولانا سیوہاروی کو دور سے نہیں دیکھا، نہ دوسروں کی زبان سے ان کے کارنامے سنے تھے۔ انھوں نے مجاہد ملت کو تاریخ بناتے اور کارنامے انجام دیتے دیکھا تھا۔ وہ براہِ راست مولانا کے سامع، ناظر اور مشاہد و مبصر تھے۔ مولانا کو دیکھنے، سننے اور سمجھنے کے جو مواقع انھیں حاصل تھے وہ اس حلقے کے کسی اور رکن کو شاید ہی

حاصل رہے ہوں۔اس کا اندازہ ان کے مفصل مقالے کے سرسری مطالعے ہی سے ہو جاتا ہے۔

سیاسی افکار و مساعی سے متعلق معلومات کے بارے میں یہ دونوں مقالے اس مجموعے کی جان ہیں۔اس موضوع پر اس تفصیل' معلومات کی صحت اور ذمہ داری کے ساتھ لکھنے کا ان دونوں اصحابِ قلم سے زیادہ اہل دوسرا کوئی نہ تھا۔یہ دونوں مقالے اپنے دائرۂ بحث ونظر میں ایک مستقل تصنیف کی حیثیت کے مالک ہیں۔

چوتھا باب علمی و تصنیفی فتوحات کے تذکرے کے لیے وقف ہے۔اس باب کی تکمیل میں بھی صرف دو اہل قلم نے حصہ لیا ہے۔دونوں مشہور صاحب علم اور اہل قلم ہیں۔ایک کا تعلق موضوع علیہ شخصیت سے صرف علمی ہے۔ان کے قلم سے اعتراف و تحسین کی بڑی قیمت ہے۔ دوسرے صاحب علمی اور دوستی و مسلک کا تعلق بھی رکھتے ہیں۔انھوں نے حضرت مجاہد ملت کی تصنیفی خدمات کا جائزہ تفصیل اور جامعیت کے ساتھ لیا ہے۔جو حضرت کے تمام علمی اور تصنیفی کاموں پر محیط ہے۔یہ دونوں مضمون اپنے موضوع پر نہایت جامع اور اہم ہیں۔

پانچواں اور آخری باب حضرت مجاہد ملت کے مختلف النوع افکار اور ان کی جرأت و ہمت' بہادری' بے باکی اور حق گوئی کا ایسا آئینہ ہے کہ یہ باب پوری کتاب میں خاصے کا حصہ ہے۔اگر کسی شخص کو حضرت مجاہدِ ملت کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو تو صرف اس باب کے مشمولات کو پڑھ کر حضرت مرحوم کی شخصیت کی عظمت' ان کی سیرت کی پختگی' ان کے افکار کی بلندی اور ان کے کمال حق گوئی کا فیصلہ کر دے سکتا ہے۔اس باب کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے اس کے مندرجات پر ایک نظر ڈال لینا ہی کافی ہے۔اب کتاب چوں کہ قارئین محترم کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے' اس کے مندرجات کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں:

صاف صورت دعا کی پیدا ہے
ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے

اس باب کے مشمولات جو حضرت مجاہد ملت ہی کے خطبات' تقاریر' بیانات' خطوط اور مسلم جماعتوں کے اتحاد کے بارے میں صدر مسلم لیگ سے ایک مراسلت اور چند دیگر تحریریں ہیں۔ یہ سب تاریخ سیاستِ ملی کی اہم سیاسی دستاویزات اور حضرت مجاہدِ ملت کے ملی مساعی اور عظمتِ کردار کا بہت بڑا اور منہ بولتا ثبوت ہیں۔

جمعیت علماے ہند کے اکابر کے سیاسی مطالعے کی یہ تیسری کتاب محترم محمد ریاض درّانی

صاحب شائع کر رہے ہیں۔ درانی صاحب کئی اعتبار سے اس سلسلے کی اشاعت کا استحقاق رکھتے ہیں۔ وہ پاکستان میں جمعیت علما کے نظام میں ایک اہم ذمہ داری کے مالک ہیں۔ وہ مسلکاً دیوبندی ہیں اور دارالعلوم دیوبند کے انقلابی سلسلے کے بزرگوں سے عقیدت و ارادت کا گہرا تعلق ہے اور اسی عقیدت و ارادت کے تحت ان بزرگوں کے سوانح و سیر اور خدمات کے تعارف اور ان کے علمی آثار وافکار کے تعارف کے لیے وہ ''الجمعیۃ پبلی کیشنز'' کا اجرا عمل میں لائے ہیں اور کئی بلند پایہ اسلامی تاریخی' سیاسی تحریک سے متعلق کتابیں چھاپ چکے ہیں۔ وہ ان کاموں کا خاص ذوق رکھتے ہیں۔ اس لیے یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ اس سلسلے کی بقیہ دو شخصیات ''حضرت مولانا مفتی اعظم محمد کفایت اللہ شاہ جہان پوری ثم دہلوی اور سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی پر کتب کی اشاعت بھی انھیں کے حصے میں آئے گی۔

امید ہے کہ اس دوران میں حضرت شیخ الہند اور حضرت شیخ الاسلام کے سیاسی مطالعات پر نظر ثانی اور نئے ایڈیشنوں کی تیاری کے کام سے بھی فراغت ہو جائے گی۔ میرے لیے وہ دن نہایت خوشی کا ہوگا جب پانچوں کتابوں کا نیا نظر ثانی شدہ سیٹ تیار ہو جائے گا۔

امید ہے کہ یہ سلسلہ اور اس سلسلے کی زیرِ نظر کتاب تاریخ ملی کے مطالعے کے شائقین میں اور جمعیت علماے اسلام اور دیوبندی مکتب فکر سے تعلق اور ارادت رکھنے والوں میں خاص طور پسند کی جائے گی۔



(ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری)

۲۳ر اپریل ۲۰۰۱ء

باب اول

حالاتِ زندگی

مجاہد ملتؒ ۔۔۔۔۔۔ بچپن اور نوعمری

مولوی مقبول احمد سیوہاروی

خدا تعالیٰ مولوی حاجی شمس الدین مرحوم پر رحمتوں کے پھول برسائے جنہوں نے اپنے ایک بیٹے (مولوی فخر الدین) کو ڈپٹی کلکٹر بنایا ایک (مولوی بدر الدین) کو وکیل بنایا۔ ایک کو طبیب بنا کر خدمت خلق کا منصب بخشا (حکیم مولوی صلاح الدین) اور ایک کو ایسا بنایا جو نہ فقط عالم بے بدل تھا' نہ فقط بلند پایہ خطیب تھا' نہ فقط دانش مند مفکر تھا نہ فقط سیاست کی گتھیوں کو سلجھانے والا تھا' نہ فقط عوام کے دلوں کی دھڑکن اور ان کی زبان تھا بلکہ امام طریقت بھی تھا' جس کے سبب اس کی بے پناہ محبت مخلوق کے دلوں میں بس گئی تھی' اس کی صحت' مخلوق کی صحت تھی' اس کی بیماری مخلوق کی بیماری تھی' اور اس کی موت نے مخلوق پر اداسی طاری کر دی ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰنؒ کے جذبہ خدمت نے انہیں اتنے بلند مقام تک پہنچا دیا تھا' جہاں ہر ایک کی رسائی مشکل ہی نہیں محال ہے۔

کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے۔ میٹھی بات کہنا' الفاظ سے تسلی دینا' زخمی دل کو مشورہ دینا آسان ہے اور اسے ہر ایک کر سکتا ہے' مگر مردان طریقت کا عمل یہ رہا ہے اور یہی رہے گا کہ مشورہ بھی دیں' چارہ سازی بھی کریں' بیمار کو تسلی بھی دیں اور طبیب تک پہنچا کر علاج بھی کرا دیں:

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

سوچیے!! ایک درجہ یہ ہے کہ راستہ بتا دیا جائے' حکیم کا گھر مشرق کی سمت ہے' گلی سے گزر کر نیم کا درخت ملے گا۔ پھر جنوب کی طرف جانا' آگے بڑا پھاٹک ہے' متصل سہ دری ہے۔ حکیم صاحب کا وہی مطب ہے۔

ایک درجہ یہ ہے کہ مریض کا ہاتھ پکڑا' چلنے کی سکت نہیں ہے تو سواری میں بٹھایا اور ساتھ لے جا کر حکیم کو دکھایا۔ سفارش کے ساتھ حال بیان کیا اور نسخہ لکھا کر دوا لا دی۔ یہ ''رہنمائی''

نہیں ''رہبری'' ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن رہنمائی نہیں کرتے تھے' رہبری کرتے تھے اور ابتدائے عمر سے اس وقت تک کہ بستر موت پر رہے ان کا عمل اور کردار رہبری کا تھا۔

ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

مولانا حفظ الرحمٰن پر نہ جانے کیسے کیسے بلند پایہ لکھنے والوں نے قلم اٹھایا ہے۔ میں تو صرف اس لیے مجلس غم میں شریک ہونے آیا ہوں کہ وہ میرے رفیق حال تھے' ہم وطن' ہم محلّہ اور ایک ہی خاندان سے تھے۔ گھر سے گھر ملا ہوا تھا۔ برابر برابر دروازے تھے۔ ان کی معصوم صورت بھولا بھالا چہرہ اس وقت بھی میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔ شاید جگر مرحوم نے اسی موقع کے لیے کہا تھا۔

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں' وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

گرمی ہے' دوپہر کا وقت ہے۔ مدرسہ فیض عام سے آ رہے ہیں بڑی بڑی کتابیں بغل میں دب رہی ہیں' اس وقت ان کی عمر ۱۶ سال کی تھی' صورت پر مسکینی اور سادگی' سعادت کا یہ انداز کہ جب مدرسہ سے آتے تھے راستہ میں کسی جگہ ٹھہرنا' بات کرنا اور ہنسی مذاق کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ کوئی بڑا بوڑھا ملا تو ادب سے سلام کیا اور گھر میں چلے گئے۔ ظہر کی اذان ہوتے ہی مسجد میں آ جاتے' نماز پڑھتے اور مدرسہ چلے جاتے تھے۔

میں ان سے سولہ برس بڑا تھا۔ وہ چھوٹے ہونے کے سبب بے جھجک بات نہ کرتے۔ اور میں بڑا ہونے کے سبب بے تکلف نہ ہوتا اور یہی عمل ان کا آخر وقت تک رہا۔

خدمت خلق کا جذبہ اسی عمر میں موجیں مارنے لگا تھا۔ کسی کو بیمار سنتے تو پرسش حال کے لیے جاتے اور دیر تک بیٹھ کر تسلی دیتے رہتے۔ برادری میں کوئی تقریب ہوتی تو ہاتھ بٹانے چلے جاتے اور پورے انہماک سے ہر کام میں مشورہ اور مدد دیتے۔

کسی کی میت ہوتی تو فوراً گھر پہنچتے اپنے ہاتھ سے غسل دیتے' کفن پہناتے' جنازہ کے ساتھ جاتے اور میت کے دفن میں شرکت کرتے۔

انکسار اور فروتنی اتنی تھی کہ شفیع الرحمٰن جس کا حال ہی میں دردناک قتل ہوا ہے' ایک نور باف سے کسی بات پر لڑ پڑا اور اس کا تھان پھاڑ کر آ گیا۔ نور باف دھام پور کا رہنے والا تھا'

سیوہارہ میں دکان تھی۔

اس واقعے نے نورباف برادری میں ہیجان پیدا کر دیا' صلح کے لیے جائے تو نورباف کے ہاں کون جائے۔ اور وہ آئے تو کیوں آئے۔ کچہری عدالت کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مولانا خود اس کے پاس گئے' خوشامد کی اور عدالت جانے سے روکا' جس سے سیوہارہ کے مسلمانوں میں باہمی تصادم کا خطرہ ٹل گیا۔

یاد رہے کہ شفیع الرحمٰن صاحب مولوی صاحب کا خاندانی عزیز نہ تھا' ہم محلہ اور دوست کا برادرزادہ تھا۔

ان کا صلح کل مشرب فقط اپنی برادری یا عزیزوں تک محدود نہ تھا بلکہ ہندو مسلمان سکھ عیسائی سب معترف ہیں اور انہیں یاد کر کے روتے ہیں۔ یہ ایسی خصوصیات تھیں جو بظاہر معمولی تھیں مگر صاحب نظر کے لیے نشان دہی کرتی تھیں کہ یہ شخص آگے چل کر کیا ہونے والا ہے۔ سچ کہا ہے سعدی نے۔

بالائش سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارہء بلندی

محلّہ میں میلاد شریف کی محفلیں ہوتیں۔ زیادہ اجتماع بھی نہ ہوتا مگر مولانا آتے اور اپنے نقطہ نظر کے مطابق مختصر تقریر کر کے بغیر مٹھائی لیے چلے جاتے۔

آپ جانتے ہیں کہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں انسان کی کیفیات کیا ہوتی ہیں۔ رنگین خوابیں اور رنگین تصورات ہوتے ہیں۔ مجلس آرائیاں اور فلک شگاف نعرے ہوتے ہیں۔ مگر اس مرد مجاہد کا شاندار نظارہ بھی دیکھ لیجئے۔ سہس پور' سیوہارہ کے ایک اسٹیشن بعد آتا ہے' اسی سہس پور کے اسٹیشن پر ایکسپریس کا ایک خوفناک حادثہ ہوا تھا۔ حادثہ ایسا تھا کہ آس پاس کے دیہات والے بھی دوڑ پڑے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن' خدا ان کی قبر کو نور سے بھرے' بے قرار ہو کر سہس پور پہنچے حادثہ کا نظارہ اتنا ہولناک تھا کہ دیکھ کر رو پڑے۔ پھر جس مستعدی اور ان تھک محنت سے زخمیوں' ضرب رسیدہ مرد' عورت بچوں کی خبر گیری کی' اپنی کمر پر لاد لاد کر انہیں ہسپتال پہنچایا اور ملبے سے نکالا' وہ نہ الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے نہ تحریر میں آ سکتا ہے۔

جن لوگوں نے ریلوے حادثات دیکھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ زخمیوں کی کراہٹیں' ملبہ میں دبے ہوؤں کی چیخیں' کتنی دل خراش ہوتی ہیں' مگر مولانا پر نہ گھبراہٹ تھی نہ خوف تھا' نہ زخمیوں

کے خون سے لتھڑے ہوئے جسموں سے نفرت اور گھن تھی، بس مسلسل مدد تھی اور یہ سن کر آپ تعجب کریں گے کہ پورے ایک دن اور ایک رات بھوکے پیاسے کام کرتے رہے تھے۔ اللہ اللہ

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

اس زمانے میں مولانا عبدالغفور صاحب، مدرسہ فیض عام کے صدر مدرس تھے، تقریر میں خطابت نہ تھی اصلاح، موعظت زیادہ ہوتی تھی، مولانا حفظ الرحمٰن نے ان ہی کی شاگردی سے ترقی کی اور دورۂ حدیث کے لیے دیوبند چلے گئے۔

اس وقت دیوبند میں مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ ، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ ، مولانا حبیب الرحمٰن مہتمم دارالعلوم، حافظ محمد احمد صاحب رحمہم اللہ جیسے فاضل اور یگانہ موجود تھے اور مولانا حفظ الرحمٰن کے زمانۂ تعلیم میں یہ سب حضرت سیوہارہ آتے رہے اور مولانا کے مہمان رہے۔

اسی زمانہ کی بات ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن نے ایک خواب دیکھا، انہوں نے دیکھا کہ روشن چاند آسمان سے ٹوٹ کر گرا ہے اور ان کے گریبان میں داخل ہو گیا ہے اور پھر کرتہ کی آستین سے نکل کر آسمان پر چڑھتا چلا گیا ہے۔ ایسا یاد پڑتا ہے کہ جس وقت یہ خواب مولانا نے بیان کیا تھا، مولانا شبیر احمد عثمانی بھی موجود تھے۔

راقم الحروف نے کہا تھا کہ آپ شہرت کے آسمان پر چمکیں گے اور آپ کا سینہ انوار کا مرکز بنے گا۔

چند ہی دن بعد تحریک خلافت کا ظہور ہوا، مولانا بھلا اس موقعے پر کیسے خاموش رہتے، تقریریں شروع ہو گئیں، جلسے ہونے لگے، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا مدنی مالٹا سے تشریف لائے تو تحریک پورے شباب پر تھی اور سیوہارہ میں وہ تاریخی جلسہ ہوا جس کی یاد دلوں میں اب تک باقی ہے۔

اس جلسے کا نظم ونسق عزت مآب حافظ محمد ابراہیم صاحب وزیر برقاب کے ہاتھ میں تھا اور وہی مختار کل تھے، جلسہ کے صدر مولانا مدنی تھے اور روح رواں مولانا حفظ الرحمٰن تھے۔ یہ جلسہ گویا اعلان جہاد تھا جس میں مولانا حفظ الرحمٰن کی دلیری اور حق گوئی کے جوہر چمکے اور راقم الحروف نے محسوس کیا کہ اب وہ سولہ برس مجھ سے بڑے ہو گئے اور ان کی قیادت میں ہر جلسے میں شرکت ہونے لگی۔ پھر سیوہارہ کا وہ مقدمہ شروع ہوا جس میں عوام وخواص جوق جوق

تحریک میں شریک ہو گئے۔

طے یہ ہوا تھا کہ مقدموں میں صفائی نہ دی جائے' اس لیے نہ کوئی صفائی تھی نہ وکیل کھڑا کیا گیا' راقم الحروف نے بیان میں جو شعر پڑھا تھا وہ یہ تھا۔

وہی قاتل' وہی مخبر ہے' وہی منصف ہے
اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر

اور اسی پر میرے بھائی عبداللطیف بجنوری نے جو سال گزشتہ تک پارلیمنٹ کے ممبر بھی تھے پولیس افسری سے استعفیٰ دے کر تحریک آزادی میں شرکت کی تھی۔

اس مقدمہ میں مولانا بشیر احمد بھٹا مرحوم' راقم الحروف برادر معظم مولوی حکیم ابرار احمد صدیقی مقیم دہلی' حکیم عبدالکریم مرحوم' میر مظاہر حسین مرحوم' مولوی رضی الحسنین اور دوسرے لوگ جن کے نام یاد نہیں ہیں' غالباً پندرہ سولہ آدمی تھے۔

مولانا بشیر احمد مرحوم کی یہ تجویز ہوئی کہ جب بھی مقدمہ کی پیشی ہو' ہماری جماعت قصبات اور گاؤں سے گزرتی اور تقریریں کرتی بجنور تک پہنچے اس تجویز پر عمل کرنے سے پورے ضلع میں ہیجان پیدا ہو گیا اور ہزاروں آدمی تحریک آزادی میں شامل ہو گئے۔

تقریروں میں مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا بشیر احمد بھٹا مرحوم کی قائدانہ حیثیت تھی اور راقم الحروف ان کی اقتدا کرتا تھا' آخر یہ گروپ بجنور جیل میں داخل ہو گیا۔ بجنور کے سپرنٹنڈنٹ زیڈ احمد صاحب تھے آسام کے رہنے والے سیاہ فام' فربہ جسم' چہرہ پر چیچک کے داغ' خوب پھیلی اور ناف تک لٹکی داڑھی' مزاج کے سخت تھے' ہفتہ بھر بھی نہ گزرا تھا کہ ہماری جماعت کی ان سے ٹکر ہو گئی۔

گرمیوں کا زمانہ تھا' قیدیوں نے ململ کے پنکھے سرکنڈوں میں پھنسا کر ہمیں دے دیئے۔ یہ خبر کسی نے زیڈ احمد صاحب کو پہنچا دی۔ صبح کو معائنہ کے لیے آئے تو پنکھوں کو دیکھ کر بولے ''تم راجا کا لرکا'' یہ جملہ تین دفعہ کہا' سامنا مولانا بشیر احمد مرحوم کا تھا' مولوی صاحب مرحوم غصہ میں لال ہو گئے' قریب تھا کہ جھپٹ پڑیں' میں نے اور مولانا حفظ الرحمٰن نے اشارہ کیا اور خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اور جواب میں ہم نے کھانے کی ہڑتال کر دی اور ہمارے اس اقدام نے جیل کے قیدیوں میں بغاوت کی روح پھونک دی۔

ہمارے وارڈ کے قریب پنڈت دیورتن شرما جنرل سکریٹری آل انڈیا ہندو مہا سبھا پہلے

ت جیل یاترا کے لیے آ چکے تھے۔ ہم سے اتنے قریب تھے کہ جنگلے کے دروازے سے جھانک کر باتیں کر لیتے تھے' انہوں نے بھی کھانا چھوڑ دیا اور ہم سے کہا جب تک زیڈ احمد معافی نہ مانگے ہرگز کھانا نہ کھانا۔

اب ایک دلچسپ قصہ سنیئے۔ زیڈ احمد صاحب کی بیوی دلی کے خاندان کی ایک شریف خاتون تھیں۔ زیڈ احمد صاحب ان سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے جب سنا کہ خلافت کے مولویوں نے کھانا چھوڑ دیا ہے تو خود بھی کھانا چھوڑ دیا۔

ہماری بھوک کا کتنا اثر ہوا یہ تو ہم جانتے نہیں مگر بیگم صاحبہ کا حربہ اتنا کارگر ہوا کہ زیڈ احمد صاحب کے حواس جاتے رہے۔ بیگم صاحبہ نے کہا جب تک مولویوں سے معافی نہ مانگو گے میں ہرگز کھانا نہ کھاؤں گی اور کئی قسم کے کھانے پکا کر شوہر کو دیئے کہ ابھی جاؤ' میرا اسلام کہو اور معافی مانگ کر کھانا کھلاؤ۔

زیڈ احمد صاحب بیوی کی خفگی کی تاب نہ لا سکے اور جیل میں آ کر ہم سب سے کھلے لفظوں میں معافی مانگی اور ہم نے پنڈت شرما کے کہنے پر کھانا کھالیا۔

ایسی حالت میں بجنور جیل میں ہمیں کیسے رکھا جا سکتا تھا' بریلی بھیج دیا گیا۔ ڈسٹرکٹ جیل میں ہم ایسے وقت پہنچے کہ صبح ہونے میں دو گھنٹے باقی تھے اور جب تک سپرنٹنڈنٹ نہ آ جاتے ہمیں پھاٹک سے جیل میں داخل نہ کیا جا سکتا تھا۔

صبح کے وقت سپرنٹنڈنٹ آیا۔ یہ آئرلینڈ کا شریف انگریز تھا ہم لوگ کھادی کے سبز چغے پہنے ہوئے تھے سینہ پر بٹن لگے ہوئے تھے جن پر ''خلافت'' لکھا ہوا تھا۔ بٹن دیکھ کر بولا اچھا خلافت' خلافت اور تعظیماً ٹوپی اتار لی۔ اندر لے کر چلا تو ہنستا ہوا حکم دیا کہ ان لوگوں کے لیے دیوانی کا جیل صاف کرایا جائے۔

دیوانی کا جیل اچھا خاصا مکان تھا۔ پاخانہ بھی الگ تھا' دروازہ بھی تھا جسے بند کرا دیا جائے تو جیل سے الگ ہو جاتا تھا۔ بجنور جیل میں ہم میں سے ہر ایک کو دو کٹورے لوہے کی چادر کے دیئے گئے تھے۔ ایک کھانے کے لیے اور ایک پانی پینے کے لیے مگر بریلی کے سپرنٹنڈنٹ نے حکم دیا کہ مٹکے اور گھڑے منگوا کر پانی بھروا دیا جائے اور روز کے روز تازہ پانی بھرا جایا کرے۔ مستقل ایک قیدی جو حافظ قرآن تھے' انہیں ہدایت کی گئی کہ ہمارے پاس رہیں کھانا لائیں' پانی بھریں اور جو کام ہوا نجام دیں۔

رمضان شروع ہو گیا تھا' سحری کے لیے سبزی دال اور چاول اور شام کے کھانے پر فقط دال اور روٹی آتی تھی۔

عید آئی تو ہمارے کہنے پر سپرنٹنڈنٹ نے جیل کی چار دیواری میں نماز عید کا بندوبست کرایا اور تمام مسلمان قیدیوں کو اجازت دے دی کہ جو کوئی چاہے ہمارے ساتھ نماز ادا کرے۔ حکیم عبدالکریم مرحوم نے نماز پڑھائی۔

کچھ دن بعد سنٹرل جیل تبادلہ ہو گیا اور وہاں کے سپرنٹنڈنٹ جیل سے ہمارا ٹکراؤ ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ جب بھی جیل کی گشت کے لیے آئے ہم اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوں' ہم لوگ اسے گوارا نہ کرتے تھے۔

مولانا بشیر احمد اور راقم الحروف کا یہ مشورہ ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ جیل کے آنے کے وقت مولانا حفظ الرحمٰن چبوترہ پر بیٹھ کر تفسیر قرآن بیان فرمائیں اور ہم لوگ مودب بیٹھ کر سنا کریں۔ تاکہ یہ کہا جا سکے کہ یہ ہماری عبادت کا وقت ہے اور عبادت کے وقت کسی کی تعظیم نہیں کی جا سکتی۔

ایک دلچسپ واقعہ اذان کا پیش آیا۔ میر مظاہر حسین مرحوم اذان دیتے تھے اور پوری آواز اور نعروں کے ساتھ اللہ اکبر کی تکرار کرتے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ اور جیلر نے اعتراض کیا تو مولانا حفظ الرحمٰن نے مسکرا کر کہا:

''ہمارا عقیدہ ہے کہ جہاں تک اذان کی آواز جاتی ہے شیطان بھاگ جاتا ہے اس لیے ہم اذان پوری آواز سے دیتے ہیں۔''

اس پر دونوں چلے گئے۔

بابا رام چندر لیڈر کسان سبھا اور حمید اللہ الہ آبادی بھی اسی جیل میں تھے مگر ہم سے دور تھے' دونوں نے پیغام بھیجا کہ اپنے قول سے ہٹنا نہیں اور پوری بلند آہنگی سے اذان دینا۔

ایک دن سپرنٹنڈنٹ جیل نے ہم سے پوچھا آپ دنیا میں کیا کام کرتے تھے' میں نے اور مولانا بشیر احمد نے کہا۔ جی! ہم چوری کرتے تھے ڈاکے ڈالتے تھے' جیب تراشتے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ اردو مشکل سے بولتا تھا۔ بولا نہیں نہیں' ہم یہ پوچھتا ہے کہ آپ لوگ دنیا میں کیا کام کرتے تھے' بہر حال ہم نے بتا دیا اور سپرنٹنڈنٹ کے اس جملے پر کہ دنیا میں کیا کام کرتے تھے دیر تک ہنستے رہے۔

جس زمانے میں ہم جیل میں تھے' ہمارے خاندان والوں کو تسلی دینے کے لیے ملک کے مایہ ناز فرزند اور حکومت کے محبوب وزیر اعظم پنڈت نہرو اور مولانا آزاد سیوہارہ پہونچے اور ہم جیسے بینواؤں کے گھر گھر جا کر تسلی دی اور اپنی ہمدردی کا یقین دلایا۔

جیل سے واپس آئے تو ہم میں سے بہت سے رفیق مولانا کا ساتھ نہ دے سکے اور تھک کر بیٹھ رہے۔ مگر مولانا کے جوش اور ولولہ کا یہ حال تھا کہ ہر قدم اٹھاتے وقت آسمان چھو لینا چاہتے تھے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا' انگریز بھگاؤ اور ۴۷ء کا کردار تو اس کو بچہ بچہ جانتا ہے اگر بیان کیا جائے تو پورا اخبار اسی سے بھر جائے گا۔

وہ تو شاید اس خواب کو بھول بھی گئے ہوں گے۔ مگر ہم میں سے کچھ لوگ خصوصاً راقم الحروف کو انتظار تھا کہ وہ وقت کب آتا ہے کہ مولانا کے کردار کی روشنی سے ہندوستان کا کونا کونا منور ہو گا۔

اور اب سب دیکھ رہے ہیں کہ وفات کے بعد بھی خواب کا عکس اور پرتو نظر آ رہا ہے اور بڑے بڑے رہنما' حکومت کے وزیران کے کردار کی روشنی سے اپنے دل کے چراغ روشن کرنے کے خواہشمند ہیں۔

مجاہدِ ملت: بچپن سے طالب علمی تک

(مولانا مفتی) محمد جمیل الرحمٰن سیوہاروی

ظلمت کدہ میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع تھی دلیل سحر، سو خموش ہے
(غالب)

مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ ۱۳۱۸ھ میں عالم دنیا میں تشریف لائے۔ آپ کا اصل نام معزالدین تھا اور مستقبل نے ثابت کر دیا کہ آپ فی الواقع اسم بامسمیٰ تھے۔ یعنی خداوند ذوالجلال نے آپ کے ذریعے دین متین کو عزت بخشی تھی۔ حفظ الرحمٰن آپ کا تاریخی نام تھا جب کہ رحمان کے لفظ کو الف کے ساتھ لکھا جائے۔ مولانا نے یہ تصریح خود مجھ سے بیان فرمائی تھی۔ ابوالقاسم کنیت فرماتے تھے۔ وطن مالوف قصبہ سیوہارہ ضلع بجنور محلہ مولویان تھا۔ مولانا ایک تعلیم یافتہ زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا اسم گرامی الحاج مولوی شمس الدین صاحب صدیقی تھا۔ جو نہایت خوش عقیدہ، صالح بزرگ اور علمائے حق کے گرویدہ و پروانہ تھے۔ اور حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی (ضلع اناؤ) سے بیعت تھے۔

مولانا مرحوم ابتدائے شعور ہی سے متین اور مہذب واقع ہوئے تھے۔ اول تو متانت و تہذیب آپ کا خلقی و طبعی تقاضہ تھا لیکن خاندان کے بزرگوں کی تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ مکتبی تعلیم اپنے مکان پر حاصل کی۔ آپ کے والد ماجد نے آپ کو ہونہار دیکھ کر خاص طور پر آپ کو عربی تعلیم دلانے کا عزم کیا۔ چند ابتدائی کتابیں مدرسہ شاہی مسجد مرادآباد میں آپ نے پڑھیں۔ اس کے بعد مدرسہ فیض عام سیوہارہ میں آپ کو داخل کر دیا گیا اور درس نظامی کی تکمیل تک آپ اسی مدرسہ میں مصروف تعلیم رہے۔

مدرسہ فیض عام میں آپ کے مخصوص اساتذہ میں سے حضرت مولانا سید عبدالغفور صاحب سیوہاروی تلمیذ رشید حضرت مولانا سید احمد حسن صاحب امروہوی اور الحاج حافظ مولانا

احمد صاحب چشتی نیز مولانا سید آفتاب علی صاحب شاگرد رشید حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند تھے۔ یہ تمام حضرات اعلیٰ قابلیت سے متصف اور اخلاق فاضلہ سے مزکی ومزین تھے۔ اساتذہ کے یہ معنوی محاسن وکمالات مولانا پر بھی اثر انداز ہوئے۔ جس کے بعد دیگر اکابر ملت کی خدمت میں پہنچنے پر ان اثرات میں مزید جلا پیدا ہوگئی۔

مولانا مرحوم بہت ذکی اور ذہین تھے۔ خدا نے آپ کو طبع وقاد ودیعت فرمائی تھی، اسی بناء پر آپ زمانہ تعلیم میں اپنی جماعت میں ہمیشہ نمایاں اور ممتاز رہتے تھے، اور آپ کے اساتذہ آپ کی بڑی قدردانی فرماتے تھے، خوش قسمتی سے اساتذہ نے جس انداز سے آپ کی تعلیمی تربیت کی۔ اس نے شروع ہی میں آپ کو شاہراہ ترقی پر کھڑا کر دیا اور پوری زندگی میں یہ تربیت آپ کی رہنما ثابت ہوئی جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب آپ کی اعلیٰ تعلیم کا زمانہ آیا تو ہفتہ وار مجلس میں تقریر کے لیے آپ کے ہم جماعت طلبہ کو اسلام وغیرہ سے متعلق اہم موضوع دیے جاتے تھے اور آپ ہفتہ وار بلاناغہ اس موضوع پر تقریر کرتے اور اساتذہ سے داد وتحسین حاصل کرتے تھے۔ اس طرح آپ کو کتب بینی کا شوق بھی پیدا ہوا اور آپ کا مطالعہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور انجام میں یہی طریق تربیت آپ کے اعلیٰ خطیب اور وسیع النظر ہونے کا سبب بنا۔ مدرسہ فیض عام میں تکمیل کے بعد آپ نے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، اور بحر العلوم حضرت مولانا سید انور شاہ صاحبؒ کشمیری، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، حضرت میاں صاحب وغیرہم، جیسے آفتاب وماہتاب اکابر ملت، نیز مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی، جیسے شیخ طریقت سے استفادہ کا آپ کو طویل موقع نصیب ہوا۔ یہاں آپ نے دوبارہ دورہ حدیث وغیرہ اعلیٰ نصاب کی تکمیل فرمائی۔ اور بلاشبہ دارالعلوم دیوبند کے اس قیام نے آپ کی اعلیٰ قابلیت میں چار چاند لگا دیئے۔ دارالعلوم کے زمانہ طالب علمی میں مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب خلف اکبر حضرت مفتی اعظم قدس سرہ اور آپ کا ساتھ ہوا۔ جو آخر لحہ حیات تک قائم رہا۔

مولانا کی سیاسی زندگی کا آغاز تحریک خلافت ہی سے ہو جاتا ہے مولانا کی سیاسی نشوونما میں حضرت مولانا بشیر احمد صاحب (بھٹا) مرحوم کی رفاقت کو بہت بڑا دخل ہے اور ان دونوں بزرگوں کی یہ رفاقت بھی پوری یکسانیت کے ساتھ آخر تک قائم اور باقی رہی ہے۔ مولانا مرحوم کے مخصوص دوستوں میں میرے برادر بزرگ جناب حاجی حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم تھے، اور دونوں اپنے مخصوص تعلق کی بناء پر ہمیشہ ایک جان دو قالب نظر آتے تھے۔ بھائی صاحب کا

وصال اب سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے ہو چکا ہے۔ اور ان کی وفات پر ایک بیان میں مولانا نے فرمایا تھا۔ کہ مجھے تو یہ امید تھی کہ حاجی صاحب مرحوم سے پہلے میں رخصت ہوں گا اور وہ مجھ کو مٹی دیں گے۔ لیکن آہ وہ داغ مفارقت دے کر پہلے ہی چلے گئے، مگر ڈیڑھ سال کا آگے پیچھے ہی کیا۔ یوں سمجھیئے کہ دونوں جگری دوست ساتھ ہی گئے اور ایک نے دوسرے کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ خدائے پاک دونوں کو رحمت خاصہ سے نوازے اور مغفرت تامہ نصیب فرمائے۔

اب اس رباعی پر اپنی گزارش کو ختم کرتا ہوں:

در خلد حفظ رحمٰن آرام یاب بادا
عزت مآب بادا، ہم مستطاب بادا
گفتم کہ چیست ہاتف تاریخ ارتحالش
فرمود ایں دعائے غفراں مآب بادا

۱۳ ھ ۸۲

حضرت مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰنؒ

شاکر جلیل صدیقی شیرکوٹی

حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند و ممبر پارلیمنٹ کے بارے میں ادبی حیثیت سے تو میرا مضمون کوئی درجہ نہیں رکھتا۔ لیکن جو عزیز دارانہ تعلق اور قرب مجھے حاصل رہا ہے اور جس طرح میں نے ان کی خانگی زندگی سے ان کی بیرونی زندگی کی مطابقت کی ہے اس کے اعتبار سے میرا مضمون معلوماتی ہوگا۔

مولوی شمس الدین صاحب سیوہارہ ضلع بجنور کے معززین اور علماء دین کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے' بھوپال اور ریاست بیکانیر میں اسسٹنٹ انجینئر کے عہدے پر مامور رہے۔ ان کی زمینداری مال گزاری کے علاوہ پانچ ہزار روپیہ سالانہ بچت کی تھی۔ مولوی شمس الدین صاحب کے چار لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔

بیٹے: مولوی ڈپٹی فخر الدین صاحب' مولوی بدرالدین صاحب وکیل' مولوی حفظ الرحمٰن اور حکیم صلاح الدین صاحب تھے۔

بیٹیاں: بتول فاطمہ اور عظمت النساء تھیں' بڑی لڑکی کی شادی مولوی انوارالحسن صاحب نائب صوبہ دار ریاست گوالیار سے اور دوسری کی شادی حافظ ابراہیم صاحب وزیر آب پاشی برقیات سے ہوئی تھی۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی والدہ محترمہ بڑی دین دار' مخیّر اور پابندِ صوم وصلوٰۃ خاتون تھیں اور حافظ عبدالرحمٰن صاحب مراد آبادی سے بیعت تھیں۔ مولانا کے منجھلے بھائی مولوی بدرالدین صاحب انتقال فرما چکے ہیں۔ مولوی ڈپٹی فخر الدین صاحب اور حکیم صلاح الدین صاحب بقیدِ حیات ہیں۔ مولانا مرحوم کی والدہ محترمہ نے مولانا کے والد بزرگوار سے درخواست کی کہ میں حفظ الرحمٰن کو دینی تعلیم دلانا چاہتی ہوں۔ ان کی یہ درخواست منظور ہوئی۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم سیوہارہ کے عربی مدرسے میں حاصل کی۔ پھر وہاں سے دیوبند

چلے گئے۔ حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شاگردی پر ہمیشہ ناز رہا۔ فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند میں تعلیمی خدمات انجام دینے لگے۔

اس کے بعد اساتذہ کے مشورہ پر سیٹھ یعقوب صاحب کی درخواست بہ سلسلۂ تبلیغ ۱۹۲۶ء میں مدراس گئے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے' کہ مولانا مرحوم بچپن ہی سے مجاہدانہ خدمتِ خلق کا جذبہ دل میں رکھتے تھے۔ سیوہارہ میں ایک نومسلم جذامی جس کی بہت بری حالت میں موت واقع ہوئی۔ اسے غسل دینے کے لیے کوئی تیار نہ تھا۔ مولانا مرحوم نے اپنی کم عمری ہی میں اس جذامی کی تجہیز و تکفین اپنے ہاتھوں سے انجام دی۔

دوسرا واقعہ' نوادہ سہس پور میں ٹرین کا حادثہ پیش آیا' سیکڑوں افراد مجروح ہوئے اور بہت سے موت کے گھاٹ اتر گئے۔ مولانا نے جلتی ہوئی آگ سے مجروحین کو نکال کر ان کی تجہیز و تکفین کی' خود بھی اس حادثے سے جھلس گئے تھے۔ کافی عرصے تک زخمیوں کا علاج کراتے رہے۔

عنفوان شباب ہی سے جمعیۃ علماء و تحریک خلافت و کانگریس میں آزادی وطن کے لیے طوفانی دوروں اور پراثر تقریروں سے ہر جماعت کے محاذ پر سرگرم رہے اور وہ خدمات انجام دیں کہ ملک کے ممتاز اور سرگرم لیڈروں میں مقام حاصل کر لیا' مدراس کے قیام کے دوران ۱۹۲۸ء میں ڈابھیل تشریف لے گئے اور وہاں اپنے استاد حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اس کے بعد ۱۹۳۴ء میں کلکتہ چلے گئے۔ وہاں دو سال مقیم رہے۔ وہیں سے مولانا نے اپنے زورِ بیان اور ترجمہ قرآن شریف کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی شروع کر دیا۔ جسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی' اور ایک مستقل ادارہ کے قیام کی بات لوگوں کے مشورہ سے سامنے آئی۔ مولانا مرحوم نے فیصلہ کیا کہ یہ ادارہ دہلی میں قائم کیا جائے۔ چنانچہ امروہہ میں تین سال درس و تدریس میں گزارنے کے بعد سیاسی مشغولیتوں کے ساتھ ۱۹۳۸ء میں دہلی چلے آئے۔ ندوۃ المصنفین کی بنیاد ڈالی' آج تک قائم ہے جس کے نگراں حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ہیں اور مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی وغیرہ کی رفاقت میں بڑی شان سے چل رہا ہے' ایک ادبی رسالہ ''برہان'' بھی اس ادارہ سے شائع ہو رہا ہے۔

جمعیۃ علماء کی وابستگی اور مولانا کی خدمات وخلوص سے متاثر ہو کر اکابرین نے مولانا مرحوم کو ۱۹۴۲ء میں جمعیۃ علماء کا ناظم اعلیٰ منتخب کیا یہ سلسلہ تادم واپسیں قائم رہا۔ جمعیۃ کی بقا کے لیے فنافی الجمعیۃ ہو کر کام کیا۔ اپنے گھر اور اہل وعیال کے مستقبل سے اللہ کے توکل پر بھروسا رکھتے ہوئے ہمیشہ لاپرواہ رہے۔ کبھی آرام کرنا نہ جانا۔ بیمار ہوں یا تندرست جاڑا ہو یا گرمی آج یہاں ہیں تو کل وہاں، جوش خدمت میں اپنی صحت تک کا خیال نہ کیا۔

۱۹۴۷ء کے فسادات میں کئی مرتبہ بچے۔ گولیاں سر پر سے اور دائیں بائیں قریب سے گزر گئیں۔ اللہ کریم کو اب تک زندہ رکھنا تھا، اب تک زندہ رہے۔

حضرت مولانا عبدالقادر صاحب ؒ رائے پوری فرمایا کرتے تھے:

> ''مولانا حفظ الرحمٰن کی ۱۹۴۷ء کے خونی دور کے ایک دن کی خدمت ہم خانقاہی لوگوں کی تمام عمر کی عبادت سے زیادہ ہے۔''

مرحوم کچھ دنوں یو۔ پی اسمبلی کے ممبر رہے ہیں۔ چند مہینوں کے بعد ہی پارلیمنٹ کے انتخاب میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے اور تاحیات کامیاب ہوتے رہے۔

تصانیف:

رسول کریم، قصص القرآن، اسلام کا اقتصادی نظام، اخلاق اور فلسفہ اخلاق، البلاغ المبین حفظ الرحمٰن المذہب النعمان وغیرہ وغیرہ۔

مرحوم کی یہ کتابیں بڑی مقبول ہوئیں۔

خدمت جمعیۃ علماء:

نظامت عظمیٰ پر سرفراز ہونے کے بعد حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو چند در چند دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جمعیۃ مقروض تھی۔ نہ اخبار تھا، نہ بزنس، نہ ذاتی دفتر، نہ جائیداد، یہ ان کی ہمت تھی اور استقلال کہ انہوں نے قرضہ بھی ادا کر دیا، اخبار کا دوبارہ اجراء ہوا، الجمعیۃ بک ڈپو کا قیام عمل میں آیا اور ''الجمعیۃ برقی پریس'' دہلی کے ایک ممتاز پریس کی حیثیت سے منظر عام پر آ گیا۔ بک ڈپو کے ساتھ ایک لائبریری بھی قائم ہے جمعیۃ علماء ہند کی ذاتی املاک میں ایک بڑی عمارت اور اس سے ملحقہ جائیداد مجموعی طور پر ساٹھ ہزار روپے کی حاصل کر دی۔

مولانا مرحوم کے روزمرہ کے دفتری معمولات بھی انتہائی رکھتے تھے۔ صبح کی نماز کے

بعد گھر آتے' اور سب گھر والوں پر محبت بھری ایک نگاہ ڈال کر دفتر چلے جاتے۔

صبح کی چائے دفتر ہی میں جاتی تھی۔ دفتر کی چائے کے ساتھ اپنی چائے مہمانوں کے ہمراہ پیتے تھے۔ مہمانوں میں دسترخوان پر کوئی تخصیص نہ تھی۔ ہندو' مسلمان' سکھ' عیسائی' سب ہی ہنس بول کر چائے پیتے۔ اس کے بعد مولانا دفتری امور کی دیکھ بھال شروع کرتے اور اطراف و اکناف ہند کے آنے والوں کی ضرورتوں اور پریشانیوں کو سنتے اور ان کے مناسب و معقول حل تلاش کر کے مدد فرماتے۔

یہ سلسلہ ڈیڑھ بجے دن تک جاری رہتا۔ اس کے بعد گھر جا کر آپ کھانا کھاتے اور پھر دفتر واپس آ کر آرام فرماتے اور عصر کے وقت اٹھ جاتے اس درمیان میں ضرورت مند حضرات کو پوری اجازت تھی کہ عصر سے رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک پھر دفتر جمعیۃ علماء ہند میں ملاقاتیوں اور ضرورت مندوں کا ہجوم رہتا' اور مولانا ان کی خاطر خواہ خدمت کرتے۔

اسفار کا یہ عالم تھا کہ جس کسی نے لکھا' اس کی درخواست اگر کوئی ضرورت خاص نہ ہوتی تو قبول فرماتے۔ بستر ہر وقت بندھا رہتا' اسے لیتے اور چلے جاتے۔

✱ دفتر جمعیۃ علماء ہند کی مصروفیتوں کے علاوہ مولانا نے اپنی مرضی کے خلاف ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب موجودہ نائب صدر جمہوریہ ہند کے اصرار پر سنی مجلس اوقاف صوبہ دہلی کی صدارت قبول فرمائی اور اس سے متعلق تمام اداروں کی ذمہ داری سرانجام دی۔

۱۔ مدرسہ عالیہ فتحپوری

۲۔ مسلم ہائر سکنڈری اسکول فتحپوری

۳۔ دلی کالج اجمیری گیٹ

۴۔ فتحپوری پبلک لائبریری

۵۔ انجمن ترقی اردو

۶۔ حج کمیٹی بمبئی

۷۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۸۔ کانگریس وغیرہ کی میٹنگوں میں مستعدی اور پابندی سے اپنے فرائض ادا کرتے' حج کمیٹی کے دوران پارلیمانی امور کو بھی سبکدوش فرماتے رہتے۔

اخلاق:

مولانا مرحوم بڑے مردم شناس اور بڑے مرنجان مرنج تھے‘ قوت برداشت کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی کسی مخالف سے برسرکار ہونے کو کہتا تو مولانا کا چہرہ سرخ ہو جاتا اور وہ سختی کے ساتھ منع کرتے۔ حتیٰ کہ اپنے گالی دینے والوں سے محبت اور خلوص کے ساتھ پیش آتے۔

ایک مرتبہ کچھ لوگ اپنی ضرورت لے کر مولانا کے پاس آئے‘ مولانا نے فرمایا‘ یہ کام مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ پھر بھی ان لوگوں کے اصرار اور خوشامد پر اپنے حلقہ اثر میں ٹیلیفون بھی کیا‘ اور وزراء کو ان کے کیس کی جانب متوجہ کرنے کے بعد خطوط بھی لکھے۔ ان مراحل کے طے ہونے کے بعد وہ لوگ دفتر سے جانے لگے۔ میں بھی اپنی ضرورت سے ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ جس کا ان لوگوں کو علم نہ ہوا۔ باہر نکلتے ہی انہوں نے مولانا کی شان میں گستاخانہ کلمات نکالے اور یہ کہا کہ۔۔ دیکھا کیسا کام کرایا۔ قریب تھا کہ میں ان سے دست و گریبان ہو جاتا۔۔ کہ پیچھے سے مولانا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ان لوگوں کو محسوس نہ ہونے دیا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔

اور مجھے گھر لا کر سختی سے کہا مجھے خواہ کوئی کچھ ہی کہے تم میرے معاملات میں قطعی دخل نہ دیا کرو۔ ورنہ میں تمہیں اپنے لیے اور اپنے آپ کو تمہارے لیے مردہ تصور کروں گا۔ اس دن کے بعد میری ہمت نہ ہوئی کہ میں کسی سے باز پرس کرتا۔ لوگ سب کچھ کہہ جاتے اور مولانا ہنس کر ٹال دیتے۔ اور یہ ہی کہتے کہ یہ لوگ مصیبت زدہ ہیں‘ اپنا غصہ اس طرح اتار کر اپنے غم کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔ انہیں نظر انداز کرو۔ لوگ پیچھے بادشاہ کو بھی گالیاں دیتے ہیں۔

مولانا مرحوم کی ساری زندگی سیاسی تگ و دو میں کانگریس کے ساتھ گزری اور اس درجہ کے کانگریسی شمار کیے گئے کہ بعض لوگوں نے انہیں وظیفہ خوار تک قرار دیا۔ لیکن مولانا مرحوم نے ملکی اور قومی مفاد کی وجہ سے اپنی وضع نہ بدلی۔ پورے خلوص کے ساتھ کانگریسی رہے پھر بھی انتخابات ختم ہوتے ہی مولانا مرحوم کا انداز حزب مخالف کے لیڈروں جیسا ہو جاتا اور وہ یہ کہتے کہ جتنا وطن عزیز کا میرے اوپر حق ہے اتنا ہی مسلم اقلیت کا ایک فرد ہونے کے ناطے سے مسلمانوں کا بھی مجھ پر حق ہے۔ چنانچہ حکومت اور کانگریس دونوں سے مسلمانوں کے لیے دشمن کی طرح لڑتے۔ ہندو‘ سکھ حضرات کے کیس بھی اگر لے کر کھڑے ہوئے تو ان کا رویہ وہی ہوتا جو مسلمانوں کے لیے ہوتا تھا۔ کوئی تفریق نہ ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی انتخابات میں

حصہ لیا۔ بھاری تعداد میں ہندو ووٹوں سے کامیاب ہوئے۔ مسلمان ووٹ تو انہیں نوے فیصدی ملتے ہی تھے۔ ہندو بھی دوسری پارٹیوں کے زور لگانے کے باوجود مولانا ہی کو ووٹ دیتے۔

آخری دنوں میں مولانا نے مسلمانوں کی خاطر مسلم کنونشن کیا۔ تمام پارلیمانی حلقے کے مسلمانوں نے اسے شروع شروع میں قبول نہ کیا۔ حکومت کے اعلیٰ ترین ذمہ داران بھی اسے فرقہ وارانہ تصور کرتے رہے اور یہ کنونشن نہ کرنے پر بضد رہے۔ لیکن مولانا کی بے باکی اور ہمت واستقلال نے یہ کنونشن شان کے ساتھ کیا۔ ہندوستان کے تمام اخبارات اور کئی جماعتوں نے مخالفت کی۔ لیکن مرحوم کے عزم وحوصلہ میں فرق نہ آیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفین قائل ہوئے اور سکوت اختیار کرنا پڑا۔ مسلم کنونشن ہوا اور عالمی حیثیت سے کامیاب ہوا۔ حکومت کو بھی شکایت نہ ہوئی' اور مسلمانوں کے مسائل بھی سامنے آ گئے اور مخالفین کے دانت کھٹے ہو گئے۔

مولانا مرحوم کے پسماندگان:

ایک لڑکا اور پانچ لڑکیاں ہیں۔ لڑکے کا نام لطف الرحمٰن عرف اسلم فیروز ہے۔ لڑکے اور دو لڑکیوں کی شادی ہو چکی ہے' تین لڑکیاں غیر شادی شدہ ہیں۔ مرحوم کے تین پوتے اور ایک پوتی ہے۔ پوتوں کا نام اسعد فیروز' احمد فیروز' ارشد فیروز ہے۔ ماشاء اللہ بڑا پوتا اسعد فیروز بہت ہونہار اور پڑھنے کا شوقین ہے۔

باب دوم

شخصیت و سیرت

وقت کی اہم ترین شخصیت

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم۔ اے صدر شعبہء دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مولانا اکبر آبادی نے یہ مضمون ۱۹۵۵ء میں تحریر کیا تھا۔ بحث یہ تھی کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے کس قسم کے رہنما کی ضرورت ہے؟

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی رشتہ میں مجھ سے بڑے میرے ماموں زاد بھائی ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے ساتھ تعلق کی نسبت سے میرے خواجہ تاش' جامعہء اسلامیہ ڈابھیل کی زندگی کے ساتھی اور اس کے بعد ندوۃ المصنفین دہلی کے رفیق ہیں۔ اس بنا پر میں نے ان کی زندگی کا مطالعہ بہت قریب سے کیا ہے۔ ان کی خانگی زندگی اور خاندانی ماحول سے واقف ہونے کے ساتھ میں نے ان کو خلوت میں' جلوت میں اور بے تکلف دوستوں کی مجلس میں' غرض ہر جگہ اور ہر مقام پر دیکھا ہے اور ان کی سیرت و کردار کا بڑی گہری نظر سے جائزہ لیا ہے اور اسی کا یہ اثر ہے کہ اس وقت میں یہ چند سطریں تحریر کر رہا ہوں' جو احباب اس حقیقت سے واقف ہیں کہ میں کسی زندہ انسان کی مدح سرائی میں خواہ وہ دنیا کا کتنا ہی بڑا انسان ہو' کس درجہ کوتاہ قلم واقع ہوا ہوں' ان کو یہ باور کرنے میں تکلف نہ ہوگا کہ ان سطور کا مقصد مسلمانوں کو خصوصاً اور اہل ملک کو عموماً صرف یہ بتانا ہے کہ تعمیر و نشاۃ ثانیہ کے اس مرحلہ پر قدرت نے حفظ الرحمٰن کے نام سے ان کو ایک کیسی جامع اور قابل قدر شخصیت عطا فرمائی ہے تاکہ وہ اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکیں اور اللہ کی اس نعمت پر شکریہ ادا کر سکیں' ورنہ جب وقت نکل جاتا ہے تو پھر پشیمان ہونے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

ابتدائی زندگی:

مولانا کے دو بھائی' بہنوئی اور بھتیجے سب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور ان میں سے کچھ اعلیٰ سرکاری ملازمتوں سے پنشن لے چکے ہیں اور کچھ اب تک برسر روزگار ہیں'

خاندان میں انگریزی تعلیم کا اس قدر چرچا ہونے کے باوجود ایک تنہا قابل ذکر ہستی مولانا حفظ الرحمٰن کی ہی ہے، جن کو شروع ہی سے انگریزی کے بجائے عربی تعلیم کی طرف میلان پیدا ہوا اور سیوہارہ کے ایک مقامی مدرسہ میں طالب علمی شروع کر دی "ہونہار برا کے چکنے چکنے پات" مشہور ہیں۔ میں بہت کمسن تھا اور آگرہ میں مکان پر ہی ایک اتالیق کے زیر نگرانی تعلیم حاصل کرتا تھا۔ اس زمانے میں میرے ماموں قاضی ظہور الحسن ناظم سیوہاروی اکثر آگرہ آتے جاتے تھے اور ہفتوں ہمارے گھر قیام کرتے تھے، ماموں صاحب کے بڑے لڑکے عثمان مرحوم تقریباً ایک ڈیڑھ سال سے آگرہ میں ہمارے ہاں مسلسل ہی رہتے تھے۔ جب کبھی ماموں سیوہارہ سے آتے تو وہ اور ان کے صاحبزادہ عثمان یہ دونوں اکثر سنایا کرتے تھے کہ سیوہارہ میں تمہارا بھائی حفظ الرحمٰن ایسا حاضر جواب ہے، خوب مناظرے کرتا ہے۔ ابھی سے وعظ کہتا ہے اور علی گڑھی بھائیوں سے ایسی ایسی بحثیں کرتا ہے کہ ان کو مات کر دیتا ہے، پھر ساتھ ہی ایسا نیک ہے، ایسا ہمدرد اور باادب ہے اور چنیں و چناں ہے۔ غرضکہ ماموں مزے لے لے کر مجھ کو اور والد صاحب اور والدہ صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا کو بھائی حفظ الرحمٰن صاحب کی باتیں سناتے تھے اور جی بھر کر تعریفیں کرتے تھے۔

جذبہ خدمتِ خلق:

ان خوبیوں کے ساتھ موصوف میں خدمتِ خلق کا جذبہ اور اس راہ میں تکالیف برداشت کرنے کا حوصلہ بھی شروع ہی سے تھا۔ ۱۹۲۰ء میں مراد آباد کے مدرسہ امدادیہ میں پڑھتا تھا کہ سنا کہ سیوہارہ سے پانچ میل کے فاصلہ پر رات کے دو بجے کے قریب دون ایکسپریس کو ایک بڑا شدید حادثہ پیش آیا جس میں بیسیوں آدمی مظلومیت و بیچارگی کے ساتھ لقمہ اجل بن گئے۔ بھائی حفظ الرحمٰن کو جوں ہی اس حادثے کی اطلاع ملی اسی وقت اندھیری رات میں پانچ میل پاپیادہ سفر کر کے موقع واردات پر پہنچ گئے اور پھر جو کچھ وہ کر سکتے تھے کیا اور اس عالی حوصلگی کے ساتھ کیا کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے۔

تحریک خلافت:

انہیں دنوں میں تحریک خلافت اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا ملک اس کے ہنگامے سے گونج اٹھا، حفظ الرحمٰن ایسی طبیعت اس سے کس طرح الگ رہ سکتی تھی؟ اس میں شریک ہوئے

اور جیل خانہ پہنچے۔ موصوف جس جیل میں تھے اس کے افسر اعلیٰ کرنل زیڈ احمد تھے جو اپنے زمانے کے بڑے ہی سخت قسم کے افسر تھے ان کی صاحبزادی فخریہ حمیدہ سلطان جو اردو زبان کی مشہور ادیبہ اور افسانہ نگار ہیں اور ان کی بیگم صاحبہ جو دلی کے مشہور خانوادے کی چشم و چراغ اور بڑی عابدہ وزاہدہ ہیں یہ دونوں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے اس زمانہء اسارت کا بڑی دلچسپی سے ذکر کرتی ہیں۔ ایک مرتبہ فخریہ حمیدہ سلطان نے کہا کہ میں اس وقت کم عمر تھی مگر اب تک مجھ کو یاد ہے کہ مولوی حفظ الرحمٰن اور ان کے ساتھی جیل میں قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے اور نماز پڑھتے تھے۔ والدہ صاحبہ کو یہ معلوم ہوا تو ابا سے کہا کرتیں کہ آپ نے خدا کے کتنے بندوں کو جیل خانہ میں بند کر رکھا ہے۔ بہر حال بیگم صاحبہ بیچاری کر کیا سکتی تھیں۔ ''حکم حاکم مرگ مفاجات'' پھر بھی اتنا ضرور کرتی تھیں کہ عمدہ عمدہ کھانے پکوا کر اپنے شوہر سے ان قیدیوں کے لیے بھجواتیں اور ان کی خاطر مدارات کرتیں۔ اسی اثنا میں عید آ گئی تو بیگم صاحبہ نے بہت بڑی مقدار میں سویاں' دودھ' شکر اور شیر وغیرہ بھیجا اور اس طرح ان کی دعوت کی کہ مرزا غالب کے لفظوں میں ان اسیران فرنگ کو یہ کہنے کا موقع نہ رہا کہ:

اگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

کرنل زیڈ احمد صاحب مرحوم کے پورے خاندان کو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے ساتھ جو غیر معمولی خلوص و عقیدت اور ارادت و محبت ہے وہ اسی زمانہ سے ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں:

۱۹۲۱ء میں میں دارالعلوم دیوبند چلا آیا اور میرے وہاں پہنچنے کے ایک سال بعد جب تحریک خلافت کا بحرانی دور ختم ہو گیا تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی علوم وفنون کی تکمیل کے لیے وہاں پہنچ گئے اور غالباً دورہء حدیث میں داخلہ لیا۔ موصوف نے دیوبند پہنچتے ہی وہاں کی سوسائٹی میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا اور بہت جلد حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ الکشمیری کے مقربین خاص اور مخصوص تلامذہ میں جن میں اس وقت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اور شیخ الحدیث مولانا محمد بدر عالم (میرٹھی) نمایاں تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی شامل ہو گئے۔ دورہء حدیث سے فراغت تو ایک سال میں ہو ہی گئی' لیکن مولانا اس کے بعد مختلف

فنون کی اعلیٰ کتابیں پڑھنے کے ساتھ صحیح بخاری کی سماعت مسلسل کئی سال تک کرتے رہے۔ چنانچہ میں جس سال دورہ حدیث میں تھا اس سال بھی یہ صحیح بخاری کی سماعت بڑی پابندی سے کر رہے تھے اور میرے لیے حضرت شاہ صاحب کی تقریر قلم بند کرتے تھے۔ میرے پاس بھائی حفظ الرحمٰن صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ دو موٹی موٹی کاپیاں محفوظ تھیں۔ مگر ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں جب گھر لٹا تو یہ کاپیاں بھی نہ رہیں۔

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

۱۹۲۸ء میں حضرت شاہ صاحب اپنے چند رفقاء اور تلامذہ کے ساتھ ڈابھیل ضلع سورت تشریف لے گئے تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی ایک رکن کی حیثیت سے اس جماعت کے ساتھ ڈابھیل آئے اور طبقہ علیا کی کتابوں کا درس دینے لگے۔ طبیعت ایسی رسا اور ذہین پائی ہے کہ یہاں ہر فن کی اونچے درجے کی کتاب پڑھایا کرتے تھے اور یہ کہنا مشکل تھا کہ انہیں سب سے زیادہ مناسبت کس فن سے ہے۔

سیاسیات:

ڈابھیل میں کم وبیش تین سال قیام رہا اور اصلاً مشغلہ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف ہی رہا لیکن سینہ میں استخلاص وطن کا جو جذبہ موجزن تھا وہ ابھر آنے کے لیے مواقع ومحل کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ چنانچہ گاندھی جی کی تحریک سول نافرمانی شروع ہوئی اور ملک نے سیاسیات میں ایک نئی کروٹ لی ہی تھی کہ مولانا حفظ الرحمٰن اپنی ملازمت سے مستعفی ہو کر اپنی پوری قوت کے ساتھ سیاسیات کے خارزار میں کود پڑے۔ اس وقت ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ ۱۹۳۰ء میں بہ مقام امروہہ جمعیۃ علماء ہند کا جو سالانہ اجلاس ہوا اس میں مولانا محمد علی مرحوم ایسی شخصیت کے ساتھ ٹکر لے کر شرکت کانگریس کا رزولیوشن منظور کرا لیا اور اس طرح مسلمانانِ ہند کے لیے ایک واضح اور روشن نصب العین متعین کر دیا۔ جمعیۃ علماء ہند کے سرگرم کارکن ہونے کے ساتھ کانگریس کے برابر ممبر رہے اور صوبہ کانگریس میں ہمیشہ باوقار سمجھے گئے۔ متعدد بار جیل گئے۔ لیکن جب ہزاروں آدمی جیل جا رہے ہوں اور ''مرگ انبوہ جشن دارد'' کا عالم ہو صرف جیل جانا کوئی معیار فضیلت نہیں قرار پا سکتا۔ البتہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جس خلوص، انہماک، ایثار اور عزم واستقلال کے ساتھ جیل کے مصائب اور اس

کے متعلقات کو برداشت کیا ہے وہ بے شبہ ان کی کتاب فضائل کا ایک روشن باب ہے۔

سال ۱۹۳۲ء کا ہے کانگریس کو غیر قانونی جماعت قرار دیا گیا ہے اور اس کے باوجود کانگریس نے فیصلہ کیا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ مسز سروجنی نائیڈو کی صدارت میں دہلی میں گھنٹہ گھر کے پاس ہوگا۔ گاندھی ٹوپی میں جو نظر آتا ہے پکڑا جاتا ہے۔ کھدر میں جو دکھائی دیتا ہے دھر لیا جاتا ہے' اب ممبران کانگریس ہیں کہ عجیب عجیب طرح سے بھیس بدل بدل کر آ رہے ہیں' انہیں میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی تھے مگر اپنی وضع میں' پولیس کو پتہ چل گیا اور وہ ان کے تعاقب میں چلی لیکن مولانا ہیں کہ دلی میں ہی ایک گھر سے دوسرے میں اور دوسرے سے تیسرے میں چھپے اور اس طرح پولیس اور سی آئی ڈی کو جل دیتے پھر رہے ہیں' یہاں تک کہ جلسہ کا مقررہ وقت ہوا۔ اور گھنٹہ گھر پر متعین پولیس نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سامنے ہی نظر آئے انجام تو پہلے ہی سے معلوم تھا' پکڑ لیے گئے' جیل گئے لیکن جلسہ کرنا تھا وہ کر چکے تھے۔ روپوشی کے ان دنوں میں سے ایک دن میرے گھر میں بھی رہے تھے۔ مجھ کو یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ پولیس کی لاٹھیاں کھانی اور پھر جیل جانا یقینی تھا مگر کیا مجال کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی پیشانی پر فکر و تشویش کی ایک شکن بھی کہیں نظر آ جائے۔ وہی روزانہ کے معمولات کی پابندی' ہر ایک کے ساتھ ہنسی خوشی سے بات چیت' کھانا پینا اور وقت پر سو جانا' گویا انہیں کوئی نیا حادثہ پیش آنے والا ہی نہ تھا اور گویا انہوں نے کسی خطرناک وادی میں کوئی قدم ہی نہ رکھا۔

۱۹۴۲ء میں:

اس کے بعد اسی سلسلے کا دوسرا واقعہ جو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا وہ ۱۹۴۲ء میں پیش آیا' جنگ عالمگیر زوروں پر تھی۔ کانگریس خلاف قانون جماعت قرار دی جا چکی تھی ورکنگ کمیٹی اور ہزاروں ممبران کانگریس گرفتار ہو چکے تھے اور روزانہ ہو رہے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کا بھی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر ہونے کی حیثیت سے گرفتار ہونا یقینی تھا اور صبح شام ہو رہی تھی۔ ان دنوں میں مولانا ندوۃ المصنفین کے رفیق کی حیثیت سے تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے تھے۔ فضا میں اس درجہ بحران اور گرفتاری کے یقین کامل کے باوجود ان کا معمول تھا یعنی صبح آٹھ بجے دفتر ندوۃ المصنفین میں پہنچ جانا اور شام کو چار بجے وہاں سے رخصت ہو کر دفتر

الجمعیۃ میں بیٹھنا' کیا مجال کہ اس میں سر مو بھی فرق آ جائے وقت مقررہ پر آتے اور مطالعہ کرتے' لکھتے' بولتے چالتے اور تھوڑی دیر کے لیے درمیان میں قیلولہ کرتے۔ یہ سب معمولات بدستور قائم رہے۔ چنانچہ ایک دن دو پہر کے دو بجے کا وقت تھا کہ اچانک پولیس دفتر ندوۃ المصنفین میں داخل ہوئی اور وارنٹ دکھایا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ہنستے ہوئے شیروانی پہنی' ٹوپی سنبھالی' اپنے کاغذات لپیٹ کر رکھے اور سب سے مل ملا مصافحہ کر پولیس کے ساتھ چل دیئے' پھر ان کے لیے کوئی پیغام ہے' نہ گھر سے متعلق کوئی ہدایت ہے' چہرہ ہے کہ اسی طرح شگفتہ ہے' لب ہیں کہ ان پر تبسم کھل رہا ہے' ان کے ساتھی جو اس طرح ان کو جاتے دیکھ رہے ہیں دم بخود ہو کر رہ گئے ہیں۔ آنکھیں ڈبڈبا آئی ہیں' لیکن اس بطل حریت کا یہ عالم ہے کہ جیل خانہ کی طرف اس طرح قدم بڑھائے جا رہا ہے کہ گویا اسے وہاں پہنچنے میں دیر ہو گئی ہے اور وہ رفتار تیز کر کے اب تلافی مافات کر رہا ہے:

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشقِ ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

اس زمانہء اسارت میں کئی مرتبہ ان سے جیل خانہ میں ملاقات ہوئی مگر ہمیشہ یہی ہوا کہ ملاقات کے وقت جیل خانہ کا ماحول' آہنی سلاخیں اور کوٹھریاں دیکھ کر ہمارا دل ہے کہ اندر ہی اندر اداس ہو رہا ہے لیکن مولانا حفظ الرحمٰن ہیں کہ خوش وخرم نظر آ رہے ہیں گویا کہ ملک کے آسمان پر شدائد ومصائب کے جو گھرے بادل چھائے ہوئے تھے' مولانا نے ان بادلوں کی نقاب اٹھا کر آزادی کی روشن ناطورہء خوش جمال کو دیکھ لیا تھا' جو ان کے پیچھے چھپی بیٹھی تھی اور جو جلد ہی عالم ظہور میں آنے والی تھی۔

تقسیم کے بعد:

کہتے ہیں کہ انسانی کیریکٹر کے اصل نقوش وخطوط جو عام حالات میں ڈھکے چھپے اور دبے دبے رہتے ہیں۔ انتہائی غم یا جوش کے عالم میں یک بیک سطح پر ابھر آتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو آیئے اس آئینہ میں حفظ الرحمٰن صاحب کے کیریکٹر کی ایک جھلک دیکھتے چلیں۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کا دن حفظ الرحمٰن کے روزگارِ حیات میں گویا ایک جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ جب صبح مسرت اور شام غم دونوں ایک دوسرے سے مصافحہ کر رہے تھے۔ مسرت اس کی

کہ وطن آزاد ہوا' اور رنج والم اس بات کا کہ ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے اور اس کے نتیجے میں سرحد کے اِس پار اور اُس پار دونوں طرف شرافت وانسانیت ننگی ناچنے لگی۔

حادثہ جانکاہ:

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی ایک نہایت پیاری نوجوان بیٹی خالدہ جو دو تین برس سے تپ دق میں مبتلا تھی اور جس کے علاج معالجے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا تھا آخر ۲۔ یا ۳ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو مفارقت ابدی کا داغ دے کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔ مولانا انتقال کے وقت سیوہارہ میں ہی تھے اور ابھی ان کے غم کے آنسو خشک بھی نہ ہوئے تھے کہ خبر ملی کہ مشرقی پنجاب کا طوفان برق و بلا دہلی میں پہنچ گیا ہے اور چلتی ٹرین میں حادثات ہونے لگے ہیں' بچی کے انتقال کے دوسرے ہی دن سامان اٹھا کر اور تمام گھر والوں کو روتا پیٹتا چھوڑ کر دلی کے لیے روانہ ہو گئے۔

ان دنوں میں ریلوں میں مسلمانوں پر حملے ہونے شروع ہی ہو گئے تھے۔ خود مولانا جس ڈبے میں تھے اس پر بھی حملہ ہوا جس کا ظاہر ہے کہ سب سے بڑا نشانہ آپ ہی تھے لیکن چونکہ قدرت کو ان سے کام لینا تھا اس لیے فوج کا ایک افسرِ اعلیٰ جو سکھ تھا اور مولانا کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا اور اس نے ان لوگوں کو ڈرا دھمکا کر واپس کر دیا اور اس طرح آپ دہلی بخیریت پہنچ گئے۔ دہلی میں پہنچ کر انہوں نے کیا کیا؟ اے کاش دہلی کی جامع مسجد کو گویائی عطا ہوتی اور وہ اس داستان کو سنا سکتی' یا شاہجہاں آباد کے گلی کوچے' وہاں کے بازار اور سڑکیں وہاں کے محلے اور آبادیاں بول سکتیں اور وہ یہ کہانی بیان کر سکتیں۔ دہلی کی مسلم آبادی کے محلے' آگ کے شعلوں میں لپٹے ہوئے تھے' وحشت و بربریت کا کاروان برہنہ رقص کرتا پھر رہا تھا' جو انسانیت کے ہمدرد اور غم گسار تھے' وہ کس مپرسی کے عالم میں دم بخود تھے۔ مسلمان غریب اپنے مکان کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے بھی ڈرتا تھا' مگر دلی کا چپہ چپہ گواہ ہے کہ ایسے عالم رعد و برق میں ایک مولانا حفظ الرحمٰن ہیں کہ ایک چھوٹی سی موٹر میں صبح و شام ادھر ادھر پھر رہے ہیں۔ جہاں فساد کی اطلاع ملی اور یہ موقع پر پہنچے۔ حکام کو ان کے فرائض کی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ ان کو مشورہ دے رہے ہیں جو لوگ مکان چھوڑ رہے ہیں ان کے تخلیے کا انتظام کرا رہے ہیں کہ وہ جائے پناہ تک صحیح وسلامت پہنچ جائیں' شہر میں جہاں جہاں جو صورت حال پیدا ہو رہی ہے یا

اس کے پیدا ہونے کا امکان ہے اس کا بڑی گہری نظر سے جائزہ لے رہے ہیں اور پل پل کی خبر حکومت دہلی اور حکومت ہند کو پہنچا رہے ہیں اور اس سلسلے میں ضروری احکام لے رہے ہیں۔ غرض ایک تنہا جان ہے جو ہر وقت متحرک' ہر آن بیدار اور برابر سرگرم عمل ہے۔ راستہ میں موٹر پر کئی بار بم گرے' لاٹھیاں برسیں' پتھر پھینکے گئے۔ قتل کی سازشیں ہوئیں' دھمکیوں کے خط ملے۔ لیکن جس نے اپنی جان جان آفریں کے بندوں کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی وہ ان سب چیزوں سے کیا ڈرتا۔ اس کی سرگرمی اور جوش میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ اس وقت کون کہہ سکتا ہے کہ حفظ الرحمٰن کے دل میں غم والم کے کتنے بادل ہوں گے جو آنکھوں کی راہ سے برس کر کھل جانا چاہتے ہوں گے۔ لیکن کیا مجال کہ چہرہ پر اداسی اور افسردگی کی کوئی ایک سکوڑ بھی ہو۔ وہی ایک بہادر سپاہی کا عزم و استقلال' وہی ایک خود اعتمادی اور ہمت جو حوادث کے ہاتھوں شکست کھا کر بھی تازہ دم رہتی ہے اور اپنے مستقبل کو ماضی و حال کی مایوسیوں کے سپرد نہیں کرتی۔ اس تمام مدت میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے چہرے بشرے سے اور ان کی ہر ہر ادا سے عیاں اور نمایاں تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ آج دہلی میں اور اس کے اطراف ونواح میں لاکھوں مسلمان آباد ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حکومت اور دوسرے پبلک ورکرز کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ لیکن مجھ کو اس میں ذرا شک نہیں کہ مولانا حفظ الرحمٰن ان تمام کوششوں کے روح رواں تھے جو ایک طرف پبلک اور دوسری طرف حکومت دونوں سے پوری طرح وابستہ تھے' یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی دلی آئے تو انہیں سب سے زیادہ اعتماد مولانا حفظ الرحمٰن پر ہی تھا۔ روزانہ صبح کو ان کا گاندھی جی کے پاس پہنچنا' حالات سے باخبر کرنا' اور اس سلسلے میں انتظامی مشورے دینا یہ ان کا مقررہ معمول تھا' اگر کسی دن مولانا کو ذرا دیر ہو جاتی تو گاندھی جی سخت پریشان ہو جاتے تھے کہ خدا خیر کرے آج حفظ الرحمٰن اب تک نہیں آئے اور کوئی شگوفہ تو کہیں نہیں کھل پڑا۔

مخالفوں کے ساتھ سلوک:

انسانی کیریکٹر کی سب سے بڑی عظمت یہ ہے کہ مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف کا معاملہ کیا جائے اور وقت پڑنے پر ان سے انتقام نہ لیا جائے۔ ان مذکورہ بالا تمام کاموں کے ساتھ سیکڑوں' ہزاروں' مسلمان تھے جو کل تک مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے شدید

مخالف اور بے حد نکتہ چین رہے تھے۔ مولانا نے اس وقت دوست دشمن کا کوئی امتیاز نہیں برتا اور ان لوگوں کے لیے جو پاکستان جانے کا ارادہ کر چکے تھے سفر کی سہولتوں کا انتظام کیا۔ غرض کہ اس وقت مسلمانوں کی امداد اور اس کے ذریعے سے خود ملک کی خدمت کا کوئی ایک کام بھی ایسا نہیں تھا کہ جس کو مولانا پوری سرگرمی، جوش، تندہی اور کمالِ ایثار و قربانی کے ساتھ انجام نہ دیتے ہوں۔

غیرت وحمیتِ اسلامی:

تقسیم کے بعد مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ تباہ کن ان کا احساس کمتری تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ملک کے طول وعرض کا دورہ کر کے اپنی حقیقت افروز تقریروں سے اس احساس کو جس طرح دور کیا ہے، اسے تمام باخبر حضرات جانتے ہیں۔ لیڈروں کا عام طور پر ظاہر و باطن ایک نہیں ہوتا۔ پلیٹ فارم پر کچھ کہتے ہیں اور خلوت میں کسی اور طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن یہاں معاملہ بالکل یکساں ہے۔

دو واقعات:

ایک مرتبہ ۱۹۴۸ء میں میں اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب دونوں ایک ساتھ دہلی سے لکھنو جا رہے تھے۔ وہاں یو۔ پی گورنمنٹ کی ایک تعلیمی سب کمیٹی کے جلسہ میں شریک ہونا تھا۔ راستہ میں میں نے ان سے کہا کہ پاجامہ اور دھوتی کی جنگ ختم کرنے کے لیے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کی طرح مغربی لباس اختیار کر لیا جائے؟ مولانا نے فوراً تڑاق سے جواب دیا کہ اگر مسلمانوں نے ہندوؤں سے مرعوب ہوکر اسی طرح اپنی قومی تہذیب اور ملی تمدن کو چھوڑ کر مغربی تہذیب و تمدن کو اختیار کر کے اپنی عافیت و اطمینان کا سہارا ڈھونڈا تو پھر بات ہی کیا ہوئی؟ اور یہ تو کسی آزاد ملک کے ایک آزاد باشندے کی زندگی نہ ہوئی۔ اسے میں ہرگز پسند نہیں کر سکتا۔

اسی طرح میرا ذاتی خیال تھا کہ ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر مسلمانوں کو گاؤکشی کے انسداد کا اعلان کر دینا چاہیے۔ کیوں کہ مذہباً ایسا کرنا جائز بھی ہے اور اس سے ہندو مسلم تعلقات کے خوشگوار ہونے کی امید بھی ہوسکتی ہے۔

ایک دن مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے میں نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا تو حسبِ عادت

سنتے ہی بگڑ پڑے اور لگے تقریر کرنے۔ انہوں نے کہا کہ تقسیم سے پہلے اگر ہم کرتے تو اس کی قدر بھی ہوتی لیکن اب تو یہ کہا جائے گا کہ مسلمانوں نے ڈر کر ایسا کیا ہے تو پھر کرنے کا کیا فائدہ؟ اس لیے میں ہرگز مسلمانوں سے نہیں کہوں گا کہ وہ انسداد گاؤ کشی کا اعلان کر دیں۔ حکومت سیکولر ہے۔ دستور جمہوری ہے۔ اگر ہندو اس سیکولرازم اور جمہوریت کو عریاں کرنا چاہتے ہیں تو وہ بڑے شوق سے گاؤ کشی قانوناً بند کرا دیں۔ اس وقت ہمارا موقف دوسرا ہوگا اور ہم اس مسئلے پر پھر از سر نو غور کریں گے۔

مجھ کو اپنی رائے پر اتنا اصرار تھا کہ میں نے اس پر برہان میں لکھا مگر ساتھ ساتھ مولانا حفظ الرحمٰن کو اپنی رائے پر اس قدر پختگی تھی کہ انہوں نے میرے مضمون کا جواب برہان میں بھی دیا اور بڑے زور و شور کے ساتھ دیا۔ اس وقت تو بات میری سمجھ میں نہ آئی تھی لیکن اب میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ہی غلطی پر تھا اور رائے انہیں کی درست تھی۔

ٹھنڈا دماغ:

۱۹۴۷ء کے انقلاب نے ہندو اور مسلمان کانگریسی اور مسلم نیشنلسٹ سب کے دماغ کا توازن ہی بگاڑ دیا جو کل تک گاندھی جی کے دست راست تھے وہ آج فرقہ پرستی میں ننگ وطن ہیں جو کل تک بہادر تھے آج بزدل ہیں اور ان پر مرعوبیت چھائی ہوئی ہے لیکن مولانا حفظ الرحمٰن صاحب آج سے دس برس پہلے جہاں تھے وہیں آج بھی ہیں۔ ایک طرف سیاسیات اور قومی ملکی معاملات کے مسائل ہیں اول درجہ کے نیشنلسٹ اور جمہوریت پسند' لیکن ساتھ ہی مذہبی اور ثقافتی امور میں پکے مسلمان اور دونوں میں ایسا توازن اور تناسب قائم رکھتے ہیں کہ:

ہر ہوسنا کے نداند جام و سنداں باختن

ان کا جو فیصلہ ہوتا ہے ٹھنڈے دماغ کے ساتھ ہوتا ہے اس میں نہ کسی مرعوبیت کو دخل ہوتا ہے اور نہ کسی کو خوش کرنے کا جذبہ!

بے لوثی:

اسی وجہ سے وہ کانگریس کے سرگرم کارکن اور اس کے ٹکٹ پر پارلیمنٹ کے ممبر ہین لیکن اس میں کانگریس کے مرہون احسان بالکل نہیں دو مرتبہ کانگریس کے ٹکٹ پر الیکشن لڑا مگر کانگریس کے سخت اصرار کے باوجود اس سلسلے میں ایک پیسہ کانگریس سے نہیں لیا سب

اخراجات جوں توں کر کے خود ہی برداشت کیے۔ ان کا یہی معاملہ جمعیت کے ساتھ ہے۔ دن رات وہ اس کی خدمت کے لیے وقف ہیں پھر بھی تمام خدمات آنریری ہیں' یہاں تک کہ پارلیمنٹ تک آنے جانے میں وہ جمعیت کی موٹر استعمال کرتے ہیں۔ تو اس کے لیے پچھتر روپے ماہوار اپنی جیب سے جمعیۃ کو ادا کرتے ہیں۔

بعض شکایات:

کچھ لوگوں کو اب ان سے یہ شکایت پیدا ہوگئی ہے کہ ان کا غصہ بڑھ گیا ہے۔ بات بات پر بگڑ جاتے ہیں اور ان کا لب ولہجہ سخت و کرخت ہو جاتا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ اس کی وجہ ان کی کمزوری ہے کہ وہ ہر چھوٹا بڑا کام خود کرنا چاہتے ہیں اور کرتے ہیں یہاں تک کہ جلسے میں مقرر کے نام کا اعلان بھی کریں گے تو خود ہی! اس بنا پر ان کا نقصان ایک طرف تو یہ ہے کہ ان کے رفقا اور ساتھیوں کو بھی بدگمانی ہوتی ہے کہ مولانا کو ان پر اعتماد نہیں ہے اور اس وجہ سے وہ تقسیم کار کے اصول پر عمل پیرا نہیں ہوتے اور دوسری جانب ان کا دل اور دماغ خود دونوں پریشان ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے مزاج میں اور کرختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ کرختگی صرف ظاہری اور سطحی ہوتی ہے' ورنہ ان سے بڑھ کر کوئی ہمدرد نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ بڑے نرم اور مہربان ہو جاتے ہیں اور پوری ہمدردی کے ساتھ کہنے والوں کی بات سنتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں۔ بہرحال ہندوستان کے موجودہ حالات میں مسلمانوں کو جس قسم کا لیڈر درکار ہے۔ مولانا اس کے تمام اوصاف وکمالات کے جامع ہیں اور اگر میرا خیال صحیح ہے تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو توفیق دے کہ وہ اس حقیقت کو محسوس کریں اور ان کی خدمات سے فائدہ اٹھائیں۔

مجاہد ملت ایک پیکر اخلاص و ایثار

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

اپنے خطاب کے واقعی مستحق:

ہمارے ملک میں قومی و ملی تحریکات کے شروع ہونے' سیاسی و ملی شعور کے بیدار ہونے' جماعت سازی اور خطابت وصحافت کے اس دور میں (جو تحریک خلافت اور جنگ آزادی کے بعد بڑے پیمانے پر شروع ہوا) اعزاز و اکرام اور تعریف و توصیف کے خطابات و القاب دینے کا عام رواج ہو گیا' اور بعض مرتبہ اس میں ایسی فیاضی' غلو اور عجلت و جذباتیت سے کام لیا گیا کہ بعض حقیقت پسندوں کی زبان پر بے اختیار یہ مصرع آ گیا:

اب آبروئے شیوہء اہل نظر گئی

لیکن ہر کلیے میں استثنا ہوتا ہے' اس کلیے میں بھی کئی استثنا ہیں' جن میں اس وقت دو توصیفی القاب کا استثنا کروں گا' ایک مولانا محمد علی جوہر کے لیے ''رئیس الاحرار'' کے خطاب کا دوسرے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مرحوم کے لیے ''مجاہد ملت'' کے لقب کا' مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی مرحوم صرف ہندوستان کی ملت اسلامی ہی کے تعلق سے ''مجاہد ملت'' کہلانے کے مستحق نہ تھے' وہ ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد' انگریزی حکومت و اقتدار کے مقابلے میں صف آرائی' ہندو مسلم اتحاد اور ایک آزاد و منصفانہ جمہوری و دستوری حکومت کے قیام کے لیے ایثار و قربانی اور قید و بند کی آزمائشیں برداشت کرنے والے قائد کی حیثیت سے بھی ایک صاحبِ عزیمت و صاحبِ شجاعت مجاہد کے لقب کے مستحق ہیں۔

کمال حق گوئی:

بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اپنوں کی اس مخالفت' سماجی و معاشرتی مقاطعہ' دل آزاری' دشنام طرازی اور تذلیل و اہانت کے ان مظاہروں کی بنا پر جو (راقم کو معاف کیا جائے) مسلم لیگ کی

تحریک کے اعصابی و جذباتی جوش' پاکستان کے سحر انگیز اور دل فریب نعرہ اور کانگریس اور جمعیت علمائے ہند کے قائدین پر طنز و استہزا کے اس دور میں جو ملک کی تقسیم سے کئی سال پہلے شروع ہو گیا تھا' اور جس میں اس نظریے سے ادنی اختلاف رکھنے والوں کو معاف نہیں کیا جاتا تھا' شجاعت و استقامت اصول و عقیدہ پر ثبات و دوام اور ایثار و قربانی میں ان کا حصہ اکثریت کے ان سیاسی قائدین اور رہنماؤں سے کہیں زیادہ ہے' جن کو اپنے فرقے کے افراد اور اپنے ہم مذہبوں کی طرف سے ایسی آزمائشوں کا سامنا کرنے کا موقع پیش نہیں آیا' سب جانتے ہیں کہ اپنے خاندان کے افراد کی مخالفت' اپنے گھر میں ایذا و اہانت کا معاملہ' سماجی مقاطعہ' باہر کی مخالفتوں اور قید و بند کی صعوبتوں سے کہیں زیادہ صبر آزما اور اذیت رساں ہوتا ہے' اس موقع پر بے اختیار راقم کو یاد آ گیا کہ ایک مرتبہ غالباً پنت جی نے (جو اس وقت ریاست اتر پردیش کے وزیر داخلہ یا وزیر اعلیٰ تھے) کسی موقع پر مولانا مرحوم کے بارے میں کوئی طنزیہ جملہ کہا یا ان کی حب الوطنی اور ملک کی آزادی کے سلسلے میں کوئی تعریض کی' تو مولانا نے اس کے جواب میں بڑی صاف گوئی اور جرأت سے کام لیا اور کہا کہ ''ہم ہی (مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ کے معتوب ہونے اور پاکستان کے مطالبے کے ہم نوا نہ ہونے کی وجہ سے) اپنے ہم مذہبوں کے قہر و غضب اور تمسخر و استہزا کا نشانہ بنے اور ہمیں کو اپنے پرجوں (دھوبی' نائی اور کام کرنے والوں) کے مقاطعہ کا نشانہ بننا پڑا' غیر مسلم سیاسی رہنماؤں اور اکثریت کے فرقہ کے ''سورماؤں'' کو اس مرحلے سے گزرنا نہیں پڑا اور نہ ان کو اس کی نوبت آئی'' جن حالات میں اور جس شخصیت کے اعتراض یا جملہ کے جواب میں یہ جرأت مندانہ اور دلیرانہ جواب دیا گیا تھا' اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس وقت کرنا مشکل ہے۔

مولانا مرحوم کی متعدد و نمایاں اخلاقی' ذہنی' علمی و دینی' تحقیقی و تصنیفی خصوصیات و کمالات کے اعتراف و احترام کے ساتھ ان کے جس امتیاز کا اس مختصر مقالہ میں (جو علالت و مصروفیت کی حالت میں ان کا حق سمجھتے ہوئے اور فرض کو ادا نہ کرنے کو ناسپاسی اور حقیقت پوشی جانتے ہوئے سپرد قلم کیا جا رہا ہے) خاص طور پر ذکر کرنا ہے' وہ ان کی حق گوئی اور بے باکی اور ملک کے آزاد ہونے کے بعد اپنے ایثار اور قربانی کی ادنیٰ سے ادنیٰ قیمت وصول نہ کرنا ہے' جہاں تک پہلے وصف کا تعلق ہے' جس کا کچھ نمونہ اوپر پیش کیا گیا' وہ اقبال کے اس شعر کے مستحق معلوم ہوتے ہیں:

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اس حق گوئی و بے باکی کا اظہار مجالس قانون ساز کی تقریروں، حکومت کے ذمہ داروں سے مخاطبت و مکاتبت، مسلمانوں کے مسائل کے سلسلے میں جرات و صاف گوئی اور دوروں اور جلسوں میں تقریروں، شرعی مسائل سے تعلق رکھنے والے قوانین، نئی نسل کی دینی تعلیم اور اردو کے تحفظ کے لیے ان کی جدوجہد، جلسوں کے انعقاد اور کمیٹیوں کی تشکیل اور ان میں اپنی صحت و راحت سے بے پروا ہو کر شرکت میں ہوا، جس کے شاہد اخبارات کے قدیم فائل اور مجالس قانون ساز کے ریکارڈ ہیں اس راقم کو بھی بمبئی کی تعلیمی کانفرنس میں جو (تقسیم کے بعد) مولانا ہی کی تحریک و دعوت پر منعقد ہوئی تھی، اس لکھنو میں بعض شرعی مسائل وقف وغیرہ سے تعلق رکھنے والی کمیٹیوں میں شرکت و رکنیت کا اتفاق ہوا'' جن میں مرحوم سید محمد احمد صاحب کاظمی بھی ایک اہم رکن اور مشیر کار تھے، ان مواقع پر مولانا کی سیاسی و دینی بصیرت اور قائدانہ مخلصانہ جرأت کے نمونے دیکھنے میں آئے۔

کمال اخلاص وایثار:

جہاں تک دوسرے وصف جنگ آزادی کے سلسلہ کی قربانیوں اور قید و بند کی صعوبتوں کی قیمت وصول نہ کرنے اور اپنے اثرات و تعلقات سے (جن میں کم ہی لوگ ان کے ہمسر و مساوی ہوں گے) فائدہ نہ اٹھانے کا تعلق ہے، اس میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی ؒ اور ایک دو حضرات کو مستثنیٰ کر کے مشکل سے ان کا کوئی سہیم و شریک ہوگا۔ راقم کو ایک دو بار جمعیۃ العلماء کے دفتر واقع گلی قاسم جان، دہلی میں رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کے ساتھ قیام کرنے اور مولانا مرحوم کے مہمان ہونے کا شرف حاصل ہوا، اس وقت ان کی سادہ بلکہ زاہدانہ زندگی اور بے غرضی و بے لوثی کا کچھ اندازہ ہوا، وہ اہل تعلق اور ضرورت مندوں کے لیے تعارفی و سفارشی خطوط بھی لکھ دیتے تھے، اور ان کا احترام بھی کیا جاتا تھا، لیکن اپنے لیے انہوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا اور دہلی میں نہ ایک مکان بنایا، نہ حاصل کر سکے، ان کے متعلق فارسی کا یہ قدیم شعر لکھنے کو جی چاہتا ہے:

عدیل ہمت ساقیست فطرت عرفی
کہ حاتم دگران و گدائے خویشتنست

مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی استاد تفسیر و حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء جو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ سے ان کی زندگی میں قریبی ربط و تعلق رکھتے تھے' ان کی زندگی کا ایک سبق آموز واقعہ بیان کرتے ہیں:

''سب واقف جانتے ہیں کہ مولانا مرحوم آزادی کے بعد بننے والی پہلی پارلیمنٹ کے ممبر بنے پھر تادم آخر ممبر رہے' مولانا کی زندگی کا آخری الیکشن ۱۹۶۲ء میں ہوا' مولانا اپنی شدید علالت (جو بالآخر مرض وفات ثابت ہوئی) میں مبتلا رہنے کی وجہ سے ایک دن بھی ورک نہیں کر سکے لیکن اس کے باوجود الیکشن میں نمایاں طور پر کامیاب ہوئے' یہ کامیابی ایک طرف تو مولانا کی غیر معمولی مقبولیت اور اخلاص کے ساتھ ان کی قومی خدمات کا ثبوت ہے' تو دوسری طرف قوم کی بیدار مغزی اور محسن شناسی کی بھی علامت ہے (مولانا کا حلقہء انتخاب امروہہ' سنبھل تھا) اتنی طویل مدت تک پارلیمنٹ کے ممبر رہنے اور بلا شرکت غیرے مدتوں تک مسلمانوں کے عظیم رہنما ہونے کے باوجود مولانا اپنا ذاتی مکان دہلی میں نہیں بنا سکے اور پرانی دہلی کے محلہ بلیماران میں' جہاں اس وقت جمعیت علماء ہند کا صدر دفتر تھا' اسی کے قریب' ایک متوسط درجے کے کرائے کے مکان میں رہتے رہے' جو کسٹوڈین کی تحویل یا ملکیت میں تھا (آزادی کے بعد ہندوستان سے پاکستان منتقل ہو جانے والے مسلمانوں کی جائداد پر قبضہ اور اس کی نگرانی کرنے کے لیے ایک مستقل محکمہ ''کسٹوڈین'' کے نام سے مدتوں قائم رہا جس کی چیرہ دستیوں نے مسلمانوں کو عاجز و درماندہ کر رکھا تھا' پھر ان مکانات کو نیلام کیا گیا اور خریداری کا اولین حق داران کے ساکنوں کو قرار دیا گیا تھا) مولانا کے مرض وفات میں اس مکان کی نیلامی کا نوٹس آیا'' اتفاق سے جس وقت مولانا کو اس نوٹس کی اطلاع' ان کے معتمد حاجی حسام الدین صاحب نے دی راقم الحروف (محمد برہان الدین) مولانا کے پاس حاضر تھا (مولانا مرحوم' راقم

کے والد ماجدؒ مولانا قاری حمید الدین سنبھلی کے دوستوں بلکہ قدر شناسوں میں تھے' اسی رشتے سے راقم پر بھی خاصی نظر عنایت تھی' اسی لیے اکثر حاضری کی سعادت حاصل کر لیا کرتا تھا) مولانا نے یہ اطلاع پا کر جس تاثر بھرے بلکہ درد بھرے لہجے میں اظہار خیال کیا' اسے راقم بھولتا نہیں' مولانا نے فرمایا کہ ہمارے پاس تو اتنے پیسے نہیں کہ یہ مکان خرید سکیں اور ہمارے تو آبائی مکانات جو سیوہارہ میں تھے۔ ڈھے کر ختم ہو گئے' اور یہ فرماتے ہوئے ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں' یہ تھا مولانا کا زاہدانہ کردار کہ ان کی وجہ سے سیکڑوں بلکہ شاید ہزاروں لاکھوں مسلمان مالا مال اور صاحب جائداد بن گئے' مگر وہ خود اس لائق بھی نہ ہو سکے کہ سر چھپانے کے لیے معمولی سا مکان ذاتی بنا سکتے' بعد میں معلوم ہوا کہ مولانا کی وفات کے بعد مولانا کے بعض صاحب ثروت دوستوں بلکہ ممنون احسان افراد نے اس مکان کو نیلام میں کسٹوڈین سے خرید کر مولانا مرحوم کے اکلوتے صاحبزادہ محمد اسلم کو دے دیا۔''

راقم کو ان کے اس بیرونی سفر پر جانے کے وقت جو اپنے شدید صبر آزما مرض کے علاج کے لیے اختیار کرنے والے تھے' اور پھر وہاں سے واپسی پر زیارت و ملاقات کا موقع ملا' ان دونوں موقعوں پر وہ اپنے کسی اہل تعلق کے یہاں مقیم تھے' اور نہایت سادگی کے ساتھ انہوں نے یہ پرصعوبت اور طویل سفر گوارا کیے اور واپسی پر صبر و رضا اور قناعت کے ساتھ سفر آخرت اختیار کیا' جہاں ان کو ان کے اخلاص' خدمت دین اور ایثار و جد و جہد کا حقیقی صلہ ملنا تھا۔

علمی خدمات:

اس طویل سیاسی جد و جہد کے ساتھ جس کا مزاج علمی کاموں اور تحقیق و تصنیف سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا' انہوں نے اپنے علمی ذوق' تصنیف و تحقیق کی صلاحیت اور لکھنے پڑھنے سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی' وہ ندوۃ المصنفین دہلی کے بانیوں اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اور مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کے نہ صرف شریک کار اور ندوۃ المصنفین کے ایک معمار تھے'' بلکہ ان دونوں حضرات کو ان سے تقویت اور ندوۃ المصنفین کو ان سے اعتبار و عزت حاصل تھی' اس سلسلے میں ان کی دو تصنیفات ایک تو ''قصص القرآن'' دوسرے ''اسلام کا

اقتصادی نظام'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں' اردو میں ہمارے علم میں قصص قرآن' انبیاء علیہم السلام کی سوانح حیات اور ان کی دعوت حق کی مستند تاریخ وتفسیر (جو قرآن مجید کے گہرے مطالعے اور صحف قدیم اور جدید تحقیقات کی مدد سے مرتب کی گئی ہو) اس سے پہلے نہیں تھی' عربی میں البتہ مصر کے نامور عالم شیخ عبدالوہاب نجار کی قصص القرآن موجود ہے' مولانا نے اردو میں یہ کتاب تصنیف فرما کر ایک بڑی ضرورت کی تکمیل کی اور اسلامیات وعلوم قرآن کے طالب علموں کے لیے ایک قیمتی ذخیرہ مہیا کر دیا' یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں ہے۔ جلد چہارم حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے واقعات و حالات پر مشتمل ہے۔

ان کی دوسری کتاب ''اسلام کا اقتصادی نظام'' بھی گراں قدر تصنیف ہے' جس میں قدیم کے ساتھ جدید اقتصادی نظاموں سے واقفیت اور اسلامی اقتصادی نظام کی برتری کا علمی انداز میں اظہار و اثبات ہے' س کتاب میں انہوں نے ایک بڑے نکتہ کی بات لکھی ہے جس کی طرف حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں اشارہ کیا ہے کہ ''اقتصادیات کا اخلاقیات سے آزاد و بے تعلق ہو جانا معاشرہ کے لیے سخت مضر اور خطرناک ہے۔''

علمی ذوق و اشتغال کا سیاسی مصروفیات اور ان کے تقاضوں کے ساتھ جمع کرنا بڑا دشوار اور ہمت آزما کام ہے' اور تھوڑے ہی لوگ اس پر قادر ہوتے ہیں' اور اس پر کسی درجے میں حسرت کا یہ شعر صادق آتا ہے:

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

مولانا کی وفات پر ہندوستان میں ملی قیادت کے میدان میں ایک عظیم خلا واقع ہو گیا ہے جو ابھی تک پر نہیں ہوا' ان کے بعد کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جس پر صحیح معنی میں ''مجاہد ملت'' کا لقب و خطاب صادق آسکے۔ اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور ان کے درجے بلند تر کرے۔

مجاہدِ ملت۔۔۔ایک جامع جہات شخصیت

مولانا محمد منظور نعمانیؒ

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو پہلی دفعہ میں نے اب سے تقریباً ۳۸‘۳۹ سال قبل جمعیت علماء ہند کے اجلاس منعقدہ مراد آباد میں دیکھا تھا‘ میں اس وقت اپنے وطن سنبھل مراد آباد میں معقولات کی آخری کتابیں پڑھ رہا تھا اور حدیث پڑھنے کے لیے آئندہ سال دارالعلوم دیو بند جانے کا ارادہ تھا (یہ آخر ۲۴ء یا شروع ۲۵ء کی بات ہے) مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اس وقت بالکل نوجوان تھے‘ میری عمر اس وقت ۱۸‘۱۹ سال کی تھی اور مولانا ۲۴۔۲۵ سال کے ہوں گے۔ وہ عمر میں مجھ سے ۵‘۶ سال بڑے تھے‘ اس اجلاس میں مولانا نے اپنا ایک عربی قصیدہ بھی سنایا تھا۔ اسی وقت کسی سے یہ معلوم ہوا تھا کہ یہ دارالعلوم دیو بند کے بہت ممتاز طالب علم ہیں۔ تقریر بھی بہت اچھی کرتے ہیں اور عربی میں شعر بھی کہتے ہیں۔ (عربی کے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے میری دلچسپی اس وقت انہیں باتوں سے زیادہ ہو سکتی تھی) اس اجلاس میں میں نے ان کی تقریر نہیں سنی نہ ملاقات کی نوبت آئی۔

دارالعلوم دیو بند میں:

اگلے سال میں دارالعلوم دیو بند پہنچا‘ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ جو کہنے کو تو دارالعلوم کے ''نائب مہتمم'' تھے لیکن عملاً دراصل وہی مہتمم تھے۔ اللہ نے انہیں بڑی نگاہ دی تھی‘ ان کا طریقہ تھا کہ طلبہ میں سے جس میں خاص جوہر دیکھتے اس کو دارالعلوم میں لے لیتے‘ اس کے لیے انہوں نے ''معین المدرسین'' کا ایک درجہ قائم کر رکھا تھا‘ ابتدائی تقرر ایسے تو فارغین کا اسی حیثیت سے ہوتا تھا‘ جب میں دارالعلوم دیو بند پہنچا ہوں تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب غالباً ''معین مدرس'' کی حیثیت سے دارالعلوم کے استاد مقرر ہو چکے تھے اور چند ابتدائی و متوسط اسباق ان سے متعلق تھے میری عادت چونکہ ملنے ملانے کی بہت کم تھی اس لیے اس زمانے میں مولانا سے میرا کوئی رابطہ قائم نہیں ہو سکا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا

بہت اچھے مناظر بھی تھے۔اسی زمانے میں ایک معرکے کا مناظرہ شاہجہانپور میں قادیانیوں سے ہوا تھا۔اس میں ختم نبوت کے موضوع پر مولانا ہی نے مسلمانوں کی طرف سے مناظرہ کیا تھا' قادیانیت سے متعلق ابتدائی دور میں مولانا نے کچھ پمفلٹ بھی لکھے تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب مولانا کلکتہ کے ایک دینی اور تبلیغی ادارہ سے وابستہ تھے'اس ادارہ کا نام اب مجھے یاد نہیں رہا۔

ابھی میں دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت طالب علم ہی کے مقیم تھا کہ مولانا علاقہ مدراس کے کسی مدرسے میں بھیج دیے گئے۔ دینی مدارس کے اساتذہ کی تنخواہوں کے اس زمانے کے معیار کے لحاظ سے وہاں مولانا کی تنخواہ بہت معقول تھی' مولانا کے پاس جلد ہی حج کے قابل روپیہ جمع ہوگیا۔ مولانا نے فریضہ حج کی ادائیگی میں تاخیر مناسب نہیں سمجھی اور حج کو روانہ ہوگئے۔اس طرح مولانا نے حج بھی بالکل نوجوانی میں اس دور میں کیا جب کہ سفر حج سخت مجاہدہ کا سفر تھا اور نئی عمر میں حج کو جانے کا رواج بہت ہی کم تھا۔

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (سورت):

میری طالب علمی کے آخری سال کے بالکل آخری ہفتوں میں تقدیر الٰہی سے کچھ واقعات دارالعلوم دیوبند میں ایسے پیش آئے کہ اس وقت کے شیخ الحدیث اور صدرالمدرسین استادنا حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور ان دونوں بزرگوں کے ساتھ اساتذہ کی ایک اچھی خاصی تعداد نے دارالعلوم دیوبند سے اپنے آپ کو الگ کرلیا اور اس ''شر'' سے اللہ تعالیٰ نے یہ ''خیر'' پیدا فرمایا کہ گجرات میں ایک عظیم الشان دارالعلوم و جامعہ اسلامیہ (ڈابھیل) قائم ہوگیا۔ اور یہ سب حضرات وہیں منتقل ہوگئے۔مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی ان حضرات کے ساتھ وہیں چلے گئے۔ یہاں اس کا بھی اظہار مناسب ہوگا کہ دارالعلوم دیوبند کے نظام کی اصلاح کی جس تحریک یا کوشش کے نتیجہ میں یہ واقعات پیش آئے تھے'اس میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا خاص حصہ تھا۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے ساتھ اس ناچیز کا تعلق بھی اسی زمانے سے شروع ہوتا ہے۔دارالعلوم دیوبند والی برادری کے علاوہ ہم دونوں کو جوڑنے والا خاص رشتہ حضرت استاذ کشمیریؒ کے ساتھ خاص تعلق و رابطہ تھا اس کے سوا ہم دونوں میں ایک درجہ کی ہم مذاقی بھی تھی۔

اس وقت سیاست کے میدان میں تو خاموشی تھی اس لیے اس کے علاوہ جو دینی وملی کام ہو رہے تھے اور جو خاص جلسے اور اجتماعات ان کے سلسلے میں کبھی کبھی ہوتے تھے ان میں اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی' خاص کر ''جمعیۃ العلماء'' کے جلسوں میں جو اس وقت صرف ''علماء'' ہی کی جمعیت تھی۔

تحریک سول نافرمانی:

اسی زمانے میں جب مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے متعلق تھے یہ واقعہ پیش آیا کہ ''جمعیۃ العلماء ہند'' جو اپنے یوم پیدائش ہی سے جنگ آزادی میں کانگرس کے ساتھ شریک تھی۔ ''نہرو رپورٹ'' کے مسئلہ پر اختلاف پیدا ہو جانے کی وجہ سے ۱۹۲۸ء میں اس نے اپنی راہ کانگریس سے الگ کر لی۔۔۔ اس کے بعد اواخر ۱۹۲۹ء میں لاہور میں کانگرس کا اجلاس ہوا اور اس میں نہرو رپورٹ منسوخ قرار دے کر آزادی کی جنگ شروع کر دینے کا اختیار گاندھی جی کو دے دیا گیا۔ گاندھی جی نے حکومت کو ایک نوٹس دینے اور گویا اتمام حجت کر دینے کے بعد نمک سازی کی شکل میں سول نافرمانی کی جنگ گجرات سے شروع کر دی' مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ڈابھیل سے جا کر گاندھی جی کی اس نمک سازی کی تحریک میں شریک ہوئے۔ میں اس زمانے میں امروہہ میں مدرس تھا کسی ضرورت سے دہلی جانا ہوا تھا۔ واپسی میں محض اتفاق سے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ وہ ڈابھیل یا احمد آباد سے آ رہے تھے اور اپنے وطن سیوہارہ جانے کے لیے دہلی سے مراد آباد جانے والی ٹرین پر سوار ہوئے تھے۔ مجھے بھی اسی ٹرین سے امروہہ آنا تھا۔ یہ تو یاد نہیں کہ ہم میں سے پہلے کس نے دوسرے کو دیکھا۔ بہرحال ملاقات ہوگئی اور دونوں ایک ہی ڈبہ میں بیٹھے دوران گفتگو میں معلوم ہوا کہ مولانا نمک سازی کی سول نافرمانی میں گاندھی جی کے ساتھ کام کر کے واپس آ رہے ہیں۔ مولانا کے ساتھ ایک پڑیا میں بندھا ہوا اپنے ہاتھ کا بنایا ہوا نمک بھی تھا جو میری فرمائش پر انھوں نے نکال کر دکھایا اور میرے ساتھ ٹرین کے عام مسافروں نے بھی بڑی دلچسپی سے دیکھا۔

امروہہ میں جمعیۃ کا تاریخی اجلاس:

اسی ۳۰ء میں' بلکہ اسی زمانے میں جب گاندھی جی نے نمک کی تحریک شروع کی تھی۔ امروہہ میں جمعیۃ العلماء کا اجلاس ہوا اس اجلاس کے انعقاد کا فیصلہ کئی مہینے پہلے ہو چکا تھا۔

میں ابھی بتا چکا ہوں کہ اس زمانے میں میرا قیام بھی امروہہ ہی میں تھا۔ اس وقت ''جمعیۃ العلماء'' کا ایک ممبر اور اس کی برادری کا ایک فرد ہونے کے علاوہ اس اجلاس سے میری غیر معمولی دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی پیدا ہو گئی تھی کہ۔

امروہہ میں جو عنصر مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کا پیرو تھا اس نے ''جمعیۃ'' کے اجلاس کو ناکام بنانے ہی کی غرض سے ٹھیک انہیں تاریخوں میں جن میں جمعیۃ کا اجلاس ہونے والا تھا مولانا محمد علی مرحوم کی بنائی ہوئی اس ''نئی جمعیت علمائے کانپور'' کا اجلاس بھی امروہہ ہی میں رکھ دیا جو کچھ ہی دنوں پہلے ''جمعیۃ العلماء ہند دہلی'' کی مخالفت میں بنائی گئی تھی۔ اور جمعیۃ العلماء ہند کے خلاف ان ناخدا ترسوں نے زور شور کے ساتھ امروہہ اور اس کے اطراف میں پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ یہ صرف وہابیوں، دیوبندیوں کی اور (معاذ اللہ) دشمنانِ رسول ﷺ کی جماعت ہے۔

بہر حال اس حملے اور اس چیلنج نے قدرتی طور پر ہم لوگوں کو بہت متاثر کیا تھا جو جمعیت کے ساتھ ساتھ اکابر دیوبند سے بھی وابستہ تھے اور پھر ہم نے بھی جمعیت کے اجلاس کو کامیاب بنانے کے لیے جی جان کی بازی لگا دی۔

اس وقت کا سیاسی ماحول:

اس وقت کا سیاسی ماحول یہ تھا کہ ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۹۲۹ء تک کوئی عوامی سیاسی تحریک نہ چلنے کی وجہ سے سیاسی میدان میں ایک قسم کی بے حسی اور جمود پیدا ہو گیا تھا، خاص کر مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ پہلے شدھی سنگھٹن کی تحریک اور اس کے نتیجے میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات نے ان کو بددل کیا تھا اور بعد میں نہرو رپورٹ کے قضیے نے ان کے بہت سے ان عناصر کو بھی کانگریس سے دور کر دیا تھا۔ جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہے تھے، الغرض ان وجوہ سے کانگریس کی چھیڑی ہوئی اس جنگ کے لیے مسلمانوں میں کوئی امنگ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کسی درجے کی ہمدردی بھی اس وقت نہیں تھی۔ بلکہ اس کے برعکس صرف دو چار کو مستثنیٰ کر کے ان کے عام اخبارات اور مولانا محمد علی و شوکت علی مرحوم جیسے ان کے لیڈر بھی اس کے خلاف تھے کہ اس جنگ میں مسلمان شریک ہوں، بہر حال یہ فضا تھی جس وقت کہ جمعیت کا اجلاس امروہہ میں ہونے والا تھا۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا ریزولیوشن:

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جو اس وقت جمعیت کے اکابر میں یا اس کے ہائی کمانڈ میں تو نہیں تھے مگر اپنے سیاسی ذہن اور جرأت وفعالیت کی وجہ سے اپنے اقران میں سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ کانگرس کی جنگ آزادی میں شرکت کے متعلق ایک ریزولیوشن اجلاس کی تاریخ سے کافی دونوں پہلے ہی دفتر کو بھیج دیا اور ساتھ ہی اشاعت کے لیے اسے اخبارات کو بھی دے دیا' اس وقت خود جمعیت کے اندر اس مسئلے پر خاصا اختلاف رائے تھا' بلکہ اجلاس شروع ہونے کے دن تک جمعیت کے جو ارکان مختلف مقامات سے امروہہ پہنچے تھے' ان سب کی نجی گفتگوؤں کا خاص موضوع مولانا حفظ الرحمٰن کا یہ ریزولیوشن ہی بنا ہوا تھا۔ ان کی باتوں سے ہم لوگوں نے اندازہ یہ کیا تھا کہ ریزولیوشن پاس نہ ہو سکے گا۔ بہرحال اجلاس شروع ہوا۔ سب سے پہلے دستور اور رواج کے مطابق صدر استقبالیہ (سید ابوالنظر رضوی مرحوم) نے اپنا خطبہ پڑھا' اس کے بعد اجلاس کے صدر منتخب حضرت مولانا شاہ معین الدین صاحب اجمیری ؒ کا خطبہ صدارت پڑھا گیا۔ ان دونوں خطبوں میں شد و مد کے ساتھ اور خاص کر خطبہ استقبالیہ میں استدلال کے پورے زور کے ساتھ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی اس تجویز کے خلاف رہنمائی دی گئی تھی۔ لیکن جب مسئلہ سبجکٹ کمیٹی میں آیا تو مولانا کی اس تجویز کو چار نہایت اہم اور باوزن شخصیتوں کی حمایت اور تائید حاصل ہوگئی۔ ایک جمعیۃ العلماء ہند کے اس وقت کے مستقل صدر حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب ؒ دوسرے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی ؒ تیسرے حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی ؒ اور چوتھے سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم۔ یہ ناچیز سبجکٹ کمیٹی میں شریک تھا۔ جب اس ریزولیوشن پر بحث شروع ہوئی تو ایک دو موافقانہ اور مخالفانہ تقریروں کے بعد حضرت مفتی صاحب اور سید صاحب نے علی الترتیب بڑی مدلل اور بصیرت افروز تقریریں ریزولیوشن کی حمایت میں کیں۔ اس کے بعد حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی ؒ نے ایمانی جذبہ و جوش اور درد سے بھری ہوئی ایک تقریر فرمائی جس میں ہندوستان کی آزادی کے مسئلے کی اہمیت اور خاص کر مسلمانوں کے لیے اس کی ضرورت پر روشنی ڈالنے کے علاوہ حضرت ممدوح نے ماضی قریب اور ماضی بعید کے تاریخی واقعات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ انگریزوں نے عالم اسلام کے ساتھ کیا کیا ہے اور پوری دنیا کے مسلمانوں کی

تباہی و بربادی میں انگریزوں کا کتنا حصہ ہے؟ اس لیے مسلمانوں کے دشمن نمبر ایک انگریز اور صرف انگریز ہیں۔ لہٰذا انگریزی اقتدار کے خلاف جو جنگ کسی کی طرف سے شروع ہو ہمیں بلاشرط اس میں شریک ہو کر اس کو تقویت پہنچانا چاہیے۔ حضرت مولانا کی ذاتی عظمت کے ساتھ ان کی اس دردمندانہ اور جذبات سے بھرپور تقریر نے شرکاء اجلاس میں سے بہت سوں کی رائے بدل دی۔ اس کے بعد جو کمی کسر رہی وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ساحرانہ خطابت نے پوری کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تجویز نہ صرف یہ کہ پاس ہوئی بلکہ تقریباً بالاتفاق پاس ہوئی۔ جن چند حضرات کو اس سے اتفاق نہیں تھا انہوں نے بھی خاموشی مناسب سمجھی سوائے ایک دو صاحبوں کے۔

یہ واقعہ ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جس ناموافق ماحول میں اپنی یہ تجویز پیش کرنے کی جرأت کی تھی اور اخبارات میں اعلان کیا تھا اور پھر جس شان کے ساتھ وہ پاس ہوئی اس نے مولانا کو اس نوعمری ہی میں سیاسی دنیا میں خاص اہمیت دے دی' اس کے بعد سے برابر وہ اس میدان میں اپنی۔ صلاحیتوں اور قربانیوں کی وجہ سے آگے ہی بڑھتے رہے۔

سب کچھ ملت کے لیے:

ان کے جاننے والے سب جانتے ہیں کہ اس میدان میں انہوں نے جو کچھ کیا اور جو قربانیاں دیں وہ ملت ہی کے لیے دیں' وہ اس وقت اپنے اور اپنی جماعت کے سیاسی موقف کی تائید میں کہا کرتے تھے اور یقین اور اعتماد کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ "ہندوستان کی آزادی کی یہ جنگ کامیاب ہو کر رہے گی دیر یا سویر انگریزوں کو یہاں سے جانا پڑے گا' اگر آزادی کی جنگ میں اور اس کی قربانیوں میں ہمارا حصہ نہ ہوا تو آزادی کے ثمرات میں بھی ہمارا حصہ نہ ہوگا اور ہم رعایتوں کی بھیک مانگا کریں گے لیکن آج اگر ہم جنگ میں شریک ہوں گے اور قربانیاں دیں گے تو کل جب ملک آزاد ہوگا تو ہم بھی اس میں برابر کے حصہ دار ہوں گے اور ہمیں حق ہوگا کہ "ڈنڈا لے کر کھڑے ہوں" اور کہیں کہ ہم بھی ملک کے لیے لڑے تھے اور ہم نے بھی قربانیاں دی تھیں اس لیے ملک کی آزادی میں ہمارا بھی حصہ ہے"" (مولانا کی اس طرح کی تقریر ناچیز کو کئی دفعہ کی یاد ہے اور بالخصوص "ڈنڈا لے کر کھڑے ہونے" کے الفاظ خاص انہیں کے ہیں۔)

بہر حال ۳۰ء سے لے کر ۴۷ء تک مولانا نے جنگ آزادی کے سلسلے میں جو کچھ کیا اور جو قربانیاں دیں وہ اسی نیت سے اور گویا اسی چیز کو بطور نصب العین کے سامنے رکھ کر دیں اور وقت آنے پر پورے ملک نے اور پوری ملت اسلامیہ نے دیکھ لیا کہ آزادی کے بعد جب مسلمانوں کے ساتھ ناانصافیاں کی گئیں تو اس بندہ خدا نے اس کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے ہمیشہ یہی کہا کہ اس آزادی کے لیے ہم نے بھی قربانیاں دی ہیں اور ہمارا بھی اس میں برابر کا حصہ ہے اس لیے کسی ناانصافی اور حق تلفی کو ہم برداشت نہیں کریں گے۔

سب سے بڑی خدمت:

آزادی کے بعد ملت کے لیے جو کچھ مولانا نے کیا اور جو خدمات انجام دیں' سب جانتے ہیں کہ اس کی فہرست کتنی طویل ہے' لیکن ان کی سب سے بڑی خدمت اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ وہ ہے جس کی توفیق اللہ نے ان کو ۴۷ء کے فسادات میں دی۔ جس وقت دہلی میں مسلمان محلوں کو لوٹا اور جلایا جا رہا تھا اور مسلمانوں کا گویا قتل عام ہو رہا تھا اور کسی مسلمان کا اپنے گھر یا اپنے خاص حلقے سے باہر نکلنا گویا موت کے منہ میں جانا تھا' اس وقت مولانا حفظ الرحمٰن ہتھیلی پر رکھے مسلمانوں کی حفاظت کے لیے اسی دلی میں بھاگ دوڑ رہے تھے۔ کبھی پنڈت نہرو اور مولانا آزاد اور دوسرے ذمہ داران حکومت سے ملتے' کبھی خطرے میں گھرے ہوئے مسلمانوں کے پاس پہنچے اور انہیں محفوظ مقامات پر منتقل کرنے کا انتظام کرتے۔

پھر جب گاندھی جی دلی آ گئے تو مولانا حفظ الرحمٰن ہی نے ان کے سامنے دلی کی اس وقت کی صورت حال رکھی اور زبان سے اور ساتھ ہی داڑھی پر بہتے ہوئے آنسوؤں سے کہا کہ ہندوستان کی ہماری راجدھانی میں مسلمانوں کے ساتھ کیا ہوا ہے اور کیا ہو رہا ہے گاندھی جی کو چونکہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے خلوص اور سچائی پر اعتماد تھا اس لیے وہ بے حد متاثر ہوئے اور وزیر اعظم پنڈت نہرو' وزیر داخلہ سردار پٹیل اور کابینہ کے تیسرے اہم رکن مولانا آزاد مرحوم سے گفتگو کرنے کے بعد بھی جب وہ مستقبل کے بارے میں مطمئن نہیں ہوئے تو انہوں نے اس صورت حال کے خلاف پروٹسٹ کے طور پر مرن برت کا اعلان کر دیا۔ حالات کو درست کرنے کے لیے یہ آخری ہتھیار تھا جو گاندھی جی استعمال کر سکتے تھے یعنی انہوں نے فسادات کے روکنے اور ملک میں امن قائم کرنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی گاندھی جی

کی شخصی عظمت کا ملک اور حکومت پر جو اثر پڑ سکتا تھا اس کے علاوہ اس برت کا ایک اہم اور دور رس پہلو یہ بھی تھا کہ گاندھی جی کی طرف سے گویا یہ اس بات کا اعلان تھا کہ حکومت امن قائم کرنے اور مسلمانوں کی حفاظت کرنے میں ناکام رہی اور اس کی انتظامی مشنری پر اس بارے میں اب مجھ کو بھروسہ نہیں ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر ان کے اس برت کا ملک کے عوام پر اور خصوصیت کے ساتھ حکومت پر بہت اثر پڑا اور اسی دن سے ہوا کا رخ بدلنے لگا اور امید پیدا ہوگئی کہ برت کے نتیجے میں امن قائم ہو جائے گا۔ چند روز کے بعد جب حکومت اور عوام کے نمائندوں نے گاندھی جی کے سامنے امن کی ذمہ داری لی اور انہیں اطمینان دلایا تو گاندھی جی نے چند شرطیں قبول کرا کے برت توڑ دیا۔ تو کہنا یہ ہے کہ گاندھی جی کے برت نے ملک میں امن کی جو فضا قائم کی اور مسلمانوں کے قتل و غارت اور لوٹ مار کا جو سلسلہ اس وقت ختم ہوا وہ بالواسطہ مولانا حفظ الرحمٰن کا کارنامہ ہے۔ اگر موصوف جرأت و اعتماد سے کام لے کر گاندھی جی کے سامنے بات اس طرح نہ رکھتے تو اصلی صورت حال گاندھی جی کو کبھی نہ معلوم ہو سکتی اور خدا ہی جانتا ہے کہ خون کا وہ سیلاب کب تک بہتا رہتا۔

خدمات کا ایک لامتناہی سلسلہ:

پھر ۴۷ء کے بعد سے اس ۶۲ء تک کے پندرہ سالوں میں وہ برابر ملت ہی کے کاموں میں لگے رہے۔ اس عرصے میں جب کبھی اور جس وقت بھی دفتر جمعیت میں ان کے پاس دلی جانا ہوا تو یہی دیکھا کہ مختلف مقامات کے مسلمان ان کو گھیرے ہوئے ہیں اور اپنے مسائل و مصائب ان کے سامنے رکھ رہے ہیں اور مولانا جو کچھ ان کے لیے کر سکتے ہیں' کر رہے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ بہت سے ہندوؤں اور سکھوں کو بھی دیکھا کہ وہ اپنے ان کاموں کے لیے جو حکومت سے متعلق ہوتے' ان کے پاس آتے اور مولانا ان کے لیے بھی جو کچھ کر سکتے اس میں دریغ نہ کرتے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلے کی ان کی شدید مصروفیت دیکھ کر ان پر رشک بھی آتا تھا اور دل میں برابر ان کی وقعت بڑھتی تھی۔ یہ مسائل جن کو لے کر لوگ ان کے پاس آتے تھے۔ عموماً شخصی اور جزیء ہوتے تھے۔ لیکن میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ انہوں نے کسی سے یہ کہا ہو کہ بھائی یہ شخصی اور جزیء مسائل ہیں۔ میرے سامنے ملت کے بڑے اجتماعی مسائل ہیں جن سے مجھے فرصت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ان جیسا شخص یہ کہتا تو

بالکل بے جا نہ ہوتا۔

ان سے اپنا کام کرانے کے لیے کسی تعلق، تعارف اور سفارش کی بالکل ضرورت نہ تھی جو کچھ کر سکتے تھے کہ کسی کے لیے، اس سے دریغ نہیں تھا۔

کوئی دو برس پہلے کی بات ہے وہ کسی کام سے لکھنو تشریف لائے، اپنے معمول کے مطابق ملاقات کے لیے میرے پاس بھی تشریف لائے اور تشریف لے گئے۔ تین چار ہی دن کے بعد دارالعلوم دیوبند کے ایک کام کے سلسلے میں ہم دونوں کو دیوبند میں جمع ہونا تھا۔ جب ملاقات ہوئی تو فرمایا کہ اس دن جب میں لکھنو سے روانہ ہونے لگا اور ٹرین میں بیٹھ گیا تو ایک صاحب آپ کا سفارشی خط لے کر پہنچے۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی جب میں امکانی خدمت کے لیے یوں ہی حاضر ہوں تو آپ لوگ میرے دوستوں کو سفارش کے لیے کیوں تکلیف دیتے ہیں۔ اسی کے ساتھ مولانا نے بتایا کہ خدا کے فضل سے ان صاحب کا وہ کام کل ہو گیا۔ مجھے مولانا سے یہ سن کر حیرت ہوئی اور میں نے کہا کہ میں نے تو ان دنوں میں کسی کے لیے کوئی سفارش نہیں لکھی وہ خط جعلی ہوگا۔ مولانا نے فرمایا کہ ہاں تمہارے قلم کا تو نہیں تھا بلکہ اس شخص نے بتایا بھی تھا کہ مولانا کو جلدی تھی اس لیے خط انہوں نے خود اپنے قلم سے نہیں لکھا ہے بلکہ دوسرے آدمی سے لکھایا ہے۔

بہر حال لوگ ایسی حرکتیں بھی کرتے تھے لیکن جیسا کہ میں نے ابھی بتایا، مولانا اپنے پرائے، متعلق، غیر متعلق، متعارف، غیر متعارف ہر ایک کی خدمت کے لیے حاضر تھے۔ میں جتنا بھی غور کرتا ہوں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ بہت بڑی بات ہے، اور اللہ کے ہاں بھی اس کی بڑی قدر ہے۔

یادگار کارنامہ:

ملت کی خدمت کے اس لامتناہی سلسلے کے علاوہ اسی سلسلے کا ان کا ایک عظیم اور قابل یادگار کارنامہ یہ بھی ہے کہ حکومتی پارٹی (کانگریس) کے ٹکٹ پر پارلیمنٹ کا ممبر ہونے کے باوجود مسلمانوں کے خلاف ہونے والی بے انصافیوں اور خاص کر فسادات کے سلسلے میں انہوں نے پارلیمنٹ کے ایوان میں جس طرح کی تقریریں پچھلے چند برسوں میں کیں، جو پارلیمنٹ کے ریکارڈ اور اخبارات کی فائلوں میں محفوظ ہیں۔) ان میں انہوں نے ملت کی مخلصانہ اور درد

مندانہ وکالت اور حق گوئی و بیباکی کا حق ادا کر دیا ہے۔

اور اس مجاہدانہ گفتار کے علاوہ فسادات کے سلسلے میں ان کا مستقل ''خادمانہ کردار'' یہ رہا کہ ملک کے جس حصے میں مسلمانوں پر کوئی مصیبت آئی انہوں نے وہاں جلدی سے جلدی پہنچنے کی کوشش کی اور وہ جو کچھ کر سکتے تھے' اس کے کرنے میں کوئی دریغ نہیں کیا اور ان کاموں کے تقاضے کے سامنے اپنی صحت بلکہ زندگی تک کے مسئلے کو بھلا دیا۔ پچھلے سال نومبر میں علی گڑھ وغیرہ میں فسادات ہوئے تو انہوں نے علی گڑھ کا دورہ اس حالت میں کیا کہ ان کے پھیپھڑے میں کینسر ہو چکا تھا اور اس کے اثر سے پانی کی کافی مقدار پیدا ہو چکی تھی جس کی وجہ سے کھانسی کی سخت تکلیف تھی' جسم گھلا جا رہا تھا لیکن انہیں اپنے اس حال کی کچھ خبر نہ تھی اور ڈاکٹری معائنہ کرانے کے لیے انہیں فرصت نہیں مل رہی تھی۔ علی گڑھ سے انہیں سیدھا دیوبند آنا تھا۔ یہاں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا اسی دن اجلاس تھا۔ ہم لوگ پہلے پہنچ چکے تھے لیکن مولانا راستے میں موٹر فیل ہو جانے کی وجہ سے چار پانچ گھنٹے لیٹ پہنچے' ہم لوگوں نے ان کی کھانسی کی تکلیف اور ان کی صورت دیکھ کر ان سے کہا کہ خدا کے لیے آپ اپنے اوپر رحم کریں' چند روز آرام کر لیں اور قاعدہ کا علاج کرا لیں' بہرحال اس دن دیوبند ہی میں یہ بات طے ہو گئی کہ اب وہ دہلی پہنچ کر سب سے پہلے ڈاکٹری معائنہ کرائیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لیکن ملت کی بدنصیبی کہ ڈاکٹری معائنے سے معلوم ہوا کہ ان کی کھانسی معمولی کھانسی نہیں ہے' بلکہ ان کے پھیپھڑوں میں پانی کی بہت مقدار ہے' پانی نکالا گیا اور علاج شروع ہوا' چند روز کے بعد طے ہوا کہ مولانا علاج کے لیے بمبئی جائیں وہاں کے ڈاکٹروں نے بتایا کہ مولانا تو کینسر میں مبتلا ہیں اور پھیپھڑے میں پانی اسی کا نتیجہ ہے۔ بہرحال کہنا یہ تھا کہ وہ پھیپھڑے میں کینسر لیے ہوئے اور پانی بھرے ہوئے ملت ہی کے کاموں سے علی گڑھ اور دیوبند دوڑ رہے تھے۔

اتفاق یا لطیفہ غیبی:

یہ عجیب اتفاق ہے یا لطیفہ غیبی کہ بستر علالت پر مستقل لیٹ جانے سے پہلے ملت کے کاموں کے سلسلے میں مولانا کی زندگی کا آخری سفر علی گڑھ اور دیوبند کا ہوا ''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی'' ملت اسلامیہ ہند یہ کا دنیوی مرکز اور دارالعلوم دیوبند اس کا دینی مرکز!

مولانا کا خاص جوہر:

اس عاجز کی نظر میں مولانا کا خاص جوہر جو ان کے مختلف النوع محاسن اور کارناموں کا گویا سرچشمہ تھا' وہ ان کی جرأت و فعالیت' محنت و جفاکشی اور خوداعتمادی تھی' وہ جس چیز کو صحیح اور ضروری سمجھتے تو حالات خواہ کیسے ہی ناسازگار ہوتے وہ مایوس نہ ہوتے اور اس کے لیے جدوجہد کے میدان میں کود پڑتے اور محنت و جانفشانی سے میدان اکثر سر ہی کر لیتے' عیش پسندی اور آرام طلبی سے انہوں نے ہمیشہ اپنے کو دور رکھا۔ آزادی سے پہلے تو گویا مسلسل زمانہ جنگ تھا اور مولانا کا تبادلہ گھر سے جیل اور جیل سے گھر کی طرف ہوتا رہتا تھا' اس زمانے کی مستقل عادتوں میں سے ان کی ایک یہ عادت بھی تھی کہ دن کو وہ ہمیشہ زمین پر سوتے تھے' تاکہ جیل کی زندگی میں زمین پر سونا شاق نہ ہو۔ یہ عادت انہوں نے آزادی کے بعد بلکہ پارلیمنٹ کی ممبری کے زمانے میں بھی قائم رکھی۔ سہ پہر کو جب پارلیمنٹ کے اجلاس سے ''جمعیت'' کے دفتر واپس آتے تو ظہر کی نماز پڑھ کر ہمیشہ زمین ہی پر سوتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ مولانا اور عاجز کا قیام کہیں ساتھ ہوا۔ مولانا نے اپنے معمول کے مطابق زمین پر سونا چاہا مجھے یہ بات بہت بری معلوم ہوئی کہ میں پلنگ پر سوؤں اور مولانا زمین پر' اس لیے میں نے بھی ان کے ساتھ زمین پر سونا چاہا لیکن مولانا نے مجھے اتنا مجبور کیا کہ مجھے ہار مان کے ان کی فرمانبرداری کرنا پڑی۔

رائے میں صلابت:

مولانا کی ایک خصوصیت ان کی رائے کی صلابت اور مضبوطی سے اپنے موقف پر قائم رہنے کی عادت تھی۔ الا یہ کہ خود اپنی رائے بدل جائے یا وہ خود معاملے کو غیر اہم اور قابل درگزر سمجھ کر اپنی رائے پر اصرار مناسب نہ سمجھیں۔ اس معاملے میں مولانا اتنے پکے تھے کہ اپنے بڑے بڑے واجب الاحترام بزرگوں کی رائے سے بھی اگر کسی معاملے میں ان کو اختلاف ہوتا اور وہ اس کو اہم سمجھتے تو پوری قوت سے اپنے اختلاف کا اظہار کرتے اور اپنا موقف چھوڑنے کے لیے کسی طرح آمادہ نہ ہوتے۔ مارچ ۱۹۳۹ء میں جمعیۃ العلماء ہند کا جو اجلاس دہلی میں مولانا عبدالحق مدنیؒ کی صدارت میں ہوا تھا اس میں اس وقت کے اٹھے ہوئے مسلمانوں کے ایک خاص مسئلے کے بارے میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ ایک تجویز پاس کرانا

چاہتے تھے اور ان کو اس پر اصرار تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور ارکان جمعیت میں سے چند اور صاحب رائے حضرات اس کو مناسب نہیں سمجھتے تھے' لیکن جب حضرت شیخ نے اس کے حق میں اپنے خاص انداز میں تقریر فرمائی جس میں برہمی کا عنصر بھی شامل تھا تو سب حضرات نے تو خاموشی ہی میں خیریت سمجھی لیکن مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ؒ اس خاص نیاز مندانہ اور عقیدت مندانہ تعلق کے باوجود جو ان کو حضرت شیخ سے تھا (جس کو سب جاننے والے جانتے ہیں) پوری مضبوطی کے ساتھ اپنی رائے پر قائم رہے اور جب تجویز اکثریت کی تائید سے پاس ہوگئی تو انہوں نے مفصل اور مدلل اختلافی نوٹ لکھا اور اصرار کیا کہ میرا اختلافی نوٹ کارروائی میں شامل کیا جائے اور اس کو شامل کرا کے چھوڑا۔

نسبتِ بیعت

غالباً دو سال پہلے کی بات ہے دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ یا مجلس عاملہ کے اجلاس کے موقع پر کسی سلسلہ گفتگو میں مولانا نے خود اس عاجز سے فرمایا کہ اپنے اکابر سے پوری عقیدت مندی کے باوجود ان میں سے کسی کی بیعت میں صرف اس وجہ سے نہیں کر سکا کہ اس تعلق کے بعد ہمارا ماحول اختلاف رائے کی بالکل اجازت نہیں دیتا اور اس کو بے ادبی اور محرومی کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ اسی سلسلہ گفتگو میں مجھے پہلی دفعہ مولانا سے یہ معلوم ہوا کہ باضابطہ بیعت کے بغیر ان کا ایک گونہ اصلاح کا تعلق حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب نقشبندی ؒ سے رہا تھا۔ البتہ اس آخری علالت کے دوران مولانا کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اب غالباً وہ اس خانے کو پر کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ عرفی طور پر کسی شیخ سے بیعت نہ ہونے کے باوجود اپنے اکابر و مشائخ کے ساتھ ان کو جو گہرا قلبی تعلق تھا اور ان حضرات کی جو شفقت و محبت اپنی ملی خدمات کی وجہ سے ان کو حاصل تھی اس کے ہوتے ہوئے عرفی بیعت نہ ہونے سے کوئی خاص کمی نہیں رہتی۔ ہمارے اکثر اکابر و مشائخ کی نگاہ میں عرفی بیعت کی وہ اہمیت نہیں ہے' جو عام طور پر سمجھی جاتی ہے۔ ہم نے اپنے صاحب ارشاد اکابر سے بار بار سنا ہے کہ اصل چیز بس مخلصانہ تعلق و محبت ہے۔ ''المرءُ مع من احب''

تواضع اور وضع کی پابندی:

مولانا اپنی ملی اور ملکی خدمات کی وجہ سے خاص کر ۴۷ء کے بعد اگرچہ ایک بلند ترین مقام

پر فائز تھے اور مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ ملک بھی صف اول کی شخصیتوں میں ان کا شمار ہوتا تھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس بلند مقامی کی وجہ سے اس شخص میں بڑائی کی ذرا بھی خو بو نہیں آئی۔۔۔ بعض ناواقف حضرات کو ان کے پرزور انداز گفتگو سے شبہ ہوجاتا تھا کہ وہ شاید احساس بالاتری میں مبتلا ہیں لیکن ان کے سب جاننے والے جانتے ہیں کہ اس بیماری نے اللہ کے اس بندے کو چھوا بھی نہیں دراصل ان کا بات کرنے کا یہ انداز ہمیشہ سے اور بالکل فطری تھا۔ خاص کر بحث اور اختلاف رائے کے موقع پر اپنے بے تکلف دوستوں بلکہ بڑوں کے سامنے بھی ہمیشہ سے اسی انداز میں بات کرتے تھے۔ بہرحال یہ انداز گفتگو ان کا بالکل فطری تھا۔ نیچے سے نیچے کی سطح کے جن آدمیوں کے ساتھ بھی جو تعلق اور برتاؤ ان کا بیس پچیس سال پہلے تھا' وہی اس آخری دور میں بھی رہا۔

دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی یا مدرسی کے زمانے سے ان کا یہ معمول رہا تھا کہ عشاء کے بعد کسی طالب علم کے حجرہ میں کچھ دیر بیٹھتے اور یہ مجلس بڑی بے تکلف گویا ''یار پارٹی'' ہوتی۔ بعض طلبہ بھی شریک ہوجاتے۔ مولانا نے اب تک اپنی اس وضع کو اس طرح نباہا کہ آندھی' مینہ کچھ ہو لیکن مولانا جب دیوبند میں ہوتے تو عشاء کے بعد کی یاروں کی یہ مجلس قضا نہ ہوتی۔ یہ عاجز چوں کہ عشاء کے بعد جلدی سونے کا عادی ہے۔ اور مزاج بھی قدرت نے کچھ خشک اور کم آمیز بنایا ہے۔ اس لیے افسوس ہے کہ مجھے کبھی اس لطیف صحبت میں شرکت کا موقع نہیں ملا۔ بس مولانا ہی سے کبھی اس کی روداد سن لیتا۔

دارالعلوم دیوبند سے تعلق:

مولانا نے دارالعلوم دیوبند میں پڑھا' اس کے بعد بہ حیثیت استاد بھی کچھ دن وہاں رہے اور اب قریباً اٹھارہ انیس سال سے اس کی مجلس شوریٰ کے اہم ترین رکن تھے۔ لیکن دارالعلوم اور جماعت دارالعلوم کے ساتھ مولانا کا تعلق ان سب تعلقات سے (جو صرف قانونی اور ضابطہ کے بھی ہوسکتے ہیں) بالاتر گہرا روحانی اور قلبی تعلق تھا۔ وہ دارالعلوم کو صرف ایک دینی درسگاہ اور اپنی مادر علمی ہی نہیں بلکہ دینی مسلک اور روحانی مرکز یقین کرتے تھے اور اسی حیثیت سے اس سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ وہ ملت کے وقتی تقاضوں کے مطابق ''روشن خیال'' اور ''وسیع المشرب'' ہونے کے باوجود دینی مسلک اور طرز فکر میں جماعت دیوبند کے اکابرو

اسلاف کے گویا پورے مقلد تھے۔ ملت کے اجتماعی مسائل اور مصالح کے پیش نظر خاص کر ۱۹۴۷ء کے بعد کبھی کبھی ایسے بعض کام بھی انہیں کرنے پڑے جو بظاہر ان کے اور ان کے اکابر کے مسلک کے خلاف تھے۔ لیکن وہ انہوں نے سوچ سمجھ کر شریعت کے "اختیار اھون البلیتین" کے اصول پر کیے تھے۔ پھر بھی ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ "میں تو ایک دنیادار آدمی ہوں" "میرا عمل سند نہیں ہے، مسئلہ وہی ہے جو علما بے حق بتائیں۔" اسی طرح اگر کبھی انہوں نے کوئی ایسا کام کیا جو بظاہر ان کی غیر معمولی جرأت مندی اور بے لاگ حق گوئی و بے باکی سے میل نہیں کھاتا، تو وہاں بھی انہوں نے اپنے فہم کے مطابق ملت کے اجتماعی مصالح کو مقدم رکھ کر اپنی فطری خودی کو دبایا اور ان شاءاللہ وہ اپنے اس مجاہدے اور قربانی پر اجر کے مستحق ہوں گے۔

بے مثال مقرر:

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے تقریر و بیان کا جو ملکہ دیا تھا اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، ملک کا وہ کون سا گوشہ ہے جہاں کے لوگوں نے ان کی تقریریں نہیں سنیں۔ تقریر و خطابت کا یہ ملکہ اللہ تعالیٰ کا ایک عطیہ تھا اور مولانا نے ملک و ملت کے لیے اسے خوب استعمال کیا خاص کر پارلیمنٹ کی ان کی تقریریں تو یادگار رہیں گی۔

تصنیف و تالیف:

تقریر کی طرح تحریر اور تصنیف و تالیف سے بھی مولانا کو خاص مناسبت تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے انہوں نے سب سے پہلی کتاب "بلاغ مبین" لکھی تھی جس میں رسول اللہ ﷺ کے ان دعوتی مکاتیب کو جمع کیا تھا جو آپ نے اپنے زمانے کے چھوٹے بڑے فرمانرواؤں کو بھیجے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے متعلق مفصل تاریخی بحث بھی کی تھی۔ یہ کتاب مولانا نے غالباً ۱۹۳۵ء میں لکھی تھی اس کے بعد قومی و ملی خدمات کے ساتھ ساتھ (جس کے سلسلے میں بار بار جیل بھی جانا پڑا) ۱۹۴۷ء تک تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا اور اس عرصے میں "اسلام کا اقتصادی نظام" "فلسفہء اخلاق" اور چار جلدوں میں "قصص القرآن" جیسی ضخیم کتابیں آپ نے لکھیں۔ مولانا فطری طور پر ان مصنفوں میں تھے جو تھوڑے وقت میں زیادہ لکھتے ہیں۔ اگر وہ دوسرے کاموں سے یکسو ہو کر صرف تصنیف و تالیف کا کام کرتے تو اپنے زمانے کے کثیر التصانیف مصنفین میں ہوتے اور غالباً ہر مہینہ دو مہینے میں ایک کتاب تیار کر دیا

کرتے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد وہ ملت اسلامیہ ہند کے کاموں میں ہمہ تن ایسے مشغول ہو گئے کہ اس کے بعد لکھنے لکھانے جیسے کسی علمی کام کی ان کے اوقات میں بالکل گنجائش نہیں رہی۔ اس کے باوجود زندگی کے آخری دو سالوں میں انہوں نے دوڑتے بھاگتے دو کام کر ڈالے' ایک سیرت پر اپنی قدیم تصنیف ''رسول کریم ﷺ کو گویا دوبارہ لکھا جس کے بعد ضخامت کے لحاظ سے بھی وہ سابق کے مقابلے میں قریباً دو چند ہو گئی ہے (اب سے تھوڑے ہی دنوں پہلے ''رسول کریم ﷺ'' کا یہ جدید ایڈیشن شائع ہو چکا ہے) دوسرا کام انہوں نے یہ کیا کہ ''قصص القرآن'' کی پہلی جلد جو معیار تحقیق کے لحاظ سے خود ان کی نگاہ میں بھی ہلکی ہو گئی تھی' اس کو انہوں نے پچھلے دنوں میں گویا از سر نو مرتب کیا' ان شاء اللہ عنقریب یہ بھی چھپ کر سامنے آ جائے گی۔

آخری علالت اور سانحہ وفات:

یہ بات پہلے ذکر کی جا چکی ہے کہ گذشتہ دسمبر میں دار العلوم کی مجلس شوریٰ کی شرکت کے لیے جب مولانا علی گڑھ سے دیو بند پہنچے تو وہ سخت کھانسی میں مبتلا تھے اور صورت سے معلوم ہو رہا تھا کہ ان کا جسم گھلا جا رہا ہے۔ ہم لوگوں نے اصرار کیا کہ آپ کچھ دن کے لیے سفر اور دوسرے کام چھوڑ کر علاج کرائیں اور آرام کریں۔ اس کے چند روز بعد ہی جب ڈاکٹروں نے مولانا کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ ان کے پھیپھڑوں میں پانی کی کافی مقدار ہے۔ چنانچہ دلی میں وہ پانی نکالا گیا اس کے بعد مولانا علاج کے لیے بمبئی تشریف لے گئے۔ جن دنوں مولانا بمبئی میں زیر علاج تھے' رفیق محترم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کویت کے سفر سے واپسی میں بمبئی ٹھہرے' میں نے ان کو لکھ دیا تھا کہ وہ بمبئی میں مولانا کو دیکھ کر آئیں اور ممکن ہو تو ان کے معالجوں سے بھی ان کی بیماری کی نوعیت کے بارے میں صحیح صورت حال معلوم کرنے کی کوشش کریں' مولانا ندوی اسپتال میں مولانا سے بھی ملے اور وہاں کے ایک معالج ڈاکٹر سے پرائیویٹ طور سے بات کرنے کا بھی ان کو خاص موقع مل گیا۔ اس نے بتایا کہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے پھیپھڑے میں کینسر ہے اور اس کا محل وقوع ایسا نازک ہے کہ نہ آپریشن کیا جا سکتا ہے اور نہ برقی شعاعوں سے ہی اس کا علاج کیا جا سکتا ہے بس دوائیں ہی استعمال کی جا سکتی ہیں اور ان سے کامیابی کی کچھ زیادہ امید نہیں ہے۔ مولانا ندوی کے ذریعے یہ بات جس وقت مجھے معلوم ہوئی' اس وقت تک عام طور پر یہ بات لوگوں کے علم میں نہیں آئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اسی

دن سے مولانا کے بارے میں ایک مایوسانہ تشویش دل میں پیدا ہوگئی۔ کچھ دنوں کے بعد مولانا بمبئی سے دہلی آ گئے اور ان کی صحت و مرض کی رفتار کا حال نجی خطوط سے اور اخبار ''الجمعیۃ'' کی اطلاعات سے معلوم ہوتا رہا۔ ۲۲/اپریل کو میں مولانا سے ملاقات اور مزاج پرسی ہی کے لیے دہلی گیا۔ اس وقت مولانا کی حالت دیکھنے میں تشویشناک نہیں تھی' بس کینسر کا نام ہی سب کو تشویش میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔

میں مولانا کے پاس شام کے وقت گیا تھا یہی ملاقات کا عام وقت بھی تھا' تھوڑی دیر کے بعد جب اور حضرات اٹھنے لگے تو میں نے بھی اٹھنے کا ارادہ کیا اور اجازت چاہی' مولانا نے مجھے روک لیا' میں نے عرض کیا کہ اس شرط پر بیٹھوں گا کہ آپ باتیں نہ کریں' میں محسوس کرتا ہوں کہ ہماری وجہ سے آپ باتیں کرتے ہیں اور اس سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے۔ میں مولانا کو یہ بتا چکا تھا کہ میرا پروگرام یہاں سے حضرت رائے پوری (قدس سرہ) کی خدمت اقدس میں حاضری کے لیے رائے پور جانے کا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب مغرب کا وقت بالکل قریب آ گیا اور میرے علاوہ جو دوسرے حضرات مولانا کے پاس اس وقت تھے وضو وغیرہ کے لیے اٹھ گئے اور اتفاق سے میں اکیلا رہ گیا تو مولانا نے فرمایا کہ'' مجھے ایک بات کہنی تھی' میں کل گذشتہ رائے پور حضرت کی خدمت میں جانے کا پروگرام بنا چکا تھا' موٹر وغیرہ کا پورا انتظام ہوگیا تھا اور یہاں میں نے کسی کو اس کی اطلاع نہیں کی تھی۔ سوچا یہ تھا کہ خاموشی سے صبح نکل جاؤں گا اور رات تک واپس آ جاؤں گا' لیکن کل رات سانس کی تکلیف بڑھ گئی اور مجھے وہ پروگرام ملتوی کرنا پڑا۔ اب جس دن بھی میری طبیعت ذرا بہتر ہوگی' میں ان شاء اللہ رائے پور حاضر ہوں گا۔ آپ حضرت کی خدمت میں یہ بات اور میرا سلام بھی عرض کر دیں۔''

میں اپنے پروگرام کے مطابق دہلی سے رائے پور گیا اور حضرت اقدس کی خدمت میں مولانا کا سلام پہنچایا اور آنکھوں دیکھا حال بتایا اور حاضری کے ارادے کے بارے میں مولانا نے مجھ سے جو کچھ فرمایا تھا وہ بھی عرض کیا۔ اگرچہ حضرت کی خانقاہ میں بعد ختم روزانہ پابندی کے ساتھ مولانا کی صحت کے لیے دعا ہوتی تھی۔ لیکن اس دن حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ مولانا پر مرض غالب آ چکا ہے' آپ انہیں لکھ دیں کہ ایسی حالت میں وہ یہاں آنے کا ارادہ نہ فرمائیں انہیں تکلیف ہوگی۔ چنانچہ میں نے خط لکھ دیا۔

میں ابھی رائے پور ہی میں تھا کہ معلوم ہوا کہ علاج کے لیے مولانا کے امریکہ جانے کا

فیصلہ ہو رہا ہے۔ اس کے بس دو چار ہی دن کے بعد وہ امریکہ روانہ ہو گئے۔ وہاں سے ۱۲ر جولائی کو واپسی ہوئی میں ۱۴ر کو دہلی میں جا کر مولانا سے ملا۔ اس وقت مولانا کا بیان یہ تھا کہ وہاں کے معالجین نے مجھے یقین دلایا ہے کہ جہاں تک کینسر کا تعلق ہے اس کا پورا علاج ہو چکا ہے اب جو شکائتیں باقی ہیں وہ آہستہ آہستہ رفع ہو جائیں گی، لیکن بعض دوسرے نجی ذرائع سے یہ بات ہم لوگوں کو معلوم ہو گئی تھی کہ امریکہ کے معالجین نے مولانا کو مایوس ہو کر واپس کیا ہے اور صرف ان کے دل کی تسلی اور تقویت کے لیے علاج کی کامیابی کا یقین دلایا ہے۔ مولانا کی ظاہری حالت اور ضعف و نقاہت کو دیکھ کر بھی کسی طرح یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ مولانا اصل مرض سے نجات پا چکے ہیں، لیکن یہ اندازہ بھی بالکل نہیں تھا کہ ان کا وقت اتنا کم باقی رہ گیا ہے میں مولانا سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ اس وقت تو آپ کے پاس آنے والوں کا سخت ہجوم ہے، اب ان شاء اللہ میں چند روز کے بعد پھر آؤں گا' اس درمیان میں یہ اطلاع ملتی رہی کہ اگر چہ ٹمپریچر تو بدستور ہے لیکن کمزوری آہستہ آہستہ گھٹ رہی ہے اور قوت کچھ بڑھ رہی ہے۔ اگست کے پہلے ہفتہ میں میں نے دہلی جانے کا پروگرام بنالیا تھا کہ بالکل اچانک ۲ر اگست کی صبح کو مولانا کے انتقال کی خبر سن لی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ تعالیٰ اپنے فیصلوں کی حکمتیں خود ہی خوب جانتا ہے ہم بندوں کو چارۂ دم زدن نہیں۔ لیکن ہم کم نگاہوں نے تو یہی محسوس کیا کہ وہ ایسے وقت پر اٹھائے گئے' جب کہ ملت اسلامیۂ ہندیہ کے لیے بظاہر ان کی بڑی ضرورت تھی۔ بے شک اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے کہ وہ کسی موت ہی سے حیات کا سامان پیدا کردے۔ "یخرج الحی من المیت ویخرج المیت من الحی" (۳۰:۱۹) اس کی شان ہے۔

اپنا ایک خواب:

جی چاہتا ہے کہ اس تذکرے کو اپنے ایک خواب پر ختم کردوں۔ مولانا کے انتقال کے ۴' ۵ دن بعد (جب کہ میں اس مضمون کا کافی حصہ لکھ چکا تھا) رات کے آخری حصہ میں میں نے خواب دیکھا کہ مولانا کے متعلق کوئی بہت تشویش انگیز خبر آئی ہے۔ غالباً یہ کہ ان کی حالت نہایت نازک ہے' میں اس خبر کے ملتے ہی دہلی روانہ ہو گیا۔ مولانا کا قیام ایک بہت وسیع کوٹھی میں ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہاں لوگوں کا کوئی اِزدِحام نہیں ہے' جو غیر معمولی حالت

میں ہونا چاہیے تھا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ مولانا اندر تشریف رکھتے ہیں، میں اندر چلا گیا، دیکھا کہ مولانا نہایت تندرست بیٹھے ہوئے ہیں، جسم پر گوشت ہے، رنگ سرخ وسفید ہے، داڑھی سیاہ اور چمک دار ہے (حالانکہ مولانا جوانی میں بھی کبھی ایسے نہیں تھے) میں نے انہیں اس حالت میں دیکھ کر بڑی بے تکلفی سے بلکہ خفا ہو کر کہا کہ "آپ اچھے خاصے بیٹھے ہیں اور اپنے سارے دوستوں کو آپ نے پریشان کر دیا۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ آپ کے متعلق اس خبر کی اشاعت نے دنیا کو کس قدر پریشان کیا ہے۔" مولانا نے مجھ سے فرمایا "میں اچھا نہیں ہوں، تمہیں ایسا نظر آ رہا ہوں" اس کے بعد کچھ اور باتیں ہوتی رہیں پھر فرمایا کہ "میری کتاب" ولایت "تو تمہارے پاس ہو گی؟ مجھے خواب ہی میں یاد آیا کہ مولانا نے اکابر اولیاء اللہ میں سے کسی بزرگ کی کتاب کا اردو میں ترجمہ یا اس کی تلخیص کی تھی اور "ولایت" ہی کے نام سے اب سے بہت پہلے وہ چھپ بھی گئی تھی۔ اسی بناء پر میں نے مولانا سے کہا کہ "یاد تو آیا" بہت دن ہوئے آپ کی وہ کتاب دیکھی تھی اب پتا نہیں کہ میرے پاس ہے یا نہیں؟ مولانا نے فرمایا کہ "اب اس کا نیا ایڈیشن تیار ہوا ہے" اور یہ کہہ کر اس کا ایک نسخہ مجھے دیا۔ یہ جیبی سائز کی بہت حسین کتاب تھی، ٹائیٹل پر نہایت خوشخط اس کتاب کا نام "ولایت" لکھا ہوا تھا اور نیچے مولانا کا نام تھا۔ مجھے خواب میں مولانا کو صحت مند دیکھ کر اور ان کی یہ کتاب پا کر اتنی خوشی ہوئی کہ فرط مسرت سے ہی میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلنے کے بعد بھی میں نے اپنے کو مسرت وخوشی سے لبریز پایا۔ گھڑی دیکھی تو تین بجے تھے۔ اٹھ کر وضو کیا، نماز پڑھی، مولانا کے لیے خصوصیت سے دعا کی۔ اتنے میں فجر کی اذان ہو گئی۔ اس کے بعد میں پھر لیٹ گیا، میری آنکھیں بند تھیں اور میں ایسی حالت میں تھا کہ نہ تو وہ پوری بیداری کی حالت کہی جا سکتی ہے اور نہ نیند کی، اسی حالت میں میں نے دیکھا کہ نہایت حسین اور نورانی حروف میں لکھی قرآن مجید کی یہ آیت میری نظر کے سامنے ہے:

"وھو الذی یقبل التوبۃ عن عبادہ ویعفوا عن السئیات"

یہ خواب ظاہر ہے کہ تعبیر سے مستغنی ہے۔ امید ہے کہ مولانا نے ملت کے لیے جو کچھ کیا اور اللہ کے لاکھوں بندوں نے ان کی علالت کے زمانے میں ان کی صحت وحیات کے لیے جو دعائیں کیں، جو یقیناً آخرت کے لیے ذخیرہ بنتی رہیں۔ ان شاء اللہ ان سب کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کا معاملہ ان کے ساتھ خاص الخاص رحمت وکرم کا ہو گا۔ وہ رؤوف بالعباد اور ارحم الراحمین ہے۔

(مولانا) حفظ الرحمٰنؒ ـــ چند خصائص سیرت

مولانا عبدالماجد دریابادی

مرحوم و مغفور سے پہلی ملاقات آج سے تیس بتیس سال قبل دہلی کے سفر میں ہوئی۔ مرحوم اس وقت عملی سے زیادہ ایک علمی آدمی تھے۔ تفصیل تو اب یاد نہیں۔ اتنا اچھی طرح یاد ہے کہ گفتگو زیادہ تر علمی و دینی رہی۔ خصوصاً قرآن مجید کی تفسیروں اور ترجموں سے متعلق، سنجیدگی فکر اور اپنے کام میں تندہی وانہماک کے آثار اس وقت بھی نمایاں تھے۔

پھر اس طویل عرصے میں ملاقاتیں بار بار رہیں کبھی کبھی طویل بھی اور مراسلت بھی وقتاً فوقتاً رہی۔ مولانا کا رخ بھی بجائے دین کی علمی خدمات کے رفتہ رفتہ سیاسی وملی خدمات کی طرف زیادہ پھرتا گیا، اور وہ عالم و مقتدائے دین سے بڑھ کر مجاہد و قائد بنتے گئے اور ۱۹۴۷ء کے بعد سے تو کہنا چاہیے کہ ملت کے مرجع امید وہی رہ گئے تھے۔ ایک طرح مولانا ابوالکلام و رفیع احمد قدوائی صاحب کے ہم پلہ اور ایک طرح ان دونوں سے بھی بڑھ کر۔

اگلی سطروں میں کوشش یہ ہوگی کہ طویل سابقہ میں جو تاثرات ان کے متعلق قائم ہوئے انہیں مختصر اور سادہ لفظوں میں قلم بند کیا جائے۔

۱۔ مولانا کی خصوصیت: شاید سب سے بڑی، ان کا انہماک عمل، سرگرمی اور یکسوئی تھی۔ جس کام کو ہاتھ میں لیتے اپنا سارا وقت اور اپنی ساری قوت وقف کر دیتے اور ان کی سنجیدگی فضولیات اور گپ شپ کے لیے کوئی مہلت ہی ان کے لیے نہ رکھتی تھی۔ وہ تفریح بھی کام ہی سے حاصل کرتے تھے۔

۲۔ ان کی دوسری بڑی بنیادی صفت ان کی گہری۔۔۔ آج کی زبان میں ''بے پناہ'' محبت اسلام اور ملت اسلامی کے ساتھ تھی۔ ان کی ''نیشنل ازم اور وطن پروری'' خدمت اسلام کے منافی ہونا کیا معنی، اس سے ایک ذرہ الگ نہ تھی۔ نیشنل ازم کے تقاضوں کی خاطر وہ اپنے دینی تصلب میں ڈھیل دینا یا مداہنت برتنا جانتے ہی نہ تھے۔ نیشنل ازم کی ''علم''

برداری کے ساتھ ساتھ اتنا درد اسلامی رکھنے والا اور ایسا کھرا اور پکا مسلمان ذرا کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ خود جمعیۃ علماء کے حلقہ میں ان کی سی مثالیں بہت زیادہ نہیں۔

۳۔ تیسری بڑی چیز ان کا امتزاج جوش و ہوش تھا۔ محض جوشیلے مسلمان تو بہت دیکھنے میں آئے ہیں' جو اپنے اندھا دھند جوش میں آگے پیچھے کچھ نہیں دیکھتے اور نہ کسی خطرہ کی پروا کرتے ہیں' نہ کسی مصلحت کی رعایت رکھتے ہیں۔ نتائج سے بے پروا یہ نادان دوست بارہا مقصد کو نقصان ہی پہنچا چکے ہیں۔ ان کے ٹھیک مقابل ایک طبقہ محض ہوش مندوں اور مصلحت شناسوں کا ہے۔ ملت پر کچھ بھی گزر جائے۔ دین کو جتنا بھی صدمہ پہنچ جائے یہ اپنی حکمت عملی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔۔ مرحوم کی ذات جوش و ہوش کی جامع' دل و دماغ سے بیک وقت کام لینے کی عادی تھی۔ صفِ اول کے مسلمان لیڈروں میں فہم و فراست' تدبر اور جوش وغیرہ کے اچھے نمونوں کی افسوسناک کمی بارہا محسوس ہوئی' اس سے بڑی حد تک اور مستثنیٰ ذات دیکھنے میں آئی وہ انہیں مرحوم و مغفور کی تھی۔

۴۔ چوتھا بڑا وصف مرحوم کا طبعی انکسار تھا۔ جاہ و مرتبہ پا کر یا بڑے مقام پر پہنچ کر وہ آج بھی اپنی زندگی میں ایسے سادہ تھے کہ جیسے لیڈر نہیں' اب تک طالب علم ہی ہوں' لیڈری پر پہنچ کر اچھے اچھے بہک جاتے ہیں۔ یہ منزل خاصی امتحان کا کام دیتی ہے۔ مرحوم کی بات چیت میں کوئی فرق آنے پایا' نہ وضع و لباس میں' نہ اور کسی چیز میں' سوا اس کے کہ اب دسترخوان شاید زیادہ وسیع ہو گیا تھا' اپنے غریب عزیزوں سے ملنے ملانے یا ان کا کام کرنے سے وہ ہرگز نہ شرماتے' نہ جھجکتے۔

۵۔ پانچواں امتیازی وصف میں نے مرحوم میں شرافت مزاج کا پایا' نظریات کے اختلاف کو ہنسی خوشی برداشت کر لیتے۔ دل میں اپنے حریف یا مقابل کیمپ والے کی طرف سے ذرا بھی میل نہ لاتے' بلکہ اپنے معاندانہ یا سب وشتم کرنے والے کی طرف سے بھی دل تنگ نہ ہوتا۔ اور موقع پانے پر ہمدردی' مروت' رواداری' درگزر برابر اس کے ساتھ بھی کرتے رہتے۔۔۔ اتنی عالی ظرفی اور برداشت ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔ ان ذالک لمن عزم الامور۔

۶۔ ایک اور وصف جو مرحوم کا میرے تجربہ میں آیا' وہ ان کی مہمان نوازی اور فیاضی تھی۔ اور اس کے لیے کچھ اس کی قید نہ تھی کہ کوئی ان کے گھر ہی پر جا کر ان کا مہمان ہو' کہیں ریل

میں اتفاق سے ساتھ ہو گیا تو یہاں بھی بے تکلف وہ مہمان داری میں مشغول ہو جاتے اور اپنے ساتھی کو اصرار کر کے کھلاتے پلاتے۔ ایک بار گرمیوں کے موسم میں لکھنو سے مولانا کا ساتھ دہرہ ایکسپریس پر ہوا۔ وہ دہلی سے آ رہے تھے اور خربوزے ان کے ساتھ تھے بس چھیل کاٹ کاٹ کر مجھے کھلانے شروع کر دیئے' حالانکہ میزبانی کا حق اگر تھا تو مجھ کو پہنچتا تھا کہ میں خربوزہ کی منڈی ''لکھنو'' سے سوار ہوا تھا۔

۷۔ سال ڈیڑھ سال ہوا' لکھنو کونسل گھر میں مرحوم کا ساتھ ایک اردو زبان کی کمیٹی کے سلسلہ میں رہا۔ میٹنگ ختم ایسے وقت ہوئی کہ نماز عصر کا وقت آ گیا مولانا نے برآمدہ میں چٹ اپنی شیروانی اتار کر بطور جانماز بچھائی اور مجھے امامت کے لیے آگے کر دیا۔ اب میں ہر چند انکار کرتا ہوں' لیکن ان کا اصرار اسی قوت سے بڑھتا جاتا ہے۔ آخر میں ہارا' مجھی کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

اس ایک واقعہ سے علاوہ اہتمام نماز کے مولانا کے اس وصف پر بھی روشنی پڑ گئی کہ اپنے سے کمتروں کو دینی پیشوائی میں بھی آگے بڑھاتے رہتے تھے۔

مولانا اپنی نفع رسانیء خلائق و خدمت ملتِ کے عین شباب میں اٹھا لیے گئے۔ اللہ کی مصلحتوں کو کون سمجھ سکتا ہے۔ تاہم اتنی بات تو کھلی ہوئی نظر آتی ہے کہ حشر میں خدا معلوم کتنی تعداد میں اللہ کے بندے ایسے نکلیں گے جو ہر طرح مولانا کے ممنون کرم اور زیر بارِ احسان ہوں گے۔ وہ سب کے سب مولانا کا بوجھ اتار کر اپنے سر لینے کو شوق سے دوڑیں گے اور مولانا کتنے سبک ہو کر' کیسے ہلکے پھلکے' شاداں و فرحاں' خرم و خنداں' ان شاء اللہ جنت کی طرف روانہ ہوں گے۔

اس دنیا میں رہ جانے والوں کی تو بس یہی دعا ہے کہ اللہ انہیں اپنے ان الطاف خصوصی سے سرفراز فرمائے جو مقربین کے لیے مخصوص ہیں!

سر آمد روزگارے آں فقیرے!

حمیدہ سلطان

’’بولی اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دیدو‘‘

بجنور میں ایک بہت بڑا ہجوم ہماری کوٹھی کے سامنے کھڑا زور زور سے گا رہا تھا۔ اور میں اپنے اور بھائیوں، بہنوں کے ساتھ گول کمرے کی کھڑکی سے اس ہجوم کو حیرت و شوق کی نظروں سے تک رہی تھی۔ کوٹھی کے دونوں پھاٹک بند تھے۔ مسلح سنتریوں کی پوری ٹولی پہرہ دے رہی تھی۔ ہجوم اب نعرے لگا رہا تھا۔

’’ٹوڈی بچہ ہائے ہائے۔ انگریز نوکر شاہی چھوڑ دو۔‘‘

اور یہ ہنگامہ اس لیے تھا کہ ابا جان بجنور کے سول سرجن تھے اور بجنور جیل بھی قاعدے کے مطابق ان کی نگرانی میں تھی۔

مولانا حفظ الرحمٰن اور غالباً حافظ محمد ابراہیم صاحب، نیز کچھ اور سیاسی کارکن دو دن قبل بجنور جیل میں زیر حراست لے لیے گئے اور اس سلسلے میں ہماری کوٹھی کے سامنے اظہار ناراضگی کرتے ہوئے عوام پورے جوش و خروش سے مظاہرہ کر رہے تھے۔

میرے کان میں بی مغلانی کی آواز آئی۔ وہ والدہ صاحبہ سے کہہ رہی تھیں ’’اے بی بی! یہ نگوڑے کیوں بیکار اشتلم مچا رہے ہیں۔‘‘

والدہ صاحبہ نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا:

’’بوا! کیا کہوں؟ مجھے تو خود اس کا افسوس ہے نہ جانے کیسے کیسے شریف لوگ ملک اور قوم کی خاطر قیدی دان بنے ہیں، مہینہ رمضان کا ہے۔ اور جو مسلمان ہوں گے، وہ اس گرمی میں روزے رکھ رہے ہوں گے۔ میں تو آج صاحب سے کہوں گی کہ ان بیچاروں کو پنکھے اپنے پاس سے منگوا کر دیں۔ کورے گھڑوں اور سحری کے لیے

دودھ کا انتظام بھی خود کر دیں۔''

یہ ۱۹۲۲ء کا ذکر ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب خود فرماتے تھے کہ دودھ سحری کے لیے جو آپ کی والدہ نے مقرر کرایا تھا۔ وہ پھیکا ملتا تھا مگر یہ بھی غنیمت تھا کہ اس سے کچھ تسکین تو ہوتی تھی۔

مولانا صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ جیل کے احاطے میں کبھی کبھی انہوں نے اس زمانے میں مجھے اپنی آپا کے ساتھ گھومتے ہوئے دیکھا تھا۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی سیاسی زندگی کے متعلق تو ان کے ساتھی اور سیاسی رہنما ہی لکھیں گے۔ میری بساط کیا ہے کہ جو اس عظیم انسان کی خدمات جلیلہ پر کچھ لکھوں' لیکن اتنا جانتی ہوں کہ مولانا کی طرح کے بہت کم قوم پرست ہوں گے جو عنفوانِ شباب میں ہی اپنے ملک کو غلامی سے آزاد کرانے کے لیے جان کی بازی لگا بیٹھے تھے۔ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد مولانا کو مسلم آزاد کانفرنس کے زمانے میں دیکھا۔ ہمارا قیام ان دنوں ۲۳۔ سری رام روڈ۔ سول لائن میں تھا۔ آ کا[1] بھائی سے ملنے اور مشورے کرنے اکثر مولانا صاحب ان دنوں تشریف لاتے تھے۔ مولانا کی رہائش جب قرول باغ میں تھی' مجھے کچھ ایسا شعور نہیں تھا کہ اس وقت مولانا کے کاموں کی اہمیت سمجھ سکتی۔ ایک مذہبی رہنما سمجھ کر ان سے عقیدت البتہ تھی۔ میری واقفیت دراصل مولانا سے ۱۹۴۸ء سے ہوئی۔ اس زمانے میں دلی' دلی والوں سے کافی خالی ہو چکی تھی اور جو لوگ یہاں رہ گئے تھے' وہ مایوس' غمزدہ' پریشان اور گھبرائے ہوئے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن اگر اس وقت ان مصیبت زدوں کو سہارا نہ دیتے' دکھے دلوں کے لیے آسرا نہ بن جاتے تو دلی میں مسلمان جم نہیں سکتے تھے۔ مولانا کی پرنور مسکراتی ہوئی صورت اور مشفقانہ انداز گفتگو صبح سویرے سے رات گئے تک غمزدہ مایوس لوگوں کو ڈھارس بندھاتا رہتا تھا۔ وہ ایک ایسے مسیحا تھے جنہوں نے جاں بلب قوم کو از سر نو زندگی بخشی۔ اور جمہوری نظام کو بحال کرنے کے لیے ہر وقت کام کیا۔ دورے' ملاقاتیں' ٹیلیفون' تقریریں' یہاں اور وہاں' سوتے اور جاگتے کام ہی کام اور آرام کا نام نہیں۔ اس انتھک محنت نے اس غازی مرد کو آخر جام شہادت پینے پر مجبور کر

۱۔ فخر الدین علی احمد اس وقت حکومت آسام کے ایک وزیر تھے' اس کے بعد مرکزی حکومت میں مختلف وزارتوں پر فائز رہے۔ انڈین یونین کے پانچویں صدر منتخب ہوئے۔ اسی منصب پر فروری ۱۹۷۷ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔

دیا۔ اب کہ مولانا کا جسدِ خاکی ہمارے سامنے نہیں ان کے کام' ان کا جذبہءعمل' ان کی خوداعتمادی یقیناً ہمارے لیے مشعل راہ رہنی چاہیے۔ انسان اگر چاہے تو اپنے عزم سے' ہمت سے ہر مصیبت کو ختم کرسکتا ہے۔ مشکلات پر قابو پالیتا ہے۔ مولانا نے مسلمانوں کو سکھایا کہ وہ کبھی مایوس نہ ہوں' کبھی اپنا دل چھوٹا نہ کریں۔ ہمت وحوصلہ سے کام لیں اور زمانے کو اپنے ساتھ ساز کرنے کے لیے مجبور کریں۔

۱۹۵۰ء سے مولانا حفظ الرحمٰن انجمن ترقی اردو شاخ دلی کی مجلس عاملہ میں شامل ہوئے۔ بارہ سال مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا فخر حاصل ہے۔ ان بارہ سالوں میں مولانا نے شاخ دلی کے لیے کیا کام کیا اور کس طرح اپنے مفید مشوروں سے ہماری رہنمائی کی۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میں تو ان کی اولوالعزمی اور کام کرنے کی بے پناہ طاقت پر حیران تھی۔ باوجود نت نئی مصروفیتوں کے انجمن کی مجلس عاملہ کی شاید ہی کوئی میٹنگ ایسی ہوگی' جس میں مولانا تشریف نہ لائے ہوں۔ بیماری کے عالم میں بھی اکثر میٹنگ میں چلے آتے تھے۔ آخری میٹنگ مجلس عاملہ کی ۲۵ نومبر ۱۹۶۱ء کو ان کی صدارت میں ہوئی۔ اس دن مولانا کا عالم یہ تھا کہ ان کو خاصا بخار تھا۔ کمبل لپیٹ کر آئے تھے۔ کھانسی دم بھر چین نہ لینے دیتی تھی۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ ان کا یہ حال دیکھ کر میں گھبرا گئی اور عرض کیا:

> ''خدا کے لیے مولانا! آپ آرام کیجئے' اتنا بھی کام کیا کہ انسان اپنا بالکل خیال نہ کرے یا اس حالت میں تشریف لاکر آپ نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں' لیکن آپ کی زندگی ملک کا عزیز ترین سرمایہ ہے۔''
>
> مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر فرمایا:
>
> ''ہاں' بھئی ہاں! میں بھی سوچ رہا ہوں فرصت ملے تو کچھ دن آرام لے لوں۔ اب یہ الیکشن سر پر آ گیا' اس کے بعد ضرور آرام کروں گا''

پھر وہ اردو کے مسائل پر گفتگو فرمانے لگے اور اپنی بیماری کو اس طرح بھول گئے گویا وہ بیمار ہی نہیں۔ اس عالم خودفراموشی نے مولانا کو موت کے چنگل میں قبل از وقت پھنسا دیا۔

مرکزی اردو کانفرنس دلی میں جو ہوئی۔ یہ مولانا حفظ الرحمٰن کی بدولت ہی اتنی شان سے ہوئی۔ اس کانفرنس میں جو لوگ شامل تھے۔ شاید پھر کسی اور کانفرنس میں نہ ہوسکیں۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد علیہ الرحمۃ کا آخری دیدار بہت سے اردو دوستوں نے جو باہر سے آئے

تھے' اس کانفرنس میں کیا۔ اوران کی وہ آخری تقریر دلپذیر بھی سنی جو حاصل کانفرنس تھی۔ اور اس دن بہت سے وہ لوگ جو مولانا آزاد کی ذات گرامی پر اعتراض کرتے تھے' ان کا کلمہ پڑھنے لگے اور یہ شاندار کارنامہ مولانا حفظ الرحمٰن کا تھا۔ اگر دلی میں اردو کانفرنس نہ ہوتی تو اس طرح لوگ کیسے مولانا کو دیکھ سکتے تھے اور سن سکتے تھے۔ یوں تو بہت لوگ مجلس استقبالیہ میں شامل تھے اور ان میں سے اکثر ایسے عہدیدار اصحاب تھے جو اردو کی خیر خواہی کا دم اٹھتے بیٹھتے بھرتے رہتے ہیں۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس عظیم الشان کانفرنس کے لیے چندے کی فراہمی کا بوجھ بہت زیادہ مولانا حفظ الرحمٰن پر پڑا۔

میں خود کو خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ کئی سال تک مولانا کے ساتھ مل کر کام کرنے کا مجھے موقع ملا۔ جب بھی کوئی مشکل مسئلہ دلی شاخ کے لیے ہمارے سامنے آتا' مولانا کے ناخن تدبیر سے سلجھ جاتا۔

مولانا حفظ الرحمٰن کے لیے دلی شاخ کی طرف سے تعزیتی جلسہ ہوا تو مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے فرمایا:

> ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن ابھی آئیں گے۔ ایک دھواں دھار تقریر کریں گے۔ اپنے دلکش انداز بیان سے ہمیں نیا ولولہ اور ہمت کام کرنے کے لیے دیں گے۔''

میں بھی یہی محسوس کرتی ہوں کہ مولانا اس دنیا سے نہیں سدھارے' کہیں لمبے سفر میں حسب معمول گئے ہوئے ہیں' کچھ ہی دن بعد ان کی مسکراتی صورت ہمیں دیکھ کر اطمینان ہوگا۔ ان کے مفید مشورے الجھے مسائل کو سلجھا دیں گے' وہ مجھے کچھ تنبیہہ فرمائیں گے۔ پھر مشفقانہ انداز میں زمانے کے نشیب و فراز بتائیں گے اور اردو کے لیے کسی مخصوص نشست میں اس طرح بے دھڑک بولیں گے کہ جس سے اردو والوں کو نیا عزم ملے گا' دوست خوش ہوں گے اور مخالف ان کا منہ تک کر رہ جائیں گے۔ کاش! یہ میرا خیال صحیح ہوتا۔ مولانا اپنے لمبے سفر سے واپس آ کر ہماری رہنمائی فرما سکتے۔ لیکن اب تو ان کی مقدس روح باری تعالیٰ کے حضور میں پہنچ گئی۔ مسلسل کام نے ان کو قبل از وقت ابدی آرام لینے پر مجبور کر دیا۔ بقول جگر:

دل کو سکون روح کو آرام آ گیا

وہ اپنے دوست کے پاس پہنچ گئے۔ لیکن ان کا کام' ان کا جذبہ ایثار و عمل ہمارے سامنے

ہے۔اس عالم میں بھی کہ مولانا چند دن کے مہمان تھے اور کمزوری کا عالم یہ تھا کہ چند منٹ بات کرنے سے تھک جاتے تھے۔ان کے پاس تری پورہ سے مسلمانوں کا وفد آیا' اور ان سے کہا کہ وہاں سے مسلمانوں کو نکالا جا رہا ہے' تو تڑپ گئے۔مجھ سے اور انیس باجی سے فرمایا'' تری پورہ والوں کے لیے کچھ ہونا چاہیے۔''

آ کا بھائی آسام سے آئے۔مزاج پرسی کے لیے گئے تو ان سے بھی بہ اصرار کہا۔۔۔۔ کہ'' ان مظلوموں کی مدد کیجئے۔''

معاملہ چونکہ بنگال کا تھا' اس لیے انہوں نے کہا'' مولانا! یہ کام تو مرکزی حکومت ہی کر سکتی ہے۔ہم لوگ مجبور ہیں۔''

آخری مرتبہ میں ان کی خدمت میں وفات سے چار دن قبل حاضر ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی فرمایا'' آپ اچھی ہیں؟''

میں نے عرض کیا'' مولانا! میں تو ٹھیک ہی ہوں' آپ کی علالت نے البتہ ہم سب کو فکر مند کر دیا ہے۔خدا آپ کو صحت دے۔

مسکرا کر خاموش ہو گئے' اسی وقت ڈاکٹر سید محمود اور حافظ محمد ابراہیم صاحب تشریف لے آئے۔

حافظ صاحب سے مولانا نے فرمایا'' میرے کشمیر جانے کا جلدی انتظام کرا دیجئے۔''

اس کے چار دن بعد بجائے جنت ارضی کشمیر کے مولانا جنت الفردوس سدھار گئے۔۔۔لیکن ان کی روح اب بھی یقیناً اپنی قوم و ملک کے لیے بے چین ہو گی۔

میرے مشاہدات!

کنور مہندر سنگھ بیدی

۱۹۴۲ء میں میری پہلی بار دہلی تعیناتی ہوئی' میں ان دنوں نیشنل وار فرنٹ کا انچارج تھا۔ دہلی میں آنے کے فوراً ہی بعد مجھے مختلف سیاسی جماعتوں کے اراکین سے تعلقات قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ فرائض منصبی کی ادائیگی کے لیے بھی میرے لیے ایسا کرنا مناسب تھا۔ چنانچہ اسی سلسلے میں ایک روز گلی قاسم جان جمعیت کے دفتر پہنچا۔ وہاں بہت سے اصحاب موجود تھے۔ ایک لاغر جسم لیکن باوقار انسان مجھ سے ملنے کے لیے اٹھے۔ ان کے کتابی چہرے' نورانی ریش اور چمک دار آنکھوں سے متانت' تدبر اور استقلال کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ یہ تھے مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم ومغفور' بہت دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور جب میں نے تخفیف تصدیعہ کہہ کر رخصت حاصل کی تو باہر تک مجھے پہنچانے آئے۔ پہلی ہی ملاقات میں مولانا نے میرے دل پر ایک گہرا نقش چھوڑا۔

مجھے دہلی میں قریب گیارہ برس سرکاری طور پر رہنے کا موقع ملا۔ اس اثنا میں سیکڑوں بار مولانا سے ملنے کا اتفاق ہوا' کئی بار سیاسی معاملات کی خاطر ملنا پڑا۔ بارہا دنیوی سلسلے میں ملاقاتیں ہوئیں۔ کئی بار میں نے ان سے ذاتی معاملات میں بھی مشورہ حاصل کیا۔ ہر ملاقات میں مولانا کی شخصیت' گفتگو' اخلاق' تہذیب' مشرقیت' ذہانت اور سنجیدگی سے متاثر ہوا۔ مولانا کے ویسے تو ہزاروں نیاز مند تھے۔ لیکن مجھ سے مولانا بڑی محبت سے پیش آتے تھے اور اپنے عزیز ترین نیاز مندوں میں شمار کرتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے فوراً ہی بعد جب میں دہلی میں بطور سٹی مجسٹریٹ تعینات ہوا تو مولانا ایک روز غریب خانہ پر تشریف لائے۔ ان کے دل و دماغ پر ایک بوجھ سا تھا جیسے وہ کسی بڑی کش مکش میں مبتلا ہیں۔ فرمانے لگے میں آپ کو لینے آیا ہوں۔ باڑہ ہندوراؤ میں مسلمانوں کا اجتماع ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ وہاں چل کر ان کی ڈھارس بندھائیں۔ وہ آپ پر اعتماد رکھتے ہیں۔ مولانا کے ہر حکم کی تعمیل کرنا میں اپنا فرض سمجھتا

تھا اور پھر یہ تو مسئلہ بھی نہایت ضروری تھا۔ چنانچہ میں ساتھ ہولیا۔ مولانا نے رسمی طور پر مجمع سے میرا تعارف کرایا اور مجھے تقریر کرنے کے لیے فرمایا جلسے کے اختتام پر جب ہم گھر لوٹے تو مولانا نے اس خلوص اور محبت کے ساتھ میرا شکریہ ادا کیا جیسے میں نے ان کی گردن سے کوئی بھاری بوجھ اتار دیا ہو۔

فسادات کا یہ دور مولانا کے لیے نہایت اہم اور نازک تھا۔ دہلی کے مسلمان گھبرائے ہوئے تھے۔ بہت جاچکے تھے' باقی جانا چاہتے تھے۔ مولانا محسوس فرماتے تھے کہ ان کا دہلی سے ان حالات میں جانا جہاں ان کے اپنے مفاد کے خلاف ہوگا' وہاں ہندوستان کی بین الاقوامی شہرت اور عزت کے لیے بھی مضر ثابت ہوگا۔ چنانچہ چوبیس گھنٹے ادھر ادھر مارے مارے پھرتے تھے اور اس کوشش میں تھے کہ فضا ہموار ہو اور سبھی قومیں پھر سے پہلے کی طرح شیر وشکر ہو کر رہیں۔ اس دور میں مسلمانوں کی صحیح نمائندگی کا بوجھ یا تو امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اٹھا سکتے تھے یا مولانا حفظ الرحمٰن۔ اس لیے نہیں کہ دہلی یا ہندوستان میں اور کوئی صحیح دماغ مسلمان لیڈر نہیں تھا بلکہ اس لیے کہ مولانا آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن پر سب قومیں اعتماد رکھتی تھیں اور ان کی ہر تجویز کو محض اس لیے نہیں ٹھکرا دیا جاتا تھا کہ ان میں کسی تعصب یا انتقام کا عنصر ہے۔

ان دنوں مجھے وقت بے وقت دہلی کے گلی کوچوں میں گشت کرنی پڑتی تھی۔ کبھی کبھار مولانا بھی ہمراہ ہوتے تھے۔ فضا مایوس کن ہونے کے باوجود مولانا کو ہندوستان کا مستقبل تاریک نظر نہیں آتا تھا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ ہمارا ملک سیکولرازم کی صحیح مثال دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے اور کرے گا۔ چنانچہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ مولانا کی یہ پیشین گوئی کس قدر درست ثابت ہوئی۔

جو شخص اپنے عقائد کا پکا ہو' بہادر بھی ہوا کرتا ہے۔ اسی جذبے نے دنیا میں غازی اور شہید پیدا کیے ہیں۔ مولانا بھی اپنی دھن کے پکے تھے اور کبھی کسی مصیبت یا رکاوٹ سے گھبراتے نہیں تھے۔ میں نے ان کو کئی بار مخدوش علاقوں میں اکیلے چکر کاٹتے دیکھا۔ ایک بار لال کنواں بازار کی ایک گلی میں کسی پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ میں پولیس لے کر فوراً موقع پر پہنچا' دیکھا کہ مولانا پہلے سے ہی وہاں پر موجود ہیں۔ میں نے گزارش کی کہ اب آپ تشریف لے جایئے میں یہاں کی دیکھ بھال کرلوں گا۔ میں نے ہر چند چاہا کہ پولیس ساتھ کردوں تاکہ مولانا کو گلی قاسم جان تک پہنچا آئے۔ لیکن مولانا نے انکار کردیا اور فرمانے لگے کہ میں اکیلا ہی چلا جاؤں

گا۔ میں نے تعمیل حکم میں پولیس کو کہیں اور گشت کے لیے بھیج دیا۔ مولانا پیدل ہی واپس گلی قاسم جان کی سمت چل پڑے۔ بظاہر تو میں نے مولانا سے رخصت چاہی۔ لیکن جب وہ تھوڑی دور چلے گئے تو میں آہستہ سے ان کے پیچھے ہولیا۔ تاکہ راستے میں کہیں کوئی اور واقعہ نہ پیش آ جائے مولانا کی زندگی ہمارے لیے ایک بیش بہا سرمایہ تھی' جسے ہم کسی قسم کے خدشے میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ اس واقعے کا ذکر آج میں پہلی بار کر رہا ہوں۔ مولانا کو بھی اس کا علم نہ تھا۔ مولانا کی تمام عمر اسی جدوجہد میں گزری کہ ہم ہندوستانی بلاتفریق مذہب وملت باہم انس واخلاق سے رہیں اور اپنے محبوب وطن کی فلاح و بہبود کے لیے شانہ بشانہ کام کریں۔

جب لسانی مسئلہ نے نازک صورت اختیار کی اور یہ ایک مذہبی سا مسئلہ بن کر رہ گیا' اس وقت بھی مولانا نے اس طوفان بدتمیزی کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انہیں ایام میں دویا شنکر جی آئی' سی' ایس سردار پٹیل کے سیکریٹری تھے' بلکہ دست راست تھے۔ انہوں نے ایک روز مجھے یاد فرمایا اور کہا کہ سردار پٹیل یہ چاہتے ہیں کہ زبان کا مسئلہ تعصب سے بری رہنا چاہیے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ چند ایسے لوگ میدان میں آئیں جن کا کردار ہمیشہ سے غیر متعصب رہا ہے دونوں زبانوں کو نزدیک لانے کی کوشش کی جائے۔ ہندی کو بسروچشم قومی زبان تسلیم کیا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی پنپنے کا موقع دیا جائے۔ میں نے اس بارے میں جن معدودے چند حضرات کو ہم راز بنایا ان میں سے ایک مولانا حفظ الرحمٰن تھے اور دوسرے منشی گوپی ناتھ امن۔ ان دونوں کے مشورے سے دہلی میں اردو سبھا کا انعقاد ہوا کچھ دیر تک اردو سبھا نے اس سلسلے میں بہت اچھا کام کیا اور مولانا نے ہمیشہ اس کی سرپرستی فرمائی۔

مولانا مرحوم اپنی تمام مصروفیتوں کے باوجود ادبی سرگرمیوں کے لیے وقت نکال لیا کرتے تھے۔ ان کے ایما سے درجنوں ایسے مشاعروں کا انعقاد ہوا جو اپنی مثال آپ تھے۔ شاعر حضرات (انہیں خدا رکھے) اکثر زود رنج' مشتعل مزاج ہوتے ہیں۔ ان مشاعروں میں اور ان کے علاوہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں ان لوگوں کو تعلقات بگاڑنے اور بنانے کے کافی مواقع ملتے ہیں۔ جب کبھی شعراء میں ناچاقی ہو جاتی تھی۔ مولانا مرحوم کو ثالث بنا دیا جاتا تھا۔ اور دونوں فریق مکمل طور پر مطمئن ہو کر شیر وشکر ہو جاتے۔ ایک بار لال قلعے میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اس میں قبلہ جوش ملیح آبادی نے ایک نظم پڑھی۔ جس میں منتظمین مشاعرہ سے یہ گزارش کی گئی تھی کہ وہ سیاست کو ادب میں نہ گھسنے دیں۔ ادبی لحاظ سے نظم بہت اچھی تھی۔ لیکن اس

مشاعرہ کے پس منظر کے نقطۂ نظر سے نہ پڑھی جاتی تو اچھا تھا۔ اس نظم سے مشتعل ہو کر میرے ایک اور عزیز دوست شاعر نے ایک قطعہ براہ راست جوش صاحب کے خلاف پڑھ دیا۔ جو کسی لحاظ سے بھی مناسب نہ تھا۔ ہم سب کو اس شاعر کا ایسا کرنا ناگوار گزرا لیکن چونکہ جوش صاحب صرف میرے ہی اصرار پر اس مشاعرے میں شریک ہوئے تھے' میں مشاعرے سے اٹھ کر چلا گیا۔ مولانا نے بھانپ لیا۔ کہ میں احتجاج کے طور پر کنارہ کش ہوا ہوں۔ چنانچہ فوراً ہی میرے پیچھے اٹھ کر آ گئے اور فرمانے لگے گو کہ واقعہ افسوسناک ہے' لیکن میرے یوں اٹھ کر چلے جانے سے اور بھی زیادہ افسوسناک ہو جائے گا' یہ فرماتے ہوئے مجھے بازو سے پکڑ کر واپس لے آئے۔

مولانا کو ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل کبھی بھی تاریک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اور وہ ہر مناسب موقع پر صاف صاف کہہ بھی دیا کرتے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان سے تاجروں اور اخبار نویسوں کا ایک خیر سگالی وفد ہندوستان آیا۔ پھاٹک حبش خاں میں حافظ یوسف صاحب نے اس وفد کو چائے پر مدعو فرمایا۔ میں بھی وہاں موجود تھا' بڑی پر تکلف چائے تھی' ادھر ادھر سے بڑی لچھیدار تقریریں ہوئیں۔ مقررین نے دونوں ملکوں کے تعلقات بہتر ہونے کی دعائیں مانگیں۔ ہم سب نے آمین کہی۔ جب مولانا حفظ الرحمٰن کی باری آئی تو انہوں نے فرمایا اگر پاکستان والے ہندوستان کے مسلمانوں کی بہتری چاہتے ہیں اور اگر صحیح معنوں میں ان کے ہمدرد ہیں تو ہندوستان کے مسلمانوں پر رحم کریں اور ان کو اِن کے حال پر چھوڑ دیں۔ ہندوستان کے مسلمان خود ہی اپنے حقوق کی دیکھ بھال کرنے کے اہل ہیں۔ وقتی طور پر شاید اس تقریر کا اثر پاکستانی وفد پر اچھا نہ پڑا ہو لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ مولانا نے کتنی اچھی بات کہی تھی۔

مولانا میں سب سے بڑا وصف جو میں نے دیکھا وہ یہ تھا کہ ان کے دل میں کبھی بے جا نام و نمود کی خواہش پیدا نہ ہوئی' اگر وہ چاہتے تو سرکاری طور پر کئی قسم کے اعزازات حاصل کر سکتے تھے' لیکن انہوں نے کبھی اس کی پروا اس لیے نہیں کہ ایسا کرنے سے شاید وہ عوام کی اتنی خدمت نہ کر سکیں۔ آج کل کی سیاسی دنیا میں ایسے لوگ اگر نایاب نہیں تو نادر ضرور ہیں۔

مولانا کی طویل علالت کے دوران میں ان کے ہزاروں لاکھوں بہی خواہوں نے کیا کیا نہ دعائیں مانگیں' لیکن جو عدم سے وجود میں آئے' اسے واپس لوٹنا پڑتا ہے۔ دستِ اجل سے آج تک سوائے خدائے پاک کی ذات کے اور کوئی مفر حاصل نہ کر سکا۔ مہاتما گاندھی گئے' سردار پٹیل گئے' مولانا آزاد گئے اور رفیع احمد قدوائی گئے' پنڈت پنت گئے۔ اب مولانا حفظ

الرحمٰن چل بسے' خدا جانے اب اور کس کی باری ہے۔

ہمارے لیے اب اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے کہ صدق دل سے خداوند تعالیٰ کے حضور میں دعا مانگیں اور علامہ اقبال کا یہ شعر دہرائیں۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی

اک شمع رہ گئی تھی ۔۔۔۔۔۔۔۔

ڈاکٹر ضیاء الحسن فاروقی

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

۱۲ر اگست کو نمبرا کینگ لین (نئی دہلی) میں نہ معلوم کیوں اس وقت یہ شعر میری زبان پر بے اختیار آ گیا' جب ہندوستان کی ایک مقتدر ہستی جس کے ہاتھوں میں اس وقت زمام اختیار ہے' اپنے ایک ساتھی اور جنگ آزادی کے بہادر سپاہی کے جنازہ کے سامنے خاموش کھڑے ہو کر عقیدت کے پھول پیش کر رہی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ اس سے میری مراد کیا ہے اور میں نے کس کی ''بے زبانی'' کی طرف اشارہ کیا ہے۔۔۔۔اس کی بے زبانی جو گفتار ہی کا غازی نہیں بلکہ کردار کا بھی غازی تھا' اور جس کی شخصیت پر مجاہدِ ملت کا خطاب اسی طرح زیب دیتا تھا جس طرح مولانا حسین احمد مدنی' اور مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیتوں پر شیخ الاسلام اور امام الہند کا۔

حضرات! مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا انتقال ہو گیا یعنی وہ شمع خاموش ہو گئی جس کی روشنی میں ہمارا درماندہ کارواں اب دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا' وہ انسانی سہارا جاتا رہا جو حالات کی اندھیاریوں میں امید کی کرن بن کر چمکتا تھا' لوگوں کی مصیبتوں کو سن کر تڑپ جانے والا ایک دل تھا جو ٹھہر گیا' آزادی اور بے باکی کی ایک آواز تھی جو ڈوب گئی' فکر و عمل کا ایک آفتاب تھا جو غروب ہو گیا۔

مولانا مرحوم کا جنازہ کینگ لین سے قوم اپنے کاندھوں پر اٹھا کر فیروز شاہ کوٹلہ کے بڑے میدان میں لائی اور پھر اسے مہندیوں کے احاطے میں محصور اس شہر خموشاں میں سپرد خاک کر دیا' جہاں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خانوادے اور سلسلے کے لوگ ابدی نیند سو رہے ہیں!

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ہزاروں انسانوں کا ایک ہجوم تھا‘ جو ملت کے اس مجاہد رہنما کو دل کی تمام سوگواریوں کے ساتھ رخصت کرنے آیا تھا‘ اور اس ہجوم میں میری نظر تصور یہ دیکھ رہی تھی کہ مولانا مرحومؒ کے جنازہ کے ساتھ دو سو سال کی تاریخ بھی تھی جو اسے نئی دہلی سے مہندیوں کے احاطہ تک رخصت کرنے آئی تھی‘ یہ اس لیے کہ مولانا اس عہد میں اسی سلسلے کی ایک کڑی تھے جو شاہ ولی اللہ کے افکار و خیالات سے شروع ہوتا ہے اور جس کا دامن ان گنت انقلابی سیاسی‘ تعلیمی اور مذہبی تحریکوں پر پھیلا اور پھیلا ہوا ہے۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن سیوہارہ (ضلع بجنور) میں پائی اور اس کے بعد وہ دنیائے اسلام کی مشہور درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوگئے۔ یہ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا اور اگرچہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی انقلابی تحریک ناکام ہوچکی تھی۔ لیکن دارالعلوم دیوبند کی فضا اس کی گرمی سے معمور تھی‘ اس فضا کا مولانا کے حساس دل و دماغ پر گہرا اثر پڑا تھا‘ اور ان میں آزادی اور اس کی برکتوں کا شعور پوری طرح جاگ اٹھا۔ یہاں تک کہ جب ۱۹۲۰ء کی تحریکیں شروع ہوئیں تو مولانا عہدِ شباب کے پورے جوش و خروش کے ساتھ ان میں شامل ہوگئے۔ اور قید و بند کی منزل سے گزرے۔ قیدِ فرنگ سے آزاد ہوئے تو پہلے انہوں نے دارالعلوم کے نصاب کی تکمیل کی اور پھر وہیں ایک بوریئے پر بیٹھ کر درس دینے لگے‘ لیکن اس زمانے میں بھی وہ اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر‘ کانگریس‘ خلافت اور جمعیۃ العلماء ہند کے تحت مختلف تحریکوں میں حصہ لیتے رہے‘ کہا جاتا ہے کہ ان کی عمر کے پندرہ سال درس و تدریس میں‘ پانچ سال قیلہ فرنگ میں اور باقی حصہ ملک و ملت کی خدمت میں گزرا۔

مولانا کی شخصیت کا کمال یہ رہا کہ اس میں دین و دنیا‘ مذہب اور عقل‘ یعنی دوسرے لفظوں میں ''جام شریعت'' اور ''سندانِ عشق'' کا ایک ایسا خوشگوار امتزاج پیدا ہوگیا تھا جو اس زمانے میں خال خال اشخاص کے یہاں ملتا ہے۔ انہوں نے ایک طرف علمائے دیوبند کی پروقار مجاہدانہ روایات کے ساتھ گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کے دوش بدوش چل کر‘ آزادی کی لڑائی لڑی تھی۔ آزادی کے بعد پنڈت نہرو کا ایک بازو بن کر سوشلزم کی بنیادوں پر نئے ہندوستان کی تشکیل و تعمیر میں لگے ہوئے تھے‘ سیکولرزم کے حامی تھے اور اس کا جرأت کے ساتھ پرچار کرتے تھے‘ دوسری طرف وہ جمعیۃ العلماء جیسی مذہبی جماعت کے ناظم اعلیٰ ہی نہیں بلکہ

روح رواں تھے' مکاتب' مدارس اور دینی تعلیم کے پروگرام کو چلاتے تھے' مسجدوں' خانقاہوں اور قبرستانوں کو واگذار کراتے تھے اور ان سے متعلق اوقاف کو بچانے میں رات دن مصروف رہتے تھے' ایک طرف وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعۂ ملیۂ اسلامیہ جیسے تعلیمی اداروں میں جہاں دنیوی تعلیم دی جاتی ہے' اپنی شخصیت کا سایہ ڈالتے رہتے تھے۔ تو دوسری طرف دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ایک بہت ہی اہم رکن تھے' اس طرح وہ بیک وقت مختلف النوع مذہبی وسیاسی' تعلیمی وثقافتی' لسانی' تصنیفی انجمنوں اور اداروں کے فعال رکن تھے اور ہر جگہ قائد کی حیثیت رکھتے تھے' آزادی سے پہلے بھی اور آزادی کے بعد خاص طور سے ملک وملت کی تاریخ پر ان کی شخصیت' ان کی انتھک جدوجہد' ان کی ذہانت' ان کی معاملہ فہمی اور ان کی گہری اور اثر آفریں انسانیت کی چھاپ ہے' اس تاریخ کا مطالعہ ان کی شخصیت کے مطالعے کے بغیر نامکمل رہے گا۔

مولانا کی شخصیت کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی جرأت اور ان کی بے خوفی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ خدا کے سوا اور کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ ہم سب مذہبی انسان یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم خدا کے سوا اور کسی سے نہیں ڈرتے' لیکن حق یہ ہے کہ ہم خدا کے سوا سب سے ڈرتے ہیں۔ اس زمانے میں جب کہ بڑے بڑے قومی رہنما گوشہ نشین ہوگئے تھے اور اپنی کمزوریوں پر حالات کی نامساعدت یا مصلحت کا پردہ ڈال کر مطمئن ہو بیٹھے تھے' ایک آواز تھی جو ملک کے گوشے گوشے میں گونجتی تھی' ایک عشق تھا جو بے خطر تغیرات وانقلابات کی آگ میں کود پڑا تھا' ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد کے پیچیدہ اور نازک زمانے میں ایک شخص تھا جو بہادری سے کہتا تھا کہ وہ مسلمان ہے اور ہندوستانی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں جب حالات قابو سے باہر ہوگئے تھے اور اس کے غیر مسلم ساتھیوں نے اس خیال سے کہ یہ شخص بھی فسادات کی نذر نہ ہو جائے' یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ کہیں پناہ گزیں ہو کر بیٹھ جائے تو معلوم ہے کہ اس شخص نے کیا جواب دیا تھا' اس نے کہا تھا کہ جس وطن کی آزادی کے لیے میں نے جدوجہد کی تھی' اسی وطن میں آج میں شرنارتھی بن کر رہوں' یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا' جس زندگی کو میں اس طرح بھاگ کر بچالے جاؤں گا' وہ کس قیمت کی ہوگی؟ آپ لوگ کیا باتیں کرتے ہیں' یہ موقع جان دینے کا ہے یا جان بچانے کا؟

لیکن مولانا میں محض جرأت وبے خوفی ہی نہیں تھی' آپ کو آج بھی خود جمعیۃ العلماء میں

بہت سے نڈر سپاہی اور رضا کار مل جائیں گے۔ مولانا کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ جرأت کے ساتھ ساتھ ہوش وسلیقہ بھی رکھتے تھے۔ بات کتنی ہی سچی ہو اور کتنی ہی بے باکی سے کیوں نہ کہی جائے' اگر کہنے کا سلیقہ نہیں تو بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے' مولانا کو بات کہنے کا سلیقہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ کوئی بات کہتے تھے تو وہ سنی جاتی تھی اور اس کا اثر ہوتا تھا۔ مولانا ایک بڑے خطیب تھے اور ان کی خطابت میں بلا کی صلابت تھی۔ اس صلابت اور اس کی سحر آفرینی کا سرچشمہ ان کی حق پرستی اور قوت ایمانی تھی۔ وہ وہی بات کہتے تھے' جسے وہ حق سمجھتے تھے اور جس کی سچائی پر ان کا ضمیر مطمئن ہوتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ کوئی بات اپنے خاص اسلوب میں' اپنی پوری شانِ خطابت سے کہتے تھے تو سننے والوں کے ذہن کی گرہیں کھل جاتی تھیں' کتنے دل ہوتے تھے جو تڑپ اٹھتے تھے۔ اور کتنے ضمیر ہوتے تھے جو بیدار ہو جاتے تھے۔

ابھی بہت دن نہیں ہوئے اور وہ معرکہ ہم سب کو یاد ہے جو اس برصغیر میں مسلم لیگ کے دوقومی نظریے اور مطالبہء پاکستان کے سلسلے میں گرم ہوا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو لفظ اسلام سے کتنا گہرا جذباتی تعلق ہے' یہ نظریہ اور یہ مطالبہ اس طرح پیش کیا گیا تھا کہ گویا اس وقت سارا اسلام یہی تھا۔ مولانا نے اپنے بزرگوں کی رہنمائی میں یہ چیلنج قبول کیا اور گاؤں گاؤں پھر کر اس کی نفی کی۔ مسلمان ایسے لوگوں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے اور ان کی تذلیل واہانت اسلام کی خدمت تصور کرتے تھے' اپنے ہی ہم مذہبوں کے خلاف اس طرح ڈٹ جانا کوئی آسان کام نہیں' بڑا مجاہدہ ہے یہ' ایمان کی بڑی آزمائش ہے اس میں! مولانا ہندوستان کی تقسیم کو تو نہیں روک سکے۔ لیکن انہوں نے حق شناسی اور بے باکی کی ایک مثال قائم کر دی' تقسیم کے بعد جو صورت حال سامنے آئی' اس نے دوقومی نظریے کا کھوکھلا پن ثابت کر دیا جس چیز کو مسلمان عین ایمان سمجھ بیٹھے تھے محسوس ہوا کہ وہ باطل تھی' جنہیں وہ اپنی کشتی کا ناخدا سمجھتے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ انہیں منجدھار میں چھوڑ کر دوسرے کنارے پر پہنچ گئے' جس زمین پر انہوں نے اپنے خوابوں کے محل تعمیر کیے تھے وہ زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی' یہ صورت حال ایسی تھی جس نے مسلمانوں کو کہیں کا نہیں رکھا۔ کروڑوں انسانوں کے اس ملک میں ان کی حالت ان جلی ہوئی لکڑیوں کی مانند ہو گئی جنہیں قافلے صحرا میں جلا کر چھوڑ جاتے ہیں' نتیجہ ہوا وہی جو ہونا تھا' ان کا روحانی اضطراب اور ذہنی انتشار انتہا کو پہنچ گیا اور بے اعتمادی اور خوف کی وہ فضا پیدا ہو گئی جس کی مثال مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کے بعد نہیں ملتی' ایسے نازک وقت میں

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مسلمانوں کی کشتی کے نگہبان بن گئے۔ مرکزی دفتر جمعیۃ العلماء میں بیٹھ کر ملک کے کونے کونے میں جا کر، پارلیمنٹ میں، غرض ہر جگہ پہنچ کر ایسے ایسے حوصلہ بخش بیانات دیئے اور ایسی ایسی ولولہ انگیز تقریریں کیں کہ مسلمانوں میں زندہ رہنے کا حوصلہ ایک بار پھر پیدا ہو گیا۔

مولانا کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ مایوس ہونا نہیں جانتے تھے اور قنوطیت اور احساس کمتری کے سخت دشمن تھے، عثمان فارقلیط صاحب نے صحیح کہا ہے کہ مولانا کا ایمان تھا کہ اسلام اور عزت نفس لازم ملزوم ہیں کسی امت کا تباہ ہونا اتنا افسوس ناک نہیں، جتنا کہ اس کا احساس کمتری میں مبتلا ہونا، عزتِ نفس کی موت احساسِ کمتری کی زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ حضرت مولانا کو احساسِ کمتری کے نام سے چڑ تھی، آپ جہاں جاتے اس خطرناک جذبہ کی سختی کے ساتھ مذمت کرتے، مرکزی دفتر جمعیۃ العلماء میں لوگوں کا ہجوم رہتا اور آپ برابر گفتگو کرتے رہتے اور انداز بیان ایسا اختیار کرتے گویا احساس کمتری کو چیلنج کر رہے ہوں، اگر ایڈیٹر الجمعیۃ کے قلم سے کسی اداریہ میں احساس کمتری کی جھلک نظر آجاتی تو آپ اس پر سخت تنبیہہ کرتے اور فرماتے کہ ہماری زندگی تو اس جذبہ کے خلاف جہاد کرنے میں گزری ہے، اگر جمعیۃ العلماء کا ترجمان بھی یہ جذبہ پیدا کرنے لگے تو مسلمانوں کو اس دلدل سے نکالنے کے لیے کون آئے گا اور پوری امت کا انجام کیا ہو گا؟

مولانا نے یہ وطیرہ کبھی نہیں اختیار کیا کہ حکومت وقت کی خوشنودی کے لیے اور اپنی سیکولرزم کے دکھانے کے لیے یہ کہیں کہ یہاں ہندوستان کے مسلمانوں کو مشکلات کا سامنا نہیں ہے اور ان کا کوئی مسئلہ نہیں۔ انہوں نے کھلے بندوں بار بار اس بات کو کہا کہ مسلمانوں کے سامنے بڑی مشکلات ہیں، پچھلے سال کے مسلم کنونشن میں انہوں نے مسلمان نمائندوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی شکایات کا ایک دفتر تیار کیا۔ مسلم کنونشن جن حالات میں ہوا وہ ہم کو معلوم ہے، کس طرح مختلف حلقوں سے اس کے انعقاد کی مخالفت ہوئی، طنز و تشنیع کا ایک محاذ تھا جو مختلف جماعتوں نے اس کے خلاف قائم کر لیا تھا اور غالباً حکومت بھی اس کو مناسب نہیں سمجھتی تھی، لیکن مولانا نے کسی کی پروا نہیں کی، کنونشن ہوا اور جس مقصد کے لیے منعقد ہوا تھا وہ مقصد مولانا نے پورا کر کے دکھایا۔ مولانا مسلمانوں کی مشکلات بیان کرتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ وہ اس بات کو پرزور طریقے سے کہتے تھے کہ ان مشکلات کو ہم ہی حل کر سکتے ہیں، کوئی

دوسرا ملک یا دوسری جماعت نہیں حل کر سکتی، ہاں دوسرے ہماری پریشانیوں میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ جب وہ یہ کہتے تھے تو بلاشبہ ان کے سامنے پاکستان کا رویہ ہوتا تھا۔ اس طرح مولانا نے بے جا تملق کی فضا کو صاف کیا اور ان کی حق پرستی نے زمانہ ساز اور اقتدار کے بھوکے رہنماؤں کو رسوا کیا۔ انہوں نے حکومت پر سخت سے سخت تنقید کی اور اس طرح مسلمانوں اور باہر والوں پر واضح کیا کہ ہندوستان میں جمہوریت اور اظہار خیال کی آزادی ہے۔ مولانا ہندوستان کی جمہوریت اور سیکولرزم کی آبرو بن گئے تھے۔

مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی یہ خصوصیت نئی تعلیم والوں کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے کہ اب تک اس قوم کی کوئی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے تو انہیں لوگوں نے دی ہے، جنہوں نے مکتبوں اور مدرسوں میں چٹائیوں پر بیٹھ کر تحصیل علم کیا تھا۔ مولانا ایک غریب اور گمنام خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ تعلیم بھی انہوں نے پرانے طرز کی پائی۔ لیکن کام وہ کر گئے جو کالج اور یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے والوں سے نہ ہو سکا۔ کیا اسے ہم مکتب کی کرامت کہہ سکتے ہیں؟ بلاشبہ یہ فیضانِ نظر تھا۔

حضرت مجاہد ملت صرف مسلمانوں ہی کے لیڈر نہیں تھے، درحقیقت وہ ملک کے ایک بہت ہی بڑے رہنما تھے۔ وہ قومی مسائل میں پوری دلچسپی لیتے تھے۔ ان کے پاس غیر مسلم حضرات بھی اپنے مسائل لے کر آتے تھے اور خواہ وہ مسائل حل ہوں یا نہ ہوں، مطمئن ہو کر جاتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے مسائل کو خاص طور سے پیش کرتے تھے مگر محض اس خیال سے نہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ بلکہ اس یقین کے ساتھ کہ مسلمانوں کے حل میں ملک اور قوم کی نیک نامی ہے۔ جمہوریت کی کامیابی ہے۔ سیکولرزم کی جیت ہے۔ یقیناً وہ ایک سچے محب وطن تھے۔

مولانا کی طبیعت میں فقیروں کی سی سادگی اور بوریہ نشین بزرگوں جیسا انکسار اور وقار تھا۔ وہ ایک ایسے درویش تھے جس کی خانقاہ میں کوئی دربان نہیں ہوتا۔ دہلی میں جمعیۃ کا دفتر اس درویش کی خانقاہ تھی۔ جس کے دروازے موافق اور مخالف، امیر و غریب، مسلم و غیر مسلم، مقیم اور مسافر سب پر ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ لوگ دور دور سے آتے ایک گوشہ میں اپنا سامان رکھتے اور پوچھتے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کہاں ہیں؟ مولانا موجود ہوتے تو سلام کر کے ان کے پاس بیٹھ جاتے، بس اپنی بات کہنے اور اگر جی چاہے تو اس خانقاہ میں قیام کرنے کے لیے اتنا کافی تھا، مولانا موجود نہ ہوتے تو لوگ کئی کئی دن ان کا انتظار کرتے، مولانا ہر طرح کے

لوگوں سے ایک ہی طرح ملتے اور سب کے مسائل کو کمال توجہ سے سنتے اور ان کے حل کی تدبیریں سوچتے اور بتاتے اور جتنا ہوسکتا اتنا کرنے کے لیے خوشی سے تیار رہتے۔۔۔ مولانا نے اپنی امنگوں کو قوم کی امنگوں سے' اپنی ضرورتوں کو قوم کی ضرورتوں سے کچھ اس طرح ہم آہنگ کر دیا تھا کہ ان کی انفرادی زندگی جماعتی زندگی اور جماعتی زندگی ان کی انفرادی زندگی بن گئی تھی' درویش صفت عوامی رہنما کی یہی شان ہوتی ہے اور یہی شان باقی و قائم رہتی ہے۔

آج مولانا ہم میں نہیں رہے' لیکن وہی دارالعلوم دیوبند ہے وہی جامعۂ ملیہ ہے' وہی مسلم یونیورسٹی ہے' وہی ندوۃ العلماء ہے' وہی زمین اور وہی آسمان ہے' آفتاب اسی طرح چمکے گا اور چاند اپنی چاندنی سے فضا کو اسی طرح منور کرے گا۔۔۔ دیکھنا یہ ہے کہ اب اس آب و گل سے پھر کسی حفظ الرحمٰن کی تخلیق ہوتی ہے یا نہیں!

مرد کامل مولانا حفظ الرحمٰن

قاضی محمد عدیل عباسی ایڈووکیٹ

آفتابے کہ از تجلی او
افق ارم و شام نورانی

بعض ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جو اس دنیا سے گزرنے کے بعد ملک میں ایسا خلا پیدا کر جاتی ہیں، جس کا پر کرنا بہت دشوار ہوتا ہے اور کبھی کبھی ایک قرن' ایک صدی یا اس سے زیادہ کا انتظار کرنا پڑتا ہے "جب کہ مردے از غیب" نمودار ہو کر اس کمی کو پورا کرے جو موت کے ظالم لیکن ناگزیر ہاتھ نے پیدا کیا ہے۔ ایسی ہستیاں بالعموم ہمہ گیر ہوتی ہیں اور فکر و نظر میں بھی اور عمل و سعی میں بھی انقلاب آفرین ہوتی ہیں۔ اسی طرح کی ایک ہستی مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی تھی جو سیوہارہ ضلع بجنور کے گاؤں سے ایک کرن کی طرح نمودار ہوئی اور آفتاب بن کر تمام ہندوستان اور ہندوستان کے باہر ایشیا و افریقہ کے بلاد پر چمکی' زمانہ بہت سی کروٹیں لے گا' زمین اپنے محور پر کتنے چکر کاٹے گی تب کہیں جا کر ایک ایسی جامع شخصیت کا وجود ہو سکے گا۔

آفرینندہ عہد:

مولانا کو بجا طور پر آفرینندہ عہد کہا جا سکتا ہے۔ مولانا نے جب دنیا میں آنکھ کھولی تو خلافتِ اسلامیہ اور اتحادِ اسلام کا پاکیزہ تصور پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ وقت آیا کہ ایک طرف علامہ شبلی مرحوم مرثیہ خواں تھے:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

دوسری طرف علامہ اقبال دل گیر ہو کر پکار رہے تھے:

خاک و خون میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش

ہندوستان میں مسلم فرقہ پرستی زوروں پر تھی۔ فرقہ پرستی دراصل خوف اور بے یقینی سے

پیدا ہوتی ہے جب منزل کا پتہ نہیں لگتا اور ہمت جواب دے جاتی ہے تو انسان اپنے کو ایک حصار میں بند کرنا چاہتا ہے۔ اسی سے تنگ نظری جنم لیتی ہے اور واہمہ کو ڈراؤنے خواب نظر آنے لگتے ہیں اسی لیے مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا تھا:

''وہ وساوس ہیں جنہیں افکار کہتے ہو' خطرات ہیں جنہیں عزائم کہتے ہو۔''

مولانا ان وساوس اور خطرات سے بہت دور تھے اور اپنی زندگی میں قوم کو ان مہلک بیماریوں سے نجات دلانے کے لیے انہوں نے جو کچھ کیا وہ کوئی دوسرا نہ کر سکا اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے اور ان کا مشن روز افزوں ترقی کے لیے ساتھ جاری رہے گا۔

مسلمانان ہند میں فکر و نظر کی پختگی اور صحیح الخیالی پیدا کرنے کے کام پہلے سے ضرور شروع ہوا تھا۔ اور ایشیا کی وہ سب سے بڑی علمی و اسلامی درس گاہ جو دارالعلوم دیوبند کے نام سے موسوم ہے اور جس نے کبھی کسی حکومت سے امداد نہیں لی' ان معتقدات کا سنگِ بنیاد رکھ چکی تھی۔ مولانا محمود حسنؒ نے انگریز حکومت کی موجودگی میں گاندھی جی کے برسرعام آنے سے پہلے تمام قوموں کی ایک ملی جلی مشترک حکومت عارضی ''عارضی جمہوریہ ہند'' کے نام سے قائم کر دی تھی۔ جمعیۃ علماء ہند کا بھی قیام عمل میں آ چکا تھا جس نے متحدہ قومیت اور مشترکہ حکومت کو جائز اور آزادی و خودمختاری کے لیے سعی و جہد ضروری قرار دی تھی۔ مگر اس فکر و نظر کی تفصیلات کو طے کرنے سے ایک مجموعہ دفعاتِ قانون بنانے اور اس کی ہر مشکل گرہ کو کھولنے کا کام اور اسے عملی جامہ پہنانے کی خدمت مولانا حفظ الرحمٰن نے اسی طرح کی جس طرح لینن نے کارل مارکس کے نظریات کو تجربہ اور عمل میں لا کر کمیونزم کو عالم آشکارا کیا۔ آج جس کا نام ہندوستان میں نیشنلزم رکھا جاتا ہے اور جس کی مطابقت دیگر ملکوں سے کر کے اس کے حسن و قبح پر بحث کی جاتی ہے' وہ مولانا حفظ الرحمٰن کے نزدیک ایک واضح اور بہتر مسئلہ کا انکشاف تھا۔ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس میں مختلف مذاہب کے لوگ بستے ہیں۔ اور جہاں پیروانِ اسلام عددی طور پر اقلیت میں ہیں' سوال یہ ہے کہ یہاں مسلمان کس طرح زندگی گزاریں۔ مولانا نے اس نظریے کو ایجاد تو نہیں کیا کہ:، پکے مسلمان ہوتے ہوئے پختہ ہندوستانی بنیں ملک و وطن کی خدمت میں سب سے آگے آگے رہیں۔ احساس کمتری کو ترک کر دیں اور اسلام پرستی و وطن دوستی میں کسی قسم کا تضاد تصور نہ کریں۔ لیکن جو نظریہ پہلے سے موجود تھا اسے مدون کرنے اور اسے منظر

عام پر بیباکی اور حق گوئی کے ساتھ لانے میں انہوں نے جو خدمت انجام دی' اس کی حیثیت ''فکر و نظر'' میں انقلاب پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ وہ بہ یک وقت جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ' اسلامی جلسوں کے جادو بیاں مقرر' ''دارالمصنفین'' میں حقائق اسلام کو اجاگر کرنے والے مصنف اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر اور پارلیمنٹ کے رکن تھے۔ اپنے عالمانہ و محققانہ انداز' اپنی سحر آفرین خطابت' اپنی بے پناہ قوت تصنیف وانشا پردازی' اپنی اعلیٰ شخصیت' سادگی و پاکیزگی' جرأت و دلیری' جذبہء خدمت' اخلاقِ عالیہ' اور قربانی و ایثار سے وہ ہر جگہ چھائے رہتے تھے۔ کانگریس میں جاتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کے عظیم لیڈروں میں ہیں۔ اسلام کی خدمت تقریر اور تحریر سے کرنے پر آتے تھے تو اکابر علمائے روشن خیال میں نظر آتے تھے۔ اس طرح وہ اس زمانے کو پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے جو ہندوستان کی سالمیت اور وحدت کو بھی قائم کرنا ہے اور ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کے لیے ایک شاندار مستقبل کی بھی نشان دہی ہے۔ قوم نے ناانصافی کی جو انہیں صرف ''مجاہد ملت'' کہا وہ اس سے بہت اونچے تھے۔

بصیرت اور روشن خیالی:

مولانا نے لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کو متاثر کیا اس میں مذہب اور ذات پات کی قید نہیں ہے۔ مسلمان اور ہندو کا امتیاز نہیں ہے۔ جس کی وجہ ان کی بصیرت اور روشن خیالی تھی۔ ہندوستان سے متعلق جتنے معاملات آتے تھے۔ ان میں وہ صرف ہندوستان کی بسنے والی پانچ کروڑ مسلم آبادی ہی کے مفاد کے تصور کے دائرے میں گھرے نہیں رہتے تھے بلکہ ۴۰ کروڑ ابنائے ہند کے فائدے اور مستقبل کو مدنظر رکھتے تھے۔ انہیں ہندوستان کے ایک ایک فرد سے محبت تھی خواہ وہ کسی مذہب و ملت اور کسی ذات اور قوم کا ہو' سوائے ان معاملات کے جن کا تعلق مسلمانوں کے مذہب اور کلچر اور شعائر کے تحفظ و ترقی سے تھا۔ بقیہ دیگر امور یعنی اقتصادیات' خوش حالی' غریبی' مرض' وبا اور بہت سی مشکلات سے دوچار ہونے اور ان پر قابو پانے میں وہ مسلمانوں کی تقدیر کو دوسری قوموں سے نہ صرف وابستہ سمجھتے تھے' بلکہ اس کا پورا پورا یقین رکھتے تھے اور نہایت صفائی کے ساتھ اس کی تلقین بھی کرتے تھے۔ غالباً مولانا حفظ الرحمن پہلے بڑے عالم ہیں جنہوں نے کانگریس کے الیکشن دیگر کانگریسیوں کی طرح لڑے اور ان کو ہر

فرقہ کی تائید ومخالفت حاصل رہی۔ وہ اپنے ذہن ومزاج کے لحاظ سے عوامی تھے اور اسی لیے وہ عوام کی قیادت کرتے تھے ان سے پہلے حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی بھی صوبہ کانگریس کے نائب صدر رہے' مگر وہ اس بلندی پر تھے جہاں پارٹیوں کی اندرونی آویزش کا اثر نہ ہوسکتا تھا' بلاشبہ حضرت شیخ کی کتاب متحدہ قومیت اور ان کا بحیثیت رکن کانگریس کے جلسوں میں شریک ہونا بڑے جرأت مندانہ اقدامات تھے۔ مگر جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا حضرت شیخ کتاب تھے اور مولانا حفظ الرحمٰن اس کی شرح۔ وہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھے۔ مگر ایسی کڑی تھے جس نے ساری زنجیر کو نمایاں کر دیا تھا۔ جب وہ کانگریس کے اندر الیکشن لڑاتے تھے تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ہیں جن کی اسلام پر بصیرت افروز تقریروں اور تحریروں سے سارا ہندوستان گونج رہا ہے وہ اس وقت ایک پختہ کار کانگریسی ہوتے تھے۔ میں نے ان کو انڈین نیشنل کانگریس کا نام ہمیشہ بڑی محبت سے لیتے سنا ہے اور وہ کانگریس کو کانگریس نہیں بلکہ ہمیشہ انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے یاد کرتے تھے۔

عرصہ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں کئی قسم کے لوگ ہیں ایک وہ ہیں جن کی سمجھ ہی میں نہیں آتا ہے کہ اسلام کے دعویٰ کے باوجود ایک متحدہ قومیت اور ایک مشترکہ حکومت کا تخیل قائم کیسے ہوسکتا ہے۔ یہ لوگ تمام ان باتوں میں مجبوراً حصہ لیتے ہیں جو ان کی روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں مگر اسے خلاف اسلام بھی سمجھتے ہیں۔ اس لیے برابر اپنے کو گنہگار تصور کرتے رہتے ہیں۔ یہی وہ خیال ہے جو احساس کمتری پیدا کرتا ہے اور جس سے آگے چل کر بڑی بڑی برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو ان باتوں کو جائز تو سمجھتے ہیں مگر انہیں رخصت کے اس درجے پر رکھتے ہیں جو کرامت کی حد کے قریب ہے۔ میں جب ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ سے الیکشن لڑ رہا تھا تو اس صوبہ کے ایک ممتاز عالم میرے لیے ایک جلسہ میں تقریر کرنے آئے۔ وہ بڑے فصیح البیان مقرر تھے اور انہوں نے پاکستان کی خرابیاں طرح طرح سے ثابت کیں' اور کانگریس کی تائید کی' مگر فخریہ لہجہ میں یہ بھی کہا کہ ''میں کبھی کانگریس کا چار آنے کا ممبر نہیں بنا''

مولانا حفظ الرحمٰن کی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانان ہند کی ایک کافی آبادی کو اپنی تبلیغ اور اپنے عمل سے اس تنگ نظری سے باہر نکالا اور ان میں ذوق یقین اور جوش عمل پیدا کیا' انہوں نے ایک ماہر فن استاد کی طرح قوم مسلم کو سکھایا کہ وہ غوغائے عالم میں حصہ لے اور ہندوستان کے ایک بسنے والے کی حیثیت سے شہریت کے تمام حقوق کا مطالبہ

کرے۔ اس کے حصول کے لیے جدو جہد کرے اور پورے انشراحِ قلب سے دوسری قوموں اور دوسرے مذہب والوں کے ساتھ دوش بدوش ملکی ترقی میں سعی وکوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے۔ جمعیۃ العلماء اور بہت سی اور نیشنلسٹ جماعتوں کا بلاشبہ یہی نظریہ تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن اس میں منفرد نہ تھے وہ تو وہی بات کہتے تھے جو ہر مکتبہ خیال کے پانچ سو سے زائد علماء متفقہ طور پر کہہ چکے تھے، جن کے تقدس اور جن کے علم وتحقیق کی مثالیں کم ہیں مگر مولانا حفظ الرحمٰن کی حیثیت ایک میر کارواں کی تھی، انہوں نے اس نظریہ کو جاندار بنایا اسے خلعت فاخرہ بخشا اور اپنے پختہ عقیدے، بے پناہ عزم، مسلسل عمل، جرأت وبیباکی، ایثار وقربانی اور بے مثال ذہن، اور باریک بینی سے اسے اجاگر کر دیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہی اس کے موجد تھے۔ لاکھوں انسان ان کے پیرو تھے اور ان کے ہر قول کو واجب التعمیل سمجھتے تھے، انہی میں یہ عاجز بھی تھا۔ میں اس پر فخر نہیں کرتا مگر میری عادت نکتہ چینی کی ہے اور میں نے آج تک کسی کی کورانہ تقلید نہیں کی۔ اگر مولانا حفظ الرحمٰن دن کو رات کہہ دیتے تو میں تسلیم کر لیتا کیونکہ مجھے ان کے سوچنے کے انداز اور ان کی دیدہ وری پر پورا بھروسا تھا۔

ملتِ اسلامیہ ہند کی خدمت:

اس عوامی نظریے کے ساتھ انہوں نے ملت اسلامیہ ہند کی جو گراں بہا اور ان مٹ خدمات انجام دیں وہ تاریخ میں زریں حروف سے لکھی جائیں گے آئندہ کا مؤرخ جب اس زمانے کے حالات قلم بند کرے گا تو انہیں یقیناً نجات دہندہ کا لقب دے گا۔ ۱۹۴۷ء کی آزادی کی برکتوں کے ساتھ پاکستان کے قیام کے ردعمل کے طور پر نفرت اور تنگ نظری کی جو فضا پیدا ہوئی، وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ ہر نیشنلسٹ مسلمان کا یہ خیال تھا کہ اس فضا کی بالواسطہ ذمہ داری مسلم لیگ پر ہے۔ یہ خیال صحیح ہو یا غلط اس سے یہاں بحث نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ مولانا کا نظریہ بھی یہی تھا۔ وہ مسلم لیگ سے بے پناہ جرأت ودلیری کے ساتھ لڑے تھے اور ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ان لوگوں کے ساتھ محبت اور بھائی چارے کا رشتہ قائم کرنا بہت ہی دشوار تھا۔ لیکن اس عظیم انسان کے لیے یہ بات جو ہم سب لوگوں کے لیے بڑی مشکل تھی، ایسی آسان نکلی کہ گویا اس میں کوئی بات ہی نہ تھی وہ ہر مسلم لیگی کے لیے پشت پناہ تھے اور پنجاب سے مدراس اور کلکتہ سے پونا تک دورہ کر کے چیختے تھے کہ مسلمان سے وفاداری کا مطالبہ غلط

ہے وہ ملک و وطن کا وفادار ہے۔ کریم النفسی اور عالی ظرفی کی ایسی نادر مثال شاید ہی مل سکے۔ پھر ان لوگوں سے جو وفاداری کا مطالبہ کرتے تھے' مولانا بجلی کی کڑک دار آواز سے خطاب کرتے تھے' مجھے وہ منظر کبھی بھول نہیں سکتا' جب مسلمانان ہند کی کانفرنس (دسمبر ۱۹۴۷ء) لکھنو میں منعقد ہوئی۔ اس وقت وفاداری کا مطالبہ اپنے عروج پر تھا۔ تمام ہندوستان کا مسلمان یہاں جمع تھا۔ امام الہند مولانا آزاد صدر تھے۔ اس میں مولانا حفظ الرحمٰن نے ایک یادگار تقریر کی تھی' اب تک جب میں اس تقریر کو سوچتا ہوں تو میرے کانوں میں بجلیاں کڑکتی اور توپیں گرجتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ انہوں نے جو الفاظ کہے تھے ان کا مفہوم میں ذیل میں درج کرتا ہوں:

''ہم کسی جماعت یا پارٹی کے وفادار نہیں ہیں ہم صرف ملک اور وطن کے وفادار ہیں' اگر کوئی جماعت' پارٹی یا حکومت ہم سے وفاداری کا مطالبہ کرتی ہے تو ہم اسے بتا دینا چاہتے ہیں کہ اگر وہ جماعت یا پارٹی یا حکومت غلط راستوں پر جائے تو ہمارا کام اس کو سیدھا کرنا یا الٹ دینا ہے' جو افراد یا جماعتیں ہم سے وفاداری کا مطالبہ کرتی ہیں' ہم ان سے ملک کی وفاواری کا مطالبہ کرتے ہیں وہ جو لوگ فرقہ پرستی' تنگ نظری یا تعصب پیدا کرتے ہیں وہ ملک کے غدار اور وطن کے دشمن ہیں۔ ان کو کسی دوسرے سے وفاداری کے مطالبہ کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ خود اپنی وفاداری کا امتحان دیں۔''

میں نے دیکھا کہ ہر صوبہ کا مسلمان جو پژمردہ' مایوس' خوف زدہ اور مضمحل تھا ایک دم بشاش ہو گیا اور گردن اٹھا کر سینہ تان کر چلنے لگا۔ یہ ایک مثال نہ صرف ان کی جرأت و دلیری اور وطن دوستی کی ہے' کیوں کہ انتہائی درجے تک محبت وطن ہوئے بغیر کوئی شخص اس طرح کی باتیں کہنے کی ہمت ہی نہیں کرسکتا' بلکہ یہ ان کی بے مثال ذہانت کو بھی ظاہر کرتی ہے یہی ان کی نکتہ بینی اور صحیح الفکری تھی جو انہیں اپنے عصر کے لوگوں پر ممتاز کرتی تھی۔ میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ نہ صرف علما بلکہ بڑے بڑے انگریزی داں وکیل ماہر سیاست ملکی امور میں ان کے سامنے طفل مکتب نظر آتے تھے۔ چنانچہ آج مولانا کی یہ تقریر ایک اصول مسلمہ بنی ہوئی ہے اور اس نے بے شمار پریشاں دماغیوں کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ہندوستان کا کوئی گوشہ کوئی گاؤں ایسا نہیں تھا' جہاں سے ان کے پاس فریاد نہ جاتی ہو اور جہاں وہ خود اس فریاد پہ دوڑ کر نہ پہونچتے ہوں یا کسی کو بھیج کر یا مقامی اشخاص کو لکھ کر اس پر پوری توجہ نہ صرف کرتے ہوں۔ اس میں وہ اپنے

عقیدے پر بھی اصرار نہ کرتے تھے۔ اگر اجمیر شریف اور خواجہ بختیار کا کیؒ کے عرس بند کیے جاتے تھے تو یہ مولانا حفظ الرحمٰن کی ذات تھی کہ اس کو کھلوانے کے لیے مجاہدہ کرتی تھی۔ چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی ان کی توجہ کا مرکز بنتی تھیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ سارے ہندوستان کا مسلمان انہیں ملجاد ماویٰ سمجھنے لگا تھا۔ ان کے بارے میں امیر مینائی کا یہ شعر پورے طور پر موزوں ہے:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

۱۹۵۰ء' ۱۹۵۱ء کے ہنگامہ خیز زمانے میں وہ یوم النبیؐ کمیٹی بستی کی درخواست پر ۱۲/ربیع الاول کو تقریر سیرت کرنے آئے اور میرے مہمان ہوئے۔ میں نے کسی کی دعوت نہیں کی تھی مگر ۵۰۔۶۰ آدمیوں کا کھانا پکوایا تھا' کیونکہ میں جانتا تھا کہ ان کا نام سن کر قرب و جوار کے مواضعات کے مقامی مسلم کارکن دوڑ پڑیں گے' چنانچہ یہی ہوا گونڈہ' فیض آباد' بہرائچ' گورکھ پور' دیوریا' غازی پور' بلیا' سلطان پور وغیرہ سے لوگ اپنی شکائتیں لے کر آئے اور اپنی اپنی کہانیاں بیان کرتے تھے۔ مولانا بڑے ہی صبر و سکون سے سب کی باتیں سنتے تھے اور جواب دیتے تھے۔ جس چیز نے سب سے زیادہ مجھ کو متاثر کیا وہ مولانا کا اطمینان اور سکون قلب تھا۔ وہ مطمئن تھے کہ فرقہ واریت دم توڑ کر رہے گی ان کا خیال تھا کہ آدھی لڑائی جیتی جا چکی ہے اور آدھی صرف باقی ہے جو جلد جیت لی جائے گی۔ اس کے علاوہ وہ ہندو فرقہ واریت سے اسی طرح لڑ رہے تھے جس طرح وہ مسلم فرقہ واریت سے لڑ چکے تھے' کبھی میں نے ان کے اندر نفرت یا تلخی نہیں پائی اور نہ مایوسی ان کے قریب آئی۔ ان کے نزدیک یہ کام بھی حق و صداقت' ملکی و وطنی سالمیت کی گراں بہا خدمات تھے۔

دستور ہند:

جو مسلمان پاکستان چلے گئے ان کی متروکہ جائداد' گاؤں گاؤں میں قبرستان کے کھودے جانے کے قضیے' مسجدوں کی تعمیر میں رکاوٹیں بلوے اور فسادات اور اس سلسلے میں حکام کی بعض جگہ بے راہ رویاں یہ سب اور ان کے علاوہ بہت سے بڑے اور چھوٹے معاملات ہمہ وقت ان کے پیش نظر رہتے تھے۔ اس سلسلے کی داستان طویل ہے۔ مگر سب سے بڑا احسان جو انہوں نے ملت اسلامیہ پر کیا وہ دستور ہند کا موجودہ ڈھانچہ ہے۔ اس وقت مولانا دستور ساز اسمبلی

کے ممبر تھے اور کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ اقلیتوں کو جو حقوق دیئے گئے ہیں' ان کی ترتیب و تدوین میں مولانا حفظ الرحمٰن کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ آج یہی دستور کی دفعات ہیں' جو مسلمانوں کو ہندوستان میں سربلند رکھ سکتی ہیں اور اگر ان میں ان حقوق کے حاصل کرنے کی طاقت پیدا ہو جائے یعنی وہ احساس کمتری سے نکل آویں تو ان کا مستقبل تابناک ہو سکتا ہے۔ مولانا بار بار کہتے تھے مسلمانوں سے احساس کمتری مٹانا اس عصر کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ ایک مرتبہ مولانا نے مجھے ایک خط لکھا اور ایک خاص قومی معاملے میں مجھ سے رائے طلب کی۔ میں نے جواب میں عرض کیا کہ میں تو آپ کا پرانا مقلد ہوں لیکن آپ رائے پوچھتے ہیں تو بہ تعمیل حکم عرض ہے کہ بات یوں ہے اس پر مولانا نے مجھے لکھا کہ آپ کے جواب سے طبیعت بہت خوش ہوئی' اگر اسی طرح مسلمان احساس کمتری کو اپنے دلوں سے نکال پھینکیں تو ہمارے کل معاملات آناً فاناً حل ہو سکتے ہیں۔ احساس کمتری کو مٹانا دستور کے دیئے ہوئے حقوق کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ اور عمل ہے دستور نے جو حقوق دیئے ہیں وہ ایسے جامع ہیں کہ ان کے بارے میں کوئی بھی آج تک اضافہ کی ہمت نہ کر سکا۔ جو لوگ حکومت الٰہیہ کا خواب دیکھتے ہیں اور ملک کی اس طرز حکومت کو نظام باطل کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ بھی دستور ہند کے ان دفعات کی داد و تحسین کرتے ہیں' جن میں مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے حقوق درج ہیں۔ مگر یہ حقوق بلا احساس کمتری کو دور کیے حاصل نہیں ہو سکتے ہیں۔ مولانا کا یہ زبردست مشن تھا کہ مسلمان احساس کمتری کو ترک کریں وہ فرمایا کرتے تھے کہ زمانہ حاضرہ کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ مسلمانوں سے احساس کمتری کو دور کیا جائے۔ یہ ان کے فکر کی گہرائی کی واضح مثال ہے۔

دینی تعلیمی تحریک:

مولانا حفظ الرحمٰن کو بجا طور پر دینی تعلیمی تحریک کا موجد و محرک قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کی دور رس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ مسلمان بچوں کو موجودہ ماحول میں دینی تعلیم دیئے بغیر آئندہ کی نسلوں کا مسلمان رہنا دشوار ہوگا وہ مسلمانوں کو اس سانچے میں جو دستور ہند کے ذریعے انہوں نے تیار کرایا تھا' پوری طرح فٹ کرنا چاہتے تھے۔ ان کی وطن دوستی اور ملک نوازی اسلام کے اصولوں سے کسی مصالحت پر مبنی نہ تھی' بلکہ ملک وطن تمام ہندوستان کی اقلیت و

اکثریت کی خدمات وہ صرف اسلام کے احکام کے ماتحت کرتے تھے۔ انہوں نے خوب سوچ سمجھ کر یہ رائے قائم کی تھی کہ ملک کی ترقی کے ساتھ مسلمانوں کی ترقی اور ملک کی تنزلی کے ساتھ مسلمانوں کا تنزل بھی وابستہ ہے۔ اور یہی امر حق ہے کہ ملک سے محبت اور دوستی میں کسی منافقت کو دخل نہ دیا جائے کیونکہ وہ کشتی جس میں ہندو' مسلمان' سکھ' عیسائی' پارسی سب سوار ہیں اگر ڈوبے گی تو سب ڈوب جائیں گے کوئی نہ بچے گا۔ مگر اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں کی مذہبی وثقافتی انفرادیت کو نہ صرف قائم رکھنا چاہتے تھے' بلکہ اسے اجاگر کرنے کے لیے بے چین رہتے تھے اس لیے بنیادی دینی تعلیم پر انہوں نے نہ صرف حد سے زیادہ زور دیا بلکہ بمبئی میں اس کے لیے ایک آل انڈیا مسلم کنونشن بھی کیا اور ایک آل انڈیا دینی تعلیمی بورڈ بھی بنایا جس کی شاخیں تمام صوبوں میں قائم کیں۔ مولانا ایک بہت معروف آدمی تھے مگر قوم کو انہوں نے ایک فکر دے دی۔ اور جہاں تک ہو سکا اس کے لیے کوشش اور جدوجہد بھی کی۔

جمعیۃ علماء ہند:

مولانا کو جمعیۃ علماء ہند سے بے پناہ محبت تھی' بلکہ ہم لوگ کبھی کبھی یہ محسوس کرتے تھے کہ اس میں ان کو غلو کا درجہ حاصل ہے۔ مجھے ایک مرتبہ انہوں نے لکھا کہ میں ان لوگوں کو بہت ناپسند کرتا ہوں جو میری تو تعریف کرتے ہیں اور جمعیۃ علماء ہند کی خدمت نہیں کرتے ہیں۔ میں جمعیۃ کا ایک خادم ہوں اور میں جو کچھ کر سکتا ہوں' یا کرتا ہوں وہ تنہا میرا کارنامہ نہیں میرے جملہ رفقا کی مشترکہ جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ ایک کل ہند جماعت بنانا یا بنی ہوئی جماعت کو قائم و برقرار رکھنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ تقسیم کے بعد ملک کے اندر ایک ایسا طبقہ پیدا ہو چکا تھا جو مسلمانوں کی ہر تنظیم کا مخالف تھا۔ جمعیۃ علمائے ہند کے شاندار ماضی کو نظر انداز کر کے وہ طبقہ اس کا بھی دشمن تھا کیوں کہ جمعیۃ اب مسلمانوں کی آواز تھی۔ جمعیۃ علماءِ ہند کو بڑے طوفانوں سے گزرنا پڑا' مگر مولانا حفظ الرحمٰن نے اس امانت کو جو انہیں اپنے بزرگوں سے ملی تھی بہت سنبھال کر رکھا۔ اور نہ صرف سنبھال کر رکھا بلکہ بہت ترقی دی۔ جمعیۃ کی یہ خوش قسمتی تھی کہ ان کو ایک ایسا قائد ملا تھا جس کا کوئی رقیب نہ تھا اور اگر کبھی اندرونی اختلافات رونما ہوئے جو ہر زندہ جماعت کے لیے لازمی ہیں تو ان کی بات کوئی ٹالنے والا نہ تھا وہ سب کو ایک دھاگے میں پروئے رہتے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کا ایک بڑا کارنامہ جمعیۃ علماء ہند کو اس مضبوطی استحکام اور

نظم کے ساتھ قائم رکھنا تھا۔ شاہ ایران‘ شاہ افغانستان‘ جمال عبدالناصر‘ صدر انڈونیشیا الغرض جو بھی مسلم حکمراں یا قائد دنیا کے کسی گوشے سے آتا تھا اسے مسلمانوں کا ایک نظام ملتا تھا اور ہندوستان کا مسلمان خواہ وہ جمعیۃ میں ہو یا نہ ہو یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوتا تھا کہ ہم بھی اس ملک میں بستے ہیں اور ہماری بھی آواز ہے۔ اور جب جب اندرون ملک میں ضرورت پڑتی تھی مسلمانوں کی ایک باضابطہ انجمن نمائندگی کے فرائض انجام دینے کے لیے تھی۔ میں اس موقع کو غنیمت تصور کرکے ''قومی آواز'' (لکھنو) کی اس اپیل کی تائید کرتا ہوں کہ مولانا حفظ الرحمٰن کی اس یادگار کو مسلمان مضبوط بنائیں کیونکہ مسلمانوں کا یہ واحد ادارہ ہے‘ جس کا ماضی تابناک اور جس کی حالیہ خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

انجمن ترقی اردو اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ:

مولانا انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی کورٹ کے بھی ممبر تھے اور شاذ و نادر ہی کسی خاص مجبوری کی بنا پر ان کے جلسوں میں شرکت ناغہ کرتے تھے۔ مولانا اردو کو ہندو اور مسلمانوں کا مشترکہ سرمایہ تسلیم کرتے تھے اور اس کا کل کام انجمن ترقی اردو کے ذریعے کرنے کے قائل تھے۔ اردو پر ان کے عظیم احسانات ہیں۔ اور شاید ہی ہندوستان میں کوئی دوسرا ایسا شخص ہو جو خدمت اردو میں ان کا ہم پلہ قرار دیا جاسکے۔ مولانا کو اردو سے اس درجہ شغف تھا کہ جب سہ لسانی فارمولے کی آڑ لے کر ریاست اتر پردیش میں اردو کو ختم کرنے کے منصوبے بننے لگے تو انہوں نے امریکہ کے بستر علالت سے جسے اب بستر مرگ ہی کہا جاسکتا ہے وزیر اعلیٰ شری سی۔ بی۔ گپتا کو ایک دردانگیز خط لکھا جس نے بھی اس خط کو پڑھا ہوگا اس کی آنکھ ضرور نم ہوگئی ہوگی۔ مولانا کے اس خط کا عالم گیر اثر ہوا اور پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کا جواب دیا اور مولانا کو اطمینان دلایا۔ مولانا اپنے متوازن اور مدبرانہ مشوروں کے لیے ہر نازک موقع پر تلاش کیے جاتے تھے اور رہبران تحریک اردو کو اپنی رائے پر اس وقت تک بھروسا نہیں ہوتا تھا‘ جب تک کہ مولانا اس پر صادنہ کردیں۔ یہی حال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا تھا۔

ان تمام مختلف مقامات پر کام کرتے ہوئے مولانا کی شخصیت خاص طور پر اجاگر رہتی تھی۔ میں نے ہر دمہ کو ان کا احترام کرتے دیکھا۔ یہ احترام ان کی فطری ذہانت وفراست اور ان تمام معاملات میں جن کے لیے علوم جدیدہ کی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے‘ ان کی وسیع

معلومات‘ ان کی بے پناہ جرأت و ہمت‘ ان کا خلوص‘ ان کا جذبہ ٔقربانی اور عدیم المثال حب الوطنی کی بنا پر تھا۔ وہ ایک جامع و ہمہ گیر ہستی تھے اور بلا وزن کیے اور تولے ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالتے تھے ان کے نزدیک اردو اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور اس طرح کی دوسری ضروری خدمات ملک و وطن کی خدمات تھیں جن کے متعلق تنگ نظرانہ رویہ ملک کو تباہی و بربادی کی طرف لے جانے والا تھا۔ وہ جس محفل میں بیٹھ جاتے تھے منفرد اور یگانۂ روزگار نظر آتے تھے۔ اور اسی لیے علما اور مغربی تعلیم یافتہ سب کی گردنیں ان کے آگے جھکتی تھیں۔

خصائص ذاتی:

مولانا کے خصائص ذاتی کا تذکرہ اسی طرح دشوار ہے‘ جس طرح ان کی عظیم شخصیت اور ان کی خدمات ملکی و ملی کو بیان کرنا مشکل ہے۔ وہ بہت ہی سادہ مزاج اور عوامی آدمی تھے۔ وہ دیکھیے جمعیۃ علماء ہند کے دفتر کے سائبان میں زمین پر ایک فرش بچھا ہے اس پر مولانا بیٹھے ہیں اور شہر اور بیرون شہر کے لوگ یکے بعد دیگرے اپنی حاجتیں لیے چلے آ رہے ہیں۔ نہ کوئی دربان ہے اور نہ کسی سے یہ مطالبہ ہے کہ آپ کون ہیں کس غرض سے آئے ہیں۔ ہندو اور مسلمان دوست اور دشمن جمعیۃ علمائی وغیر جمعیۃ علمائی کانگریسی وغیر کانگریسی کی کوئی شرط نہیں ہے۔ نہ کبھی تھکتے ہیں اور نہ کبھی منہ بناتے ہیں‘ خندہ پیشانی سے سب کی باتیں سنتے اور سب کو مشورہ اور سب کی امداد کے لیے آمادہ ہیں کسی کو کسی یونیورسٹی میں داخلہ چاہیے کوئی پاسپورٹ مانگ رہا ہے‘ کسی کی متروکہ جائیداد کا جھگڑا ہے کسی کو نوکری چاہیے الغرض تمام متنوع کام جو انسان کو پیش آ سکتے ہیں اس دربار قلندرانہ میں پیش ہو کر انجام کو پہونچتے ہیں۔ کہیں خط لکھ رہے ہیں‘ کہیں ٹیلیفون ہو رہا ہے اور کہیں بہ نفس‘ نفیس جا رہے ہیں۔ جلسوں میں جاتے تھے تو کوئی امتیازی شکل نہیں اختیار کرتے تھے۔ مسجد میں جاتے تھے تو یہ صورت تھی۔

در مسجد! گرا دی چناں رو کہ ترا
در پیش نخوا ہندو امامت نہ کنند

تواضع اور مہمان نوازی حد درجے تھی‘ جب صدر جمہوریہ سے اردو کا وفد مل رہا تھا تو میں بھی اس کا ایک رکن تھا مولانا نے مجھ سے کہا کہ تم میرے ہی پاس ٹھہرنا اگرچہ نئی دہلی دور ہے مگر میں اس کو قریب کر دوں گا۔ ایک مرتبہ اور میں ان کا مہمان ہوا۔ شام کو میں حافظ محمد ابراہیم

صاحب کے ہاں گیا اور رات میں رہ گیا۔ صبح میں ناشتہ کر رہا تھا کہ وہ آ گئے مجھے دیکھ کر فرمایا غریب کے گھر رہا نہیں جاتا منسٹر کے ہاں چلے آئے۔ میں نے حافظ صاحب کی کوٹھی کے لان کی طرف اشارہ کیا اور غرض کیا کہ جمعیۃ کے دفتر میں گرمی بہت تھی۔ فرمانے لگے کہ ہاں جمعیۃ کے دفتر کی توسیع کر رہا ہوں' ان شاء اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کی یہ تکلیف جلد دور ہو جائے گی۔ کاش کہ قوم مولانا کی اس تمنا کو پوری کرنے کی جانب جلد توجہ کرے۔ مولانا میں سب سے زیادہ نمایاں اور تعجب خیز چیز ان کا کلچر تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک بڑے کلچرڈ آدمی تھے۔ کلچرڈ آدمی کی تعریف پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ کی ہے کہ جو دوسروں کے جذبات و خیالات کو سمجھ سکے۔ ان کے برتاؤ میں ہر شخص کے ساتھ شائستگی' ستھرا پن اور ملائمت کے وہ عنصر غالب رہتے تھے جو کم یاب ہیں وہ کسی سے نفرت کرنا اور کسی سے خواہ وہ کوئی ہو بہرے پن کا برتاؤ کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ یہ وہ بات ہے جو مغربی تعلیم والے اپنے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں۔ مگر وہ سب میں ممتاز تھے جب اردو کا وفد صدر جمہوریہ سے ملنے والا تھا تو وہاں کے آداب و قوانین مقررہ کے ماتحت باریابی حاصل کرنے کا ایک سوال تھا مولانا نے فوراً کہا کہ میں یہ سب کام کر لوں گا۔ چنانچہ ہم لوگوں کو کچھ خبر نہ ہوئی' مولانا نے موٹریں اکٹھا کر دیں اور نہایت تیزی سے یہ بتلاتے گئے کہ کون کہاں بیٹھے اور سب سے آگے اپنی موٹر کر دی اور سب سیدھے صدر جمہوریہ تک پہنچ گئے۔ اسی طرح وہاں سے واپسی کے بعد حیات اللہ انصاری کو یہ پریشانی ہوئی کہ کسی طرح فوراً ایک پریس کانفرنس ہو جائے جس کو وفد کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین خطاب کریں' مولانا نے نہایت اطمینان سے کہا کہ میں اس کا انتظام کر دوں گا۔ پھر ہر چھوٹے سے چھوٹا انتظام ہو گیا اور مولانا کی شخصیت کے اثر سے بہت سے اخبارات کے نمائندے آ گئے۔ مسلم لیگ سے آویزش کے دوران میں کچھ لوگوں نے نیشنلسٹ مسلمانوں کی ایک علیحدہ پارٹی بنانے کا ارادہ کیا۔ لکھنو میں جمعیۃ علما کا اجلاس ہو رہا تھا اس وقت جمعیۃ علما الیکشن لڑتی تھی اور امیدوار کھڑا کرتی تھی۔ نیشنلسٹ مسلمانوں کی جماعت بنتی تو جمعیۃ کی رقیب ہوتی مگر جب مولانا سے یہ بات کہی گئی تو انہوں نے فوراً منظور کر لیا کہ گنگا پرشاد میموریل ہال میں جلسہ کرا دیا' خرچ کل جمعیۃ سے مولانا نے دلایا اور خود شرکت بھی کی' مگر انتظام سب نیشنلسٹ مسلمانوں کے ہاتھ میں رہا۔ ایسی فراغ دلی اور کشادہ قلبی کی مثالیں کہاں ملتی ہیں؟ اور جب یہ معلوم ہو گا کہ کن حالات میں انہوں نے جمعیۃ کے صرفہ سے یہ جلسہ کرایا تھا اور زیادہ حیرت ہو گی ایک نیشنلسٹ مسلمان

صاحب نے کہا کہ ہم کانگریس میں جاتے ہیں تو وہاں لوہے کی دیوار کے اندر گھس نہیں پاتے ہیں۔ آپ کے ہاں آتے ہیں تو آپ ہمہ وقت مذہب کی بات کرتے ہیں۔ اس لیے ہم اپنی الگ جماعت چاہتے ہیں' مولانا نے جلسہ کو منظور کرتے ہوئے جو جواب دیا تھا وہ اب تک میرے دل پر نقش ہے۔

''فرمایا! آپ جلسہ ضرور کریں' ہال کا کرایہ ہم دیں گے۔ فرش فروش وغیرہ ٹھیک کرا دیں گے' اور آپ کی ہر مدد کر دیں گے مگر جلسہ کی باگ ڈور آپ اپنے ہاتھ میں رکھیں۔ رہی مذہب والی بات تو وہ تو ہم آپ کو ضرور سنائیں گے' آپ یہاں نہیں سنیں گے تو گھر پر آپ کو سنائیں گے آپ ہمیں دھتکار دیں گے تو ہم چلے آئیں گے' مگر پھر جائیں گے۔ غرضیکہ ہم آپ سے کہتے رہیں گے اور تھکیں گے نہیں۔''

یہ تھا مولانا حفظ الرحمٰن کا ضمیر!

سارا ہندوستان بلا قید مذہب وملت ان کا شیدائی تھا۔ اور تمام ہندوستان کی وہ مدد کرتے تھے۔ فیس کی معافی سے لے کر بڑی بڑی نوکریاں دلوانا اور ویزا حاصل کرنا وغیرہ ہزاروں کام روزمرہ لوگ ان کے پاس لے کر آتے تھے اور ان کا ایک پورا محکمہ ان خدمات کے لیے وقف تھا۔ مولانا کے چہرے پر کسی کی امداد کرنے میں کسی تھکن محسوس نہیں کی بلکہ انتہائی ذوق وشوق سے وہ ہر حاجت مند کی حاجت روائی کرتے تھے۔ اس میں مخالف وموافق کی بھی کوئی قید نہ تھی۔

مولانا جمعیۃ علماء ہند کے سنوارنے والوں میں ہیں۔ ان کو جمعیۃ سے بے انتہا شغف تھا اور وہ جمعیۃ کو مسلمانان ہند کی خدمت کرنے کے قابل بنانے میں ہمیشہ مصروف رہتے تھے۔ اور جمعیۃ نے اس دور بلا میں جو شاندار کام انجام دیئے ہیں ان میں مولانا کی شخصیت ان کی خدمت اور لگن کا بڑا ہاتھ تھا

ہر نازک موقع پر وہ شیر کی طرح گرجتے تھے' مگر اس گرج میں نفرت اور علاحدگی پسندی نے کبھی کارفرمائی نہیں کی' افسوس! اب یہ گرج سنائی نہیں دے گی۔ اب پارلیمنٹ کا ایوان ہو یا کانگریس کا اجلاس' مسلمانوں کا پلیٹ فارم ہو یا مشترکہ جلسہ' حق گوئی کی وہ بے باک آواز کون اٹھائے گا۔ اب کون امریکہ کے بستر مرگ سے ''اردو'' کے لیے شری سی بی' گپتا کو چھٹی لکھے گا

جس کا جواب پنڈت جواہر لال نہرو دیں گے۔

اب ہندوستان کے ان چار کروڑ مسلمانوں کی رہنمائی اور نگہبانی کے لیے فرائض کون انجام دے گا۔ افسوس! کوئی جانشین نہیں چھوڑا۔ آفتاب غروب ہو گیا اور تاریکی پھیل گئی ہے۔ اس اندھیرے میں اجالا کون کرے گا۔

مولانا حفظ الرحمٰن کا ماتم ایک عصر کا ماتم ہے' اس ایسے لیڈر کا ماتم ہے جو صحیح الخیالی' بے تعصبی' خوش فکری اور اسلام نوازی و ملک دوستی کے امتزاج کے لیے یقینِ محکم و عملِ پیہم کا نمونہ تھا۔

مولانا حفظ الرحمٰن نہ اپنی تعریف سے خوش ہوتے تھے اور نہ اپنی مذمت سے ناراض۔ وہ کل خدمات فرض سمجھ کر تمام عمر انجام دیتے رہے' نہ ستائش کی پروا کی اور نہ کبھی صلے کی تمنا کی۔ وہ انبیائے کرام کے اس مسلک پر تھے کہ "ان اجری الا علیٰ اللہ" (میں اللہ کے سوا اور کسی سے کوئی اجر نہیں مانگتا) وہ ایک عظیم انسان' ایک محب وطن اور ایک کارکن تھے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ اللہ کے فرمان بردار بندے تھے' جو کچھ کرتے تھے اللہ کی رضا جوئی کے لیے کرتے تھے انہوں نے دنیا کو دکھلا دیا کہ ایک سچے مسلمان کا کردار کیسا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی روح کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور ان کے مدارج بلند کرے۔ آمین!

مجاہدِ ملت کا مشن

ظہیرالدین صدیقی ایم' اے۔ایل' ایل' بی (علیگ)

ظہیرالدین صدیقی ایم' اے (علیگ) جن کا مقالہ پیش نظر ہے۔ایک ہونہار اہل قلم ہیں۔ان کو اپنے دور طالب علمی ہی سے جمعیۃ علماء اور مجاہد ملت کے ساتھ مخلصانہ تعلق رہا ہے۔ ۵۷ء' ۵۸ء میں آپ کو بطور سکریٹری حضرت مولانا مرحوم سے بہت قریب رہنے کا موقع بھی ملا۔مسلم کنونشن کے شعبہ نشرو اشاعت کی پوری ذمہ داری حضرت مجاہد ملتؒ نے آپ ہی کے سپرد رکھی۔ اپنے اس قریبی تعلق اور وابستگی کے ساتھ یہ مختصر مقالہ آپ نے تحریر کیا ہے جوشکریہ کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔ (انیس الحسن)

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی رحلت سے مسلمانان ہند ایک عظیم مجاہد اور پروقار رہنما سے محروم ہو گئے ہیں۔مولانا مرحوم جس شدید بے چین روح کے ساتھ زندگی بھر مسلمانوں کی بہبود کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔اس نے ان کی شخصیت کو حسن عمل کا ایک ہمہ گیر ادارہ بنا دیا ہے۔ ہمارے ملی رہنماؤں کی تاریخ میں اتنی فعال' متحرک اور عملی صداقت رکھنے والی شخصیتیں بہت کم نظر آتی ہیں۔ان کی بے پناہ جرأت' ایمان کی حرارت' جذبے کی توانائی' فکر کی پختگی اور ان کے عظیم کارناموں نے انہیں ملی تاریخ کا ایک شاندار کردار بنا دیا ہے۔ مسلمانوں کو سربلند کرنے کی ان کے دل میں ایک سرگرم تڑپ تھی جس نے ان کو شب و روز متحرک رکھا۔مسلمانوں سے متعلق کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس پر انہوں نے بے خوفی کے ساتھ آواز بلند نہ کی۔ پارلیمنٹ ہاؤس ہو یا پبلک پلیٹ فارم' کانگریس میٹنگیں ہوں یا کلچرل اداروں کی کانفرنسیں' ایوان ہائے وزارت ہوں یا تشدد کرنے والے گروہ' جبل پور ہو یا میرٹھ' دارالعلوم دیوبند ہو یا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ' مجلس اوقاف ہو یا انجمن ترقی اردو ہند' سیاسی کانفرنسیں ہوں یا سیرت کے اجلاس' طبیعت خواہ مضمحل ہو یا ناساز' وہ ہر جگہ ممتاز نظر آئے۔حقیقت یہ ہے کہ

مولاناؒ ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کی آواز تھے‘ ان کا دماغ تھے‘ ان کا سہارا تھے اور ان کی امید تھے۔ وہ اٹھے تو ایسا لگا گویا ان کی امیدیں ٹوٹ گئیں‘ ان کی ڈھارس جاتی رہی۔ مجاہد ملت کی ایک عہد آفریں شخصیت تھی۔ ان کی زندگی تعمیر مستقبل کے فلسفۂ عمل کی تفسیر تھی۔ ان کی ذات اجتماعی کیریکٹر کا شعوری سرچشمہ تھی‘ وہ جید عالم دین تھے‘ ممتاز سیاسی لیڈر تھے اور سحرانگیز خطیب وادیب بھی‘ لیکن میرے نزدیک ان کی بڑائی کا ایک اور راز بھی ہے اور وہ یہ کہ وہ ایک دردمند انسان تھے۔ گوشت اور ہڈی کے اصول اور ایمان کے خلوص اور محبت کے‘ شفقت اور مروت کے‘ شرافت اور اخلاق کے‘ ایک نظریے اور مقصد کے ظرف کی بلندی اس سے نمایاں تھی کہ کبھی انہوں نے اپنی شخصیت پر خول نہیں چڑھائے۔ ظاہری حسن سے لے کر باطنی جوہر تک‘ گھر میں‘ مجلس میں‘ دفتر میں‘ ریلوے اسٹیشن پر‘ گاڑی کے کسی ڈبے میں یا جلسہ عام میں‘ وہی یکسانیت و یک آہنگی نہ تصنع اور تکلف کے پردے ہیں اور نہ تضاد و تناقض‘ مسکراتے تو لبوں پر کشادہ اور بلند پیشانی پر رقصاں ذہانت سایہ فگن ہوتی‘ غصہ فرماتے تو آنکھوں میں دلی شفقت کی جھلک صاف نظر آتی۔

جمال و جلال دونوں ان کی انسانیت کے ہم دوش و رفیق‘ عفو و درگذر ان کا شیوہ‘ ان کی محفل میں زاہد‘ عابد‘ شاعر‘ ادیب‘ لیڈر‘ امیر‘ غریب سب ہی موجود رہتے‘ زندگی کے ہر مسئلہ پر گفتگو ہوتی اور مولانا ایک ایک فرد کو پوری پوری اہمیت دیتے‘ دسترخوان پر نواب صاحب کیساتھ مولوی حمداللہ جان کو بھی اصرار و محبت کے ساتھ بٹھاتے اور عوام کے روزمرہ کے مسائل پر دیوتائی ذہن کے ساتھ نہیں بلکہ ایک انسان کی حیثیت سے سوچتے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے ابھی تک اتنا بڑا آدمی نہیں دیکھا جو ایک ہی وقت میں اتنا عظیم سیاسی لیڈر‘ ممتاز عالم دین اور بے پناہ صلاحیت اور طاقت والا ہو اور جس نے ہمارے لیے ایک مشن بھی چھوڑا ہو۔

مجاہدِ ملتؒ نے جمعیۃ علماء ہند کو ایک متحرک اور فعال جماعت کی شکل میں ہمارے درمیان چھوڑا ہے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی‘ اپنی بھرپور صلاحیتیں اور تمام تر فکری اور عملی قوتیں جمعیۃ علماء کے لیے وقف کر دیں اور جمعیۃ علماء ہند کی وسعت فکر و عمل کی سرگرم ترین علامت (Symbol) بن کر ہندوستان کے افق پر ابھرے جمعیۃ سے ان کو تقویت ملتی تھی اور جمعیۃ کو ان سے فکر و عمل کا فیضان (Inspiration) ملتا تھا۔ مولانا مرحوم کی شخصی اور عملی صلاحیتیں بہت وسیع تھیں‘ اسی نسبت سے انہوں نے جمعیۃ علماء کے جماعتی ڈھانچے اور میدانِ عمل کو بھی

وسیع کیا جس طرح وہ عملی سرگرمیوں کے لحاظ سے صرف ایک طبقہ (Section) کے ہو کر نہیں رہے۔ اسی طرح جماعتی سرگرمیوں کا رخ بھی انہوں نے ہر جانب موڑ دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ رہنماؤں کے شخصی عمل کے ان کی جماعت کے ساتھ ربط کی تاریخ میں یہ روشن ترین باب ہے۔ جس نے جمعیۃ علما کو آج تمام مسلمانوں کی امنگوں اور عزائم کا مرکز بنا دیا ہے۔ اس میں ہر مکتب خیال اور عقائد کے حضرات شامل ہیں سنی بھی ہیں اور شیعہ بھی' دیوبندی بھی ہیں اور غیر دیو بندی بھی' اہل حدیث بھی ہیں اور سجادہ نشین بھی' جید علماء بھی ہیں اور صوفی بھی' جمعیۃ علما کی اسی خصوصیت نے اس کو ہندی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بنا دیا ہے۔ ہمیں مجاہد ملت کے بعد جمعیۃ علما کی اس خصوصیت کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہیے اور مجاہد ملت نے فکر و عمل کی جس نہج پر جمعیۃ کو چھوڑا ہے اس کو نہ صرف قائم رکھنا ہے بلکہ انہی خطوط کو بنیاد بنا کر تیزی کے ساتھ اسے آگے بھی بڑھانا ہے۔ جوش عمل اور فکر و نظر کو اسی وسعت کی باقی رکھنا ہے اور اس طرح عوام کے ساتھ اپنے رابطہ و تعلق کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنا ہے۔

وقت کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ جمعیۃ علماء میں مسلمانوں کی نئی نسل کے لیے بھی جگہ نکالی جائے۔ ہندوستان کے مسلم نوجوان ذہنی طور پر مایوسی' انتشار اور ہیجان کا شکار ہیں۔ نہ ان میں ملی مسائل پر غور و فکر کرنے کا رجحان ہے اور نہ اجتماعی فرائض سے آگاہی' حتیٰ کہ تعلیم یافتہ نوجوان بھی مذہبی زندگی اور دینی عمل سے بے نیاز ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر یہ طبقہ ہماری اجتماعی زندگی سے اسی رفتار سے بے تعلق ہوتا گیا تو ظاہر ہے کہ آنے والی نسلوں کے مستقبل کا کون ضامن ہوگا۔ ضرورت ہے کہ جمعیۃ علماء اور اس کے رہنما زندگی اور زمانے کے نئے تقاضوں اور رجحانات کا گہرا مطالعہ فرمائیں اور جدید ماحول کے مطالبات کی روشنی میں ایسا طریقہ کار مرتب فرمائیں کہ ہماری جماعت کا نئی نسل کے ساتھ ذہنی ربط قائم ہو سکے۔ عمل کی قوت (Force of action) وسیع النظری اور اخلاق و ایثار کو بنیاد بنا کر ہم نوجوانوں کی دینی حس کی بیدار کرنے میں کامیاب ہوسکیں گے اور ان کی ذہنی تعمیر و تربیت کر سکیں گے اور ان میں حسن عمل کی پر جوش روح ابھار سکیں گے۔ یہ سب اسی وقت ہوسکتا ہے جب معاشرے کے نئے تقاضوں' غور و فکر کے نئے خطوط' جدو جہد اور عمل کی نئی بنیادوں اور موجودہ جماعتی تنظیموں کے نفسیاتی خدوخال کا حقیقت پسندانہ مطالعہ کیا جائے' ایسا نہیں ہے کہ پوری قوم مردہ ہو چکی ہے یا اس میں سربلند ہونے کی تڑپ فنا ہو چکی ہے یا تمام اچھائیاں ایک ہی جگہ جمع اور محدود ہو

کر رہ گئی ہیں یا آج اہل بصیرت زعماء کی قلت ہے۔ اگر آج کمی ہے تو صرف ایسی اسپرٹ کی جو ملت کے منتشر اور بکھرے ہوئے جوہر کو ایک جگہ مجتمع کر سکے۔ مجاہد ملت نے یہ بھی کر دکھایا اور پوری دنیا نے دیکھا کہ ہندوستان میں آج بھی کتنے مسلمان دانشور ہیں، اہل فکر ہیں، اہل دل ہیں۔ مسلم کنونشن مولانا حفظ الرحمٰنؒ اور جمعیۃ علماء کا تاریخ ساز اور عظیم کارنامہ ہے۔ جس سے مسلمانان ہند کے لیے عزم وعمل کی موثر راہیں متعین ہوئی ہیں۔ وہ مسلمانان ہند جو آگ اور خون کے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے بعد آزاد ہندوستان میں نئی حیثیت لے کر ابھرے۔ نئے ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کی ابتدا لکھنو میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس سے ہوئی جو امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کا بہت بڑا مدبرانہ کارنامہ تھا جس میں فرقہ پرستی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مجاہد ملتؒ ایک ناقابل تسخیر طاقت بن کر ہندو اور مسلم فرقہ پرستی سے ٹکراتے رہے۔ اس کے بعد مسلم کنونشن نے مسلمانوں کے روشن مستقبل کی تعمیر کی نشاندہی کی۔ مجاہد ملتؒ نے کنونشن کے داعی کی حیثیت سے جمہوریہ ہند میں مسلمانوں کے لیے طریق کار متعین کیا اور ثابت کر دیا کہ سیکولر سیاست مذہب کی نفی نہیں کرتی۔ افسوس کہ مولانا اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مگر وہ مسلمانوں کی تعمیر اور مستقبل کا مشن جمعیۃ علما کے سپرد کر گئے۔ ان کا صحیح جانشین پیدا ہونا ممکن نہیں۔ اس لیے اب جمعیۃ علماء اور اس کے ارکان کو اجتماعی فکر اور اجتماعی عمل سے مجاہد ملت کے مشن کو پورا کرنا چاہیے۔ جمعیۃ علما کو مولانا حفظ الرحمٰن نے بے پناہ ذمہ داریاں سپرد کی ہیں۔ وہیں ہندی مسلمانوں پر بھی فرض عائد کیا ہے کہ جمعیۃ علما کے ساتھ اپنی وابستگی کو مضبوط کریں اور اس کی سرگرمیوں کا ایک طاقتور جز بنیں! یہی مجاہد ملتؒ کا مشن تھا اور یہی قفس عنصری سے پرواز کرتی ہوئی ان کی مقدس روح کا آخری پیغام:

واعتصموا بحبل الله جميعاً

اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو۔

ایک سچا مسلمان اور محبِّ وطن

پنڈت سندر لال

سب مذہبوں نے اور خصوصاً اسلام نے آدمی کے دو طرح کے فرائض صاف صاف بتائے ہیں۔ ایک وہ فرائض جو ہر انسان کے اپنے خالق اور پروردگار کی طرف ہیں اور دوسرے وہ جو ہر انسان کے باقی تمام انسانوں اور تمام مخلوق کی طرف ہیں سورہ ٔنساء میں اللہ نے کہا ہے۔

''اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک مت کرو اور نیکی کرو اپنے والدین کے ساتھ، اپنے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ یتیموں کے ساتھ، مسکینوں یعنی ضرورت مندوں کے ساتھ، اپنے ان پڑوسیوں کے ساتھ جنہیں تم جانتے ہو۔ اور ان پڑوسیوں کے ساتھ جنہیں تم نہیں جانتے یا جو دور کے ہیں اور اپنے پاس کے ساتھیوں کے ساتھ اور راہ چلتوں کے ساتھ جو تمہیں مل جادیں اور ان سب کے ساتھ بھی جن پر تمہارا اختیار ہے۔ کیوں کہ اللہ ان لوگوں سے پیار نہیں کرتا جو دوسرے کے ساتھ برا برتاؤ کرتے ہیں یا جو گھمنڈ کرتے ہیں۔''(۱)

اوپر کی آیت میں ہمارے دونوں طرح کے فرائض کا صاف صاف ذکر کیا گیا ہے اور دوسرے انسانوں کی طرف ہمارے فرائض میں مذہب یا ملت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔

یہ دونوں طرح کے فرائض کلام مجید میں بار بار اور جگہ جگہ بیان کیے گئے ہیں۔ ایک حدیث اس مضمون کی بھی ہے کہ اللہ اپنی طرف انسان کے فرائض (حقوق اللہ) کو خاص صورتوں میں معاف کر سکتا ہے لیکن دوسرے انسانوں یا مخلوق کی طرف فرائض (حقوق العباد) میں کوتاہی کو معاف نہیں کر سکتا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ دوسرے انسانوں کی طرف ہمارے فرائض وقت اور حالات کے

۱۔ یہ سورہ ٔنساء (۴) کی آیت ۳۶ کے مطالب ہیں (ا۔س۔ش)

مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ اب اگر ہم فی زمانہ دنیا کے ان حالات کی طرف نظر ڈالیں تو دو باتیں صاف دکھائی دیتی ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ اس زمین کے قریب پونے تین ارب انسان چھوٹے بڑے بے شمار مذہبوں اور سیکڑوں قوموں میں بٹے ہوئے ہیں۔

۲۔ دوسری یہ کہ تمام انسانی قوم کی یگانگت یعنی مساواتِ انسانی یا اخوتِ انسانی کو عملی جامہ پہنانے کی طرف دنیا آج جس تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی نظر آ رہی ہے تاریخ میں پہلے شاید کبھی نظر نہیں آئی' دنیا کے مختلف ممالک میں آنا جانا جتنا آج بڑھا ہوا ہے پہلے کبھی نہیں تھا۔ آج آسانی سے ایک آدمی صبح کا کھانا دہلی میں کھا کر شام کا کھانا۔ نیویارک میں جا کر کھا سکتا ہے۔ چوبیس گھنٹے میں ہم پورے کرہ زمین کا چکر لگا سکتے ہیں۔

۳۔ جس منزل کی طرف انسانی دنیا آج بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے اس کا ذکر قرآن پاک صاف صاف الفاظ میں آ چکا ہے۔ کلام مجید کا کہنا ہے:

"کان الناس امۃ واحدہ (۲:۲۱۳)

یعنی تمام بنی نوع ایک امت یعنی ایک قوم تھے۔

یہ خیال کلام مجید میں قریب قریب ان ہی الفاظ میں کئی جگہ آیا ہے۔ مفسروں کی یہ رائے ہے کہ ماضی کا صیغہ ''کان'' عربی محاورہ میں تاریخی حقیقتوں اور عالمگیر سچائیوں کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ سورۃ المائدۃ میں بھی کہا گیا ہے:

لکل جعلنا منکم شرعۃ و منہاجا.... (الآیہ ۵:۴۸)

یعنی ''تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے الگ الگ شرع اور منہاج بنا دیئے ہیں۔ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت (یعنی ایک ہی شرع اور منہاج کے ماننے والے) بنا دیتا۔ لیکن وہ چاہتا ہے کہ جس کو جو طریقہ بتا دیا گیا ہے' اسی میں اسے آزماوے۔ اسی لیے نیک کاموں کے کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرو' تم سب کو اللہ ہی کی طرف جانا ہے۔ اس وقت وہ تم پر ان باتوں کی حقیقت ظاہر کر دے گا' جن کے بارے میں تم میں آپس میں اختلاف ہے۔''

آیت 'لا اکراہ فی الدین (۲:۲۵۶) کا بھی یہی منشا ہے۔ یہ بھی ظاہر

ہے کہ عربی لفظ ''امت'' کئی الگ الگ مفہوموں میں استعمال کیا جاتا ہے اور قرآن اور دیگر اسلامی کتب میں بھی الگ الگ مفہوموں میں آیا ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کی وفات پر ملال پر اپنے رنج والم کا اظہار کرنے کے لیے جو جلسۂ عام جمعیۃ علماءِ ہند کی طرف سے ہوا تھا۔ اس میں ایک بھائی نے یہ یاد دلایا تھا کہ مولانا مرحوم اپنی تقریروں میں موجودہ انسانی دنیا کا اور خصوصاً اپنے پیارے وطن کا موازنہ ایک ایسے باغ کے ساتھ کیا کرتے تھے جس میں الگ الگ رنگوں اور الگ الگ خوشبوؤں کے پھولوں کی الگ الگ کیاریاں اپنے اپنے رنگ اور اپنی اپنی خوشبو سے پورے باغ کی زینت اور اس کی شان کو بڑھاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی تمثیلیں خاص حدود کے اندر ہی درست مانی جا سکتی ہیں لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ مولانا مرحوم کا یہ خیال قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق اور مشیت ایزدی کی سچی تصویر ہے۔ اس کے خلاف تخیل اور عمل کی کوشش مشیت ایزدی میں مداخلت اور ''لاا کراہ فی الدین'' کے حکم کی خلاف ورزی ہے۔

جلال الدین رومی نے اپنی مثنوی میں جسے 'قرآن در زبان پہلوی' کہا گیا ہے۔ قرآن کے اسی مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

ہندیاں را اصطلاحے مادہ اند
سندھیاں را اصطلاحے دیگر اند

قرآن کریم نے ان لوگوں میں جو اس طرح کے حالات میں اللہ کی خدمت کرنا چاہتے ہیں' نو اوصاف کا ہونا لازمی بتایا ہے:

۱۔ وہ ایمان والے ہوں۔
۲۔ انہیں اللہ پر پورا بھروسا ہو۔
۳۔ وہ اپنے یا دوسروں کے خلاف سنگین جرم یعنی ظلم کرنے سے اور خواہش سے بچتے ہوں۔
۴۔ دوسروں کے قصور کرنے پر باوجود غصہ آ جانے کے (خود اپنی کوتاہیوں پر نظر رکھتے ہوں)
۵۔ ہر وقت اللہ کے حکم اور اللہ والوں کی نصیحت کو سننے' سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کو تیار رہتے ہوں۔
۶۔ ہمیشہ اللہ سے دعا مانگتے رہتے ہوں۔

۷۔ زندگی میں اپنے معاملات کو ان لوگوں سے ایسی صلاح ومشورہ کر کے طے کرتے ہوں جن کے ساتھ ان معاملات کا تعلق ہے (جیسے گھریلو معاملات میں گھر والوں سے' تجارتی معاملات میں ساجھے داروں سے' ملکی معاملات میں حکام وقت یا اہل کاروں یا دوسرے ساتھیوں سے وغیرہ۔

۸۔ اللہ نے جو کچھ انہیں دیا ہے اس میں سے ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہوں اور

۹۔ ان پر اگر کوئی بڑی زیادتی کی جاوے تو گھبرا کر ظلم کے سامنے کبھی جھکنے کو راضی نہ ہوں۔ کیوں کہ جو جس کو نقصان پہنچاوے اس کو اس کے بدلے میں اتنا ہی نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص معاف کر دے اور اپنے کو نقصان پہنچانے والے کے ساتھ صلح کرے تو اسے اللہ سے اس کا اچھا اجر ملتا ہے۔ سچ مچ اللہ دوسروں پر ظلم کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔ (۱)

قرآن کے بتائے ہوئے ان اوصاف مین جن دوسروں کے ساتھ برتاؤ کا ذکر کیا گیا ہے ان میں مسلم یا غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ جو لوگ مولانا مرحوم کے خیالات' جذبات اور ان کے کام کے طریقوں سے واقف تھے انہیں معلوم ہے کہ مولانا مرحوم کو ان اوصاف سے بھر پور حصہ ملا ہوا تھا۔

مولانا حفظ الرحمٰن کو مجاہد ملت کہا جاتا ہے۔ لفظ ''جہاد'' کے اونچے سے اونچے معنی میں مولانا مرحوم سچے مجاہد تھے۔ ہوسکتا ہے کہ ''جہاد'' کے اور بھی مرد میدان موجود ہوں' جن سے مجھے نیاز حاصل نہیں ہوا۔ لیکن جہاں تک میں واقف ہوں مجھے اس وقت مولانا حفظ الرحمٰن سے بڑھ کر مجاہد اس ملک میں نظر نہیں آتا۔ جہاد کے اعلیٰ ترین معنی کے لیے قرآن کی آیتیں اور احادیث نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری نظر اس وقت صرف آزادی کے بعد کے زمانے پر ہے۔

ایک واقعہ اپنے ذاتی تجربہ کا اس جگہ دہرانا مجھے ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ۴۸۔۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی کے ٹھیک بعد ہمارے کچھ بڑے بڑے اہل وطن اس بات کے درپے تھے کہ ملک کے دو ٹکڑوں سے پاکستان کو ہندوؤں سے اور ہندوستان کو مسلمانوں سے خالی کر دیا جائے۔ گاندھی جی نے دونوں طرف سے اس کارروائی کو روکنا چاہا۔ اس کے لیے انہوں نے

۱۔ سورہ شوریٰ (۴۲) کی آیات ۳۶ تا ۴۰ کے مطالب کی طرف اشارہ ہے (ا۔س۔ش)

مجھے پاکستان بھیجا۔

میں لاہور پہنچا۔ لاہور سے میں نے جہلم اور چکوال کا دورہ کیا۔ اس سارے خطے کے حالات کو آنکھوں سے دیکھا واپس آ کر لاہور میں میں نے نواب زادہ لیاقت علی خاں، راجہ غضنفر علی خاں اور دوسرے مسلم لیڈروں سے ملا، گفتگو ہوئی پاکستان کے سب مسلم لیڈر اس بات پر راضی ہو گئے کہ پاکستان سے باقی ہندوؤں کا نکلنا اور ہندوستان سے باقی بچے مسلمانوں کا نکلنا دونوں فوراً بند کر دیئے جاویں۔ اتفاق سے مسٹر جناح بھی لاہور میں موجود تھے۔ انہوں نے بھی اس تجویز سے پوری طرح اتفاق کیا۔ ایک معاہدہ تحریر میں لایا گیا۔ اس قلم بند معاہدے کی ایک کاپی راجہ غضنفر علی کے پاس چھوڑ کر دوسری اپنے ساتھ لے کر میں فوراً دہلی آیا۔ معاہدے کی کاپی میں نے گاندھی جی کو دکھائی۔ انہوں نے اسے غور سے پڑھا۔ بے حد خوش ہوئے، مجھے شاباش دی، صاف الفاظ میں انہوں نے کہا:

''یہ تو بڑی اچھی چیز ہے مجھے تو یہ منظور ہے۔''

میں نے اجازت چاہی کہ میں راجہ غضنفر علی کو گاندھی جی کی منظوری کا تار بھیج دوں تا کہ دونوں طرف سے اس پر عمل درآمد فوراً شروع ہو جائے۔ راجہ غضنفر علی نے میرے لاہور سے چلنے پر متعدد ایسی اسپیشل ٹرینوں کی روانگی پاکستان سے روک دی تھی جن میں ہندو شرنارتھی بھر بھر کر بھارت بھیجے جا رہے تھے۔ اسی لیے معاہدہ کی اس طرف سے منظوری کی اطلاع کا جلد از جلد لاہور پہنچنا ضروری تھا گاندھی جی نے میرے اجازت مانگنے پر کچھ سوچا اور کہا:

''ذرا ٹھہر جاؤ' میں دلبھ بھائی سے بات کرلوں صبح تار دے دینا۔''

میں چلا آیا۔ صبح کو پھر میں گاندھی جی کے پاس پہنچا۔ میں نے پھر لاہور منظوری کا تار بھیجنے کی اجازت چاہی۔ گاندھی جی نے نہایت درد کے ساتھ جو درد ان کے چہرے کے ایک ایک رو میں سے ٹپک رہا تھا سرد آہ بھر کر مجھے جواب دیا:

''کیا کروں بھئی! ولبھ بھائی نہیں مانتا' اچھا ذرا اور ٹھہرو' ذرا دیکھو۔۔

میں شکستہ دل ہو کر گھر لوٹ آیا۔ اس وقت کا وہ صدمہ آج تک میرے دل میں موجود ہے۔ مجھے یقین ہے' گاندھی جی کے دل پر بھی اس کا اثر مرتے دم تک رہا ہوگا' جو معاہدہ اس وقت لاہور میں قلم بند کیا گیا تھا اور جسے پاکستان کے لیڈروں اور مسٹر جناح تک نے منظور کر لیا تھا اس کی نقل ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔ غالباً اس کی کوئی نقل پاکستان میں بھی ضرور

ہو گی۔

گاندھی جی اوران کے ہم خیال لوگوں کے لیے اب صرف یہ باقی رہ گیا تھا کہ جہاں تک ہو سکے بھارت کو مسلمانوں سے خالی نہ ہونے دیا جائے۔ اس معاملے میں دلی بھارت کی گردن تھی۔ میوات کا علاقہ دلی سے ملا ہوا تھا اور بہ کثرت مسلمانوں سے آباد تھا۔ زبردست اور منظم کوششیں کی گئیں کہ دلی اور میوات کو مسلمانوں سے خالی کر دیا جائے۔ حکومت کی زیادہ تر طاقتیں بھی اسی طرف لگی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اگر دلی اور میوات مسلمانوں سے خالی ہو جاتے تو باقی بھارت میں شائد ہی کہیں کوئی مسلمان باقی رہ جاتا۔ گاندھی جی نے اپنی پوری طاقت اس کوشش میں لگا دی کہ دلی اور میوات مسلمانوں سے خالی نہ ہونے پاویں۔ اس زبردست آزمائش کے دنوں میں میں برابر گاندھی جی کے ساتھ تھا۔ ان کے حکم سے میں نے کئی بار میوات کا بھی دورہ کیا۔ دلی کی بھی گلیوں کے چکر لگائے' ظاہر ہے کہ اگر کوئی سربرآوردہ مسلمان لیڈران حالات میں گاندھی جی کی پوری پوری مدد کر لیے کھڑا نہ ہو جاتا تو گاندھی جی کی نیک کوششیں ہرگز کامیاب نہ ہو سکتیں۔ ان نازک حالات میں محض ہندوؤں کی مخالفت ہی نہیں خود مسلمانوں کی لعن طعن برداشت کر کے اور گالیاں سن کر جس مرد میدان نے گاندھی جی کا ساتھ دیا' وہ حفظ الرحمٰن تھا۔ ان دنوں مولانا حفظ الرحمٰن اپنے دو تین نیک طینت اور باہمت ساتھیوں کے ہمراہ روز مہاتما گاندھی سے ملا کرتے تھے۔ ان گفتگوؤں میں میں برابر شریک رہتا تھا۔ ایک دن کی گفتگو میں مولانا ابوالکلام آزاد' ولبھ بھائی اور جواہر لال بھی شامل تھے۔ میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان نازک حالات میں اگر دلی اور میوات کو مسلمانوں سے خالی نہ ہونے دیا گیا اور اس طرح سارے ہندوستان کو مسلمانوں سے خالی ہونے سے بچایا جا سکا' نیز ہمارے ملک کے سیکولرزم کے دعویٰ میں کچھ بھی اصلیت باقی رہ سکی تو اس زبردست کام کا سہرا مہاتما گاندھی کے بعد اگر کسی انسان کے سر پر باندھا جا سکتا ہے تو وہ مرحوم بھائی مولانا حفظ الرحمٰن کے سر پر ہی باندھا جا سکتا ہے۔

جلال الدین رومی کا جو شعر میں نے اوپر نقل کیا ہے اسی کے سلسلے میں مولانا روم نے یہ اشعار بھی کہے ہیں:

مذہب عشق از ہمہ ملت جدا است
عاشقاں را مذہب و ملت خدا است

موسیا آداب داناں دیگر اند
عاشقاں سوز درد ناں دیگر اند
تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

معلوم ہوتا ہے کہ دانستہ یا نادانستہ انسانی قوم کے قدم اسی مذہبِ عشق کی طرف بڑھ رہے ہیں، جس کی طرف جلال الدین رومی نے اوپر کے اشعار میں اشارہ کیا ہے اور جو اس فقیر کی رائے میں حقیقی اسلام یا مذہب اسلام کا جوہر ہے۔ گذشتہ تقریباً چالیس سال سے میں مولانا حفظ الرحمٰن سے کافی نزدیک سے واقف تھا۔ اپنی واقفیت کی بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا مرحوم اس مذہبِ عشق سے بے گانہ نہیں تھے۔ میری نظروں میں مولانا حفظ الرحمٰن ایک سچے ہندوستانی، سچے مسلمان اور اونچے درجہ کے انسان تھے، محبت، یک جہتی اور رواداری کے جس راستے پر چل کر انہوں نے اپنی جان دی، وہی ایک راستہ اس ملک کے موجودہ حالات میں سب کی سلامتی اور بہبودی کا راستہ ہے۔ میری رائے میں وہی عین اسلام ہے، اس کے دائیں اور بائیں کے دو راستے ایک لامذہبی کا اور دوسرا غلط قسم کی مذہبی عصبیت کا۔ یہ دونوں راستے غلط، خطرناک اور اسلام کی روح کے منافی ہیں۔ اللہ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کے نقش قدم پر چل کر اپنے پیارے وطن اور بنی نوع انسان دونوں کی سچی خدمت کر سکیں۔

مجاہدِ ملت کی پارلیمانی زندگی

محمد سلیمان صابر

مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن کی پارلیمانی زندگی کا آغاز حصولِ آزادی کے بعد اس وقت سے ہوتا ہے، جب وہ دستور ساز اسمبلی کے ممبر چنے گئے، جس کی تشکیل ملک کے لیے برطانوی دور کے فرسودہ آئین کی جگہ ایک جمہوری آئین واضح کرنے کے لیے عمل میں آئی تھی۔

آئین ساز اسمبلی کی ممبری کو عام لوگ ایک بڑا اعزاز کہہ سکتے ہیں۔ لیکن حضرت مولانا نے کسی اعزاز کی خاطر نہیں بلکہ اس لیے آئین یا قانون ساز اسمبلی کی ممبری قبول کی کہ وہ شروع ہی سے ایک قومی کارکن رہے تھے۔ برطانوی دور میں ملک کو آزاد کرانے کا اہم مقصد سامنے تھا اور حصول آزادی کے بعد سب سے اہم کام یہ تھا کہ ملک کو ایک ایسا جمہوری آئین دیا جائے کہ بلاتخصیص مذہب کسی باشندے کو کسی دوسرے پر فوقیت یا برتری حاصل نہ ہو، بلکہ قانون کی نظر میں سب برابر ہوں۔ یہ حضرت مولانا جیسے وسیع النظر ممبروں ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ملک کو ایک سیکولر آئین دیا گیا۔ اگرچہ انہیں ہمیشہ اس بات کا قلق رہا تھا کہ ہندوستانی زبان کو جس کے فروغ کے لیے مہاتما گاندھی آخر وقت تک کوشش کرتے رہے اور جسے وہ قومی زبان سمجھتے تھے آئین میں کوئی درجہ نہ مل سکا۔ اس کی جگہ ہندی نے لے لی۔

حضرت مولاناؒ کی پارلیمانی سرگرمیاں صرف ایوان پارلیمنٹ میں حاضری تک ہی محدود نہ تھیں، بلکہ اس کے باہر بھی وہ ہر وقت مصروف رہتے تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کے دفتر کے اجتماعات، وزیراعظم ہند، مولانا آزاد اور دوسرے قومی لیڈروں سے ملاقاتیں، یہ سب ان کی پارلیمانی سرگرمیوں کا حصہ تھیں۔ ملک کے طول وعرض میں سال کے زیادہ حصے میں ان کے دوروں کو بھی ان ہی سرگرمیوں کا حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ ان ہی دوروں میں انہیں عوام اور خاص طور سے اقلیتی فرقے کے مسائل کو جاننے اور سمجھنے اور پھر ان کی بنیاد پر آئین ساز اسمبلی یا

پارلیمنٹ میں بولنے کا موقع ملتا تھا۔

حضرت مولانا ان لوگوں میں نہ تھے جن کا مہر سکوت کبھی نہیں ٹوٹتا۔ جب کبھی موقع ملتا اور کوئی اہم مسئلہ سامنے آتا' وہ لازماً وقت لیتے اور بولتے تھے۔ خاص طور پر وزارت تعلیم اور وزارت داخلہ کے معاملات پر ہمیشہ بولنے کے لیے بے چین رہتے۔ کیونکہ یہ دو محکمے ایسے ہیں جو عوام کی تعلیمی ثقافتی اور سماجی زندگی پر خاص طور سے اثر انداز ہوتے ہیں۔

پارلیمنٹ ہاؤس کی پریس گیلری سے میں نے بارہا حضرت مولانا کو بولتے سنا' وہ ایک وجیہہ انسان تھے۔ طویل قامت اور چھریرا بدن' خوبصورت داڑھی' گرمی سردی کی رعایت سے سفید کھدر یا گرم پٹو کی شروانی' اور کھدر یا فر کی ٹوپی میں ملبوس' جب تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو ایک پروقار شخصیت نظر آتے۔ ان کے ہاتھ لانبے اور مضبوط تھے۔ ایک قومی سپاہی کے ہاتھ جو تقریر کے دوران مسلسل حرکت کرتے رہتے تھے۔ ان کے ہاتھوں کی یہ جنبش ان کی بے قرار توانائی کا مظہر تھی' جسے باہر نکلنے کے لیے خواہ اس پر کتنا ہی کنٹرول کیوں نہ ہو' راستے کی ضرورت تھی۔ ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ان کے منہ سے نکلی ہر بات کی تائید ہوتی تھی اور ظاہر ہوتا تھا کہ ان کا ہر جملہ ایک حقیقت اور سچائی ہے۔ وہ انتہائی صاف گو اور بے باک تھے۔ ٹکسالی اردو میں جچے تلے الفاظ بولتے کہ معلوم ہوتا تھا' منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ وہ جس مسئلے پر بولتے' خوب بولتے اور پورے ایوان کو مسحور کر دیتے۔ فن خطابت میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔

بعض اوقات تقریر میں الفاظ کی تکرار ہوتی تھی۔ مگر اس کا مقصد اپنی بات میں زور پیدا کرنا ہوتا تھا۔ اکثر انگریزی الفاظ کو بھی شامل کر دیتے۔ تاکہ جنوبی ہند کے ممبران بھی پوری طرح سمجھ جائیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ مدھیہ پردیش کی حکومت کو تنبیہہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا:

> ''آج مدھیہ پردیش کی سرکار فیلیور ہوئی ہے۔ بھوپال سے لے کر آج تک کے جو واقعات ہوئے ہیں' انہیں دیکھ کر کہنا چاہیے کہ اسے حکومت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اس طریقے سے تباہ کر کے' کرش کر کے' برباد کر کے یہاں رکھا جائے گا تو یقینی طور پر اس کے نتائج اچھے نہیں نکلیں گے۔ اس طرح کے طریقوں کو بدلنا ہوگا اور صحیح معنی میں سیکولرزم کو لانا ہوگا۔''

ان کی تقریر موقع محل کے مطابق ہوا کرتی تھی۔ مذہبی اجتماع میں مذہبی' عوامی جلسوں میں عوامی اور پارلیمنٹ میں پارلیمانی تقریر کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ کسی جگہ بھی حضرت مرحوم نے پارلیمانی ضابطے کی خلاف ورزی کی۔ قانون دان نہ ہونے کے باوجود ایسی ایسی قانونی موشگافیاں فرماتے تھے کہ اچھے اچھے وکلاء حیران رہ جاتے تھے۔ آج کل ممبران اور خاص طور پر بعض مخالف ممبران موقع بے موقع اور بعض اوقات غیر پارلیمانی زبان میں بول کر شہرت حاصل کرنے کی کوشش کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ لیکن حضرت مولانا مرحوم کا طرز عمل بالکل جدا تھا۔ وہ ایک بردبار اور سنجیدہ ممبر پارلیمنٹ تھے۔ تمام سنجیدہ مسائل پر انتہائی سنجیدگی اور دلائل کے ساتھ بولتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نظریاتی اختلاف رکھنے والوں تک کو ان کے طرز تخاطب کی تعریف کرتے سنا گیا۔

حضرت مولانا ایک نڈر' جری اور بہادر انسان تھے۔ یہ برداشت نہ کر سکتے تھے کہ ملک کے اندر کسی کے ساتھ بے انصافی اور ظلم ہو۔ وہ نہایت صفائی اور بے خوفی سے سچی بات کہتے اور بعض اوقات نام نہاد ''پارٹی ڈسپلن'' تک کی پروا نہ کرتے تھے۔ وزارت داخلہ کے معاملات پر بولتے ہوئے' حضرت مولانا نے مدھیہ پردیش کی حکومت کو ایسے جرأت مندانہ انداز میں للکارا کہ اس وقت کے وزیر اعظم ڈاکٹر کاٹجو بے چین ہو گئے تھے۔ فرمایا:

> ''جبل پور میں ساگر' دموہ اور کٹنی میں فسادات ہو جائیں' اور جو منسٹر ہیں وہ اسی طرح بیٹھے رہیں' کرسیوں پر قائم رہیں یہ ان کے لیے کیسے جائز ہو سکتا ہے' چاہے اقلیتوں کا سوال ہو' چاہے اکثریت کا۔ ہمیں سب ہی کی حفاظت کرنی ہے اور خاص طور پر اقلیتوں کی پوری قوت اور مضبوطی کے ساتھ کرنی ہے۔ میں ایمان داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ پورے ملک کا سوال ہے' ملک کی آزادی کا سوال ہے' ملک کے وقار کا سوال ہے' ملک کی شانتی کا سوال ہے اور ملک کی سالمیت کا سوال ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس طرف خاص توجہ دی جائے۔''

یہ صحیح ہے کہ حضرت مولانا آئین ساز اسمبلی یا پارلیمنٹ میں صرف مسلمانوں کے نمائندہ بن کر نہیں گئے تھے' بلکہ وہ پوری قوم کے نمائندے تھے۔ اس لیے کہ قومی بنیاد ہی پر ان کا انتخاب عمل میں آیا تھا۔ لیکن جہاں کہیں اقلیت کے ساتھ بے انصافی دیکھی۔ انہوں نے اس کے خلاف آواز اٹھانا اپنا فرض سمجھا۔

فسادات مدھیہ پردیش کے زمانے میں پارلیمنٹ میں اکثریتی فرقہ سے تعلق رکھنے والے ممبروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

''اگر سیٹھ گووند داس جبل پور کے نمائندہ نہیں بولیں گے تو حفظ الرحمٰن کو بولنا پڑے گا۔''

حضرت مولانا کو اکثر اقلیتی معاملات پر اسی بنا پر بولنے کے لیے مجبور ہونا پڑتا تھا کہ بہت کم دوسرے ممبروں کو اس بارے میں بولنے کی جرأت ہوتی تھی۔ حق و انصاف کے لیے لڑنا' ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ بات بھی صحیح نہیں کہ وہ اقلیتی مسائل کے علاوہ کسی اور مسئلے پر بولتے ہی نہ تھے۔

فروری ۶۱ء میں انہوں نے جوزوردار تقریر کی' اس میں انہوں نہ صرف مدھیہ پردیش کے واقعات پر روشنی ڈالی' بلکہ ہند' چین کے تعلقات اور کانگو جیسے ملک کے اہم مسائل سے بھی بحث کی۔ چین کے معاملے میں واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ:

''ہندوستان کے وسیع علاقہ پر قبضہ کر کے چین نے ہندوستان کے ساتھ بے وفائی کی ہے۔ اور شرافت سے گری ہوئی زندگی کا ثبوت دیا ہے۔''

حضرت مولانا قدرے تیز اور مسلسل بولتے تھے۔ کہیں درمیان میں اٹکنے کا نام نہ تھا' اس لیے بعض نامہ نگاروں کو خاص طور پر انہیں' جو اردو زبان سے اچھی طرح واقف نہ تھے' کچھ دقت ہوتی تھی' لیکن انہیں حضرت مولانا کی تقریر سے خاص دلچسپی تھی' بڑی توجہ سے سنتے اور کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تو دوسروں سے پوچھ کر اپنے اپنے اخباروں میں بھیجتے۔

جب کبھی معلوم ہو جاتا کہ حضرت مولانا کو پارلیمنٹ میں بولنا ہے۔ میں بڑے اہتمام سے پریس گیلری میں پہونچتا' لیکن کبھی کبھی ایسا ہوا کہ اپنی بعض دفتری مصروفیات کی بنا پر نہ پہنچ سکا تو حضرت مولانا تقریر کو یا تو زبانی بتادیتے اور یا پھر سرکاری طور پر آئی ہوئی تقریر کی نقل حوالے کر دیتے۔ مگر ساتھ ہی ہدایت فرمادیتے کہ تحریر کو اچھی طرح' دیکھ لینا۔ یہ اسٹینوگرافر لوگ بعض اوقات کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔

حضرت مولانا کو اپنی کسی پبلسٹی کا شوق نہ تھا۔ لیکن حالات کا اقتضاء تھا اور خود قارئین الجمعیۃ اور عام لوگوں کی' جنہیں اقلیتوں سے خصوصی دلچسپی ہے' خواہش رہتی تھی کہ حق و انصاف اور ملک میں حقیقی جمہوریت کے قیام کے لیے پارلیمنٹ میں جو باتیں بھی ہوں اخبار میں تفصیل

کے ساتھ آئیں۔ حضرت مولانا پارلیمنٹ میں جو کچھ فرماتے اس کی تفصیل کا تقاضہ بھی رہتا تھا اور ایسی تقریروں کے لیے تو قارئین بے چین رہتے تھے جن میں ان کے دکھ درد کی باتیں بیان کی جاتیں۔ خود مولانا بھی پریس کی اہمیت سے واقف تھے' اور حکومت کو توجہ دلانے کے لیے کسی بھی مظلوم طبقے کی شکایات و مطالبات کی اشاعت کو ضروری سمجھتے تھے۔

لیکن اگر اس راہ میں کارکنان الجمعیۃ کی طرف سے کبھی غفلت برتی گئی تو اس کا حضرت مولانا نے کبھی خیال نہ فرمایا۔ وہ انتہائی معتدل مزاج' متواضع اور خلیق انسان تھے۔ ان کے اندر وہ ضبط نفس دیکھا جو دارالعلوم کا خاصہ ہے جہاں کے وہ فارغ التحصیل تھے۔

ایک مرتبہ پارلیمنٹ میں حضرت مولانا کی ایک معرکۃ الآرا تقریر ہوئی جس کی مسلم نقطہ نظر سے بڑی اہمیت تھی' بدقسمتی سے تقریر کے دوران میں غیر حاضر تھا' کئی مرتبہ ایسا ہو چکا تھا کہ مولانا سے ان کی تقریر حاصل کی گئی' مگر اس مرتبہ مجھے ان کے پاس جانے میں تامل ہوا' مبادا دل میں کچھ خیال فرمائیں' حالانکہ یہ میرا خیال ہی خیال تھا وہ ایسی باتوں کی پروا نہ کرتے تھے۔۔ مولانا کو پریس گیلری سے میری غیر حاضری کا علم تھا' لیکن صبح کو جب ان کی پوری تقریر الجمعیۃ میں شائع ہوئی تو حیران ہوئے۔ ملاقات ہونے پر پوچھنے لگے کہ اتنی جلدی تقریر کہاں سے حاصل کی؟ اور جب میں نے بتادیا تو بہت خوش ہوئے۔

حضرت مولانا جب دلی میں ہوتے تو بڑی پابندی سے پارلیمنٹ جاتے تھے اگرچہ ان کی دوسری بے انتہا مصروفیات انہیں ہر روز وہاں پورے وقت نہ بیٹھنے دیتی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود جب کبھی کوئی اہم معاملہ ہوتا تو وہ ہاؤس نہ چھوڑتے تھے۔

حضرت مولاناؒ کو سینٹرل ہال میں بھی بہت کم بیٹھنے کا موقع ملتا تھا لیکن جب بیٹھتے تو ان کے گرد ممبروں کی ایک بھیڑ ہوتی تھی۔ سرکردہ مسلم ممبران تو سبھی جمع ہو جاتے اور ان مسائل پر اہم مشورے کرتے تھے جن کا خاص طور پر اقلیتی حقوق سے تعلق ہوتا تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات بالخصوص جبل پور' ساگر' علی گڑھ' میرٹھ اور چندوسی وغیرہ۔

ہنگاموں کے زمانے میں اسی ہال میں ان کی نشست بڑھ گئی تھی کیونکہ یہاں ہر طبقہ و خیال کے ممبروں سے انہیں تفصیلی گفتگو کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

آج سینٹرل ہال کی مجموعی چہل پہل میں شائد کوئی کمی نہ محسوس کی جائے لیکن ملک کے اتحاد و یکجہتی اور ایکتا کے حامی ان ممبران پارلیمنٹ کو یہ ہال ضرور خالی نظر آتا ہے جو گویا

حضرت مولانا کو اپنا رہنما سمجھتے تھے' کم از کم دو خواتین ممبر' آپا انیس قدوائی (ممبر راجیہ سبھا) اور بہن سبھد را جوشی (ممبر لوک سبھا) ایسی ضرور موجود ہیں جن کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ایک جگہ بیٹھیں اور حضرت مولانا مرحوم کو یاد نہ کریں۔ فرقہ وارانہ ہنگاموں کے موقعوں پر ان دونوں خواتین ممبروں نے جو خدمات انجام دیں' حضرت مولانا مرحوم کے دل میں ان کی بڑی قدر تھی۔ دونوں کو حضرت مولانا کا پورا پورا اعتماد حاصل تھا۔

پارلیمانی زندگی میں' میرا حضرت مولانا سے پندرہ برس کا واسطہ رہا۔ اکثر وہ اکیلے جاتے اور میں پہلے یا بعد کو پریس گیلری میں پہنچتا لیکن کبھی کبھی ساتھ بھی ہو جاتا یا واپسی میں ان کی ہمراہی' اور پارلیمنٹ میں زیر بحث مسائل پر گفتگو کرنے کا موقع مل جاتا۔ کاش اس زمانے کی اس مختصر گفتگوؤں کے جو کبھی کبھی پارلیمنٹ ہاؤس سے لال کنوئیں تک یا لال کنوئیں سے پارلیمنٹ ہاؤس تک ہوا کرتی تھیں' ریکارڈ میرے پاس محفوظ ہوتے اور اس ملک کے رہنے والے معلوم کر سکتے کہ حضرت مولانا کے دل میں قوم و ملت کا کتنا درد تھا۔

حضرت مولانا جب آخری بار پارلیمنٹ کے لیے منتخب ہوئے تو وہ اپنی علالت کے باعث اپنے ووٹروں کے پاس نہ جا سکے اور وہ کام نہ ہو سکا جو آج کل کی الیکشن بازی کا حصہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود تقریباً ۱۷ ہزار ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ یہ ان کی ہر دل عزیزی اور اپنے حلقے کے عوام میں مقبولیت کا ثبوت تھا۔

جس وقت نتیجہ کا اعلان ہوا' حضرت مولانا بستر علالت پر تھے۔ ہم لوگ پہنچے اور خبر سنائی' مولانا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ انہیں خوشی اس بات پر تھی کہ بے انتہا مخالفانہ پروپیگنڈے کے باوجود ابھی تک عوام کو ان پر اعتماد تھا۔

لیکن افسوس کہ قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ وہ اپنے حلقے اور پورے ملک کے باشندوں کی خدمت کے لیے ابھی کچھ اور دن ہمارے درمیان رہیں' کینسر کی موذی بیماری نے انہیں آ گھیرا اور بہتر سے بہتر علاج کے باوجود ان کی طبیعت بگڑ گئی' اور آخر میں روس اور امریکہ کے ڈاکٹروں سے مشورے ہوئے' تمام ڈاکٹری ریکارڈ دونوں ملکوں میں بھیجے گئے۔ روسی ماہرین نے ریکارڈ دیکھ کر حضرت مولانا کو روس آنے کا مشورہ نہیں دیا۔ لیکن امریکی ڈاکٹروں نے کچھ امید دلائی اور امریکہ جانے کا پروگرام بن گیا۔

حضرت مولانا جس دن روانہ ہونے والے تھے' اس دن پارلیمنٹ میں انہوں نے حلف

اٹھایا۔ بہن سہد راجوشی صبح ہی انہیں لینے حافظ ابراہیم (وزیر برقیات) کی کوٹھی پر پہنچ گئی تھیں، جہاں حضرت مولانا کا قیام تھا۔

پارلیمنٹ کے دروازے پر اترے تو ان کے نیازمندوں نے جن میں راقم الحروف بھی شامل تھا، ان کا خیر مقدم کیا۔ وہ کمزور و نحیف تھے اور مشکل سے ہل سکتے تھے۔ لیکن جری، مضبوط ارادے کے مالک اور مستقبل مزاج انسان تھے۔ ان کی انتہائی خطرناک علالت بھی انہیں پارلیمنٹ میں جانے سے نہ روک سکی۔

اسپیکر پارلیمنٹ کو حضرت مولانا کی علالت کا علم نہیں تھا انہیں متوجہ کیا گیا اور انہوں نے حضرت مولانا کو ان کی باری سے پہلے ہی حلف لینے کی اجازت دے دی تا کہ وہ جلد واپس جا سکیں۔

جوں ہی وہ اپنی سیٹ سے اٹھے، میں پریس گیلری سے نیچے دوڑا اور انہیں دروازے تک سہارا دینا چاہا۔ حضرت مولانا نے انکار فرمایا۔ لیکن ان کا یہ انکار ان کے ایک پرانے نیازمند کو اپنے فرض کی انجام دہی سے نہ روک سکا۔ ڈاکٹر سوشیلا نائر (وزیر صحت) اور مسز سہد راجوشی حضرت مولانا کے ہمراہ تھیں۔ مولانا موٹر میں سوار ہوئے اور اس ایوان پارلیمنٹ سے جس میں گذشتہ پندرہ برسوں میں ان کی جرأت و بے باکی اور حق وانصاف کے لیے آخر وقت تک جدوجہد کرنے کا مظاہرہ بہت سی بار دیکھنے میں آیا تھا، رخصت ہو گئے۔ پارلیمنٹ میں یہ حضرت مولانا کی آخری حاضری تھی۔۔۔ یا یوں کہیے کہ یہ ان کی پارلیمانی زندگی کا اختتام تھا۔۔۔ اسی شام حضرت مولانا بغرض علاج امریکہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ جہاں وہ دو ماہ سے کچھ زیادہ عرصے تک رہے۔

راقم الحروف جب امریکی حکومت کی دعوت پر ایک پریس پارٹی میں شامل امریکہ روانہ ہوا تو وہ میڈیسن میں زیر علاج تھے۔ خیال تھا کہ میں حضرت کو ہندوستان کے کروڑوں باشندوں کا پیغام محبت پہنچاؤں گا لیکن نہ صرف یہ کہ امریکہ میں حضرت مولانا سے ملاقات نہ ہو سکی، بلکہ واپس آنے کے بعد بھی ان کے دیدار سے محروم رہا۔ میری واپسی سے قبل ہی وہ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔۔۔ ملک وملت کا وہ روشن ستارہ غروب ہو چکا تھا۔ شاید ایسا روشن ستارہ ہم پھر کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدا ور پیدا

اللہ تعالیٰ مرحوم کی قبر کو نور سے بھرے اور انہیں جنت الفردوس میں داخل کرے۔ آمین ثم آمین!

باب سوم

خدماتِ جلیلہ

(۱)

مجاہد ملت کے چند کارنامے

مولانا سید محمد میاںؒ ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند

تقریباً سات ماہ گزر گئے جب مجاہد ملت اعتذار رخصت ہوئے تھے۔ بڑے سے بڑا زخم اس عرصہ میں مندمل ہو جاتا ہے مگر جو زخم مجاہد ملت کی مفارقت سے پڑ گئے ہیں' وہ مندمل تو کیا ہوتے' ان کی ٹیس میں بھی فرق نہیں آیا۔ مجاہد ملت کا خیال آتا ہے تو دل قابو میں نہیں رہتا' قلم بھلا کس طرح قابو میں رہ سکتا ہے۔ اس طویل بیان میں اگر آپ کو کوئی انتشار محسوس ہو تو آپ اسے نظر انداز فرما دیں مضطرب کا اضطراب قابل معافی ہوتا ہے۔ البتہ آپ کو اس میں بہت کچھ تاریخی مواد مل جائے گا۔ اگر آپ کو تاریخ سے دلچسپی ہے تو آپ اس کی قدر کریں گے۔

محمد میاں

تمہید

سبحان الذی یقضی فی عبادہ بما یشاء کیف یشاء والصلواۃ والسلام علی رسولہ خاتم الانبیاء الذی علمنا الرضاء بالقضاء۔۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ہم بھی ''صاحب قلم'' ہیں۔ مگر ہمارا قلم کیا ہے؟ ایک بے حقیقت کھلونا۔ اوپر سے نیچے گر جائے تو ریزہ ریزہ ہو جائے ذرا سی نمی سے حرفوں کی نمود ختم۔ کہیں بے احتیاطی سے رکھا جائے تو کیڑے چاٹ جائیں۔

ایک قلم وہ ہے جسے قلم تقدیر کہتے ہیں۔ سارا جہان ادھر سے ادھر ہو جائے مگر کیا مجال کہ نوشتۂ تقدیر کا ایک حرف بھی بدل سکے۔

(الف)

یہ ناکارہ سمجھ رہا تھا کہ جب تک وہ زندہ ہے مجاہد ملت کو دامت برکاتہ اور مدظلہ العالی ہی لکھتا رہے گا۔ اور جب یہ فقیر حقیر پیوند خاک ہو چکے گا تو ایک عرصے بعد وہ وقت آئے گا کہ مجاہد ملت کے لیے لحد اور تابوت کی ضرورت ہوگی۔ اور ان کے واسطے رحمۃ اللہ' غفر اللہ لہ' قدس اللہ سرہ اور نور اللہ مرقدہ جیسے الفاظ استعمال کیے جائیں گے۔

میری عمر اگرچہ تقریباً تین سال کم تھی مگر اپنی اور مولانا کی صحت اور جسمانی قویٰ کا موازنہ کرتا تھا تو یہ اندازہ صحیح ہی معلوم ہوتا تھا۔ مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ قلم تقدیر کچھ اور لکھ چکا ہے اور حد امکان کی آخری سے آخری کوشش بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتی۔

(ب)

ہاں قلم تقدیر کا ہم پلہ ایک اور قلم ہے۔ وہ ہمارے ہاتھ میں تو نہیں رہتا۔ البتہ ہمارے ساتھیوں کے ہاتھ ہر وقت اس کو جنبش دینے میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ ہمارے ساتھی وہ واجب الاحترام فرشتے ہیں جنہیں عرف میں ''کراماً کاتبین'' کہا جاتا ہے جو ہمارے ہر ایک قول اور فعل کو لکھتے رہتے ہیں۔

مایلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید (۵۰:۱۸)
بے شک مشیت ایزدی اور رحمت خداوندی کی بوندیں بسا اوقات اس تحریر کے خراب یا کمزور حصوں کو مٹا بھی دیتی ہیں۔ یمحو اللہ مایشاء ویثبت (۱۴:۴۹) مگر جو حرف باقی رہیں گے وہ ایسے امٹ اور ایسے پائیدار ہوں گے کہ صور اسرافیل بھی ان کو نہ مٹا سکے گا۔

یہ وہ نوشتہ ہوگا جو قیامت کے روز اصحاب یمین کے دہنے ہاتھ میں دیا جائے گا' اور حضرت مجاہد ملت جیسے خوش نصیب اس کو دیکھتے ہی خوشی سے پکاریں گے۔

ھاؤم اقرء وا کتابیہ۔(۶۹:۱۹)

آیئے آیئے پڑھیے یہ میری دستاویز

اور اگر ہم دنیا کے اصطلاحی الفاظ استعمال کریں تو شاید بامحاورہ ترجمہ یہ ہو۔ آیئے ملاحظہ کیجئے۔ یہ سپاسنامہ جو مجھے دیا گیا ہے۔

(ج)

یہ حقیر فانی جو سطریں لکھ رہا ہے۔ امید ہے کہ یہ بھی باقی رہیں گی کیونکہ ان میں اس تحریر کا مواد ہے جو قیامت کے روز مجاہد ملت کو پیش کی جائے گی جو ان شاء اللہ قابل فخر سپاسنامہ کی شان رکھے گی۔

خود مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کو اس تحریر کا بہت خیال رہا کرتا تھا چنانچہ غالباً ۱۹۴۸ء کا واقعہ ہے۔ جب دو قومی نظریہ کا آتش فشاں پھوٹا ہوا تھا اور ہر طرف خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ میں نے ایک بیان دینا چاہا۔ بیان اپنی جگہ صحیح تھا مگر اس کا نتیجہ یہ ہوسکتا تھا کہ اشتعال میں اضافہ ہو اور کچھ اور خون خرابہ ہو جائے۔

حضرت مجاہد ملت سے میں نے تذکرہ کیا۔ فرمایا:

''ہرگز نہیں! خون کے دھبوں سے خدا نے ہمارا دامن پاک رکھا ہے۔ آپ یہ دھبہ کیوں لگاتے ہیں۔''

(د)

احادیث مقدسہ میں ''اغاثۂ ملہوف'' کے بہت فضائل بیان فرمائے گئے ہیں۔یعنی مظلوم اور مصیبت زدہ کی فریادرسی اور امداد۔اس میں وہی پیش پیش ہوگا جس کا دل پر درد اور جگر پر سوز ہو۔۱۹۴۷ء کے ہنگامی دور میں اور اس کے بعد جو واقعات پیش آتے رہے، انہوں نے مجاہد ملت کے اس وصف کو اتنا نمایاں کر دیا ہے کہ آپ کی ذات ہمدردی اور فریاد رسی کی زندہ جاوید مثال بن گئی ہے۔

(۲)

تحریکات کا دور جدید

بچپن کا ایک ہولناک حادثہ:

یہ خاص وصف جو بلا مبالغہ لاکھوں مظلوموں کے زخموں کا مرہم ثابت ہوا۔ جس نے بے شمار مصیبت زدوں کی جانیں بچائیں دیکھنے والوں نے اس کے ''چکنے چکنے پات'' اسی وقت دیکھ لیے تھے جب تقریباً ۴۵ سال پہلے ریلوے اسٹیشن کانٹھ کے قریب ایکسپریس کے ہولناک تصادم کا حادثہ پیشہ آیا تھا۔ اس حادثہ میں کئی بوگیاں چکنا چور ہو گئی تھیں۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ اس ایکسپریس کا گارڈ جس کو مولانا ذاتی طور پر بھی جانتے تھے اس طرح چور چور ہو گیا تھا کہ اس کو فقط سیٹی کے نشان سے شناخت کیا جا سکا تھا۔

اس حادثہ میں ختم ہونے والوں کی لاشیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں انہیں کے بیچ میں وہ نیم جان زخمی بھی تھے' جن کی کراہ سے دل لرزتے اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ لاشوں تک پہنچنا' ان کو اٹھانا' زخمیوں کی مدد کرنا بڑے دل گردہ کا کام تھا پکی عمر کے آدمی بھی اس کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ قصبہ کانٹھ جس کے اسٹیشن کے قریب یہ حادثہ پیش آیا حضرت مجاہد ملت کے وطن عزیز ''سیوہارہ'' سے تقریباً سات میل کے فاصلے پر ہے۔

وہ کیا جذبہ تھا جس نے اٹھارہ یا انیس سالہ حفظ الرحمٰن کو جو قانوناً بالغ بھی نہیں تھا اس پر آمادہ کیا کہ اپنے قصبہ سے سات میل چل کر جائے حادثہ پر پہونچے اور بڑے آدمیوں کے زمرہ میں شامل ہو کر وہ کام کرے جو بڑوں کے لیے بھی سبق آموز ہوں' مزدوروں کی طرح لاشیں اٹھائے اور تڑپنے والے کے زخمیوں کی تیمارداری کرے اور جب تک اس کام سے پوری طرح فراغت نہ ہو جائے۔ اپنے مکان واپس نہ آئے۔

کچھ لاشوں کو جلایا گیا' کچھ کو دفنایا گیا۔ یہ سب کچھ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔

یہ جذبہ جس نے اس بچپن میں اس نوخیز بہادر کو والہانہ خدمت پر آمادہ کیا۔ نشان تھا اس سوز اور اس درد کا جو فطرت مجاہد کو عطا ہوا تھا۔ وہ بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھا کہ تمام ستم رسیدہ مظلوموں اور کمزوروں کا درد قلب مجاہد کا درد بن گیا۔ بقول شاعر

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

آزادی ہند کی تحریک اگرچہ بہت پہلے سے شروع ہو چکی تھی اور اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ جیسے ہی یورپ کے بنیوں نے دوکانداری کو حکمرانی کی شکل دی' آزادی کی تحریک شروع ہو گئی تھی' تو واقعات اس دعوے کا بھی ناقابل تردید ثبوت پیش کر دیں گے' مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے بعد تحریک آزادی نے ایک ایسی صورت اختیار کی جو پہلے کسی کے وہم دگمان میں بھی نہیں تھی۔ جب دیش باپو گاندھی جی نے ''ستیہ آگرہ'' کا راستہ اختیار کیا اور عدم تشدد آہنسا یا مقاومۃ بالصبر کی طاقت کو جنگ آزادی کا حربہ قرار دیا۔ جب وہ تجویزیں جو خفیہ انجمنوں میں منظور کی جاتی تھیں برملا اسٹیجوں پر پیش کی جانے لگیں اور مقابلے کے وقت میدان جنگ کو فوجوں سے پاٹ دینے کے بجائے رضا کاروں سے جیل خانوں کو بھرا جانے لگا۔

یہ پروگرام جنگ آزادی کے پہلے طریقوں سے اتنا مختلف تھا کہ عام طور پر اسی کو تحریک آزادی کا آغاز قرار دیا گیا۔

بیسویں صدی عیسوی کا بیسواں سال (۱۹۱۹ء) ہمیشہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں ''صبح صادق'' تسلیم کیا جائے گا۔ کیونکہ اسی ۱۹۱۹ء کے مارچ میں ستیہ گرہ کی تجویز منظور کی گئی۔ اسی سال جمعیۃ علماء ہند کے نظام جدید کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اور اسی سال جلیانوالہ باغ کا وہ مشہور حادثہ پیش آیا جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار ہندوستانیوں نے جنگ آزادی کی مردہ تحریک میں اپنے مظلوم و معصوم خون کے انجکشن سے جان ڈالی اور ایک کامیاب تحریک کی آبیاری کی۔

سیوہارہ کے قریب ٹرین کا حادثہ اسی سال یا اس سے ایک سال پہلے پیش آیا تھا۔

جو نوخیز نوجوان ایکسپریس کے حادثے میں ہمدردانہ ایثار و فدائیت کے جوہر دکھا کر ہر ایک صاحب بصیرت کو حیرت زدہ کر چکا تھا' ناممکن تھا کہ جلیانوالہ باغ کا حادثہ سن کر اس کی رگ حمیت میں جوش نہ آتا اور عواقب و نتائج سے بے پروا ہو کر خدمت خلق اور آزادی ملک کے میدان میں مردانہ وار قدم نہ بڑھاتا۔

چنانچہ یہ خود ساختہ والنٹیر جس نے ایکسپریس کے حادثے میں اپنے مونڈھوں پر لاشیں اٹھائی تھیں، جب جنگ آزادی کا بگل بجا تو وہ خدمت خلق اور ہمدردی ملت کے میدان میں سب سے آگے تھا۔

مولوی مقبول احمد صاحب سیوہاروی اس دور کے چشم دید شاہد اور مجاہد ملت کے رفیق ہیں ان کا مضمون اسی مجموعے میں شائع ہو رہا ہے اس میں ان ابتدائی سالوں کی تفصیل موجود ہے۔ ہم بنظر اختصار اس حصہ کو حذف کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ابھی تک مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جو درجات عربی کے طالب علم تھے پوری طرح تحصیل نہیں کر سکے تھے کہ جنگ آزادی نے دلوں میں تڑپ پیدا کی۔ جن جانبازوں اور سرفروشوں نے آگے بڑھ کر ہتھکڑیوں کو بوسہ دیا ان میں مجاہد ملت کا نام سب سے روشن ہے۔

(۳)

ایک رہنما کی حیثیت سے پہلا کارنامہ

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور ان کے رفقا اور احباب کے حالات سے واقفیت رکھنے والے اگر یہ خیال کریں کہ آپ کی وہ مخصوص سوسائٹی جس کی رہنمائی حافظ محمد ابراہیم صاحب موجودہ وزیر حکومت ہند اور مولانا بشیر احمد صاحب (بھٹہ) مرحوم کیا کرتے تھے وہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی ساخت اور پرداخت اور ان کے فطری جوہر کو نکھارنے میں مددگار ثابت ہوئی تو یہ خیال بڑی حد تک صحیح ثابت ہوگا۔ مگر ۱۹۲۹ء میں پہلے گاندھی جی کے ساتھ ڈانڈی کے مارچ میں شریک ہونا۔ وہاں پہنچ کر نمک بنانا اور پھر جمعیۃ علماء ہند کے ہونے والے اجلاس میں شرکت کانگریس کی تجویز پیش کرنا۔ یہ اقدامات اس سوسائٹی کی رہنمائی اور اس کے اثر سے نہیں تھے بلکہ خود آپ کی فراست و بصیرت اور آپ کی جرأت مندانہ فطرت کے مدبرانہ تقاضے تھے کیوں کہ آپ اس زمانے میں سیوہارہ، نگینہ اور دہلی سے تقریباً ایک ہزار میل کے فاصلہ پر ڈابھیل ضلع سورت کے جامعہ اسلامیہ میں مدرس عربی کی حیثیت سے مقیم تھے۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے ڈابھیل کے اس ماحول میں آپ کے خیالات سے متاثر ہونے والے یا آپ کی ہمنوائی کرنے والے صرف ایک رفیق تھے یعنی مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی (ناظم اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی) لہٰذا اس موقعے پر جو کچھ مجاہد ملت نے سوچا وہ خود انہیں کا فکر تھا اور جو اقدام کیا وہ خود مجاہد ملت کا فیصلہ تھا۔

جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس ۱۹۲۹ء میں قصبہ امروہہ ضلع مراد آباد میں ہو رہا تھا' احقر اس زمانہ میں مراد آباد کی مشہور درس گاہ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں درس و تدریس کی خدمات انجام دے رہا تھا مراد آباد ضلع کا صدر مقام ہے اور قصبہ امروہہ مراد آباد سے تقریباً اٹھارہ میل کے فاصلہ پر ہے اس لیے مراد آباد کے حضرات بھی اس اجلاس کے داعی اور ذمہ داروں میں شامل تھے۔ مگر احقر اس وقت تک صرف ایک مدرس تھا۔ جس کو اس کے اکابر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند) اور حضرت

الاستاذ مولانا اعزاز علی صاحب (سابق شیخ الفقہ والادب دارالعلوم دیوبند) نے چند ماہ پہلے مدرسہ حنفیہ آرہ' شاہ آباد (صوبہ بہار) سے منتقل کر کے بھیجا تھا۔

البتہ جذبہ صادق نے اس احقر کو حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب مدظلہ العالی اور حضرت مولانا قاری عبداللہ صاحب مرحوم کی پارٹی کا ایک رکن یا ایک رضا کار بنادیا تھا اور اس بنا پر اس اجلاس سے احقر کا تعلق صرف وزیٹر یا تماشائی کا نہیں تھا۔ بلکہ یہ حیثیت ہوگئی تھی کہ ایک مبصر کی طرح قریب سے قریب ہو کر حالات کا جائزہ لے سکے ابھی اجلاس میں تقریباً دو ہفتے باقی تھے کہ اخبارات نے اپنے لاکھوں ناظرین کو آگاہ کردیا کہ:

''جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس امروہہ میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب تحریک آزادی میں شرکت سے متعلق تجویز پیش کریں گے۔''

گردش لیل ونہار کے نتائج بھی عجیب وغریب ہوا کرتے تھے۔ تحریک آزادی میں شرکت کی تجویز جو اس وقت آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی باعزت زندگی کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے ۱۹۲۹ء کے ماحول میں انوکھی اجنبی' بھیانک اور بعض حلقوں میں نفرت انگیز اور وحشت آفرین تھی۔ کیونکہ آٹھ نو سال کے واقعات نے ہندوستان کی فضا کچھ ایسی بنادی تھی کہ آزادی غیر متوقع ہی نہیں رہی تھی بلکہ ایک بڑا طبقہ وہ تھا جو تحریک آزادی کو خودکشی کے مرادف سمجھنے لگا تھا۔

وہ کثیر تعداد جو تحریک خلافت ۱۹۱۷ء تا ۱۹۲۲ء میں سرگرم رہ چکی تھی۔ وہ آزادی کی حامی تھی مگر اس کے سامنے بھی ایسی معقول وجوہات تھیں جن کی بنا پر وہ اب تحریک آزادی میں شرکت کے لیے کچھ شرائط ضروری سمجھتی تھی۔

مہاتما گاندھی نے ۱۹۲۲ء میں جب کہ تحریک شباب پر تھی اور بہت بڑی اکثریت کامیابی کو یقینی سمجھتی تھی ''چوری چورا'' کے واقعے سے متاثر ہو کر تحریک کو ختم کردیا تھا۔

مہاتما گاندھی کے اس فعل سے جو شکوک پیدا ہوئے تھے تقریباً چالیس سال گزر گئے ان کا ازالہ نہیں ہوسکا۔

اعتراض کرنے والے تو گاندھی جی کی نیت پر بھی شک ظاہر کیا کرتے تھے کہ مسلمانوں کی پیش قدمی گاندھی جی کو پسند نہیں تھی۔ لیکن خود گاندھی جی نے جو وجہ بیان کی وہ بھی سی۔ آر۔ داس جیسے لیڈروں کو مطمئن نہیں کرسکی۔

گاندھی جی نے تحریک کی بنیاد ''اہنسا'' اور عدم تشدد پر رکھی تھی گاندھی جی کا عذر یہ تھا کہ ''چوری چورا'' میں چھ کانسٹیبلوں کو قتل کر کے عوام نے ظاہر کر دیا ہے کہ ''اہنسا'' کی تحریک چلانے کی صلاحیت ابھی ان میں پیدا نہیں ہوئی ہے۔

اب مولانا آزاد کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے۔ مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں:

''گاندھی جی کے علاوہ اور سب لیڈر (خود مولانا موصوف بھی) جیل میں تھے۔ گاندھی جی نے ''چوری چورا کے حادثے کی وجہ سے تحریک کو معطل کر دیا۔ سیاسی حلقوں میں اس کا شدید ردعمل ہوا اور سارے ملک میں شکست کی فضا پیدا ہوئی۔ مسٹر سی۔ آر۔ داس کو یقین تھا کہ تحریک بند کرنے میں گاندھی جی نے ایسی غلطی کی ہے، جس سے شدید نقصان ہوگا۔ اس نے سیاسی کام کرنے والوں کی ہمتیں پست کر دی ہیں کہ اب پبلک میں جوش برسوں تک پیدا نہ کیا جا سکے گا۔''

مختصر یہ کہ ایک طبقہ وہ تھا جو اگرچہ تحریک آزادی کا حامی تھا، مگر اس کو گاندھی جی کی قیادت پر اعتماد نہیں تھا اسے خطرہ تھا کہ یہ مہاتما اپنے مخصوص عقیدے کی وجہ سے کسی بھی مرحلے پر بلا استصواب و بلا مشورہ تحریک بند کرنے کی پرانی غلطی دوبارہ لوٹا سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی ظاہری اور قدرتی حقیقت تھی کہ انگریزی حکومت چونکہ اس تحریک کا نشانہ تھی تو لازمی بات تھی کہ انگریزی حکومت اور انگریز اپنے جملہ ذرائع عوام کو تحریک آزادی سے برگشتہ کرنے میں صرف کرتے چنانچہ ان کا یہ عمل پوری قوت سے جاری تھا۔

مختصر یہ کہ ۱۹۲۹ء میں چند طبقے وہ تھے جو تحریک کے مخالف تھے اور ان کی کوشش یہ تھی کہ اگر ممکن ہو تو وہ زبانیں کھینچ لی جائیں اور وہ حلقوم ذبح کر دیئے جائیں جن سے نعرہ آزادی بلند ہو۔

۱۔ انگریز

۲۔ انگریزوں اور ان کی حکومت کے بہی خواہ

۳۔ وہ طبقہ جو تحریک خلافت کی ناکامی سے اتنا مایوس ہو گیا تھا کہ اب اس جدوجہد کو عبث اور بیکار محض سمجھتا تھا۔

۴۔ وہ طبقہ جو اگرچہ محب وطن اور حریت پسند تھا۔ تحریک آزادی کے لیے قربانیاں بھی پیش کر سکتا تھا لیکن شرکت تحریک سے پہلے چند شرطیں تسلیم کرا لینی ضروری سمجھتا تھا۔

ان سب کے برخلاف ایک جماعت وہ تھی جو آزاد ہندوستان میں ہر ایک فرقہ اور ملت کی باوقار زندگی کے لیے ایک فارمولے کی ضرورت تو ضرور محسوس کرتی تھی لیکن اب جب کہ جنگ آزادی شروع ہو رہی ہے اور انگریز اور اس کے تمام ہوا خواہ اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں اور یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ اس پر آشوب فضا میں کوئی فارمولا متفقہ طور پر طے ہو جائے اور یہ بات قطعاً ممکن ہے بلکہ یقینی ہے کہ مسٹر جناح نے اگر ۱۴ نکات پیش کیے ہیں تو جیسے ہی ان ۱۴ نکات کی منظوری کا وقت آئے اسی شدومد سے ۱۶ نکات کا کوئی دوسرا فارمولا ابھر کر سامنے آ جائے اور جب یہ چکر چل رہا ہو تو انگریز کی موجودگی میں آزادی کی جنگ کبھی شروع نہیں ہو سکے گی اور اگر شروع ہو گی تو مسلمان اس میں شرکت نہیں کر سکیں گے جو نتیجہ کے لحاظ سے مسلمانوں کی سیاسی موت ہو گی۔

اس جماعت میں وہ رہنما شریک تھے جن کو نیشنلسٹ اور قوم پرور کہا جاتا تھا اور ان میں بھاری اکثریت علماء کرام کی تھی۔ ان حضرات کے گہرے غور و فکر نے ایک اور سوال بھی ان کے سامنے رکھا تھا۔

سوال یہ تھا کہ گذشتہ چند سال کے واقعات نے اگرچہ مسلمانوں کو تحریک آزادی سے الگ کر دیا اور مہاتما گاندھی کی شخصیت بھی ان میں اس درجہ مقبول نہیں رہی ہے مگر یہی تحریک ہندوؤں کے بڑے حلقے میں جڑ پکڑ چکی ہے اور گاندھی جی نے اس حلقے میں یہ مقبولیت حاصل کر لی ہے کہ وہ صرف اونچے درجے کے رہنما یا لیڈر نہیں رہے' بلکہ ان کا شمار ہندوستان کے رشیوں میں ہونے لگا ہے۔ یہاں تک کہ نام سے زیادہ ''مہاتما'' کا خطاب مقبول اور زبان زد ہو چکا ہے۔

مہاتما گاندھی اپنی اس مقبولیت کی طاقت کے ساتھ تحریک شروع کر چکے ہیں اور ہندوستان کا ہر ایک شہر اور ہر ایک حلقہ اس سے متاثر ہو چکا ہے۔ تو کیا مسلمانوں کے مستقبل کے لیے یہ درست ہو گا کہ وہ محض تماشائی رہیں یا انگریز کے دست و بازو بن جائیں۔

جمعیۃ علماء ہند کا یہی اجلاس جس کا تذکرہ پہلے آ چکا ہے' اسی کی سبجیکٹ کمیٹی میں مولانا سید سلیمان صاحب جیسے مدبر مفکر نے تقریر فرماتے ہوئے کہا تھا۔

''انقلاب کی تحریک جب شروع ہو جاتی ہے تو تاریخ کی شہادت یہی ہے کہ وہ بے نتیجہ ختم نہیں ہوتی۔ بے شک اس کو مختلف حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کبھی

ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ نیست و نابود معلوم ہونے لگتی ہے لیکن اس کی خاک میں چھپی ہوئی چنگاریاں پھر دہکتی ہیں اور شعلہ بن کر مختلف طاقتوں کو نذر آتش کر دیتی تھیں۔ اب کیا مسلمان یہ پسند کریں گے کہ مخالف انقلاب طاقتوں کا ضمیمہ بن کر وہ بھی نذر آتش ہو جائیں یا ساحل پر کھڑے ہوئے طوفان کا تماشہ دیکھتے رہیں اور جب طوفان ختم ہو تو وہ اپنی سیاسی حیثیت بھی ختم کر چکے ہوں اور ان کا شمار بھی انہیں پسماندہ قوموں میں ہو جن کے لیے ہندوستان میں نفرت و حقارت کی پالیسی ہمیشہ کے لیے طے ہو چکی ہے۔''

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تقریر میں فقہی نقطہ نظر سے روشنی ڈالی اور ان چند علماء کی تردید کی جو انگریزوں کو ''اولی الامر'' کی حیثیت دے کر ان کے خلاف ''سول نافرمانی'' کی تحریک کو ناجائز فرما رہے تھے جن کی پشت پر ایک نواب صاحب اور چند سر صاحبان تھے جو علمائے دیوبند سے اپنے پرانے تعلقات کا واسطہ دیتے ہوئے اسی لیے شریک اجلاس ہوئے تھے کہ معاذ اللہ گمراہ مولویوں کو راہ راست پر لائیں۔

بھاؤ تاؤ اور لین دین کے نظریے سے آپ قوم پرور مسلمانوں اور علمائے کرام کے حق میں جو چاہیں فیصلہ کریں مگر حریت پسندی، عزت نفس، خودداری اور باوقار مستقبل کے جذبات کا تقاضا وہی تھا جس کی دعوت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے دی تھی۔ یہی سبب ہے کہ جو ''حوصلہ مند'' عمل کے وقت لیت و لعل کے عادی نہیں تھے ان کا تعلق خواہ کسی بھی مذہبی فرقہ اور مکتبہ خیال سے تھا وہ جمعیۃ علماء کے ساتھ ہو گئے تھے۔

اب یہ کہنا تو قطعاً غلط ہوگا کہ ابوالقاسم مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب کی تجویز نے حضرات علماء کو جنگ آزادی میں شرکت کی طرف متوجہ کیا کیونکہ اگر مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب تحریک نہ کرتے تب بھی جمعیۃ علماء ہند کا فیصلہ یہی ہوتا۔ البتہ یہ درست ہے کہ مولانا مرحوم کے اس اقدام نے حضرت علامہ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب۔ حضرت علامہ مولانا انور شاہ صاحب کاشمیری، حضرت علامہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت صوبہ بہار، حضرت علامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب رحمہم اللہ جیسے اکابر اور مشاہیر کی موجودگی میں نوجوان مولانا حفظ الرحمٰن کو قائدانہ حیثیت دے دی اور غالباً

اسی وقت سے آپ کو جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا رکن بنالیا گیا۔

اس موقع پر یہ عرض کر دینا بھی ایک تاریخی انکشاف ہے کہ جلسہء عام میں جس نے اس تحریک کی تائید کی وہ ہندوستان کے مشہور خطیب حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمہ اللہ تھے جن کی شعلہ بار تقریر نے جس کا سلسلہ تقریباً تین گھنٹہ تک جاری رہا تھا بہت سے دلوں کی دنیا بدل دی۔ جن میں سے ایک خود یہ راقم الحروف بھی ہے کہ پہلے صرف ایک گوشہ نشین مدرس تھا اور اب جنگ آزادی کا سپاہی بن گیا جس کو قید و بند اور دار و رسن کے خوب آنے لگے۔

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے تعلق اور علیحدگی:

مجاہدِ ملت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب نے تمام تعلیم خود اپنے وطن قصبہ سیوہارہ میں اور کچھ عرصہ جامعہء قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں حاصل کی۔ فراغت کے بعد آپ حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہء درس حدیث میں داخل ہونے کے لیے دیوبند تشریف لے گئے جہاں آپ نے دورہء حدیث مکمل کیا۔ اسی ایک سال کے مختصر قیام میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی بصیرت وفراست نے آپ کو دارالعلوم دیوبند کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ چنانچہ فراغت کے بعد ہی آپ کو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے پہلے مدراس بھیجا جہاں کسی مدرسہ میں درس کے ساتھ تبلیغ اور مناظرہ کی خدمت بھی آپ کے سپرد کی گئی اور جب آپ کی قابلیت کے جوہر میدان میں کھل کر سامنے آگئے تو اگلے سال آپ کو دارالعلوم دیوبند میں معین المدرسین کی حیثیت سے خدمت تدریس سپرد کر دی۔ مگر جب کچھ دنوں بعد دارالعلوم دیوبند میں تحریک اصلاح نے قوت اختیار کی تو آپ بھی حضرت علامہ کشمیری، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب وغیرہ اساتذہ دارالعلوم کے ناراض گروپ کے ساتھ ڈابھیل تشریف لے گئے۔ تقریباً تین سال وہاں جامعہ اسلامیہ میں قیام رہا اور جب ۱۹۲۹ء میں جنگ آزادی کا بگل بجا تو جیسے ہی آپ نے جنگ آزادی میں شرکت کی تحریک پیش کی جامعہء اسلامیہ ڈابھیل سے علیحدگی کا بھی تہیہ کر لیا۔ چنانچہ اس اجلاس سے چند ماہ بعد آپ گرفتار ہوئے اور میرٹھ سنٹرل جیل میں محبوس کر دیئے گئے۔

اس موقع پر آپ کو حضرت مولانا ابوالکلام آزاد سے تعلقات بڑھانے اور فیضِ صحبت

حاصل کرنے کا موقع ملا کیونکہ وہ بھی اسی جیل خانہ اور اسی احاطے میں تھے مگر وہ بیرک میں نہیں رہتے تھے بلکہ ایک چھولداری میں ان کا اسپیشل انتظام تھا۔

"رکھ رکھاؤ" اور عزلت جو مولانا آزاد کے مزاج پر غالب تھی وہ یہاں بھی کارفرما تھی۔ اس لیے خاص اوقات ہی میں مولانا سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ اگرچہ علمی مذاکرہ اور سیاسی بحث ونظر کے باعث وہ خاص خاص ملاقاتیں بھی کیمیا کا اثر رکھتی تھیں۔

میرٹھ کے مشہور وکیل پیارے لال شرما جو اپنے اخلاق و کردار' تہذیب و شرافت میں اپنی مثال آپ تھے جو ۱۹۳۷ء میں جب کانگریس نے پہلی مرتبہ منسٹری سنبھالی تو یوپی میں وزیر تعلیم بھی بنائے گئے تھے وہ بھی اسی جیل میں تھے۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے رات دن کے رفیق' ہم نفس اور ہمدم مولانا بشیر احمد صاحب بھٹہ تھے جن کو قدرت نے اسی جیل خانہ اور اسی بیرک میں اس لیے رکھا تھا کہ رات دن ہنستے رہیں اور دوسروں کو ہنساتے رہیں۔ افسوس اب یہ سب وفات پا چکے۔

آن قدح بشکست و آن ساقی نماند

اب کوئی ایسا بھی نہیں رہا جس سے کچھ مزید حالات معلوم کیے جاسکیں۔

(۴)

۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۲ء تک

۱۹۲۹ء میں گاندھی جی کے ڈانڈی مارچ' اور نمک سازی کی تحریک سے جنگ آزادی کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ گاندھی اروِن پیکٹ کے بعد مارچ ۱۹۳۰ء میں عارضی طور پر ملتوی کیا گیا۔ اس پیکٹ کے نتیجہ میں جتنے سیاسی قیدی جیلوں میں تھے' سب رہا کر دیے گئے۔ حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب موجودہ صدر جمعیۃ علماء ہند و شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند اور ان کا خادم یہ راقم الحروف اور ہمارے بہت سے ساتھی جو اکتوبر ۱۹۲۹ء میں گرفتار کیے گئے تھے اس عام رہائی سے بہرہ اندوز ہوئے کیونکہ ہماری سزا ایک ایک سال کی تھی اور ابھی تقریباً نصف مدت ہی ختم ہوئی تھی۔ مگر مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اس سے بہرہ یاب نہیں ہوئے کیوں کہ وہ ہم سے چند ماہ پہلے گرفتار ہوئے تھے' اور ان کی مدت سزا چھ ماہ تھی جو غالباً ۱۹۲۹ء کے آخر میں ختم ہو چکی تھی۔

مگر یہ رہائی پائیدار نہیں ثابت ہوئی۔ گول میز کی تجویز جو خداوندان برطانیہ کے پیش نظر تھی اور مقصود یہ تھا کہ گاندھی جی کو اس میں شریک کیا جائے جب تک یہ مقصود پورا نہیں ہوا۔ یہ صلح قائم رہی اور جب یہ کانفرنس ناکام رہی تو ابھی گاندھی جی ہندوستان لوٹنے بھی نہیں پائے تھے کہ نئے وائسرائے لارڈ ولنگڈن کی حکومت نے دارو گیر کی تیاریاں شروع کر دیں اور گاندھی جی کی واپسی کے بعد ابھی تین ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ حکومت نے گرفتاریاں شروع کر دیں اور اس طرح تحریک دوبارہ زندہ ہو گئی۔

اس مستقبل کا اندازہ قوم پرور طبقہ اور جنگ آزادی کے رہنماؤں کو پہلے سے تھا چنانچہ وہ بھی اس عرصے میں خاموش نہیں رہے۔ بلکہ تیاریاں کرتے رہے۔

جمعیۃ علماء ہند کا ادارہ حربیہ:

تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس موقع پر یہ بات خاص طور سے نوٹ کر لینی چاہیے کہ

جمعیۃ علماء ہند نے جب ۲۹ء میں جنگ آزادی میں شرکت طے کی تھی تو ساتھ ہی یہ بھی طے کرلیا تھا کہ اس کا پلیٹ فارم علیحدہ ہوگا۔ اس کے رضا کاروں کا نظام بھی علیحدہ رہے گا۔ گرفتاریوں کا پروگرام بھی جمعیۃ علماء ہند اپنے ارکان اور کارکنوں کے لیے علیحدہ بنائے گی اور اگر مقدمات وغیرہ کے سلسلے میں مصارف کی ضرورت ہوگی تو ان کا انتظام بھی جمعیۃ علماء اپنے طور پر کرے گی۔ کانگریس یا کسی اور پارٹی کی طرف نظر نہیں اٹھائے گی۔ اب ۱۹۳۲ء میں جب تحریک میں دوبارہ جان پڑی تو اس کو زندہ رکھنے کے لیے غذا کی ضرورت تھی۔ پروگرام کے مطابق سول نافرمانی کرتے ہوئے گرفتار ہوجانا تحریک کی غذا تھی۔

مگر اس مرتبہ اس غذا کا فراہم کرنا کانگریس اور ''جمعیۃ علماء'' دونوں کے لیے مشکل ہورہا تھا۔ کیونکہ اول تو مسلسل تین سال گزر جانے کے بعد کارکنوں کے جوش عمل میں اضمحلال پیدا ہوجانا ایک قدرتی امر تھا اس کے علاوہ ولنگڈن گورنمنٹ نے اس مرتبہ تحریک شروع ہونے سے پہلے ہی صف اول کے تمام لیڈروں کو گرفتار کرلیا تھا۔ مزید برآں ضبطی جائیداد اور گرفتاریوں کے سلسلے میں بھی حکومت کی پالیسی پہلے سے بہت زیادہ سخت ہوگئی تھی۔ ان تمام حالات کی بنا پر اگرچہ کام بہت مشکل ہوگیا تھا مگر ان حالات کا تقاضا یہ بھی تھا کہ تحریک کی رگوں اور پٹھوں میں تقویت کے انجکشن اس پردہ داری کے ساتھ لگائے جائیں کی سی آئی ڈی کی نظر تفتیش ان ڈاکٹروں تک نہ پہونچ سکے جو انجکشن کی موئیاں ہاتھ میں لیے ہوں۔

عام طور پر پروگرام یہ ہوا کرتا تھا کہ ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ رضا کاروں کے جتھے بھیجے جاتے تھے جو برسر عام قانون کی خلاف ورزی کرتے تھے اور گرفتار کرلیے جاتے تھے۔ عام طور پر دفعہ ۱۴۴/۸۸ کی خلاف ورزی بھی ہوجاتی تھی پولیس کی کوشش یہ رہتی تھی کہ وہ یہ معلوم کرے کہ رضا کاروں کا جتھا کہاں سے روانہ ہوگا۔ تاکہ روانگی سے پہلے ہی ان کو گرفتار کرلے اور یہ نہ ہوسکے تو جیسے ہی جتھا روانہ ہو فوراً گرفتار کرلے تاکہ شہر میں خلاف قانون اقدام کا مظاہرہ نہ ہوسکے۔

پورے ملک میں سول نافرمانی اور خلاف ورزی قانون کے اس نظام کو زندہ رکھنے کے لیے ایک مستقل نظام کی ضرورت تھی چنانچہ کانگریس نے جنگی کونسل قائم کردی تھی اور جمعیۃ علماء ہند نے اپنے اس نظام کے لیے عربی کا لفظ ''ادارہ حربیہ'' منتخب کیا تھا۔

وہ زمانہ بھی عجیب تھا۔

جمعیۃ علماء ہند کے صدر مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب اور ناظم اعلیٰ سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب تھے مگر وہ ڈاکٹر جس کو بہت سے انجکشن دے گئے تھے۔ ابوالمحاسن مولانا سجاد صاحب (نائب امیر شریعت صوبہ بہار) تھے۔ رحمہم اللہ ''ادارہ حربیہ'' کے کلید بردار یہی حضرت تھے۔

جمعیۃ علماء ہند کے دفتر سے علیحدہ محلہ بلی ماران کی ایک تاریک گلی میں ایک مکان لے لیا گیا تھا۔ حضرت مولانا سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قیام اسی مکان میں رہتا تھا۔ جس کا علم دفتر کے لوگوں میں سے بھی غالباً صرف قاضی اکرام الحق صاحب کو تھا۔ جماعت کے جو حضرات اسی ادارہ کی ضرورت سے حضرت موصوف سے ملاقات کرنا چاہتے تھے تو قاضی اکرام الحق صاحب ہی ان کے رہبر بنتے تھے۔

ہمیں یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ حضرت مولانا سجاد صاحب کے دست راست اور ''نفس ناطقہ'' یہی رفیق محترم مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ جن کو نظام رضا کاران کا ناظم اعلیٰ یا کمانڈر بنایا گیا تھا اور ان کا کام یہ تھا کہ ملک میں گھوم پھر کر تحریک کا جائزہ لیں اور اس نظام کو کامیاب بنائیں۔

وہ وقت یاد آتا ہے۔ احقر مدرسہ شاہی میں ملازم تھا، اور فاضل وقت اور بسا اوقات رخصت لے کر مدرسہ کا بھی وقت اسی تماشے میں صرف کیا کرتا تھا۔

مراد آباد میں خفیہ طریقہ سے مجاہد ملتؒ کی تشریف آوری کا پروگرام پہنچا۔ چند ساتھیوں کے ساتھ احقر استقبال کے لیے اسٹیشن پر حاضر ہوا۔

آج کل دہلی جنکشن سے ایک پاسنجر دس بج کر دس منٹ پر مراد آباد جاتا ہے۔ یہی پاسنجر اس زمانے میں بھی تقریباً اسی وقت دہلی سے روانہ ہوتا تھا اور تقریباً ساڑھے تین بجے مراد آباد پہنچا کرتا تھا۔ مجاہد ملت اسی ٹرین سے مراد آباد پہنچنے والے تھے۔ چنانچہ ٹھیک وقت پر پہونچے۔ مگر حسب معمول سادہ لباس میں ملبوس، کھدر کی شیروانی بھی کسی قدر بوسیدہ تھی۔ کچھ ظرافت پسند دوستوں نے عرض بھی کیا کہ کمانڈر صاحب کو تو فوجی لباس میں ملبوس ہونا چاہیے۔ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کا خاموش تبسم اس کا جواب تھا۔ مگر اس زمانے میں ایسے عہدوں کی عمر بہت کم ہوتی تھی۔

''اگر ماند شبے ماند، شبے دیگر نمی ماند''

چنانچہ چند روز بعد ہی مجاہد ملت گرفتار کر لیے گئے۔ مقدمہ چلا۔ لیکن مقدمہ کامیاب نہیں

ہوا۔ یعنی حضرت مجاہد ملت پر جرم ثابت نہ ہو سکا۔ اس مرتبہ مجاہد ملت رہا ہو گئے۔ البتہ اس اثنا میں احقر گرفتار ہو گیا۔

مولانا محمد میاں ؒ کی خدمات:

حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرے میں خصوصا اس موقع پر اپنا تذکرہ مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ مجاہد ملت ؒ کی حیثیت اس وقت آل انڈیا ہو چکی تھی۔ وہ کانگریس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر تھے اور نظام جمعیۃ علماء ہند میں وہ آل انڈیا جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے ممبر اور آل انڈیا جمعیۃ علماء ہند کے ادارہ حربیہ کے افسر انچارج یا کمانڈر تھے اور احقر کی حیثیت صرف یہ تھی کہ مدرسہ شاہی مراد آباد کا مدرس اور جمعیۃ علماء شہر مراد آباد کا ناظم تھا۔ اس موقع پر لفظ لیڈر استعمال کرنا درست ہو تو مختصر تعبیر یہ ہے کہ احقر مقامی لیڈر تھا اور مجاہد ملت ؒ آل انڈیا لیڈر تھے۔ مگر خوش قسمتی سے ایک مرتبہ جیل کاٹ چکا تھا اس بنا پر ایک خاص امتیاز حاصل ہو گیا تھا۔

دوسرا امتیاز یہ تھا کہ احقر کو جمعیۃ علماء ہند کا نواں ڈکٹیٹر نامزد کیا جا چکا تھا۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ اس زمانہ میں کانگریس خلاف قانون جماعت قرار دی جا چکی تھی۔ اور جمعیۃ علماء ہند کو اگر چہ انگریزی ڈپلومیسی نے خلاف قانون جماعت قرار نہیں دیا تھا (تاکہ خود انگریزی حکومت کے عمل سے اس کے اس دعوے کی تردید نہ ہو جائے کہ مسلمان تحریک آزادی میں شریک نہیں ہیں) مگر عمل جمعیۃ علماء ہند کے ساتھ ایسا ہی تھا جیسا کسی خلاف قانون جماعت کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ اس کے دفتر پر پولیس کے چھاپے پڑتے رہتے تھے۔ نمایاں کارکنوں کو گرفتار کر لیا جاتا تھا وغیرہ وغیرہ۔

ڈکٹیٹر شپ کا نظام:

بہر حال کانگریس اور جمعیۃ علماء ہند دونوں نے اس زمانے میں مجلس عاملہ اور صدر سیکریٹری وغیرہ کے عہدے ختم کر کے ''ڈکٹیٹر شپ'' قائم کر دی تھی۔ ڈکٹیٹر ہی نظام چلاتا تھا اور جب وہ گرفتار ہو جاتا تھا تو اپنی گرفتاری کے وقت اپنے جانشین ڈکٹیٹر کا اعلان کر دیتا تھا۔

ایسے حضرات کی فہرست خفیہ طور پر پہلے سے تیار کر لی گئی تھی جو ڈکٹیٹر بنائے جائیں اور ان کی ترتیب بھی مقرر کر دی گئی تھی۔ جہاں تک یاد آتا ہے حضرت علامہ مولانا محمد کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہند پہلے ڈکٹیٹر تھے۔ پھر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی

(رحمہما اللہ) سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب غالباً تیسرے ڈکٹیٹر تھے اور یہ بھی خیال آتا ہے کہ وہ پہلے گرفتار ہو چکے تھے اس لیے ان کا نام ڈکٹیٹروں کی فہرست میں نہیں آسکا تھا بہرحال احقر کو اپنے متعلق یہ بات یاد ہے کہ وہ جمعیۃ علماء ہند کا نواں ڈکٹیٹر تھا (اس زمانہ کا تمام ریکارڈ پولیس کے چھاپوں اور باقی ماندہ دیمک کی نذر ہو چکا' لہٰذا پختہ بات عرض کرنی مشکل ہے) علاوہ ازیں ایسی باتیں ریکارڈ میں رکھی بھی نہیں جاتی تھیں ان کو یا تو ذہن میں محفوظ رکھا جاتا یا انفرادی یادداشتوں میں۔ اور یہ شرف غالباً احقر کے لیے ہی مخصوص تھا کہ ساتھ ساتھ اترپردیش کانگریس کمیٹی (جو اس زمانے میں کانگریس کمیٹی صوبجات متحدہ تھی) اس کا بھی ڈکٹیٹر احقر ہی تھا۔

بہرحال حضرت مجاہد ملتؒ کے تذکرہ میں اپنا تذکرہ مناسب نہیں تھا مگر یہ ایک تاریخی حقیقت سپرد قلم کرنی تھی کہ اس زمانہ میں کانگریس اور جمعیۃ علماء دونوں کی طرف سے گرفتاری کے لیے ''ڈکٹیٹرشپ'' کا نظام قائم کیا گیا تھا۔ اس تاریخی انکشاف کے علاوہ ایک خاص لطیفہ بھی یہاں دلچسپی پیدا کر دیگا۔ لطیفہ ملاحظہ فرمایئے۔

ایک لطیفہ:

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اس نظام کی کلید حضرت ابوالمحاسن مولانا سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک میں تھی موصوف کی ہدایت اس احقر کے لیے یہ تھی کہ ہر ہفتہ جمعہ کی صبح کو مرادآباد سے چل کر دہلی پہونچا کرے اور نماز جمعہ کے بعد جامع مسجد میں تقریر کر کے واپس ہو جایا کرے۔

چند جمعے اس طرح گزرے' مرادآباد سے تقریباً ۵ بجے صبح کو گاڑی چلتی تھی (جیسا کہ آجکل بھی چلتی ہے) احقر اس ٹرین سے تقریباً ساڑھے دس بجے دہلی پہنچتا تھا۔ اسٹیشن پر ہی کوئی صاحب موجود رہتے جو احقر کو احتیاط سے طے کردہ مقام پر پہونچا دیتے تھے۔ پھر اسی احتیاط سے رقیبوں کی نظروں سے بچاتے ہوئے جامع مسجد پہنچاتے اور تقریر کے فوراً بعد اسی احتیاط سے کسی صاحب کی رہنمائی میں صوبہ دہلی کی حدود سے باہر پہونچا دیتے تھے۔ پولیس جب تلاش کرتی تو اس کو اپنی ناکامی پر کافی جھنجلاہٹ ہوا کرتی تھی۔

مولانا محمد میاںؒ کی گرفتاری:

جمعہ کا دن تھا۔ احقر حسب ہدایت مراد آباد سے دہلی پہونچا۔ اس روز پولیس پوری طرح چوکنی تھی اور احقر کی گرفتاری کا سامان اس نے مکمل کر رکھا تھا۔ حضرت مولانا سجاد صاحب کو اس کا علم تھا۔ مولانا موصوف نے نماز جمعہ کے لیے احقر کو خفیہ راستوں سے روانہ فرمایا تو احقر کے رہبر قاضی اکرام الحق صاحب کو تاکید کر دی کہ نماز کے بعد جنوبی دروازہ سے احقر کو نہ نکالیں۔ اس طرف پولیس چوکی ہے اور آج چوکی کے علاوہ بھی پولیس کا انتظام ہے بلکہ شمالی دروازہ کے سامنے تانگہ تیار رکھیں اور اسی راستہ سے نکال کر لائیں۔ اس طرف پولیس نہیں ہوگی۔

قاضی اکرام الحق صاحب سہو اور نسیان کے پرانے مریض ہیں یہاں بھی وہ اس ہدایت سے ایسے غافل ہوگئے کہ خاص طور پر ممنوعہ راستہ ہی پر تانگہ کا انتظام کیا۔ یعنی جنوبی پھاٹک سے ہی احقر کو لے کر آئے جہاں پولیس کی چوکی ہے پھر راستہ بھی چاوڑی بازار کے علاوہ چاندنی چوک کی طرف کا اختیار کیا۔ چنانچہ جیسے ہی کوتوالی کے سامنے تانگہ پہونچا سی آئی ڈی کے سب انسپکٹر نے جو جامع مسجد سے ہی تانگہ کے پیچھے لگ لیا تھا اور اطمینان سے اپنی سائیکل پر ہمارے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا۔ اس سب انسپکٹر نے تانگہ رکوا لیا اور احقر کو پورے اعزاز کے ساتھ تانگہ سے اتار کر حوالات میں پہونچا دیا۔

اس حوالات میں مولانا منت اللہ صاحب موجودہ امیر شریعت صوبہ بہار صبح سے قیام پذیر ہو چکے تھے اور چند ساتھی اور بھی تھے جو اسی روز یا اگلے روز آئے۔

غالباً اگست کا مہینہ تھا۔ شدید گرمی' حوالات سب طرف سے بند نہ کوئی روشن دان نہ کھڑکی صرف ایک جانب مین دروازہ کے دو طرف جنگلے تھے۔ مگر سامنے چوڑا برآمدہ تھا جس کی وجہ سے یہ جنگلے بھی ہوا سے ناآشنا رہتے تھے۔

پیشاب پاخانہ کے لیے صبح کو ۸ بجے ایک گھنٹہ کے لیے کھولا جاتا تھا باقی ۲۳ گھنٹہ اسی کمرے میں بند رہتے تھے۔ یہیں وضو بھی کیا جاتا تھا۔ پانی نکلنے کی کوئی نالی نہیں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وضو کا پانی کمرہ ہی میں بھرتا رہا۔ حسن اتفاق یہ تھا کہ کمرہ میں ڈھال کافی تھا پانی اسی ڈھال

میں رہتا تھا۔ رفتہ رفتہ صورت یہ ہوگئی کہ کمرہ کے نصف حصہ میں پانی بھر گیا اور نصف حصے میں ہمارے چھ یا سات ساتھیوں کے بستر تھے اور پرلطف بات یہ تھی کہ اسی تھانہ ''کوتوالی'' کے سب انسپکٹروں میں ایک بزرگ سید اصغر حسین صاحب بھی تھے جو احقر کے چچا زاد برادر محترم تھے۔ ان کو صدمہ تھا کہ میرا بھائی (محمد میاں) کانگریسیوں کے چکر میں آ کر گمراہ ہوگیا۔

افسوس اب ان کی بھی وفات ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ ایک ہفتہ کے بعد ہمیں حوالات سے نجات ملی اور ۶ ماہ کے لیے دہلی میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔

اگست کے مہینہ میں اس حبس بے جا کا اثر یہ ہوا کہ تمام ساتھیوں کو کچھ عوارض لاحق ہوگئے۔ احقر کو پیچش ہوگئی۔

احقر دہلی سے رہا ہوکر دیوبند پہنچا' جہاں والدہ صاحبہ اور احقر کے متعلقین تھے۔ پھر فورا ہی مراد آباد چلا گیا۔ جہاں صوبہ یوپی کانگریس کمیٹی کے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے گرفتاری کا پروگرام طے تھا۔ سی آئی ڈی احقر کی تفتیش میں رہی ہوگی اور ممکن ہے اس کو حیرت ہوئی ہو جب احقر دفعتہً مراد آباد کے چوک بازار میں اس حالت میں نمودار ہوگیا کہ ایک ہاتھ میں کانگریس کا جھنڈا تھا۔ دوسرے میں جمعیۃ علماء ہند کا!

ایک عزیز دوست پنجابی سوداگر حافظ محمد شفیع صاحب نے آگے بڑھ کر سنہری ہار گلے میں ڈالا جس کو احقر نے منظور کیا۔ کیونکہ ہار پہننے اور پہنانے کے لیے اس سے بہتر وقت کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ چند منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ حاضرین کے اجتماع نے جلوس کی شکل اختیار کر لی اور اب یہ جلوس جس کی قیادت محمد میاں کر رہا تھا (جس کے دونوں ہاتھ اس طرح گھرے ہوئے تھے کہ ایک ہاتھ میں ایک جھنڈا تھا اور دوسرے میں دوسرا اور گلے میں (قرآن شریف) امروہہ گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی تقریباً ایک فرلانگ چلا تھا کہ پولیس کے دستے نے آ کر محاصرہ کر لیا۔ احقر کو گرفتاری کا حکم سنا کر اپنی تحویل میں لے لیا اور مجمع کو منتشر کرنے کے لیے لاٹھی چارج شروع کر دیا۔

احقر حوالات میں پہونچا تو تھوڑی دیر بعد حافظ شفیع الدین صاحب بھی در آمد ہوئے۔ جرم یہ تھا کہ کانگریس اور جمعیۃ کے ڈکٹیٹر کو ہار کیوں پہنایا تھا۔ پھر ابھی انگریزی حساب سے یہ تاریخ ختم نہیں ہوئی تھی یعنی رات کے بارہ نہیں بجے تھے کہ مراد آباد کانگریس کے تمام سربراہ

جن کی تعداد ستر ہ تھی گرفتار کر کے احقر کے ساتھی بنا دیئے گئے۔

چند روز مقدمہ ہوا۔ چھ ماہ کی سزا با مشقت کلاس ''سی'' اور مشقت میں احقر اور موجودہ کین ڈویلپمنٹ منسٹر یو پی (داؤ دیال کھنہ کو چکی دی گئی' لیکن حکیم انظار احمد صاحب وغیرہ نے (جو گرفتاری سے محفوظ تھے) فوراً دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ یو۔ پی کے گورنر صاحب رخصت لے کر یورپ گئے ہوئے تھے اور ان کی جگہ نواب احمد سعید خاں صاحب آف چھتاری' فرائض گورنر انجام دے رہے تھے۔ منسٹر وغیرہ اس زمانے میں برائے نام ہوتے تھے۔ جملہ اختیارات گورنر ہی کو ہوا کرتے تھے۔ بہر حال نواب صاحب کو جیسے ہی توجہ دلائی گئی احقر اور داؤ دیال کھنہ اور چند ساتھیوں کا درجہ سی کے بجائے ''بی'' کر دیا تیسرے ہی دن اس کے آرڈر آ گئے اور ہمیں جس طرح (سی کلاس) سے نجات ملی۔ چکی کی مشقت سے بھی نجات مل گئی۔

(۵)

گھنٹہ گھر (دہلی) پر کانگریس کا خلافِ قانون جلسہ

۱۹۳۲ء میں تحریک کی حالت پر گفتگو ہو رہی تھی۔ احقر نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور حضرت مولانا کے تذکرے میں اپنے تذکرے کا بھی پیوند لگا دیا۔ ناظرین محترم اس جرأت کو معاف فرمائیں اس کا کفارہ یہ ہے کہ حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی حیات طیبہ کا ایک نہایت عجیب واقعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ ناظرین کرام محظوظ ہوں گے۔

کانگریس کے سالانہ اجلاس:

انڈین نیشنل کانگریس کمیٹی اور اس کی تمام شاخیں خلاف قانون تھیں، کہیں کوئی اجلاس نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے باوجود کانگریس نے طے کیا کہ اس کا سالانہ اجلاس حسب معمول ہو گا۔

صدر کا انتخاب کیا گیا تاریخ مقرر کی گئی۔ وقت بھی مقرر کر دیا گیا اور نہایت دلچسپ بات یہ ہے کہ اجلاس کا مقام دہلی کا گھنٹہ گھر تجویز کیا گیا جو چاندنی چوک جیسے صدر مقام پر تھا جو اس زمانے میں دہلی کا سب سے زیادہ پر رونق بازار تھا، جہاں سے چند قدم کے فاصلے پر دہلی کا سب سے بڑا تھانہ کوتوالی ہے۔

انڈین نیشنل کانگریس کمیٹی کا یہ اجلاس حکومت اور کانگریس دونوں کے لیے وقار اور عزت کا سوال بن گیا تھا۔ حکومت کی طے کردہ پالیسی یہ تھی کہ یہ اجلاس نہیں ہو گا، اس نے اپنی پالیسی کو کامیاب بنانے کے لیے پورے ہندوستان کی سی۔ آئی۔ ڈی کو سرگرم بنا دیا تھا۔ ریلوے اسٹیشنوں پر سی۔ آئی۔ ڈی، ویٹنگ روم میں سی۔ آئی۔ ڈی، ٹرین کے ڈبوں میں سی آئی ڈی، تاکہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر سفر نہ کر سکیں۔ دہلی کے گلی کوچوں میں سی آئی ڈی کے جتھے موجود، دہلی کے چپہ چپہ پر سی آئی ڈی کی نظر۔

اجلاس کے مقررہ وقت میں چند منٹ باقی رہ گئے تھے۔ گھنٹہ گھر کے آس پاس نہ میز کرسیاں تھیں، نہ فرش فروش، نہ رضا کار اور والنٹیر، نہ کوئی ممبر سی۔ آئی۔ ڈی مطمئن ہو گئی کہ پالا

مار لیا اور کانگریس کو شکست فاش دے دی۔

لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اسی پولیس اور سی آئی ڈی کی آنکھوں کے سامنے آس پاس کی گلیوں کوچوں سے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبروں کی آمد شروع ہوئی اور ایک جھپکے میں ان کی اتنی تعداد اکٹھی ہوگئی کہ باوردی اور بے وردی پولیس جو وہاں موجود تھی اپنی تعداد کو ناکافی سمجھنے لگی۔ مزید پولیس بلانے کے لیے کوتوالی کی طرف آدمی دوڑائے۔

آل انڈیا کانگریس کے ممبران جو دفعتہً یہاں برآمد ہوگئے تھے' انہوں نے ٹھیک گھنٹہ گھر کے نیچے اپنا اجلاس شروع کر دیا۔ انقلاب زندہ باد ہندوستان آزاد ہو' مہاتما گاندھی کی جے ہو' کانگریس زندہ باد' یہ سب نعرے خلاف قانون تھے۔ یہاں پہلے یہ نعرے اتنی زور سے لگائے گئے کہ آسمان گونج گیا۔

پھر صدر نے حلف نامہ آزادی پڑھا۔ تجویز آزادی پیش کی جو بالاتفاق منظور ہوئی۔ پھر جلسہ بخیر وخوبی ختم کر دیا گیا۔ ابھی پولیس پہونچنے نہیں پائی تھی کہ یارانِ شاطر اور ممبرانِ چست وچالاک اپنا کام پورا کرکے منتشر بھی ہو چکے تھے۔

پولیس پہونچی تو میدان خالی تھا۔ لاکھوں روپیہ جو اس اجلاس کے روکنے کی تدبیروں پر صرف ہوا تھا' بیکار ہوگیا اور سی آئی ڈی کا کام ختم ہونے کے بجائے پہلے سے زیادہ بڑھ گیا۔ رسوائی' بدنامی اور ناکامی انعام میں ملی۔

اس قصے کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یارانِ تیز گام اور ممبرانِ شاطر' جنہوں نے اپنی بہترین ہوش مندی' حاضر حواسی' چستی اور پھرتی سے اس اجلاس کو کامیاب بنایا۔ ان میں ہمارے محترم مجاہد ملت بھی تھے۔ رحمہ اللہ

مجاہد ملت کا دہلی پہنچنا:

اس زمانے میں مجاہد ملت کا دہلی قیام نہیں تھا۔ غالباً آپ اپنے وطن عزیز سیوہارہ سے تشریف لائے تھے۔ سیوہارہ میں پولیس کو یہی یقین رہا کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ممبر کانگریس کمیٹی یہیں قیام فرما ہیں۔ مگر آپ نے کھدر کے لباس کو گٹھری میں باندھا۔ لٹھے کا پاجامہ' ولایتی کپڑے کی شیروانی زیب تن کی۔ جے پوری صافہ جے پوری انداز میں سر پر باندھا عمدہ چھڑی ہاتھ میں۔ بقول قاضی اکرام الحق صاحب' ایک نواب کی شان سے دہلی کے اسٹیشن پر

اترے۔ قاضی اکرام الحق صاحب اسٹیشن پر موجود تھے یہ مولانا کو دیکھ کر ان کی طرف بڑھنے لگے تو فوراً اشارہ سے روک دیا۔ گیٹ پر سی۔ آئی۔ ڈی موجود تھی۔ مگر اس کو سیوہارہ سے روانگی کی اطلاع نہیں ملی تھی اور اس وقت جو ایک داڑھی والا مولوی نما نوجوان نوابی شان سے اس کے سامنے سے گزر رہا تھا' اس کے متعلق یہ وہم وگمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ یہ وہی حفظ الرحمٰن ہوگا جو ہمیشہ کھدر میں ملبوس رہتا ہے۔

۱۹۳۵ء کا ایکٹ اور انتخابات:

تحریک کا جو سلسلہ ۱۹۲۸ء کے اواخر میں شروع ہوا تھا ۱۹۳۵ء میں اس کا خاتمہ تو نہیں ہوا البتہ اس کا رخ بدل گیا۔

انڈیا ایکٹ ۳۵ء میں بہت کچھ اختیارات مرکزی اسمبلی اور صوبائی کونسلوں کو دے دیئے گئے تھے۔ مگر مکمل آزادی کا مطالبہ ابھی بہت کچھ تشنہ تھا۔ کانگریس نے اپنی پرانی تاریخ دہرائی۔ ۲۲ء والا یہ سوال پھر سامنے آیا کہ ایکٹ کو اپنا کر اس کے بموجب وزارتیں بنائی جائیں یا نہیں؟ ایکٹ پر عمل درآمد کے لیے انتخابات کی ضرورت تھی کیونکہ انتخابات کے بعد ہی کونسلیں اور مرکزی اسمبلی قائم ہوسکتی تھی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مسلم لیگ' جمعیۃ علماء ہند سے بغل گیر ہوئی اور اس نے کانگریس کے سامنے بھی نیاز مندی کا اظہار کیا۔ کیونکہ اس عرصے میں اگرچہ حریت پسند مسلمانوں پر اعتراضات کیے جاتے رہے تھے۔ مگر مسلم لیگ کے قائد خصوصاً مسلم لیگ کے قائد اعظم جناح صاحب یہ دیکھ رہے تھے کہ تحریک نے صرف ہندوؤں ہی کو نہیں بلکہ مسلمانوں کو بھی بہت زیادہ متاثر کر دیا ہے اور انتخابات اگرچہ جداگانہ ہیں مسلمان نمائندوں کا انتخاب صرف مسلمان ہی کریں گے لیکن پھر بھی وہ سمجھتے تھے کہ قوم پرور مسلمانوں نے اگر اپنا محاذ الگ بنالیا تو مسلم لیگ کے لیے مقابلہ مشکل ہوگا۔

چنانچہ مسٹر جناح جمعیۃ علماء ہند کی طرف اس قدر لپکے کہ بلا کسی دعوت کے خود جمعیۃ علماء ہند صوبہ دہلی کے اجلاس عام میں جو دہلی میں ہو رہا تھا تشریف لانے کی خواہش ظاہر کی۔ یہ بدخلقی علمائے کرام میں نہیں تھی کہ اجلاس عام کا دروازہ ایک جماعت کے سربراہ پر بند کر دیتے' چنانچہ پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔

مسٹر جناح کے اس اقدام کا اثر یہ ہوا کہ انہوں نے مسلمانوں کے قوم پرور طبقہ کو لیگ کی

طرف کھینچ لیا اور ان کو اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ الیکشن کے لیے علیحدہ محاذ قائم کریں۔ اور جب قوم پرور مسلمانوں سے رابطہ قائم ہوا تو کانگریس سے بھی عملی طور پر تعاون کا رشتہ قائم ہو گیا۔ اس وقت مسٹر رفیع احمد قدوائی مرحوم کانگریس کی طرف سے یو۔ پی۔ میں الیکشن کے انچارج تھے اور چودھری خلیق الزماں صاحب جو قوم پرور مسلمانوں میں شمار ہوتے تھے لیگ کی طرف سے انچارج تھے۔ ان دونوں میں شخصی اور ذاتی طور پر گہرا رابطہ تھا اور جماعتی حیثیت میں نجی طور پر یہ طے تھا کہ جہاں مسلم حلقوں میں کانگریس کسی مسلمان کو کھڑا کرے گی وہاں مسلم لیگ نہیں کھڑا کرے گی گویا آپس میں عملی طور پر مقابلہ نہ کرنے کا معاہدہ ہو گیا تھا۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسٹر جناح مرحوم کی یہ تدبیر کامیاب رہی اور جب انتخابات ختم ہوئے تو قوم پرور مسلمانوں کا کوئی پلیٹ فارم نہیں تھا۔ اب پلیٹ فارم صرف دو رہ گئے تھے۔

(۱) کانگریس اور (۲) مسلم لیگ

ان جماعتوں اور پارٹیوں کا اتحاد یا عملی تعاون کیوں ختم ہوا۔ یہ ایک طویل داستان ہے اور موضوع کلام سے غیر متعلق ہے۔

دو قومی نظریے کا آغاز:

حضرت مجاہد ملتؒ سے تعلق رکھنے والی بات تو یہ ہے کہ اس دور میں مجاہد ملتؒ جماعت کے ایک نمایاں اور ممتاز فرد کی طرح کام کرتے رہے، لیکن جماعت میں آپ کی حیثیت رہنما کی ابھی نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اس سلسلے میں پیش پیش محترم مولانا بشیر احمد صاحب (بھٹہ) رحمہ اللہ تھے۔ البتہ اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ وہ نقطۂ نظر جو مجاہد ملت رحمہ اللہ کی مساعی جمیلہ کا محور و مرکز بن گیا۔ اس کا آغاز اسی دور میں ہوا تھا۔ یعنی دو قومی نظریہ کا آغاز اسی دور میں ہوا۔ جس کو برطانوی سامراج کی حمایت اور تائید حاصل تھی جب کہ تقریباً چالیس سال پہلے سے یعنی جب سے ہندوستانیوں کو لوکل باڈیز میں کچھ اختیارات سپرد کیے گئے تھے تو انگریز بہادر نے جداگانہ انتخاب کا دستور قائم کر کے ذہنوں میں علیحدگی پسندی اور تفریق کے جراثیم پیدا کر دیئے تھے۔ یہ مسموم ذہن دو قومی نظریہ کی تائید کے لیے پہلے سے آمادہ تھے۔ چنانچہ جیسے ہی ایک قوم یا دو قوم کی بحث شروع ہوئی بہت تیزی کے ساتھ تمام ہندوستانی دو پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے۔

یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ صرف مسلمانوں ہی نے اس کو قبول کیا بلکہ ہندوؤں کی اکثریت بھی اگرچہ زبان سے نہیں کہتی تھی مگر دل سے اس کی حامی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو پریس نے مطالبہ تقسیم کو جو ۴۲ء تک ایک لغو خیال تصور کیا جاتا تھا اتنی اہمیت دی کہ وہ نہ صرف ایک معقول مطالبہ سمجھا جانے لگا۔ بلکہ غیر معمولی جذبات کی پشت پناہی اس کو حاصل ہوگئی۔

یہ اکثریت کانگریس سے باہر ہندو مہاسبھا' راشٹریہ سیوک سنگھ اور جن سنگھ کی صورت میں نمودار ہوئی اور کانگریس کے اندر اس کا ظہور اس وقت ہوا جب کانگریس ہائی کمانڈ کو بھی اس کی رضا جوئی کے لیے مطالبہ تقسیم کے سامنے جھکنا پڑا۔ بے شک روپ جدا جدا تھے مگر ذہنیت ایک ہی تھی۔ کانگریس میں انگریزی سامراج سے جلد ہی چھٹکارا پانے کو بہانہ بنایا گیا کہ اگر اس وقت مطالبہ تقسیم منظور نہ کیا جاتا تو آزادی پندرہ سال پیچھے پڑ جائے گی۔ ہندو مہاسبھا اور جن سنگھ وغیرہ نے ہندو اسٹیٹ کو نصب العین قرار دے کر اس ذہنی یکسانیت کا ثبوت دیا۔

اس موقعے پر اس بے موسم اظہار حقیقت کا مقصد صرف یہ ہے کہ نظریہء دو قوم جیسے ہی سامنے آیا فوراً ایک ایسا محاذ قائم ہوگیا جو جنگ آزادی کے محاذ سے کہیں زیادہ سخت تھا۔

جنگ آزادی انگریزوں سے تھی۔ جن کی حمایت کا دائرہ انگریزوں تک محدود تھا یا ان گنے چنے افراد تک جو جذبہ حریت سے بیگانہ تھے اور صرف اپنی زندگی بنانا ان کا نصب العین تھا۔ اس کے برعکس دو قومی نظریہ کا محاذ وہ تھا جہاں خود اپنوں سے مقابلہ تھا۔ یہاں تک کہ بہن بھائی جیسے عزیز و اقارب تو عموماً اس نظریہ کی بنا پر ایک دوسرے کے حریف ہوگئے تھے اور ایسی نظیریں بھی بے شمار تھیں کہ ماں باپ اور اولاد بھی دو محاذوں پر تقسیم ہو کر ایک دوسرے کے مقابل آگئے تھے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی ؒ کا یہ مشہور ارشاد جس نے عام محاورہ کی حیثیت حاصل کر لی اسی موقع پر صادر ہوا تھا۔

دہلی کے ایک جلسہ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ ''قومیں اوطان سے بنتی ہیں'' غالب خیال یہ ہے کہ برطانیہ کا ڈپلومیٹک حلقہ پشت پر تھا اور اسی کے ایما پر یہ سوال حضرت شیخ الاسلام ؒ سے کیا گیا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی حضرت موصوف کی زبان مبارک سے یہ جملہ صادر ہوا' اگلے ہی دن سے اس کی تردید اس قوت سے شروع کر دی گئی کہ جیسے کوئی گولے بارود کا میگزین آگ کی ایک چنگاری کا منتظر تھا۔

بہر حال شیخ الاسلام ؒ کے اس جملہ کو مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ نے غالباً اپنی زبان سے کبھی نہیں دہرایا۔ لیکن ایک نظریے کی حمایت اسی شدومد سے شروع کر دی جو ایک مجاہد کی شان ہو سکتی ہے۔

دوقومی نظریے کا ثمرہ تلخ، تقسیم ہندوستان اور مطالبہ پاکستان تھا' چنانچہ جیسے جیسے دوقومی نظریے کی حمایت بڑھتی رہی تقسیم ہند کا مطالبہ مضبوط ہوتا رہا۔

فراست مومن:

حدیث شریف میں ''فراست مومن'' کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے یہ نورِ حق کا پرتو ہوتی ہے۔ مومن نور خداوندی کی روشنی میں مستقبل کو دیکھ لیتا ہے۔

۴۰ء سے لے کر ۴۷ء تک کے پرآشوب ہنگامی دور میں جس بے جگری' والہانہ سرگرمی اور بے انتہا جرأت و ہمت کے ساتھ جان کی بازی لگا کر حضرت مجاہد ملت قدس اللہ سرہ العزیز نے تقسیم ہند اور پاکستان کی مخالفت کی وہ آپ کے کمال ایمان اور مکمل نور فراست کی دلیل ہے۔ قوم پرور مفکرین کی نظران غیر معمولی خطرات پر تھی جو تقسیم ہند کے نتیجے میں ہندوؤں سے کہیں زیادہ مسلمانوں کو پیش آنے والے تھے۔ چنانچہ وہ بے شمار کتابچے اور پمفلٹ جو اس زمانے میں تقسیم ہند کی مخالفت میں شائع کیے گئے تھے' اس کی دلیل ہیں۔ لیکن ان متوقع خطرات نے ان کی قوت عمل میں صرف اتنی ہی حرکت پیدا کی تھی جیسی کسی موہوم خدشے کی صورت میں ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ دو بزرگ جن میں سے ایک شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی تھے اور دوسرے ہمارے یہی مجاہد ملت! معلوم ہوتا تھا کہ وہ قتل عام اور لاکھوں کروڑوں انسانوں کی تباہی اور بربادی جو تقسیم کے وقت پیش آئی دن کی روشنی میں ان کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ گویا تقریباً آٹھ سال پہلے سے یہ حضرات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ دہلی کے گلی کوچوں میں گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے۔ مسلم کشتگان کے پشتے جگہ جگہ لگے ہوئے ہیں۔ مشرقی پنجاب' راجستھان اور یو۔ پی کے ان علاقوں سے جو مشرقی پنجاب کی سرحدوں سے ملے ہوئے ہیں مسلمانوں کا اخراج ہو رہا ہے۔ اخراج کو کامیاب بنانے کے لیے خون مسلم سے ہولی کھیلی جا رہی ہے جائدادیں تباہ کی جا رہی ہیں۔ مال و اسباب لوٹا جا رہا ہے' باعفت وعصمت خواتین کی لرزہ خیز بے حرمتی کی جا رہی ہے' دینی ادارے منہدم اور مسجدیں

قیام گاہ بلکہ خرگاہ اور اصطبل بنائی جارہی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور دوسری طرف پاکستانی علاقوں میں ہندو اور سکھوں کے ساتھ یہی سب کچھ کیا جارہا ہے۔

صرف اتنی بات ہی نہیں تھی کہ ان دونوں بزرگوں نے جلسوں میں تقریریں کردیں۔ اور تقسیم ہند کی تردید و مذمت میں ''پاکستان پر ایک نظر'' ''پاکستان کیا ہے'' جیسے کتابچے لکھ کر شائع کرادیئے' بلکہ ایک اضطرابی کیفیت تھی جو ان دونوں بزرگوں پر طاری تھی' جس نے رات کی نیند اور دن کا چین و آرام حرام کردیا تھا۔

۳۹ء سے لے کر ۱۵/اگست ۴۷ء تک آٹھ سالہ دور اسی اضطراب میں گزرا۔ بے شک اس عرصے میں تحریک آزادی کے بھی یہ دونوں حضرات علمبردار رہے اور اس سلسلے میں ۴۲ء سے ۴۴ء کے نصف تک قید فرنگ میں اسیر و نظر بند بھی رہے۔ مگر یہ اضطراب ہر ایک حالت میں بدستور رہا۔

اور حد سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہی مخالف تھے' وہی جانی دشمن اور درپے آزار تھے جن کے لیے یہ سب کچھ اضطراب' پریشانی سرگردانی اور بے چینی تھی۔

(۶)

۱۹۴۲ء کی ہندوستان خالی کرو کی تجویز

۱۹۴۲ء کا آغاز انتہائی خطرناک حالات میں ہوا تھا۔ ہٹلر کی فوجیں اسٹالن گراڈ تک دندنا رہی تھیں۔ اس کے نئے حلیف ''جاپان'' کی آبدوز کشتیوں نے سنگاپور کے قریب برطانوی بحری بیڑے کے سب سے بڑے جنگی جہاز پرنس آف ویلز کو غرق کر دیا تھا۔ اس کے ہوائی جہاز کلکتہ تک تاخت کرنے لگے تھے۔ ادھر اندرون ہند کانگریس کی تحریک آزادی کی چنگاریاں سلگ سلگ کر شعلہ بن رہی تھیں۔ انہیں حالات میں بمبئی میں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس طے کیا گیا۔

اب کانگریس کی طرف سے اجلاس کو کامیاب بنانے اور حکومت کی طرف سے ناکام بنانے کی کوششیں شد و مد سے جاری ہوگئیں۔ کمزور آدمیوں کے پتے ان تیاریوں کی خبر سے ہی پانی ہوتے تھے جو حکومت کی طرف سے اجلاس کو ناکام بنانے کے لیے کی جارہی تھیں۔
مسلح پولیس اور فوج تیار، مشین گنیں اور ٹینک تیار ممکن ہے جلیانوالہ باغ کی تاریخ دہرا دی جائے۔ یا قصہ خوانی بازار کی طرح اجلاس کانگریس کو مشین گنوں اور ٹینکوں کا نشانہ بنا دیا جائے۔ ان خبروں کو سننے کے بعد اس اجلاس میں شرکت کی ہمت وہی کرسکتا تھا جو سر بکف اور کفن بردوش ہو۔ پھر چپہ چپہ پر سی۔ آئی۔ ڈی مسلط تھی۔ اس کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے سیوہارہ سے روانہ ہو کر بمبئی پہنچنا آسان نہ تھا۔ مگر جس کو پوری قوم مجاہد ملت کا خطاب دینے والی تھی اس کے لیے کوئی مشکل مشکل نہیں تھی۔ وہ انہیں حالات میں سیوہارہ سے روانہ ہو کر بمبئی پہونچا۔

غالباً اس مرتبہ علی بہادر خاں صاحب کے یہاں قیام فرمایا۔ کانگریس اگرچہ ۳۲ء میں خلاف قانون قرار دی جاچکی تھی مگر اس مرتبہ ابھی تک خلاف قانون جماعت Unlaw ful Assembly نہیں قرار دی گئی تھی۔ مگر جس تجویز کو منظور کرنے کے لیے یہ

اجلاس کیا جارہا تھا اس کا علم حکومت کو بھی تھا۔ حکومت جانتی تھی کہ تجویز میں ہندوستان خالی کرو (Quit India) کا مطالبہ کیا جائے گا' اس تجویز کے منظور ہونے کے بعد کانگریس کو اگر کسی مصلحت سے خلاف قانون نہ بھی قرار دیا جائے تو ہمہ گیر اور عالمگیر جنگ کے اس خطرناک دور میں ''ہندوستان خالی کرو'' کا مطالبہ سراسر بغاوت ہے اور اس کے پاس کرنے والے باغی۔

چنانچہ حکومت کو اس میں تامل نہیں تھا کہ جو ممبر بھی اس اجلاس میں شریک ہوگا وہ باغیانہ سرگرمی کا مرتکب ہوگا اور اس کو گرفتار کر لینا ضروری ہوگا۔ سوال صرف یہ تھا کہ گرفتار کرنے کی ذمہ داری کون لے بمبئی کی حکومت اس کے لیے تیار نہیں تھی کہ بمبئی جیسے شہر میں سیکڑوں ممبروں کو گرفتار کر کے طوفان برپا کرے۔ پھر جیل خانوں میں ان کی ناز برداری کا فرض غیر محدود مدت تک انجام دیتی رہے۔

لہٰذا سرکاری پالیسی یہ قرار پائی کہ گرفتار کرنے کا تلخ فرض دوسرے صوبوں کی حکومتیں انجام دیں یعنی جو ممبر جس صوبہ کا ہو اسی صوبے کی حکومت اس کو گرفتار کرے۔

اس پالیسی کے طے ہونے کے بعد مجاہد ملتؒ کے لیے بھوپال یا بھرت پور تک تو پہنچنا آسان تھا لیکن جیسے ہی ٹرین حدود یوپی میں داخل ہو گرفتاری لازمی تھی۔ لیکن آپ کو اس ذمہ داری کا بھی شدید احساس تھا جو مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند کے رکن رکین اور روح رواں کی حیثیت سے آپ پر عائد ہوتی تھی۔

صدر جمعیۃ علماء ہند شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ چند ماہ پیشتر سے ایک تقریر کے سلسلہ میں گرفتار ہو چکے تھے جو آپ نے بچھراؤں میں جمعیۃ علماء ضلع مراد آباد کی کانفرنس میں کی تھی۔ حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب نقاہت اور ضعف دماغ کے مرض میں مبتلا تھے اور سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب پر دل کے دورے پڑ رہے تھے۔ جن کی وجہ سے بہت نحیف اور کمزور ہو گئے تھے۔ ضابطہ کے لحاظ سے منصب نظامت مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی کے حوالہ تھا۔ مگر مولانا صدیقی کو کسی بیدار مغز مشیر کی ضرورت تھی جو اس موقع کے مناسب غیر معمولی جرأت سے کام لے کر جمعیۃ علماء ہند کو اس کے فرض کی طرف متوجہ کر سکے۔

مجاہد ملت سے بڑھ کر بیدار مغز کون ہو سکتا تھا۔ جس کی بیدار مغزی کا ثبوت یہ ہے کہ اس

عائد ہونے والے فرض کا احساس ان سے بہت زیادہ تھا جو آئینی طور پر جماعت کی طرف سے ذمہ دار تھے۔

مجاہد ملت کے لیے قید و بند باعث تشویش نہیں تھی۔ البتہ ان کو تشویش یہ تھی کہ کہیں یہ گرفتاری ان کے پروگرام میں رخنہ انداز نہ ہو جائے۔ اس لیے آپ نے بمبئی سے روانگی کا پروگرام خفیہ رکھا اور غالباً وضع بھی ایسی اختیار کرلی کہ راستہ میں شناخت نہ ہوسکیں۔

۸/اگست ۱۹۴۲ء کو انڈین نیشنل کانگریس نے ''کوئٹ انڈیا'' کی تجویز پاس کی اسی روز شب کو حضرت مولانا ابوالکلام آزاد صدر کانگریس پنڈت جواہر لال نہرو اور ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبر گرفتار کر لیے گئے۔ اسی افراتفری میں مجاہد ملت بھی بمبئی سے روانہ ہو گئے اور موقعہ بموقعہ راستہ میں قیام کرتے ہوئے سیوہارہ پہونچے۔ سیوہارہ اسٹیشن پر اترنا احتیاط کے خلاف تھا' لہٰذا کسی اور اسٹیشن پر آپ اتر گئے اور خفیہ طور سے سیوہارہ میں پہونچے' سیوہارہ یوپی میں ہے۔ صوبائی حکومت کو آپ کی تلاش تھی اس لیے آپ کو بہت احتیاط کرنی پڑی۔

اگست کے مہینہ میں بارشیں ہوا کرتی ہیں اس وقت بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ جو چشم رقیب کے لیے گھونگٹ بنا رہا۔ آپ نے دو تین روز سیوہارہ میں قیام کیا۔ پھر دہلی پہونچنے کا ارادہ کرلیا تاکہ اس کام کی تکمیل کر سکیں جس کے لیے گرفتاری سے بچنے کی صورت اختیار کی جا رہی تھی۔ سیوہارہ اسٹیشن سے سوار ہونا بھی مخدوش تھا۔ اس لیے آپ نے دیہاتی وضع اختیار کی۔ آپ تنہا روانہ ہونے والے تھے مگر آپ کے ایک نوجوان عزیز حاجی محمد ایوب صاحب بی اے۔ اصرار کر کے آپ کے ساتھ ہو لئے اور شاید ''کانٹھ'' کے اسٹیشن سے آپ ٹرین میں سوار ہو کر دہلی پہنچے (چند سال بعد انہیں حاجی محمد ایوب صاحب سے مجاہد ملت کی صاحبزادی منسوب ہوئیں۔ بیماری میں خصوصاً امریکہ سے واپسی کے بعد حاجی صاحب کے بڑے صاحبزادے اقبال سلمہٗ ایسے باسلیقہ خدمت گزار رہے ہیں کہ مجاہد ملت ان سے بہت خوش تھے)

مجلس عاملہ جمعیۃ علماء کا اجلاس:

دہلی چند روز کے واسطے آپ کے لیے پناہ گاہ بن سکتی تھی۔ کیونکہ آپ کا وارنٹ گرفتاری یوپی گورنمنٹ نے جاری کیا تھا۔ جب تک وارنٹ یوپی سے منتقل ہو کر دہلی پہونچے آپ دہلی میں گرفتاری سے محفوظ تھے۔ اس فرصت سے آپ نے فائدہ اٹھایا اور دہلی پہونچتے ہی مجلس

عاملہ جمعیۃ علماء ہند کی ہنگامی میٹنگ طلب کرائی۔ ۲۷/ ۲۸/ اگست ۱۹۴۲ء ۳/۴ شعبان ۱۳۶۱ھ کو دہلی میں مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا۔ صدر جمعیۃ علماء ہند یعنی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی اس سے تقریباً دو ماہ پہلے ۲۵/ جون ۱۹۴۲ء کو گرفتار ہو چکے تھے۔ آپ کی غیر موجودگی کے باعث اس اجلاس کی صدارت سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب دہلوی (نائب صدر جمعیۃ علماء ہند) نے فرمائی۔

مولانا محمد میاں ؒ کی ذمہ داری:

مجلس عاملہ نے انڈین نیشنل کانگریس کے اقدام کی حمایت کرتے ہوئے ایک تجویز منظور کی۔ اور طے یہ کیا گیا کہ اس کو کثیر تعداد میں طبع کرا کر ملک کے گوشہ گوشہ میں پہونچایا جائے۔

خلاف قانون تجویز کا طبع کرانا خود ایک خطرناک مرحلہ تھا اور اس کو پورے ملک میں تقسیم کرنا اور چپہ چپہ پر پہونچانا اس سے کہیں زیادہ سخت مرحلہ تھا۔ یہ خدمت مولانا عبدالماجد صاحب دہلوی مرحوم اور احقر کے سپرد ہوئی۔ دہلی سے مشرقی ہندوستان کے آخری کنارہ تک تقسیم کرنا اور پہونچانا احقر کے ذمہ کیا گیا۔ پنجاب اور فرنٹیئر میں اس کو پھیلانا مولانا عبدالماجد صاحب ؒ کے سپرد کیا گیا۔ جنوبی ہند کے لیے بھی دفتر نے کوئی انتظام کیا ہوگا۔ احقر کو اس کا علم نہیں ہو سکا۔

اس زمانے میں احقر کا تعلق مدرسہ شاہی مراد آباد سے تھا۔ مستقل سکونت مراد آباد ہی میں رہا کرتی تھی۔ مگر ''بجرم عشق حریت'' ۸/ اگست کو رفقاء محترم حافظ محمد ابراہیم صاحب (موجودہ وزیر مرکزی حکومت) مولانا قاری عبداللہ صاحب مرحوم' مولانا محمد اسماعیل سنبھلی ایم۔ ایل۔ اے کو مراد آباد سے گرفتار کیا گیا۔ تو احقر نے فوراً ہی روپوش ہو جانا ضروری سمجھا۔

چنانچہ پولیس گرفتاریوں میں مصروف تھی اور احقر تاریک اور غیر معروف گلیوں' کوچوں میں ہوتا ہوا مراد آباد سے نکل رہا تھا۔ میرے نسبتی بھائی حافظ سادات حسن صاحب از راہ ہمدردی احقر کے ساتھ ہو لیے۔ ہم دونوں نے ۸ میل کا فاصلہ پاپیادہ طے کر کے قصبہ حکیم پور پہنچے' جب چند گھنٹہ بعد دہلی جانے والا پسنجر حکیم پور پہنچا تو احقر اس سے روانہ ہوا۔ لیکن ٹرین میں زیادہ دیر تک بیٹھنا بھی مناسب نہیں تھا۔ لہٰذا سمھاؤلی اسٹیشن پر اتر گیا اور موضع وستھ میں جو اسٹیشن سمھاؤلی سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر ہے' اپنے ماموں زاد بھائی مولانا سید محمد اعلیٰ

صاحب صدر مدرس مدرسہ اعزازیہ قصبہ ''ویٹھ'' کے یہاں دو روز قیام کیا۔ پھر کچھ پاپیادہ اور کچھ بس سے سفر کرتے ہوئے دہلی پہنچنا چاہتا تھا کہ جمنا کے پل پر راستہ روک دیا گیا کہ شہر میں کانگریسیوں نے فساد برپا کر رکھا ہے۔

فساد کا تماشہ میں خود بھی جمنا پار سے دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ پیلی کوٹھی کو جس میں ریلوے کا ریکارڈ تھا آگ لگا دی گئی تھی اور اس کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے یہ شعلے جمنا پار بلکہ شاہدرہ سے نظر آرہے تھے۔

اس وقت جمنا برج سے واپس ہوکر غازی آباد پہونچا' پھر غازی آباد سے دہلی پہونچنے کی داستان طویل ہے۔ مختصر یہ کہ مجاہد ملتؒ جیسے ہی دہلی پہنچے احقر بھی کسی صورت سے دہلی پہونچ گیا۔

مجاہد ملتؒ ''ندوۃ المصنفین'' کے رفیق تھے۔ ندوۃ المصنفین قرول باغ کی ایک کوٹھی میں تھا۔ مجاہد ملت یہاں قیام فرمایا کرتے تھے۔ آپ اس وقت بھی وہیں فروکش ہوگئے۔ مگر احقر کا قیام دفتر ہی میں رہا۔ اور ۲۷/۲۸ راگست کو مدعو خصوصی کی حیثیت سے مجلس عاملہ کے اجلاس میں شرکت کرنے کے بعد حسب ہدایت اراکین مجلسِ عاملہ' مجلس عاملہ کی تجویز اور اعلان کے بنڈل لے کر کلکتہ کی طرف روانہ ہوگیا۔

جگہ جگہ ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔ پولیس اور فوج کی گولیاں موت کی بارش برسا رہی تھیں۔ ریل کی پڑیاں اکھاڑی جارہی تھیں۔ ٹیلی فون اور ٹیلیگراف کے تار کاٹ کر نظام حکومت خصوصاً ریلوے کے نظام کو معطل کیا جارہا تھا۔ اور بارش کی مسلسل جھڑیوں نے جس طرح پولیس اور سی آئی ڈی کے کام کو دشوار کردیا تھا مسافروں کے لیے بھی صعوبتیں پیدا کردی تھیں۔

بہرحال ان حالات کو انگیز کرتے ہوئے دہلی سے روانہ ہوکر مغل سرائے تک تو رسائی ہوگئی لیکن مغل سرائے کے بعد سفر کی تمام صورتیں ناممکن ہوگئیں کیوں کہ ریلوے کی پٹریاں تو تحریک کی نذر ہوگئی تھیں اور عام راستوں اور سڑکوں کو سیلاب نے ناقابل عبور بنا دیا تھا۔ مجبوراً احقر جون پور واپس ہوا اور محترم حاجی ولی محمد صاحب مرحوم کے ایک مکان میں گوشہ نشین ہوکر اس لٹریچر کو مختلف صورتوں سے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچانے کا انتظام کیا۔

مجاہد ملت کی گرفتاری:

مجاہد ملت کا وارنٹ گرفتاری یوپی سے منتقل ہوکر دہلی پہونچا اور مجاہد ملت کو ندوۃ المصنفین قرول باغ دہلی سے گرفتار کرلیا گیا۔ جہاں آپ روزانہ اس کے منتظر رہا کرتے تھے۔

حسن اتفاق! آپ ضلع مرادآباد کی طرف سے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر تھے۔ لہٰذا آپ کا وارنٹ بھی مرادآباد سے آیا اور گرفتار کرکے آپ کو مرادآباد پہونچا دیا گیا۔ جہاں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین صاحب مدنی' عالی جناب حافظ محمد ابراہیم صاحب' مولانا محمد اسماعیل صاحب' مولانا قاری عبداللہ صاحب مرحوم اور دوسرے چند خصوصی رفقاء پہلے سے موجود تھے۔ چند روز بعد رمضان شریف آگیا تو جیل خانہ کی بارگ تراویح گاہ بن گئی۔ شیخ الاسلام تراویح پڑھاتے تھے اور مولانا قاری عبداللہ صاحب سماعت کیا کرتے تھے۔ (رحمہا اللہ)

دوستوں کی خواہش:

اس مرتبہ تحریک کے پروگرام میں یہ بات بھی داخل تھی کہ جہاں تک ممکن ہو گرفتاری سے بچ کر باہر رہ کر کام کیا جائے۔ احقر اس سفر سے واپس ہوکر مرادآباد پہونچا۔ اور بظاہر اپنے آپ کو کامیاب سمجھتا تھا کہ گرفتار نہیں ہوگا اگرچہ میرے بعض مخلص کانگریسی دوستوں کی خواہش یہی تھی کہ محمد میاں گرفتار ہو جائے اور خواہش کی بنیاد یہ تھی کہ دو سال پہلے احقر کی تصنیف ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' جب ضبط ہوئی اور احقر ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت گرفتار ہوا۔ پھر مقدمہ چلا تو میں نے کورٹ میں ایک بیان دیا تھا جس کو میں خود تو اخلاقی جرأت سمجھتا تھا۔ مگر بعض دوستوں نے اس کو معافی سے تعبیر کیا۔ کیونکہ اس بیان کے بعد اگرچہ سزا ہوئی مگر صرف تا برخاست عدالت' اور عدالت بھی فیصلہ سنانے کے بعد فوراً ہی برخاست ہوگئی تو گویا سزا نہیں ہوئی بلکہ سزا کا نام ہوا۔

'حقر کے اس بیان کی حقیقت یہ تھی کہ میں نے ان الفاظ سے معذرت کی تھی جو فی الواقع سنجیدگی کے معیار سے گرے ہوئے تھے۔ مثلاً انگریزوں کو ''سفید فام درندہ'' کہا تھا۔ قابل اعتراض صرف یہ الفاظ نہیں تھے۔ بلکہ کتاب میں ایسے مضامین بہت سے تھے جن کو باغیانہ کہا جاسکتا تھا۔ پولیس نے کتاب کے تقریباً نصف حصہ پر نشانات لگا رکھے تھے۔ ان کے جوابات کا

مجموعہ بھی اچھی خاصی کتاب بن گیا تھا جو بعد میں دیمک کی نذر ہو گیا۔ مگر اس زمانے میں مجسٹریٹوں کی ہمدردیاں بھی عموماً گرفتار ہونے والوں کے ساتھ ہوتی تھیں۔ مجسٹریٹ نے اس معذرت کی بنیاد پر سزا میں تخفیف کر دی۔ بہر حال ان کانگریسی دوستوں کا خیال یہ تھا کہ احقر گرفتار ہو جائے تو یہ دھبہ دھل جائے گا۔ بالآخر دوستوں کی خواہش پوری ہو گئی۔ اور عجیب و غریب صورت سے یہ خواہش پوری ہوئی۔

مولانا محمد میاں کی گرفتاری:

واقعہ یہ ہے کہ احقر اس زمانے میں گرفتار شدہ احباب اور بزرگوں ی جانب سے موقع بموقع سرکلر جاری کرتا رہتا تھا۔ ایک سرکلر جو سراسر باغیانہ تھا۔ اس کو پشاور میں کالج کے طلبہ نے پشتو میں ترجمہ کر کے شائع کیا اور اس پر احقر کا نام بھی لکھ دیا۔ فرنٹیئر کی پولیس نے وہ سرکلر یو پی بھیجا۔ تو اب بقول انسپکٹر پولیس یو۔ پی کی پولیس کے لیے چشم پوشی ناممکن ہو گئی۔

بہر حال اکتوبر میں احقر بھی گرفتار ہوا۔ احقر خوش تھا کہ رات دن کی دوڑ دھوپ سے نجات ملی، جیل خانہ میں کچھ آرام کا موقع ملے گا۔ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ حضرت شیخ الاسلام جیسے مرشد و مربی، اور حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ جیسے رفیق مخلص کی معیت میسر آئے گی۔

جیل خانہ میں پہونچا تو ہندو اور مسلمان سب دوستوں نے بڑی مسرت سے احقر کا استقبال کیا۔ مگر مجاہد ملت کی یہ ادا کبھی فراموش نہیں ہو سکتی کہ آپ نے نہایت خفگی کے ساتھ احقر کا استقبال کیا۔

''یہاں پہونچے بغیر چین نہیں آئی۔'' کیا خرابی تھی اگر باہر ہی رہتے۔ یہ حرکتیں نہ کرتے۔ اب باہر کا تمام کام پٹ ہو جائے گا۔''

عتاب آمیز لہجے میں اس قسم کے جملے ادا کرتے ہوئے مجاہد ملت نے احقر کا استقبال کیا۔ مگر یہ عتاب بھی کس قدر شفقت آمیز تھا۔ نہ صرف احقر کے حق میں شفقت بلکہ جماعت اور جماعت کاموں کے حق میں شفقت! پھر یہ ادا کہ جس سے زیادہ تعلق اسی پر زیادہ عتاب! ان سب چیزوں نے اس عتاب میں وہ لذت پیدا کر دی کہ جو دوسروں کی پر تکلف مسرت میں نہیں تھی۔

یہ غضبناک ادا چند سکنڈ کی تھی۔ پھر ایسا اتفاق ہوا کہ سب ساتھی بچھڑ گئے۔ صرف یہ خادم

ہی ساتھ رہا جس کی آمد پر ناراضگی ظاہر کی تھی۔

حضرت شیخ الاسلام کی یہ معیت ایک کیمیا تھی۔ ایک پارس کی پتھری تھی۔ جو پیتل کو طلاءِ خالص بنا سکتی تھی ہم نے کوشش کی کہ طلاءِ خالص نہ بن سکیں تو کم از کھوٹا سونا ہی بن جائیں۔ کسی صورت سے سونے کا رنگ روپ تو نصیب ہو جائے۔ چنانچہ درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ مگر یہ درس صرف ایک ہفتہ ہونے پایا تھا کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز کو مراد آباد سے نینی جیل منتقل کر دیا گیا۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی اس مفارقت کو ''برق خرمن سوز'' سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ ''برق'' تو آن کی آن میں قلب وجگر سب ہی کو ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ نہ جگر رہتا ہے نہ سوز جگر، نہ دل رہتا ہے نہ دل کا درد و اضطراب۔ مگر اس مفارقت سے قلب وجگر اس طرح مجروح ہوئے کہ ان کی ٹیس عرصے تک مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپاتی رہی۔

حضرت شیخ الاسلام رخصت ہوئے تو کم وبیش ہر ایک رفیق کی حالت یہ تھی کہ ضبط مشکل ہو رہا تھا۔ سب کے سامنے رونا بھی وقار کے خلاف تھا تو کونوں میں چھپ کر دل کی بھڑاس نکالتے تھے اور اس طرح روتے تھے شاید بیوہ عورتوں کو بھی اس کی نقل اتارنی مشکل ہو۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ باقی رفقا کچھ پہلے چھوٹ چکے تھے۔ کچھ بعد میں، پھر صرف مجاہد ملت رہ گئے اور آپ کے ساتھ یہ خادم، لیکن ہمارا قیام بھی مراد آباد میں زیادہ دیر نہیں رہا۔ غالباً جنوری ۱۹۴۳ء میں احقر اور مجاہد ملتؒ اور ہمارے رفیق داؤد دیال کھنہ (موجودہ) وزیر حکومت اتر پردیش) کو بریلی سنٹرل جیل منتقل کر دیا گیا۔

مجاہد ملت کا ثبات واستقلال:

اس زمانے میں حکومت نے سیاسی قیدیوں کے لیے پیرول کی صورت منظور کی تھی۔ یعنی ''کچھ مدت کے لیے عارضی رہائی'' بعنوان دیگر ''جیل خانہ کی زندگی سے رخصت''

احقر کے والد ماجد اس زمانے میں بیمار تھے۔ حضرت مجاہد ملت نے اصرار کر کے رخصت (پیرول) کی درخواست دلوائی۔ اگر چہ وہ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے تقریباً تین ہفتہ بعد منظور ہو سکی۔

پھر دوسری مرتبہ اسی طرح کچھ خانگی ضرورتوں کی بنا پر اصرار کر کے رخصت دلوائی۔ اگر چہ وہ چند روز بعد ہی منسوخ ہو گئی۔ کیونکہ مہاتما گاندھی نے ۲۲ روز کا برت رکھ لیا تھا اور

حالت ایسی نازک ہوگئی تھی کہ حکومت کو خطرہ ہوگیا تھا کہ جاں بر نہ ہوسکیں گے۔ جیسے ہی یہ خطرہ پیدا ہوا پولیس کے پاس تاروں کے ذریعے یہ احکام پہنچے اور پیرول والوں کی رخصت فوراً منسوخ کردی گئی۔

بہرحال حضرت مجاہد ملت نے دو مرتبہ اصرار کر کے احقر کو رخصت دلوائی۔ اور یہ احقر کی کمزوری تھی کہ حضرت موصوف کے اصرار کو قبول کرلیا۔ مگر اس کے برعکس خود حضرت مجاہد ملتؒ کی حالت یہ تھی کہ پیرول کے لیے کسی کے بھی اصرار کو قبول نہیں کیا۔ حالانکہ مجاہد ملت کو احقر سے کہیں زیادہ یہ حق پہونچتا تھا۔ کیوں کہ اول تو خود مجاہد ملت کی صحت بہت خراب تھی۔ آپ کو درد سر کا دورہ ہوتا تھا۔ دورہ اتنا سخت ہوتا تھا کہ کئی کئی گھنٹے تڑپتے ہوئے گزر جاتے تھے' پھر استفراغ ہوتا تھا۔ اس کے بعد سکون ہوا کرتا تھا۔ رمضان شریف میں کئی دفعہ دورہ پڑا اور عید کی تو پوری رات تڑپتے ہوئے گزر گئی۔ اس عارضہ کی بنا پر باآسانی پیرول مل سکتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ قوی عذر یہ تھا کہ آپ کی بڑی صاحبزادی علیل تھیں جو بعد میں تپ دق میں مبتلا ہوکر وفات پاگئیں۔ جیل میں مرض کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ خود مولانا فرمایا کرتے تھے کہ ان کو صاحبزادہ سے زیادہ صاحبزادیوں سے انس ہے۔

باہر کے دوستوں نے بھی اور جیل کے ساتھیوں نے بھی بے انتہا اصرار کیا۔ خود احقر نے استدعا اور التجا کی تمام صورتیں ختم کردیں مگر ''مجاہد ملت'' کا خطاب غالباً بامعنی نہ ہوتا اگر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا پائے استقلال اتنا مضبوط نہ ہوتا کہ آپ نے کسی طرح بھی گوارا نہیں کیا کہ خود اپنی زبان سے یا اپنے قلم سے باہر آنے کی استدعا کریں۔

یہ رہائی عارضی ہی ہوتی۔ مگر لفظ رہائی تو درخواست میں لکھا جاتا جو مجاہد ملت کو کسی طرح گوارا نہیں تھا۔

مجاہد ملت کا یہ استقلال سبق آموز تھا اور بجا ہوگا اگر احقر کو ملامت کی جائے کہ اتنے قریب اور شب و روز کا ساتھی رہتے ہوئے بھی یہ سبق نہ یاد کرسکا۔

(۷)

مجاہد ملت کی نظامت اعلیٰ

۱۹۴۲ء میں اجلاس لاہور کے وقت بھی حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کو جمعیۃ علماء ہند کا ناظم اعلیٰ بنانے کی تجویز منظور ہوئی تھی اور اس ناکارہ سے بھی اس وقت وعدہ لے لیا تھا کہ رفیق کار رہے گا۔ اسی طرح کا وعدہ حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز نے بھی احقر سے اس وقت لیا تھا جب جماعت کی اکثریت حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے اصرار کر رہی تھی کہ جمعیۃ علماء ہند کی صدارت منظور فرمائیں' لیکن مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کے ناظم اعلیٰ ہونے کی یہ تجویز اس وقت بروئے کار نہیں آسکی کیونکہ کچھ دنوں بعد سیاسی حالات نے تمام تر توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ یہاں تک کہ گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

دو سال بعد ۱۹۴۴ء کے روز و شب گزر رہے ہیں۔ جرمنی کی جنگ جو پانچ سال پہلے شروع ہوئی تھی دم توڑ رہی ہے۔ ہٹلر کی خودکشی اور ہیروشیما (جاپان) پر ایٹم بم داغے جانے کا وقت قریب آرہا ہے۔ کامیابی کی روشن توقعات نے برطانوی دماغ کی گرہیں بھی کھول دی ہیں۔ اب وہ مابعد جنگ کی مشکلات کو آسان کرنے کے لیے ہندوستان کے معاملے میں کوئی فیصلہ کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا گرفتاران بلا کی رہائیوں کا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے۔ اپریل میں سب سے حقیر و صغیر فرد محمد میاں کو رہا کیا گیا مئی میں مجاہد ملت رہا کیے گئے اور ۲۶/اگست ۱۹۴۴ء ۶/رمضان ۱۳۶۳ھ کو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب کو فوری آرڈر دے دیا گیا کہ وہ نینی جیل سے باہر تشریف لے جائیں۔

یہ حضرات باہر تشریف لائے تو ضرورت محسوس کی گئی کہ جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس عام منعقد کیا جائے۔ دو سال سے زیادہ گزر چکے تھے حالات میں بھی غیر معمولی تبدیلی ہوگئی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ زمانہ کچھ اس طرح کروٹیں لے رہا تھا کہ بالکل نئے قسم کے مستقبل کی روشنی نظر آرہی تھی۔

بہر حال سہارنپور کی درخواست منظور کی گئی اور ۱۱ر جمادی الاولیٰ ۱۳۶۴ھ ۴ر مئی تا ۷ر مئی ۱۹۴۵ء کو بڑی شان کے ساتھ جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس سہارنپور میں ہوا۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی صدر اور مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم اعلیٰ منتخب کیے گئے۔

احقر کا نام زبانوں پر آیا تو احقر نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر معذرت کرنی چاہی۔ مگر سیدی شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے جو اسٹیج پر تشریف فرما تھے خلاف معمول احقر کا دامن جھٹک کر کھینچا اور احقر کو نیچے بٹھا دیا۔ اب بجز تسلیم ورضا چارہ ہی کیا تھا ''قہر درویش بر جان درویش''

سہارنپور میں جلوس:

مجلس استقبالیہ جس کے رکن رکین مولانا محمد منظور النبی صاحب تھے' جناب صدر کے جلوس کی تیاری کر چکی تھی۔ لیکن جناب صدر (حضرت شیخ الاسلام) کسی طرح تیار نہیں ہوئے تو مجاہد ملتؒ نے دلداری کے لیے شرکت منظور کر لی۔ اب مجلس استقبالیہ کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ناظم اعلیٰ کی سواری کے لیے گھوڑا تجویز کیا تھا۔ نہایت عمدہ شوخ چشم گھوڑا سواری کے لیے پیش کیا گیا۔

اچھا ہوا محمد میاں کو قابل التفات نہیں سمجھا گیا۔ ورنہ محمد میاں کو گھوڑے کی سواری سے معذرت ہی کرنی پڑتی۔ اور مولوی کی پول کھل جاتی مگر مجاہد ملت کی شان دوسری تھی۔ آپ نے معذرت نہیں کی۔ آپ سوار ہوئے اور ایسی آن بان سے سوار ہوئے کہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ پرانے شہسوار ہیں۔

مشق مجاہد ملت کو نہیں تھی۔ مگر خدا نے غیر معمولی جرأت بخشی تھی مشہور مقولہ ہے۔ ہمت مرداں مدد خدا۔

ہمیں بھی اس موقع پر حضرت شاہ شرف الدین بوعلی قلندر رحمۃ اللہ علیہ (پانی پتی) کا شعر یاد آ گیا جو انہوں نے حضرت خواجہ مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء (رحمۃ اللہ علیہ) کو دیکھ کر موزوں فرمایا تھا۔ جب مخدوم صاحبؒ جوانی کے زمانے میں گھوڑے پر سوار حضرت قلندر صاحب کے سامنے سے گزرے تھے تو حضرت قلندر صاحب نے فرمایا تھا:

گلگوں لباس کرد و سوار سمند شد
یاراں حذر کنید کہ آتش بلند شد

۴۵ء اور ۴۶ء کے عام انتخابات:

اجلاس سہارنپور سے کچھ دنوں بعد اس الیکشن کا وقت آ گیا جو نہ صرف وزارتوں اور منسٹریوں کے حق میں فیصلہ کن تھا بلکہ قوم وملت کے حق میں برہان وفرقان سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ کچھ من چلے جوانوں نے دیواروں پر جلی حروف سے لکھ دیا تھا۔

''جس طرح معرکہ پانی پت فیصلہ کن تھا یہ الیکشن بھی فیصلہ کن ہوگا''

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جس طرح شیر برطانیہ کے مقابلے میں شیر ببر تھے وہ اپنوں کے مقابلے میں گربہ' مسکین بننا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ دیوبند' بریلوی' اہل حدیث جیسے اختلافات میں پڑنا کبھی پسند نہیں کیا۔ مگر یہاں صورت کچھ ایسی تھی کہ اپنوں کے مقابلے میں بھی مجاہد ملت کو شیر بننا پڑا۔ یعنی جس طرح انگریزی سامراج کے مقابلے کے لیے آپ جاں باز و سربکف تھے ایسی ہی اس فرقہ واریت کے مقابلے میں بھی جس کو آج مسلم فرقہ واریت کہا جاتا ہے) آپ کو سرفروشانہ جدوجہد کرنی پڑتی۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان بہت بلند و بالا ہے' اپنے زمانے کی کسی چیز کو صحابہ کرام کے کسی معاملے سے تشبیہ دینا بے ادبی ہے مگر سمجھنے اور سمجھانے کے لیے یہ عرض کرنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ دو نظریات کے حامیوں میں جس قوت اور شدت سے اس زمانے میں مقابلہ ہوا اس سے مشاجرات صحابہ کی ایک گھٹیا سی مثال سامنے آ گئی۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہ العزیز نے مستند حوالوں سے اپنے رسالہ ''پاکستان کیا ہے؟'' میں ثابت کیا تھا کہ ہندوستان کی تقسیم انگریز کا طے کردہ منصوبہ ہے۔ آج جب کہ ۱۹۶۲ء ختم ہو رہا ہے اور ہماری آزادی کے پندرہ سال پورے ہو رہے ہیں ہندوستان اور پاکستان اپنے غیر معمولی ذرائع کے باوجود پسماندہ' مفلوج اور برطانیہ اور امریکہ کے دست نگر ہیں۔ جب کہ اسی عرصے میں ہمارا پڑوسی ملک ''چین'' دنیا کی زبردست طاقت بن چکا ہے۔

اگر ہم ہندوستان و پاکستان کی اس پسماندگی کی علت معلوم کرنا چاہیں تو شیخ الاسلام

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ الزام قطعاً ثابت ہو جاتا ہے کہ تقسیم کا مطالبہ ہمارے اپنے احساس وفکر کا نتیجہ نہیں بلکہ انگریزی ڈپلومیسی کا شاہکار تھا جس نے اپنے مطلب کی بات ہماری زبان سے کہلوائی۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنی ہی جماعت اور اپنی ہی ملت کے بہت سے بزرگ جن کی حق پسندی صاف گوئی اور دیانت پر شک وشبہ نہیں کیا جا سکتا تھا وہ اس کو صحیح معنیٰ میں اسلامی حکومت کا سنگ بنیاد سمجھتے تھے جس پر خلافت راشدہ کے نمونے کی سیاسی عمارت قائم کی جا سکتی تھی۔ اس جماعت کے نزدیک پاکستان ایک پر تقدس تصور تھا۔ جس کو کامیاب کرنے کی سرگرمیوں میں سب کچھ قربان کر دینا اسلامی حمیت وغیرت کا تقاضا اور ہر ایک غیور وخود دار مسلمان کا فرض تھا۔

غور فرمایئے! کس قدر فرق تھا ان دونوں نظریوں میں ایک تقسیم ہند کو انگریز کی پرفریب سیاست کا شاہکار سمجھتا تھا۔ مسلمانوں کے لیے تباہ کن' ہندوستانی قومیت کے لیے مرض لازوال' اور دوسرے کے خیال اور عقیدہ میں پاکستان ایک پر تقدس تصور تھا جس کو الہام سبحانی اور القائے ربانی کہنے میں بھی اس کو تامل نہیں ہوتا تھا۔

ہر ایک فریق پوری صداقت اور دیانت داری کے ساتھ اپنے اپنے نظریے پر جما ہوا تھا۔ اس کی حمایت میں جان قربان کر دینے کو شہادت اور مخالفت کرنے والوں کی پوری پوری مخالفت کو اپنا فرض سمجھتا تھا۔

ارباب علم کا فتویٰ اس صورت میں یہی ہوگا کہ جو صاحبان سچائی اور دیانت داری کے ساتھ جس نظریے کے بھی حامی تھے ان میں سے کسی ایک کو خطائے اجتہادی میں مبتلا تو قرار دیا جا سکتا ہے۔ گنہگار کسی کو نہیں کہا جا سکتا۔

مجاہد ملت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب ان صاحب بصیرت علماء میں سے تھے جن کی دور رس نظر انگریز کی ڈپلومیسی پر تھی۔ وہ اس فریب نظر سے آگاہ تھے جو ایک تباہ کن تصور کو پر تقدس ظاہر کر رہا تھا وہ اس سے بھی واقف تھے کہ فرقہ واریت کا مہلک مرض خود مسلمانوں کے لیے وبال جان بن جائے گا۔

وہ ایسی سیاست کے حامی تھے جو کمزور کو قوی اور ضرورت مند کو بے نیاز کر دے۔ وہ پاکستانی نظریے کے فلسفے کو ملت اسلامیہ کے حق میں بہت بڑی خیانت قرار دیتے تھے۔ کیونکہ

اس کا مفاد صرف یہ تھا کہ دولت مند کی دولت میں اضافہ ہو جائے۔ رہے وہ ضرورت مند جو امداد کے محتاج تھے، جن کی ضرورت پوری کرنے کے لیے اقلیت اور اکثریت کا یہ تمام ہنگامہ برپا تھا۔ یعنی وہ مسلمان جو اقلیت میں تھے ان کی دشواریوں اور پریشانیوں کا کوئی حل اور کوئی علاج پاکستان کے حامیوں کے پاس نہیں تھا۔

اس کے علاوہ مجاہد ملت کی نظر ان نتائج پر بھی تھی جو اس وقت رونما ہو سکتے تھے۔ جب تقسیم ہند کا نظریہ بروئے کار آتا (جیسا کہ وہ پیش آئے بلکہ تصور سے زیادہ ہیبت ناک صورت میں پیش آئے۔

ان وجوہات کی بنا پر مجاہد ملت نے اپنے دونوں مقتداء (شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد رحمہما اللہ) کا دست راست اور اپنے دوسرے بزرگوں اور رفقاء کا پر شوکت ترجمان بن کر وہ کردار پیش کیا جو صاحب عزیمت، عالی حوصلہ، شجیع اور بہادر مجاہد پیش کر سکتا ہے جس کو نہ لومۃ لائم کا خوف ہو اور نہ دار و رسن کی دہشت اس کے دل میں ہو۔

ایک افسوس ناک واقعہ:

ہندوستان کے گوشے گوشے میں آپ پہونچے اور اس وارفتہ مخلوق کو جو جذبات کے خونیں سیلاب میں بہہ رہی تھی اس کی وارفتگی کے نتائج سے آگاہ کیا۔

اسی زمانے کا وہ واقعہ ہے کہ شیخ الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز کے ساتھ آپ ملتان سے واپس ہو رہے تھے۔ لاہور سے پنجاب میل کے فسٹ کلاس میں آپ حضرت شیخ کے ساتھ سوار ہوئے۔

لاہور ریلوے کے لیگی عناصر نے ریلوے کے ٹیلیفون کو نہایت غلط اور افسوس ناک مقصد کے لیے استعمال کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امرتسر جالندھر اور لدھیانہ وغیرہ یعنی پنجاب کے جن جن اسٹیشنوں پر میل ٹھیرنے والا تھا وہاں آبرو باختہ لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا اور انہوں نے شرمناک نعروں سے آگے بڑھ کر آپ کے ڈبہ پر اینٹ پتھر برسائے۔ اللہ تعالیٰ ان کا محافظ تھا کہ ان دونوں بزرگوں کا بال بیکا نہیں ہوا۔ مجاہد ملت کے صرف ایک ہاتھ پر معمولی سا خراش آیا۔ البتہ کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور ہو گئے۔ اور جب لکڑی اور جالیوں والی کھڑکیاں

چڑھادی گئیں تو وہ بھی جگہ جگہ سے ٹوٹ گئیں۔

اسی زمانے میں مسلم پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا گیا جو جمیعۃ علماء ہند' خدائی خدمتگار' مجلس احرار وغیرہ جماعتوں پر مشتمل اور لیگ کے مقابلے میں ان جماعتوں کا متحدہ محاذ تھا۔ جس کے ٹکٹ پر جگہ جگہ امیدوار کھڑے کیے گئے۔

یہ سرفروشانہ جدوجہد پانسہ تو نہیں پلٹ سکی۔ مسلم حلقوں میں عموماً کامیابی مسلم لیگ ہی کو ہوئی۔ پھر بھی تقریباً تیس سیٹیں یو۔ پی بہار وغیرہ میں بورڈ کے امیدواران کو حاصل ہوئیں اور جب دونوں کے اعداد و شمار حاصل کیے گئے تو مسلمانوں کے ۳۵ فیصدی ووٹ پاکستان کے خلاف قوم پرور (نیشنلسٹ) مسلمانوں کو ملے تھے۔

یہ تھی سیاست کے اس موڑ پر مجاہد ملت کی قائدانہ جدوجہد۔

جمیعۃ علماء ہند کے خلاف پروپیگنڈا:

میرے احباب اور بزرگ یہ تلخ نوائی معاف فرمائیں کہ اس دور میں ایک بڑا ظلم جمیعۃ علماء ہند پر کیا جاتا رہا۔

برطانوی مشنری جمیعۃ علماء ہند کے خلاف کام کر رہی تھی اور اس کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا کیونکہ جمیعۃ علماء ہند اس کی حریف تھی اور ہندوستان سے اس کا نام و نشان مٹانا چاہتی تھی۔

یہ مشنری پروپیگنڈے کی تمام طاقت دو باتوں پر صرف کر رہی تھی اول یہ کہ کانگریس ہندوؤں کی جماعت ہے اور آزادی کا مطالبہ ہندوؤں کا ہے مسلمان اس کے حامی نہیں ہیں۔

دوسرے یہ کہ جمیعۃ علماء ہند اور قوم پرور مسلمان فریب خوردہ ہیں۔ یہ کوئی مثبت پالیسی نہیں رکھتے۔ صرف کانگریس کی ہمنوائی ان کا نصب العین ہے۔

جمیعۃ علماء ہند اور قوم پرور مسلمانوں کی اتنی طاقت نہیں تھی کہ برطانوی پروپیگنڈے کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر سکتے۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ مسلمانوں کی اکثریت کو اس پروپیگنڈے نے نہ صرف متاثر بلکہ مسحور بنا دیا تھا' لامحالہ جمیعۃ علماء ہند کی آواز ''نقار خانے میں طوطی کی صدا'' بن کر ناکام ہوتی رہی۔

جمیعۃ علماء ہند کا فارمولا:

لیکن واقعہ یہ ہے کہ جمیعۃ علماء ہند پاکستان کا بہترین بدل تلاش کر چکی تھی اور ایک ایسا

فارمولا منظور کر چکی تھی کہ وہ کامیاب ہو جاتا تو ملک کی طاقت میں یہ رخنہ نہ پڑتا کہ ایک ہی ملک کے دو حصے جن کے متعلق اب یہ کہا جا رہا ہے کہ کسی بھی حصہ کا کامیاب دفاع اور تحفظ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان دونوں کی فوجی کمان ایک نہ ہو۔ یہ دو حصے ایک دوسرے کے مقابلے میں تیر و ترکش سنبھالے ہوئے ہیں اور مالیہ کا بڑا حصہ جو تعمیر و ترقی یا کسی بیرونی طاقت کے مقابلے پر دفاعی طاقت کے مضبوط بنانے میں صرف ہوتا' اپنے ہی ہاتھ پاؤں کے بچاؤ پر صرف ہو رہا ہے۔ اور یہ صورت کہ بھارت کی مسلم اقلیت غضبناک اکثریت کے شکنجہ میں کسی ہوئی بے یار و مددگار واویلا کر رہی ہے' یہ افسوسناک صورت بھی پیش نہ آتی۔ غور فرمایئے جمعیۃ علماء ہند کے فارمولے کے اہم اجزا یہ تھے:

۱۔ صوبے خود مختار ہوں۔

۲۔ مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کر دیں اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہوں۔

۳۔ ان مشترک اختیارات کے علاوہ جن کی تصریح مرکز کے لیے کر دی گئی ہو' باقی تمام غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے حوالے ہوں۔

۴۔ مرکز کی تشکیل ایسے تناسب سے ہو کہ اکثریت اقلیت پر زیادتی نہ کر سکے۔ مثلاً پارلیمنٹ کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو۔
ہندو ۴۵' مسلمان ۴۵' دوسری اقلیتیں:

۵۔ جس مسئلہ کے متعلق مسلم ممبران کی اکثریت فیصلہ کر دے کہ اس کا تعلق مذہب سے ہے وہ پارلیمنٹ میں پیش نہ ہو سکے۔

اس فارمولے کا مفاد یہ ہوتا۔

(الف) اہم پورٹ فولیو (قلمدان وزارت) کی تقسیم مساوی طور پر ہوتی۔

(ب) صوبہ سرحد' صوبہ سندھ' بلوچستان اور اگر کشمیر کو ایک صوبہ کی حیثیت دی جاتی تو صوبہ کشمیر' مذہبی' معاشی' تہذیبی اور تمدنی امور میں قطعاً خود مختار ہوتے۔

(ج) پورا صوبہ پنجاب' راولپنڈی سے لے ضلع سہارنپور کی سرحد تک۔

(د) پورا صوبہ بنگال جس کا دارالحکومت کلکتہ کا عظیم شہر ہوتا مسلم اکثریت کے زیر اقتدار رہتا۔

(ہ) صوبہ دہلی اور صوبہ آسام کی سیاست اور حکومت میں مسلمانوں کا حصہ تقریباً مساوی

ہوتا۔ کیونکہ ان دونوں صوبوں میں مسلمان ۳۴۔۳۵ فی صدی تھے۔

(و) ہندوستان کے باقی صوبوں میں مسلمان لاوارث یتیم کی طرح نہ ہوتے۔ کیونکہ

۱۔ ملازمتوں اور اسمبلیوں میں ان کا حصہ حسب سابق ۳۰ یا ۳۳ فی صد ہوتا۔

۲۔ وزارتوں میں ان کی موثر شمولیت ہوتی۔

۳۔ مذہبی اور تمام فرقہ وارانہ امور میں ان کو حق استرداد حاصل ہوتا۔

۴۔ وہ ایسے مرکز کے ماتحت ہوتے جس میں ان کی تعداد مساوی ورنہ کم از کم ۳۳ فیصد ہوتی۔ اور تمام فرقہ وارانہ امور کی باگ ڈوران کے اپنے ہاتھ میں ہوتی۔ کیونکہ اسمبلی، پارلیمنٹ یا کیبنٹ مسلم ممبران کی موافقت کے بغیر کوئی فیصلہ صادر نہ کر سکتی۔

اس فارمولے کو اس پر آشوب دور میں مسلمانوں کی اکثریت نے یا تو سنا ہی نہیں اور اگر سنا تو جذبات میں اس درجہ وارفتہ تھے کہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ بہر حال ''مضیٰ مامضیٰ'' اب اس داستان پارینہ کو دہرانے سے کیا فائدہ، مگر مجاہد ملت رحمہ اللہ کے حالات کے تذکرہ میں اس کا تذکرہ ضروری ہے۔ تاکہ کل نہیں تو آج اندازہ ہو سکے کہ مخالفت کرنے والے کہاں تک حق پر تھے اور مجاہد ملت کی سرفروشانہ جانفشانی کس مقصد کے لیے تھی۔

جمعیۃ علماء ہند کا فارمولا ایک مثبت فارمولا تھا اور جمعیۃ علماء ہند کے ارکان کو اس پر اتنا وثوق اور یقین تھا کہ وہ ہر ایک کے سامنے اس کو پیش کر سکتے تھے۔ چنانچہ وزارتی مشن آیا تو جمعیۃ علما ہند کے نمائندہ حضرات نے اس کو نہ صرف یہ کہ پیش کیا بلکہ اس پر مشن کی پسندیدگی بھی حاصل کی۔

مولانا آزاد مرحوم نے اپنی مشہور کتاب ''انڈیا ونس فریڈم'' میں واضح کر دیا ہے کہ ان کا پیش کردہ فارمولا ''وزارتی مشن'' نے منظور کر لیا تھا یہی وہ فارمولا ہے جس کو مولانا آزاد نے پیش فرمایا تھا۔

وزارتی مشن کی آمد:

ابھی صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات تمام ہندوستان میں مکمل نہیں ہوئے تھے کہ ۲۳ / مارچ ۱۹۴۶ء کو وزارتی مشن کراچی پہنچ گیا۔ لارڈ پیتھک لارنس وزیر ہند۔ سر اسٹیفورڈ کرپس اور جنرل الیگزینڈر وفد کے ارکان تھے۔ ایک ہفتہ آرام کرنے کے بعد یا تازہ حالات

کے پورے مطالعے کے بعد یکم اپریل سے مشن نے ہندوستانی لیڈروں سے ملاقات شروع کی۔

کل ہند مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے صدر کی حیثیت سے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو دعوت دی گئی تھی۔ اور چونکہ مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے ساتھ دوسری جماعتیں بھی اشتراک عمل کیے ہوئے تھیں لہٰذا جناب صدر کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ مزید تین افراد کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ چناں چہ عبدالمجید صاحب خواجہ مرحوم صدر آل انڈیا مسلم مجلس، شیخ حسام الدین صاحب صدر آل انڈیا مجلس احرار اسلام، شیخ ظہیر الدین صاحب صدر آل انڈیا مومن کانفرنس، ان تینوں جماعتوں کے سربراہوں کی حیثیت سے اور جناب حافظ ابراہیم صاحب (مرکزی وزیر برقیات) ترجمان کی حیثیت سے حضرت شیخ الاسلام کے ساتھ تشریف لے گئے۔

اس نمائندہ جماعت کو ایک ایسے صاحب بصیرت سیاسی کھلاڑی کی بھی ضرورت تھی جو نمائندگان پریس کی شوخیوں کا جواب بھی دے سکے۔ اس کی حاضر جوابی دوسری پارٹیوں کے نکتہ چینوں کو خاموش کر سکے۔ پرمغز و مدلل خطابت ہر ایک دل کو مٹھی میں لے سکے۔ ایسی شخصیت جوان اوصاف کی حامل ہو، مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب کی شخصیت تھی۔ لہٰذا آپ کو بھی اس نمائندہ وفد میں شریک کیا گیا۔

۱۶/اپریل ۱۹۴۶ء کو ۴ بجے شام سے سوا پانچ بجے تک مشن سے ملاقات ہوئی۔ جمعیۃ علماء ہند کا فارمولا وزارتی مشن کے سامنے پیش کیا گیا وزارتی مشن نے اس فارمولے سے یہاں تک دلچسپی لی کہ مقررہ وقت یعنی (نصف گھنٹہ) سے زائد ۴۵ منٹ فارمولے کے مضمرات اور اس کے مفادات کو سمجھانے پر صرف کر دیئے۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب ''انڈیا ونس فریڈم'' میں ایک فارمولے کا تذکرہ کیا ہے جس کو وزارتی مشن نے خاص طور پر پسند کیا تھا اور اسی کی بنیادوں پر اپنا اعلان مرتب کیا تھا مولانا آزاد نے اس کتاب میں اس فارمولے کو اگر منسوب کیا ہے تو صرف اپنی جانب، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کا فارمولا تھا جو جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس لاہور (مارچ ۱۹۴۲ء) میں مرتب کیا گیا۔ اور اجلاس سہارنپور (مئی ۱۹۴۵ء) میں اس کی مزید توثیق اور تشریح کی گئی تھی۔

سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے اخبار بین طبقہ کو تقریباً سولہ سال پہلی یہ بات فراموش

نہیں ہوئی ہوگی کہ مذکورہ بالا ملاقات سے ایک ماہ بعد ۱۶ رمئی ۱۹۴۶ء کو وزارتی مشن نے جو سفارشات پیش کیں وہ انہیں لائنوں اور انہیں خطوط پر تھیں جن کی طرف جمعیۃ علماء ہند کا فارمولا اشارہ کر رہا تھا۔

وزارتی مشن نے پاکستان کی تردید کرتے ہوئے نظریۂ پاکستان کو ہندوستان کے لیے مضرت رساں قرار دیا تھا۔

ان سفارشات کی بنیاد پر ۲ رستمبر ۱۹۴۶ء کو عارضی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو کیبنٹ کے ۱۴ ممبروں میں پانچ مسلمان تھے یعنی ۱/۳ سے کچھ زیادہ اور مالیات کا اہم ترین محکمہ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے سپرد کیا گیا تھا۔

مگر بخت واژگون نے پھر پلٹا کھایا۔ لیگ کی طرف سے ردعمل تو لازمی تھا۔ لیکن برطانوی ایجنٹوں کی دو رخی پالیسی نے اس کی نوعیت میں خون ریزی بھی شامل کر دی۔ انتہا یہ کہ تقسیم کا سوال پھر شدت سے سامنے آیا اور اس مرتبہ کانگریس کی غیر معمولی اکثریت بھی تقسیم کی حامی بن گئی۔

نہایت پیچیدہ حالات:

سیاست کا یہ دور بھی نہایت پرپیچ تھا اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کے متوقع نتائج کسی ایک فیصلے پر متحد کرنے کے بجائے ہر ایک فریق کے لیے متضاد دلائل مہیا کر رہے تھے۔

مثلاً یہ بات مشہور ہے کہ سردار پٹیل جو اس عارضی حکومت میں وزیر داخلہ بنائے گئے تھے ان کو اس سے سخت تکلیف ہوئی کہ وہ اپنے اختیارات سے ایک چپراسی کا تقرر بھی نہیں کر سکتے۔ چپراسی کے لیے بھی وزیر مال نواب زادہ لیاقت علی خاں کی منظوری کے محتاج ہیں۔ (جنہوں نے پارلیمنٹ سے ایک ایسا میزانیہ منظور کرا لیا تھا جس نے ہندوستان کے سرمایہ داروں کو سراسیمہ کر دیا تھا۔)

اس ایک واقعے سے قوم پرور مسلمانوں کی یہ دلیل مضبوط ہو رہی تھی کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمان ایک فیصلہ کن پوزیشن اختیار کر سکتے ہیں بلکہ ایسی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں کہ اکثریت ان کی دست نگر بن جائے۔

اور اسی ایک واقعے نے سردار پٹیل جیسے ہندوازم کے حامیوں کو یہ سبق دے دیا تھا کہ

تقسیم ضروری ہے۔ کیونکہ سیاسی اقتدار میں اگر مسلمانوں کی شرکت رہی تو ان کو ہندوازم کے چمکانے اور من مانی کارروائی کرنے کی کھلی چھٹی نہیں مل سکے گی۔

کہا جاتا ہے کہ مسٹر جناح اور ان کے ساتھی مسلم رہنماؤں کی ذہنیت فرقہ پرست تھی۔ مگر سردار پٹیل جیسے قوم پرست نے جس ذہنیت کا ثبوت پیش کیا' اس کے لیے بھی فرقہ پرستی کے علاوہ کوئی اور عنوان نہیں ہوسکتا۔ الفاظ میں اگر تبدیلی کی جائے تو سردار پٹیل کی ذہنیت کے لیے ''زہریلی سامپردا یکتا'' کا لفظ استعمال کیا جائے گا۔

بہرحال سیاست کا یہ وہ نازک موڑ تھا جس کی نظیر شاید ہندوستان کی پوری تاریخ میں نہ مل سکے۔

انڈین نیشنل کانگریس کو عام طور پر کامیاب تصور کیا جاتا ہے۔ بیشک وہ اس لحاظ سے کامیاب رہی کہ انگریز کو ہندوستان بدر کر کے سیاسی اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لیکن اگر کسی بااصول جماعت کی کامیابی کا مدار اصول کی کامیابی پر رکھا جائے تو صحیح بات یہ ہے کہ کانگریس ناکام رہی۔ کیوں کہ اس کے دونوں اصول یعنی پورے ہندوستان کا اتحاد اور بلاتفریق مذہب وملت تمام ہندوستانیوں کی قومیت کا اتحاد' یہ دونوں اصول پاش پاش ہوگئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں کانگریس کا عذر یہ تھا:

''حالات نے ہر ایک دماغ کو مجبور کر دیا ہے کہ جو حل بھی موجودہ الجھاؤ کو ختم کر سکتا ہو اس کو تسلیم کر لے۔ کانگریس کے سامنے یہ سوال نہیں تھا کہ کون سا منصوبہ منظور کیا جائے بلکہ سوال یہ تھا کہ گومگو اور غیر اطمینانی کی موجودہ تباہ کن حالت باقی رہے یا سب سے پہلی فرصت میں اس کو ختم کر دیا جائے؟''

کانگریس متحدہ ہندوستان کے نظریے سے جدا نہیں ہوئی لیکن وہ حق خود ارادیت کو بھی تسلیم کر چکی تھی کہ جو علاقے یونین میں شامل نہ ہونا چاہیں' انہیں مجبور کرنے کے وہ خلاف ہے۔''

یہ دماغوں کی مجبوری کیا تھی۔ یہ وہی فرقہ واریت تھی جو دونوں پلیٹ فارموں پر رقص کر رہی تھی۔ جس کا افسوس ناک اثر یہ تھا کہ ۳؍جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کو اسکیم کا اعلان ہوا۔ اور ۱۶؍جون تک کانگریس اور مسلم لیگ (ہندوستان کی دونوں بڑی جماعتوں نے) اس کے حق میں منظوری صادر کر دی۔

جمعیۃ علماء ہند اور مسئلہ تقسیم:

لیکن تاریخی نوشتوں میں یہ صداقت اور اصول پسندی سنہری حرفوں سے درخشاں رہنی چاہیے کہ اس بدترین بحرانی دور میں جب کہ مولانا ابوالکلام آزاد جیسا سنجیدہ اور دانش مند مدبر بھی ہر ایک دماغ کو مجبور پا رہا تھا۔ جو پلیٹ فارم اس مجبوری سے مستثنیٰ رہا وہ جمعیۃ علماء ہند کا پلیٹ فارم تھا۔ اور ممبران کانگریس میں جو رہنما اس مجبوری سے محفوظ رہا' وہ مجاہد ملت حفظ الرحمٰن تھا۔

ابھی تقسیم ہند کا اعلان نہیں ہوا تھا۔ صرف ارباب بصیرت اراکین جمعیۃ علماء ہند نے اس کے آثار سیاسی فضا میں محسوس کیے تھے کہ اسی احساس کی جمعیۃ علماء ہند نے اپنے اجلاس لکھنو مورخہ ۱۰ رمئی ۱۹۴۷ء میں تقسیم کی مضرتیں ظاہر کرتے ہوئے اس سے بیزاری کا اظہار کیا اور جب ۳ رجون کو تقسیم ہند کا باضابطہ اعلان کر دیا گیا تو ۲۴ رجون ۱۹۴۷ء کو جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ نے دوبارہ بیزاری کا اظہار کیا اور سختی سے تقسیم ہند کی مخالفت کی۔

مجاہد ملتؒ کی استقامت اور جرأت:

۱۴ رجون ۱۹۴۷ء کو کانسٹی ٹیوشن ہاؤس دہلی میں کانگریس کا اجلاس ہوا جس میں تقسیم ہند کی تجویز پیش کی گئی۔ تجویز پیش کرنے والے پنڈت ولبھ پنت وزیراعظم یوپی تھے اور تائید کرنے والے ہندوستان کے بہترین مدبر اور خطیب امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد تھے' کانگریس ہائی کمانڈ جو ہندوستان کی سب سے اونچی شخصیتوں کا مجموعہ تھا تجویز کا حامی تھا۔

اجلاس میں شریک ہونے والے ممبروں میں ممکن ہے بہت سے ممبر اس تجویز کے حامی نہ ہوں۔ مگر اول تو ہائی کمانڈ کی مخالفت کسی بھی موقع پر آسان کام نہیں خصوصاً ایسی صورت میں کہ پوری فضا ایک رنگ میں رنگی ہوئی ہو اس کی مخالفت میں صرف وہی شخص آواز اٹھا سکتا ہے جو "لا یخافون فی اللہ لومۃ لائم" کا پیکر اور اس کا صحیح مصداق ہو اور جس کی صداقت پسندی ہر ایک مرعوبیت سے آزاد ہو۔

مجاہد ملت جب تقسیم ہند کو ملک اور ملت دونوں کے لیے جرم عظیم سمجھتے تھے تو آپ نے قطعاً گوارا نہیں کیا کہ کسی بھی نوع سے اس جرم عظیم کی حمایت کریں۔

مجاہد ملت اپنا رشتہ اپنے مالک حقیقی سے جوڑے ہوئے تھے ان کو یقین تھا کہ انہیں اس کی

بارگاہ میں جواب دہی کرنی ہے۔ وہ سمجھتے تھے اور صحیح سمجھتے تھے کہ کلمہ حق کے اعلان اور اظہار کے موقع پر سکوت بھی جرم ہے۔

جمعیۃ علماء ہند کے ممتاز ارکان میں سے صرف مجاہد ملت آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر تھے۔ آپ نے وہ فرض جو جمعیۃ علماء ہند کے ناظم عمومی ہونے کی حیثیت سے آپ پر عائد تھا۔ اور جس کو نہ صرف جماعتی بلکہ ملی اور قومی تقاضا اور حق وصداقت کا مطالبہ تصور کرتے تھے اس کو پوری جرأت اور استدلال دخطابت کے بہترین سلیقہ کے ساتھ ادا کیا۔

عجیب اتفاق ہے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے تقریباً چھ سو ارکان میں سے اس تجویز کی مخالفت کی توفیق صرف ایسے دو ممبرون کو ہوئی جو آپس میں بہت سی باتوں میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ مگر اس مسئلہ میں متحد ہو گئے تھے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے علاوہ دوسرے ممبر جنہوں نے تقسیم کی اس تجویز کی مخالفت کی تھی ہندو تہذیب کے مشہور علمبردار ''پرشوتم داس ٹنڈن'' تھے۔

بیشک جمعیۃ علماء ہند کی تجویز' اظہار بیزاری اور اظہار برأت' پھر اجلاس کانگریس میں کانگریس کی تجویز کی مخالفت کامیاب نہیں ہوسکی لیکن مجا ملت اور ان کے علاوہ جمعیۃ علماء ہند کے معزز ارکان کو اس بات کا اطمینان ہے کن اور خونریز تقسیم کی ذمہ داری سے محفوظ رہے اور خون بے گناہ کا کوئی لگ سکا۔

(۸)

۱۹۴۷ء اور مجاہد ملتؒ

۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں لاکھوں مسلمان ترک وطن کر چلے گئے' پھر بھی ساڑھے تین کروڑ مسلمان (جواب خدا کے فضل سے ۶ کروڑ اور ایک قول کے مطابق آٹھ کروڑ ہو گئے ہیں) باقی رہ گئے [۱] اس طرح اگر مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ بھی ہندوستان میں رہ گئے اور پاکستان نہیں گئے تو کوئی قابل تذکرہ بات نہیں۔ قابل تذکرہ وہ انقلاب ہے جو مجاہد ملتؒ نے ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے ذہنوں' ان کے حوصلوں اور ارادوں میں برپا کیا۔ قابل تذکرہ وہ تعمیر ہے مجاہد ملتؒ جس کے معمار اول بنے۔

۱۹۴۷ء کے وہ لرزہ خیز ہنگامے جن سے صرف انسانوں کے دل ہی نہیں لرزتے بلکہ انسانیت کی نگاہیں نیچی اور شرافت کی گردن جھک جاتی ہے۔ ان کا فراموش ہو جانا ہی بہتر ہے۔ ان کی یاد تازہ کرنا نہ ملک کے لیے مفید ہے' نہ قوم وملت کے لیے' لیکن کسی ''مجاہد'' کی حیات عزیز کے خدوخال نمایاں کرنے کے لیے اگر ان کی طرف کچھ اشارے کرنے پڑیں تو وہ تاریخ کی ایک ضرورت ہوگی۔ جس سے نظر پھیر لینا بھی درست نہیں' بلکہ درحقیقت تاریخ کے حق میں ناقابل معافی خیانت اور جرم ہے۔ بیشک ہم اس تاریخ سے سبق بھی لے سکتے ہیں اور تاریخ کا اصل منشاء یہی ہے کہ ماضی کی خرابیوں سے مستقبل کو بہتر بنائیں۔

۱۹۴۷ء کا سب سے بڑا المیہ مشرقی اور مغربی پنجاب کی تبادلہ آبادی کا فیصلہ تھا جو چند چوٹی کے لیڈروں اور برطانوی ایجنٹوں نے اس طرح کیا کہ ان کروڑوں انسانوں کو اس کی خبر تک نہیں تھی جو اس خونیں فیصلہ سے تباہ وبرباد ہونے والے تھے۔

سرکاری فیصلوں کا نفاذ اخلاق اور رحم وکرم کی شعاعوں سے نہیں ہوا کرتا۔ رائفلوں' مشین گنوں اور ٹینکوں کی گرج اور توپوں کے دھماکے اس کے نفاذ کی خبر دیا کرتے ہیں جو ساتھ انسانی خون کی ارزانی کا بھی اعلان کر دیتے ہیں۔

۱۔ اب تو کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد سولہ کروڑ سے زیادہ ہے؟ (ا۔س۔ش ۱۹۹۹ء)

تبادلہ آبادی کے نتیجے میں ہند اور پاکستان کی اقلیتوں کا واسطہ ایسی بھیڑ سے پڑا۔ جن سے نہ دید و شنید تھی نہ جان پہچان' ان کی زبان جدا ان کی معاشرت علیحدہ۔

اپنے اپنے وطن میں تباہ و برباد ہو کر اور زیادہ تر وہ تھے جنھوں نے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کی تڑپتی ہوئی لاشوں کو چھوڑ کر سرحدیں پار کی تھیں۔ بہت سوں کی بہنیں اور بیٹیاں جدا ہو گئی تھیں۔ کتنے ہی وہ تھے جو اپنی رفیقہ حیات کی بے عزتی سے مضطرب اور بے چین تھے۔ ان کے دماغ جوش انتقام سے کھول رہے تھے۔ آنکھیں سرخ تھیں اور چہروں پر درندگی کی وحشت برس رہی تھی۔

فوجوں کی تقسیم نے اس وحشت انگیز اور بربریت نواز بھیڑ کو جس کی تعداد لاکھوں میں تھی اسے کئی جگہ مسلح بھی کر دیا اور حکومت کو اگر وہ امن قائم کرنا چاہے تو بے دست و پا بنا دیا تھا۔ یہی حالت پولیس کی بھی ہوئی۔ وہ خود بخود تقسیم ہو گئی۔ دہلی کی پولیس میں مسلمانوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی۔ اس نے سب سے پہلے اپنی جان کی فکر کی۔ اور بے پناہوں کی پناہ بننے کے بجائے پناہ گزینوں کے کیمپ میں جا کر پناہ گزیں بن گئی۔

پاکستانی اقلیتوں نے ہندوستان پہنچ کر مسلمانوں کو الٹی میٹم دیا۔ ''پاکستان بنانے کے ذمہ دار تم ہو۔'' اب تمہارے لیے یہاں پناہ نہیں ہے۔ ہندوستان کے فرقہ پرستوں نے ان کی تائید کی۔ بہت سی ریاستیں جو کانگریس گورنمنٹ کی بحالی اور مضبوطی کو اپنے لیے پیغام فنا سمجھتی تھیں فرقہ پرستوں کی ہمنوا بن گئیں۔ اب ان کے پاس نہ سرمایہ کی کمی تھی نہ اسلحہ کی۔

ان قیامت خیز اور طوفان افشاں حالات نے پورے صوبہ دہلی اور مغربی یوپی کے تقریباً ایک درجن اضلاع اور راجستھان کے ان تمام علاقوں کو جو پاکستانی سرحد سے ملتے تھے' جن میں الور اور بھرت پور کو خاص شہرت حاصل ہوئی' تباہی اور بربادی کے اس سیلاب کی نذر کر دیا' جو مغربی پنجاب' سندھ اور فرنٹیر وغیرہ سے امنڈ امنڈ کر آ رہا تھا۔

خود مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ وہ سب لیڈر اور رہنما جن کے بل بوتے پر پاکستان کے حامیوں نے گذشتہ دس سال تک آسمان سر پر اٹھائے رکھا تھا' ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے تھے۔

پاکستان کا ہر ایک حامی نہ صرف مصیبت زدہ اور مایوس تھا بلکہ اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہا تھا۔ غداری کا ایک عام الزام' پاکستان شرنارتھیوں اور ہندوستانی فرقہ پرستوں کی گرجتی ہوئی

کرخت آوازوں کے ساتھ ان کے سر تھوپا جا رہا تھا۔

ان حالات میں تمام قوم پرور مسلم رہنماؤں کے سامنے خود اپنے متعلق ایک سوال تھا:

''وہ ہندوستان میں رہیں تو کس حیثیت سے۔ خود ان کی پوزیشن کیا ہو' اور عام مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہو' بالخصوص ان مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہو۔ جو پاکستان کے حامی تھے۔''

دہلی کا میدان فساد:

یہ ایک حقیقت ہے کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ ' حضرت علامہ مولانا محمد کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہند' امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب اور ان سے وابستہ حضرات سب ہی نے ان سوالات کو عزم و ہمت اور بلند حوصلہ کے ساتھ حل کیا۔ مگر جہاں تک دہلی کا تعلق ہے جو دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے اور اس بنا پر کہ اصل تعداد سے کئی گنا زیادہ تعداد جوش انتقام سے بھرے ہوئے پناہ گزینوں کی یہاں ہوگئی تھی ان ہنگاموں کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا' دہلی کے متعلق بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ عوامی لیڈر کی حیثیت سے سب سے زیادہ جرأت اور ہمت کے ساتھ جس نے ان سوالات کو حل کیا' اور نہ صرف حل کیا بلکہ جس نے حل کردہ منصوبہ کو کامیاب بنانے کے لیے جان کی بازی لگا کر شب و روز کے ہر ایک لمحے کو اپنی جدوجہد سے زندہ جاوید بنا دیا۔ وہ یہی مرد مجاہد تھا جس کو اس کی قوم نے بجا طور پر مجاہد ملت کا خطاب دیا۔ رحمہ اللہ۔

''ہندوستان ہمارا وطن ہے۔ یہ ہماری روایات کا مخزن اور ہماری تہذیب و ثقافت کا گہوارہ ہے۔ اس کی در و دیوار پر ہماری ہزار سالہ تاریخ کے نشانات کندہ ہیں۔ اگر پنڈت جواہر لال نہرو کو یہاں رہنے کا حق ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ انہیں جیسا ہمارا حق بھی اس سرزمین میں نہ ہو۔

وطن عزیز پر بہت سے حوادث آئے ہیں' ایک حادثہ وہ تھا کہ برطانوی سامراج یہاں مسلط تھا۔ ایک حادثہ وہ تھا کہ مسلمانوں میں فرقہ واریت کا بھوت ناچ رہا تھا اور ایک حادثہ یہ ہے کہ ہندو فرقہ واریت کا دیو حملہ آور ہو رہا تھا۔

اگر ہم نے اپنی تمام مجبوریوں اور لاچاریوں کے ساتھ برطانوی سامراج کے مظالم کا

مقابلہ کیا۔ اگر ہم مسلم فرقہ واریت کے مقابلے میں سینہ سپر ہو گئے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ہندو فرقہ پرستی کے مقابلے میں مرد بہادر نہ بنیں اور مرعوب ہو کر وطن عزیز کو خیر باد کہہ دیں۔

ہمیں یہیں رہنا ہے اور باعزت طور پر ان تمام حقوق کے ساتھ رہنا ہے جو ایک باعزت شہری کو حاصل ہو سکتے ہیں۔

بیشک ہم مظلوم ہو سکتے ہیں مگر غلام نہیں بن سکتے۔ اگر ہم نے برطانیہ کی غلامی برداشت نہیں کی تو ہم اکثریت کی غلامی بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم آزاد شہری کی حیثیت سے یہاں رہیں گے اور نہ صرف حفظ الرحمٰن' ابوالکلام نہ صرف قوم پرور مسلمان' بلکہ وہ کروڑوں مسلمان جو ہند یونین میں ہیں سب باعزت شہری کی حیثیت سے رہیں گے۔

پاکستان بن چکا۔ اس کی حمایت اور مخالفت کا سوال بھی ختم ہو گیا اب ہند یونین کے تمام مسلمان ایک کشتی میں سوار ہیں۔ ایک کی تکلیف سب کی تکلیف اور ایک کی ذلت سب کی ذلت ہے''

یہ تھے وہ تصورات اور جذبات جن کو مجاہد ملت نے اپنایا اور جن کے لیے اپنی تمام کوششیں اور صلاحیتیں وقف کر دیں۔

مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ خود فرمایا کرتے تھے کہ ۴ ستمبر ۴۷ء کو مسجد فتح پوری میں گولا پھینکا گیا وہ دہلی میں قیامت خیز طوفان کا آغاز تھا۔ اسی وقت اپنے اور اپنے خدا کے درمیان یہ عہد کر لیا تھا کہ مخالفت و موافقت کے تمام قصے ختم ہو گئے۔ اب ہر مظلوم' ہر پریشان حال' ہر مصیبت زدہ کی امداد ہمارا فرض ہے' خواہ وہ کوئی ہو اور اس کا سابق کردار کچھ رہا ہو۔

ہندو دوستوں کا مشورہ:

ٹاؤن ہال۔۔امن کمیٹی کا سنٹر تھا۔ اس کی کوششیں کرنے والے ہندو مسلمان یہاں جمع ہوتے تھے۔

ایک روز جب خونریزی کا دور شباب پر تھا۔ ٹاؤن ہال کے چاروں طرف مسلمانوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ بلوائیوں کے ہجوم کے سامنے پولیس اور فوج بھی گویا ہتھیار ڈالے ہوئے تھی۔ ہندو دوستوں نے بڑے اصرار سے کہا:

''مولانا آپ اور آپ کے ساتھی ہمیشہ قوم پرور رہے ہیں ہماری ندامت کی کوئی

انتہا نہیں رہے گی اگر آپ صاحبان پر آنچ آئی۔ یہ وحشی ہجوم کسی کے بس کا نہیں یہاں ہمارے تمام حفاظتی انتظامات ناکام ہو چکے ہیں۔ او کھلے میں ایک کیمپ بنایا گیا ہے۔ وہاں یہ ہجوم نہیں پہنچ سکتا۔ وہاں فوجی دستے لگا دیئے گئے ہیں۔ آپ اور آپ کے ساتھی وہاں تشریف لے چلیں۔ آپ حضرات کی بڑی مہربانی ہوگی۔''

مجاہد کی غیر معمولی استقامت:

غور فرمایئے۔ اس نازک وقت میں جب موت سامنے کھڑی تھی' ہندو دوستوں کی یہ اپیل کس قدر موثر ہو سکتی تھی۔ آپ خود اپنے دل سے پوچھئے کیا آپ اس وقت اس اپیل پر لبیک نہ کہتے؟

اس وقت مجاہد ملت کے ساتھ سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب اوز دوسرے رفقاء بھی تھے۔ مگر سب سے پہلے جس نے ترخ کر جواب دیا وہ مجاہد ملت کا حوصلۂ عالی تھا۔ آپ نے فرمایا:

''ہمارے لیے اس سے زیادہ شرم اور بزدلی کی بات کوئی نہیں ہو سکتی کہ خود اپنے وطن میں ہم پناہ گزیں بن کر رہیں۔''

بیشک یہ سخت آزمائش ہے مگر ہمیں ڈٹ کر اس بحران کا سامنا کرنا ہے۔''

یا تن رسد بجانان یا جان زتن برآید

مجاہد ملت نے اپنے اس عزم کو عملی جامہ کس طرح پہنایا' وہ محتاج بیان نہیں۔ ہندوستان کا بچہ بچہ اس کا شاہد ہے۔

اس موقع پر امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے جس تدبر سے فریضۂ قیادت انجام دیا اس سے انکار نہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے تحفظ کے لیے بار باران کو اپنے دولت کدہ سے نکل کر دہلی کی گلیوں اور کوچوں میں گھومنا پڑا۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سیلاب اور طوفان کے منجدھار میں چٹان بن کر جس نے اپنے عمل اور کردار سے دوسروں کو استقلال و استقامت کا سبق دیا۔

جس کی ثابت قدمی نے دہلی میں اس وقت تقریباً ڈیڑھ لاکھ مسلمانوں کو باقی رکھا۔ اور نہ صرف دہلی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے استقلال کا اثر ہند یونین کے گوشہ گوشہ تک پہونچا۔ کیونکہ اگر دہلی اور مغربی یوپی اور راجستھان کے سرحدی اضلاع مسلمانوں سے خالی ہو جاتے تو پھر یہ طے کرنا مشکل ہے کہ وہ سیلاب جوان سرحدوں سے ٹکرا کر ختم ہو گیا کہاں تک پہنچتا۔

اس زمانے میں یو۔ پی کے مغربی اضلاع (سہارنپور، مظفرنگر وغیرہ) تک پہونچنا مجاہد ملت کے لیے ناممکن تھا۔ آپ ایک لمحہ کے لیے بھی دہلی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ان اضلاع میں جس نے درس استقلال واستقامت دیا وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند وصدر جمعیۃ علماء ہند) کا ظل ہمایوں تھا۔ قدس اللہ سرہما العزیز۔

(۹)

مجاہد ملت کا حسن تدبر اور گاندھی جی

آگ کی بھٹی سونے کا کھرا کھوٹا نکھارتی ہے اور مصائب کی بھٹی انسان کے جوہر ابھار دیتی ہے۔

مجاہد ملتؒ کو اللہ تعالیٰ نے تین جوہر ایسے عطا فرمائے تھے' جنہوں نے صرف مجاہد ملت ہی کو نہیں ابھارا۔ بلکہ پوری ملت کو ابھار دیا اور اس کا سر اونچا کر دیا۔

تدبر: یعنی تقاضائے وقت کو برمحل اور عین وقت پر پہچانا' اس کی تہہ تک پہنچ جانا۔ پھر دفع مضرت کے لیے بروقت تدبیر سوچنا۔

جرأت: یعنی بلا جھجک تقاضائے وقت کے بموجب عملی اقدام۔

خطابت: یعنی اپنے خیال اور اپنے منصوبہ کو استدلال کی پوری طاقت کے ساتھ اس طرح پیش کرنا کہ مخاطب لامحالہ متاثر ہو جائے۔ ورنہ کم از کم جواب دینے کی طاقت مفلوج اور مرعوب ہو جائے۔

مجاہد ملت اور ان کے رفقائے کرام کا تعارف گاندھی جی سے پہلے سے تھا اور جیسے ہی اس ہنگامی دور میں ۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو گاندھی جی نواکھالی اور کلکتہ سے واپس ہو کر دہلی پہونچے' مجاہد ملت کا حسن تدبر تھا کہ آپ نے پرانے تعلقات کو صرف تازہ ہی نہیں کیا بلکہ ان کو پختہ کیا اور ایسا اعتماد حاصل کیا کہ حکومت کے سربراہوں کو بھی گاندھی جی کا اتنا اعتماد حاصل نہیں تھا

گاندھی جی فی الحقیقت امن چاہتے تھے اور ابھی تین ہفتہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ بنگال کے فسادات کو' جن کا سلسلہ چند ماہ سے چل رہا تھا اور ہزاروں معصوم جانیں اس کی نذر ہو چکی تھیں' اس طرح ختم کر دیا تھا کہ دنیا حیرت زدہ ہو گئی تھی۔

گاندھی جی ۹ ستمبر کو دہلی پہونچے' فرقہ پرستوں نے ان کی مخالفت اتنی شدت سے کی کہ پرارتھنا کی مجلسوں میں گاندھی جی کو ترمیم کرنی پڑی مجاہد ملت جو خود فرقہ پرستی کے مقابلہ میں نبرد

آزماتھے' گاندھی جی کے دست راست بن گئے۔

مجاہد ملت کو سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب کی رفاقت حاصل تھی۔ بلکہ عجیب وغریب حقیقت یہ تھی کہ حضرت سحبان الہند جو چند سال سے قلب کے مرض میں مبتلا تھے نقل و حرکت سے معذور ہو کر تقریباً گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ مجاہد ملت نے ان کو کنج عزلت سے نکالا۔ بلاشبہ سحبان الہند کا خود اپنا جذبہ اور ان کے قلب بیمار کی بھی تڑپ تھی کہ انہوں نے مجاہد ملت کی دعوت پر لبیک کہا اور ضعف ونقاہت کے باوجود مولانا کا ساتھ دینے کے لیے گوشۂ عافیت سے نکل آئے۔

جمعیۃ علماء ہند کے دفتر کے پاس اس وقت تک کوئی گاڑی نہیں تھی۔ احاطہ کالے صاحب کے مشہور تاجر حافظ محمد نسیم صاحب نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی۔ روزانہ صبح کو اپنی گاڑی لے کر جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں رونق افروز ہو جایا کرتے تھے اور مجاہد ملت حافظ صاحب موصوف کے ساتھ سحبان الہند کے یہاں پہنچ کر ان کو ساتھ لیتے۔ دہلی کے بہت پرانے اخبار نویس۔ سید محمد صاحب جعفری' سابق ایڈیٹر روزنامہ ہمدرد' روزنامہ ''ملت'' بھی سحبان الہند کے یہاں موجود ہوتے' ان کو چوتھا رفیق بناتے۔ اس طرح ان چار رفقاء کا پہلا کام یہ ہوتا کہ مہاتما گاندھی کے یہاں پہنچ کر صحیح صحیح حالات بلاکم وکاست روزانہ پیش کر دیتے۔

گاندھی جی کے تدبر' نیک نفسی' صداقت پسندی اور دور اندیشی میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے طور پر بھی ان حضرات کے بیانات کو پرکھا۔ اور جب ہر طرح صحیح اور درست پایا تو ان کو اتنا اعتماد ہو گیا کہ حکومت ہند کے ہوم منسٹر سردار پٹیل کی شخصیت بھی اس کو ختم نہ کر سکی۔

حکومت ہند نے کبھی اپنی زبان سے یہ بات نہیں کہی مگر کم از کم راجدھانی کا ہر ایک باخبر انسان جانتا تھا کہ ممبران کیبنٹ کے جذبات ایک دوسرے سے مختلف اور ایسے متضاد ہیں۔ جن کے باعث نہ صرف یہ کہ امن وامان کا مسئلہ پیچیدہ ہو گیا ہے۔ بلکہ گاندھی جی کی امن پرورانہ کوششیں بھی ناکام ہو رہی ہیں۔

ایک دفعہ مجاہد ملت نے دہلی کے ڈپٹی کمشنر مسٹر رندھاوا سے (جس کو مسلمانوں کے حق میں ۱۹۴۷ء کا لارڈ کیننگ کہنا درست ہے) ہنگاموں اور فسادات کے متعلق شکایتیں کیں اور مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کا نظریہ اور ان کی منشاء سمجھانے کی کوشش کی تو مسٹر رندھاوا نے فوراً تیوری بدل کر جواب دیا:۔

"ہمارا تعلق سردار پٹیل سے ہے اور وہ ہمارے کاموں سے مطمئن ہیں۔"

تاہم گاندھی جی کا اثر ورسوخ بھی معمولی نہیں تھا۔ اس کا اثر یہ تھا کہ تمام لاچاریوں اور بے بسیوں کے باوجود جمعیۃ علماء کے کارکن اس طرح حاوی تھے کہ دہلی ایڈمنسٹریشن کے افسر طنزاً کہا کرتے تھے کہ دہلی میں حکومت جمعیۃ علماء کی ہے۔

میواتیوں کا مسئلہ:

مجاہد ملت نے فرقہ داریت کے مقابلے میں گاندھی جی کا دست راست بن کر صرف دہلی کی آتشیں فضا کو سرد کرنے کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ دہلی سے متصل راجستھان اور مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو بھی محفوظ رکھنے اور ان کو مطمئن کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہے۔

افسوس اس زمانے میں جمعیۃ علماء سے تعلق رکھنے والا ہر ایک چھوٹا بڑا اس درجہ مصروف اور منہمک تھا کہ کسی کو بھی ڈائری لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ احقر نے چند بار یہ سلسلہ قائم کرنا چاہا۔ مگر ایک طرف واقعات کی کثرت اور دوسری جانب جماعتی فرائض کی انجام دہی کی کوشش۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈائری لکھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ تاہم بہت سے واقعات علماء حق جلد دوم اور "مختصر تذکرہ خدمات جمعیۃ علماء ہند" میں درج کر کے شائع کرا چکا ہوں۔

بہر حال یہ بات کسی ڈائری کے اندراج یا کسی شخص کی تصدیق وشہادت کی محتاج نہیں ہے کہ الور اور بھرت پور کی ریاستوں کی کھلی ہوئی پالیسی یہ تھی کہ وہ اپنی ریاستوں سے مسلمانوں کا نام ونشان ختم کر دیں۔ ان مسلمانوں میں زیادہ تعداد "میواتیوں" کی تھی۔ جن کی مردم شماری ان ریاستوں میں تقریباً چھ لاکھ تھی۔ ان ریاستوں کی سرحدیں مشرقی پنجاب کے ضلع گوڑ گانوہ سے ملتی ہیں۔ اس ضلع میں بھی کئی لاکھ میواتی آباد تھے۔ جن کی کافی تعداد اب بھی موجود ہے (امید ہے کہ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں ان کی تعداد دو لاکھ سے بھی بڑھ گئی ہوگی)

الور، بھرت پور اور ضلع گوڑ گانوہ کے اس علاقے میں جس کو "میوات" کہا جاتا ہے، تقسیم سے پہلے کس طرح مسلمان میو اور ہندو جاٹ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہے اور پھر کس طرح ان میں ایسی حیرت انگیز صلح ہوئی کہ ۴۷ء کے فسادات کا آتش فشاں بھی اس میں جنبش پیدا نہ کر سکا۔ اس کی دلچسپ تفصیل علماء حق جلد دوم اور "مختصر تذکرہ خدمات جمعیۃ علماء ہند" حصہ دوم میں ملاحظہ فرمائی جائے۔

یہاں اس کا دہرانا ممکن نہیں ہے۔ یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ جب الور اور بھرت پور کی ریاستیں میواتیوں اور عام مسلمانوں کے جبراً اخراج کا فیصلہ کر چکی تھیں۔ ان علاقوں میں میواتیوں کو باقی رکھنا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

بیشک میواتیوں کی تقریباً نصف تعداد ترک وطن کر گئی تھی۔ مگر باقی ماندہ میواتی جو اس وقت تین لاکھ سے کم نہیں تھے، اپنی ثابت قدمی اور مضبوطی کے باوجود کسی پشت پناہ اور دست گیر کے محتاج تھے، بالخصوص ایسی حالت میں کہ الور اور بھرت پور کی ریاستوں کے علاوہ مشرقی پنجاب میں بھارگو گورنمنٹ اور مرکز میں سردار پٹیل کی ہوم منسٹری کا منصوبہ یہ تھا کہ ''راجدھانی'' (دہلی) سے ملے ہوئے علاقے کو شدھ کر لیا جائے اس محفوظ علاقہ پر مسلمان کا سایہ بھی نہ پڑ سکے۔

جغرافیائی لحاظ سے اس علاقے میں خشک پہاڑیاں موجود ہیں اور وہ بہت سے موقعوں پر میواتیوں کی پناہ گاہ بن جاتی ہیں، مگر اس موقع پر وہ بھی پناہ نہیں دے سکیں۔ ان کو ان پہاڑیوں سے بھی زیادہ مضبوط کوہ استقلال کی ضرورت تھی۔

بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مجاہد ملت کی عظیم الشان شخصیت ان لاکھوں مسلمانوں کے لیے وہ کوہ استقلال کی ثابت ہوئی جس کی ان کو ضرورت تھی۔ مجاہد ملت نے کبھی خود ان علاقوں کا دورہ کر کے اور کبھی اپنے رفیقوں کو بھیج کر صرف اطمینان کا پیغام ہی نہیں پہونچایا بلکہ آپ نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ان کی اہمیت مہاتما گاندھی کے ذہن نشین کرائی اور ان کو اس درجے متاثر کیا کہ گاندھی جی نے میواتیوں کی حفاظت اور اجڑے ہوئے میواتیوں کو ان کی جگہ آباد کرانا، اپنی زندگی کا ایک نصب العین بنا لیا۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز بات کیا ہو سکتی ہے کہ مشرقی پنجاب کی حکومت الور اور بھرت پور کی ریاستیں اور سردار پٹیل کی منسٹری جن کے اخراج کا فیصلہ کر چکی تھی۔ ان کے متعلق مہاتما گاندھی نے کانفرنس کے کھلے اجلاس میں فرمایا:

> ''میواتی بھارت کی ریڑھ کی ہڈی [illegible]ے ملک کا گاڑھا خون ہے۔ میں کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ وطن کا گاڑھا خون اس کے بدن سے نکال دیا جائے۔''

مجاہد ملت نے ایک طرف ان میواتیوں کو کانفرنس میں جمع ہونے کا مشورہ دیا۔ گھاسیرہ مقام پر ان کی کانفرنس ہوئی۔ جس میں پنجاب کے چیف منسٹر مسٹر بھارگو بھی شریک ہوئے اور مجاہد ملتؒ مہاتما گاندھی کو بھی اس کانفرنس میں لے گئے۔ اس موقع پر بھارگو کی تقریر میواتیوں کو

کیا خود مہاتما گاندھی کو بھی مطمئن نہ کر سکی۔ لیکن گاندھی جی نے حکومت کے ذرائع سے علیحدہ ہو کر اپنے خاص ورکروں کو اس علاقے میں لگایا۔ جو کئی سال تک یہاں کام کرتے رہے۔ گاندھی جی کے مشہور چیلے ونوبا بھاوے نے بھی گاندھی جی کے حکم سے اس علاقے کا دورہ کیا۔ جو مسلمان دہشت اور رعب کی وجہ سے ہندو ہو گئے تھے ان کی چوٹیاں کٹوائیں۔

بہر حال یہ سب کچھ ہوا مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سب کچھ نتیجہ تھا' مجاہد ملت مولانا محمد حفظ الرحمنؒ صاحب کی اس سعی بلیغ اور جدوجہد مشکور کا جس کا کچھ اشارہ ہم اوپر کر چکے ہیں۔

پانی پت:

پانی پت میں آباد تقریباً پینتالیس ہزار مسلمان بھی اسی حالت میں تھے کہ وہاں کی حکومت (دہی بہار گو گورنمنٹ) ان کے اخراج کا فیصلہ کیے ہوئے تھی اور وہ خود اس فیصلے کو منظور کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔

مجاہد ملت یہاں بھی غالباً دو مرتبہ گاندھی جی کو لے کر گئے اور ان کے لیے فضا ہموار کرنے کی کوشش کی مگر کہنا پڑتا ہے کہ ان میں وہ استقلال نہیں تھا جس کا مظاہرہ میواتیوں نے کیا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میواتیوں کو اپنے پڑوس کی حمایت حاصل ہو گئی۔ پانی پت کے مسلمان اس سے محروم رہے اس بنا پر یہاں مجاہد ملت کی کوشش اور گاندھی جی کی نصیحتیں کامیاب نہیں ہو سکیں۔

اسپیشل ٹرینوں کا انتظام:

دہلی کے علاوہ یوپی وغیرہ دوسرے صوبوں کے ہزاروں بلکہ تقریباً ایک لاکھ مسلمان جو نہ دہلی والوں سے زیادہ واقف تھے۔ نہ یہاں کی چور گلیوں اور کوچوں کی ان کو خبر تھی۔ وہ اپنے آپ کو جب حوادث کی اس طوفانی بارش میں گھرا ہوا پاتے تو اپنی موت سے زیادہ غریب الوطنی اور اپنے عزیزوں سے جدائی کا صدمہ ان کے ہوش گم کر دیتا تھا۔ مجاہد ملت نے اصرار کر کے حکومت کی طرف سے اسپیشل ٹرینوں کا انتظام کرایا۔ جب یہ لوگ اپنے اپنے مقامات پر پہونچے تو ان کو حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ یاد آ گیا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو شکم ماہی

سے صحیح سالم نکالا تھا۔

اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں۔ جن میں سے ہر ایک واقعہ تاریخ کا ایک باب ہے۔ لیکن ''علماء حق جلد دوم'' اور ''مختصر تذکرہ خدمات جمعیۃ علماء ہند'' جو اسی موضوع پر مستقل کتابیں ہیں۔ جب ان کتابوں کے دامن ان تمام واقعات کو نہیں سمیٹ سکے تو ان کالموں میں ان کی گنجائش کہاں نکل سکتی ہے۔ واقعات کی تفصیل کے بجائے ایک بنیادی نقطے کو پیش کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جو مجاہد ملت کے حوصلہ وسیع اور نظر بلیغ کی اعلیٰ مثال اور بہترین شہادت ہے۔

(۱۰)

جدوجہد کی مختلف صورتیں

بنیادی نقطہ نظر

مجاہد ملت نے کارپردازان حکومت کے دروازوں پر دستک دے کر کس طرح ان کو آرام گاہوں سے نکالا۔ ان کی بے نیازی اور بے اعتنائی ختم کر کے کس طرح ان کو امداد و اعانت پر آمادہ کیا۔ بے شمار خاندان جو متفرق محلوں میں موت کے منہ میں پھنس گئے تھے ان کو انہیں بے نیاز ممبروں کے ذریعے تباہی کے جہنم سے کس طرح نجات دلائی۔

بارہا ایسا ہوا کہ پولیس فورس فراہم نہ ہو سکی تو بنام خدا اس جہنم میں کود ے اور زندگی سے مایوس انسانوں کو یاس و ناامیدی کی ظلمت سے نکالا اور محفوظ مقامات پر پہنچایا۔

مجاہد ملت کا یہ عزم' رفقاء اور ساتھیوں پر بھی اثر انداز ہوتا اور خطرات میں گھرے ہوئے مایوس انسانوں میں وہ حوصلہ پیدا کر دیتا تھا کہ وہ خود اپنے عزم و ہمت سے اپنی حفاظت کرتے اور حملہ آوروں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے اس طوفان سے صحیح سالم ساحل اطمینان پر پہنچ جاتے تھے۔ خدا جانے کتنے ہزار انسان مجاہد ملت کی اس کرامت یا عزم کی برکت سے زندہ اور محفوظ رہنے میں کامیاب ہو گئے۔

یہ سب باتیں صحیح ہیں اور مجاہد ملت مرحوم کے کارناموں کے سنہرے ابواب ہیں۔ مگر ہم یہاں ان کی تفصیل پیش نہیں کر سکتے۔ ہمیں یہاں یہ ذہن نشین کرانا ہے کہ مجاہد ملت کا منتہاء نظر صرف یہ نہیں تھا کہ مسلمانوں کی جانیں بچ جائیں اور ان کے مال محفوظ رہ جائیں۔ بلکہ آپ کا نقطہء نظر یہ تھا کہ مسلمان اپنے وطن میں مساویانہ حیثیت سے باعزت شہری بن کر رہیں' یعنی جس طرح وہ اپنے جان و مال' عزت و آبرو کی طرف سے مطمئن ہوں اسی طرح ان کو اپنی تہذیب' اپنے مذہب اور اپنے مذہبی مراسم کی طرف سے بھی اطمینان ہو۔ کہ یہ سب محفوظ ہیں اور ان کو آزادی ہے کہ جس کام کو وہ مذہبی کام سمجھتے ہوں' اس کو آزادی کے ساتھ کرتے رہیں جس طرح پہلے کرتے تھے۔

مذہبی کاموں کے بارے میں مجاہد ملتؒ نے اپنے عقیدہ اور مسلک کو معیار نہیں بنایا۔ بلکہ خود عمل کرنے والوں کے جذبات و خیالات کو معیار قرار دیا۔ کیونکہ یہاں سنت یا بدعت کا سوال نہیں تھا بلکہ سوال تھا۔ شہری حقوق کی بحالی کا' جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان جس کام کو اپنا شہری حق سمجھتے ہیں اس کی ان کو آزادی ہو۔

یہ کام مصلحین اور مبلغین کا ہے کہ وہ غلط رسومات کا انسداد کریں۔ حکومت اس بارہ میں مفتی اور مصلح کی حیثیت نہیں اختیار کر سکتی' ورنہ پھر مذہب کے صحیح کاموں میں بھی دخل اندازی کی نوبت آ سکتی ہے۔

اس نقطہ نظر کے نتیجے میں یہ بات تو ظرافت ہی قرار دی جائے گی کہ تازیہ بنانے والوں کو بھی تازیہ بنانے کی نہ صرف آزادی حاصل ہوئی بلکہ حکومت نے اہتمام کیا کہ حسب سابق تازیے بنائے جائیں اور باضابطہ جلوس نکلیں۔ بہرحال یہ حرکت ایک طرح کی ظرافت تھی البتہ یہ بات ایک بڑے طبقے کے نزدیک قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی کہ جو عرس بند ہو گئے تھے یا اس خطرناک دور میں جب کہ دہلی کے گلی کوچوں سے بھی امن اور اطمینان مفقود ہو گیا تھا جن عرسوں کا امکان ختم ہو رہا تھا' حکومت نے خاص اہتمام و انتظام کر کے ان کو جاری کرنے کا موقع دیا۔

قطب صاحب' خواجہ اجمیر اور حضرت مجدد کی درگاہیں:

اس سلسلے کی کڑی وہ عظیم الشان خدمت ہے جو ہندوستان کی مرکزی خانقاہوں اور درسگاہوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انجام پذیر ہوئی۔

عرس کے متعلق علمائے دیوبند کا مسلک کچھ بھی ہو' مگر اکابر اولیاء اللہ سے ان کی عقیدت کسی سے کم نہیں ہے بلکہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ صحیح عقیدت علمائے دیوبند ہی کو ہے۔ بہرحال یہاں اس بحث کا موقع نہیں ہے یہاں تو یہ عرض کرنا ہے کہ یہ تین درگاہیں جو نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیاء اسلام کی نظر میں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں' اس دور پر آشوب کی تباہ کاریوں کی زد میں آ چکی تھیں۔

وہی سرہند اور بسی جو حضرت مجدد صاحبؒ کے مرکز ارشاد رہے تھے جن کا تذکرہ محبت اور قلبی تعلق کی چاشنی لیے ہوئے مکتوبات میں بار بار آیا ہے۔ چونکہ ریاست پٹیالہ میں واقع تھے

جس کا نمبر مشرق پنجاب میں سب سے بڑھا ہوا تھا اس لیے یہ دونوں عظیم الشان قصبے ان بدترین حالات کو برداشت کر چکے تھے جو مشرقی پنجاب میں پیش آئے تھے۔

یہ درست ہے کہ شاہ افغانستان نے پنڈت نہرو کو حضرت مجدد صاحبؒ کی بارگاہ کے بارے میں تار دیا تھا۔ اسی طرح اجمیر شریف کی حفاظت کے متعلق بیرونی ممالک سے پنڈت جی کے نام تار موصول ہوئے تھے جن کی بنا پر حکومت ہند نے ان کی حفاظت کا خاص انتظام کیا جس سے یہ درگاہیں محفوظ رہ گئیں۔ پھر اگرچہ سرہند اور بسی سے کلی طور پر مسلمانوں کا تخلیہ ہو گیا اور اجمیر شریف کے تمام مسلمان حالات کی شدت سے مجبور ہو کر منتشر ہو گئے۔ البتہ وہاں خدام صاحب نے فی الواقع بڑی ہمت و جرأت کا ثبوت دیا کہ خطرات کے بے پناہ ہجوم کے وقت بھی ان حضرات نے حضرت خواجہ غریب نواز کے آستانہ کو نہیں چھوڑا اور یہ بھی درست ہے کہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے اثر و رسوخ نے کافی دست گیری کی۔ لیکن عوامی لیڈر کی حیثیت سے جس نے سجادہ نشین اور خدام صاحبان کی خبر گیری کی اور ہمتیں بندھائیں، وہ مجاہد ملت ہی تھے۔ رحمہ اللہ

سرہند شریف تو حضرت مجاہد ملت اس دور میں تشریف نہیں لے گئے۔ وہاں کی حاضری تو احقر سے متعلق فرمائی تھی، مگر اجمیر شریف بار بار خود تشریف لے گئے۔ پھر درگاہ بل (کشمیر) وغیرہ میں حضرات خدام کی کافی ترجمانی کی۔ بلکہ ایک عرصے تک ایسا رہا کہ نظم کے ذمہ دار گویا مجاہد ملتؒ ہی تھے۔ اجمیر کے حضرات مجاہد ملت ہی سے مطمئن تھے۔ ہر موقع پر مجاہد ملتؒ سے مشورہ لیتے، ہدایت حاصل کرتے اور انہیں ہدایات پر عمل پیرا ہونے کو کامیابی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

ان تینوں درگاہوں میں قطب صاحب (یعنی درگاہ شریف حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی رحمۃ اللہ علیہ) کی بارگاہ معلیٰ کا معاملہ سب سے زیادہ پیچیدہ اور دشوار تھا۔ کیونکہ خاص اس دور میں کہ پناہ گزینوں کا ٹڈی دل دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا، اس کو محفوظ رکھنے کا انتظام نہیں کیا گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا قصبہ مہرولی جہاں یہ درگاہ ہے شرنارتھیوں کا شہر بن گیا تھا۔ کوئی ایک گھر بھی مسلمان کا نہیں رہا تھا۔ خانقاہ شریف کا کونہ کونہ شرنارتھیوں سے بھرا ہوا تھا۔ تقریباً ایک ہزار افراد خانقاہ میں رہتے تھے۔ درگاہ کو خالی کرانے کی کوشش گویا مہرولی میں بسنے والے ایک لاکھ شرنارتھیوں سے ٹکر لینی تھی۔

سردار پٹیل کی ڈیوڑھی پر بار بار حاضری دی گئی۔ چیف کمشنر اور ڈپٹی کمشنر (رندھاوا) سے

بار بار التجائیں کی گئیں۔مگر سب بے سود رہیں۔

بالآخر مہاتما گاندھی کا دامن پکڑا گیا۔غیر مناسب نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ ان کو شیشہ میں اتارنے کی کوشش کی گئی اور احقر کو اس شہادت کے قلم بند کرنے میں بھی تامل نہیں ہے کہ اس موقع پر سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ کی شیریں کلامی نے بڑا کام کیا۔

یہ پہلے گزر چکا ہے کہ گاندھی جی کے یہاں روزانہ صبح کو جانا ان حضرات کا معمول تھا۔ حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ اس حاضری کے وقت حضرت قطب صاحب کی کچھ باتیں ایسے انداز سے دیش باپو سے فرماتے تھے کہ مہاتما گاندھی کے دل میں اتر جاتی تھیں۔ چنانچہ گاندھی جی اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ جب ۹ رجنوری ۱۹۴۸ء سے گاندھی جی نے مرن برت رکھا تو برت کھولنے کی آٹھ شرطوں میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ قطب صاحب رحمہ اللہ کی خانقاہ مکمل طور پر خالی کرائی جائے جب گاندھی جی کی شرط کامیاب ہوگئی اور خانقاہ خالی ہوگئی۔تو اتفاق سے عرس میں چند روز باقی رہ گئے تھے۔عرس میں شرکت کی خواہش گاندھی جی نے بھی کی اور ان حضرات نے بھی اس کو حالات کے لحاظ سے مناسب اور بہتر سمجھا۔

(۱۱)

شیرازہ بندی مسلم پراگندہ

وطن دوستی، قوم پروری، اور حقوق شہریت میں مساویانہ حیثیت حاصل کرنے کے جس بلند نظریے کے ساتھ دہلی میں کام کیا گیا اور جس طرح مسلمانان دہلی کے ذہنوں کو احساس کمتری سے محفوظ رکھا گیا۔ ضرورت تھی کہ انہیں جذبات اور نظریات پر ہند یونین کے مسلمانوں کو متحد کیا جائے اور قیامت خیز ہنگاموں نے جو خوف و ہراس عام مسلمانوں میں پیدا کر دیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں وہ احساس کمتری میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں اور عین ممکن ہے کہ وہ اپنے متعلق غلامی کا فیصلہ کرلیں۔ ضرورت تھی کہ اس پست احساس کی کائی ان کے ذہنوں سے صاف کی جائے۔

جو فرقہ وارانہ رجحانات برطانیہ کی اس بنیادی پالیسی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' سے پیدا ہوئے تھے جن کو پائیدار کرنے کے لیے پچاس سال پہلے سے جداگانہ انتخاب کا طریقہ اور پھر تقسیم ہند کا مطالبہ ایجاد کیا گیا تھا۔ تقسیم کے بعد اگر ایک طرف وہ جن سنگھ، ہندو مہا سبھا اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے وجود اور ترقی کا سبب بنے ہوئے تھے تو دوسری جانب ان رجحانات نے ان مسلمانوں کو نہ صرف مایوسی میں مبتلا کر دیا تھا بلکہ ایک تاریک چوراہے پر کھڑا کر دیا تھا جو ان رجحانات کے حامی رہے تھے کیونکہ اب نہ صرف تصورات کی دنیا بدل گئی تھی بلکہ بدقسمتی یہ تھی کہ وہ ٹہنیاں ہی ٹوٹ کر اڑ گئی تھیں جن کی پھونگلوں پر آشیانے کے تنکے رکھے گئے تھے۔

ان مسلمانوں کے لیے ایسی روشنی کی ضرورت تھی جو گم گشتہ راہ کی سراسیمگی ختم کر کے ایک معین راستہ کی نشان دہی کر سکے۔

اس میں شک نہیں کہ ہند یونین کے تقریباً ساڑھے تین کروڑ مسلمانوں کی اس عمومی حالت کے احساس نے سب سے پہلے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو متحرک بنایا۔ چنانچہ آپ نے پورے ہندوستان کے ممتاز مسلم رہنماؤں کی ایک خصوصی کانفرنس ۱۳ر نومبر ۱۹۴۷ء کو دہلی میں طلب کی۔ جب کہ ۱۵ر نومبر ۱۹۴۷ء کو کانگریس کا اجلاس دہلی میں ہونے والا تھا جس میں فرقہ واریت اور فرقہ وارانہ تنظیمات کے خلاف تجویز منظور ہونے والی تھی۔

اس کے بعد کل ہند پیمانے پر ایک عام کانفرنس لکھنو میں طلب فرمائی جو آزاد کانفرنس کے نام سے اب تک مشہور و معروف ہے۔ مگر جہاں تک عملی جدو جہد اور انتظامات کا تعلق ہے چونکہ مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب نے دست راست بلکہ پیکر عمل بن کر کام کیا۔ اس لیے ان دونوں کانفرنسوں کی کامیابی کا سہرا بھی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی شخصیت ہی کو آراستہ کرتا ہے۔

نومبر ۱۹۴۷ء کو فسادات کا دور شباب تو نہیں کہا جا سکتا مگر دہلی میں خون مسلم کی کوئی قیمت اب تک بھی نہیں قائم ہوئی تھی خاص انتظام کے بغیر گلیوں اور کوچوں میں کوئی شخص اپنی جان پر کھیل کر ہی گزر سکتا تھا۔

دہلی جنکشن اب بھی غیر محفوظ تھا۔ خود پلیٹ فارموں پر سخت سے سخت جانی اور مالی حادثے پیش آ جاتے تھے، دہلی کے پر خطر حدود میں داخل ہونے سے پہلے آنے والے مدعوئین کا اس طرح استقبال کرتا کہ وہ حفاظت کے ساتھ اپنے تجویز کردہ قیام گاہ پر پہنچ سکیں یا قیام گاہ سے چل کر بہ حفاظت تمام کانفرنسوں میں شرکت کر سکیں۔ پھر اس پریشانی کے دور میں فرائض مدارات انجام دینا بہت ہی خطرناک اور پریشان کن خدمت تھی۔ جس کو نہایت بلند آہنگی اور خوش اسلوبی کے ساتھ مجاہد ملت نے اپنے مخلص رفقا کی مدد سے انجام دیا۔

جمعیۃ علماء ہند کے کچھ رضا کاروں کو اسپیشل پولیس کی حیثیت دے دی گئی تھی۔ ان کو بندوقیں بھی دے دی گئی تھیں۔ یہ مسلح دستہ حضرت مجاہد ملت کے زیر کمان ہر ایسے موقع پر فرائض حفاظت انجام دیتا تھا۔ انتہا یہ کہ قبرستان تک مسلمانوں کا پہنچنا مشکل ہوتا تھا تو یہی دستہ جنازہ کے ساتھ جاتا تھا۔ ہفتہ میں دو تین بار اس دستہ کو جنازہ پہونچانے کی ڈیوٹی لامحالہ انجام دینی پڑتی تھی۔

یہ رضا کار اور کچھ اور ساتھی غازی آباد بھیج دیئے گئے تھے۔ آنے والے مہمانوں کو غازی آباد اتار لیا جاتا تھا اور وہاں سے جیپ کار یا موٹروں کے ذریعہ محفوظ راستوں سے نکال کر قیام گاہوں پر پہنچایا جاتا تھا۔

آزاد کانفرنس لکھنو:

لکھنو میں یہ کانفرنس (آزاد کانفرنس) ۲۷ دسمبر ۱۹۴۷ء کو ہونے والی تھی۔ دہلی کی اس وقت یہ حالت تھی کہ صرف ریلوے جنکشن پر ہزاروں شرنارتھی پورا پورا اثاث البیت لیے ہوئے

قیام پذیر تھے۔ اثاث البیت کے انباروں نے تمام پلیٹ فارموں کو گودام بلکہ خطرناک گھاٹیاں بنا رکھا تھا۔ پلیٹ فارم پر گزرنا ہر ایک کے لیے مشکل تھا۔ مگر خاص طور پر مسلمانوں کے لیے حد درجہ مخدوش تھا۔ خنجر زنی کے واقعات رات دن ہوتے رہتے تھے۔

لکھنو کانفرنس میں دہلی سے نمائندگان کی بڑی تعداد جانے والی تھی تو اس وقت مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی جدوجہد نتیجہ خیز ثابت ہوئی کہ ان کے لیے اسپیشل ٹرین کا انتظام کیا گیا۔ پولیس کا ایک دستہ ٹرین کے ساتھ کیا گیا۔ دہلی جنکشن کے جس پلیٹ فارم سے یہ اسپیشل روانہ ہونے والی تھی وہاں پولیس کا خاص انتظام کیا گیا۔ ان تمام انتظامات کو مولانا آزاد کے اثر و رسوخ نے آسان کیا مگر ضرورتوں کا نقشہ تیار کرنے والے پھر اس میں عمل اور کردار کا رنگ بھرنے والے مجاہد ملت تھے (رحمہ اللہ) دہلی کے علاوہ اور علاقوں میں یہ دشواریاں نہیں تھیں' چنانچہ ہندوستان کے گوشے گوشے سے تقریباً ایک لاکھ مدعوئین اور ارکان و نمائندگان نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔

حضرت مولانا آزاد کی تقریر صدارت یقیناً ایک تاریخی تقریر تھی۔ مگر جس نے مسلمانوں کے دلوں سے خوف و ہراس دور کر کے اعلیٰ نصب العین کی روشنی دکھائی اور ایک بلند ترین مقصد کا عزم ان کے ذہنوں میں برانگیختہ کیا وہ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی تقریر تھی اسی بنا پر کامیابی کا کریڈٹ آپ کو دیا گیا۔

بہر حال ۲۷ / ۲۸ / دسمبر ۱۹۴۷ء کو یہ کانفرنس لکھنو میں کی گئی۔ سہمے ہوئے مسلمانوں نے اس کانفرنس کو پیغام زندگی تصور کیا اور ملک کے تمام گوشوں سے سفر کر کے اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ مسلمانوں کا اس سے بڑا اجتماع نہ اس سے پہلے کبھی دیکھا' نہ اس کے بعد آج تک دیکھا گیا۔ یہ کانفرنس اصولی اور بنیادی طور پر اس بات کی ضمانت تھی کہ مسلمانوں کا دامن فرقہ واریت سے پاک ہے اور وہ ملک کی مشترک سیاست میں حصہ لے کر ترقی پذیر عنصر کی حیثیت سے ملک کی خدمت کے لیے آمادہ ہیں۔

اس کانفرنس میں فرقہ واریت کے خطرات سے ملک کو آگاہ کیا گیا' صوبائی حکومتوں سے فرقہ واریت کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا گیا کہ وہ فرقہ پرور عناصر سے اپنے نظام کو پاک کر کے غیر فرقہ وارانہ جمہوریت کو کامیاب کرنے کی طرف تیزی اور مستعدی سے قدم بڑھائیں۔ اس کانفرنس کا عظیم الشان کارنامہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے دامن سے ان تمام دھبوں کو دھویا گیا جو

فرقہ پرستوں کی طرف سے لگائے جارہے تھے۔ اس کے بعد خوف و ہراس اور احساس کمتری کے باقی رہنے کے کوئی معنی نہیں تھے۔

مجاہد ملت کی تقریر:

کانفرنس کے آخری اجلاس میں جمعیۃ علماء ہند کے ترجمان مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے کانفرنس کی کارگزاری اور تجاویز پر تبصرہ کرتے ہوئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ جو ولولہ انگیز اور تاریخی تقریر فرمائی وہ الجمعیۃ کے اسی نمبر میں آپ کے ملاحظہ سے گزرے گی۔

مسلمانان ہند کے ایک لاکھ نمائندوں نے جب یہ تقریریں سنیں اور کانفرنس کی دو روز کی کارگزاری کا مشاہدہ کیا' اس کی تجاویز پر غور وخوض کیا تو پھر صرف وہی شخص خوف زدہ اور ہراساں رہ گیا جو بزدل تھا۔ یا جس کے دل میں کھوٹ تھی۔ جمعیۃ علماء ہند کے ارکان نے پورے ملک میں دورے کر کے کانفرنس کے حیات بخش فیصلوں کو ہر سننے والے کان تک پہنچایا اور ان کروڑوں مسلمانوں کو جو مستقبل سے مایوس ہو چکے تھے اطمینان بخش روشنی سے آشنا کیا۔

(۱۲)

مجاہد ملت اور سیکولرزم

اگر جمہوریت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایک باشندۂ ملک شہری حقوق میں مساوی درجہ کا مالک ہو' ہر ایک فرد کو رائے اور فکر کی آزادی حاصل ہو۔ مذہبی آزادی کے ساتھ اس کو یہ بھی حق ہو کہ اپنے کلچر' اپنی تہذیب و تمدن اور اپنی روایات کو زندہ رکھ سکے' جہاں تک ممکن ہو ترقی دے سکے۔ تو ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مختلف مذہبوں کے ماننے والے مساویانہ شہری حقوق کے مستحق ہوں جمہوریت کا لازمی تقاضا یہ بھی ہوگا کہ نظام حکومت سب مذہبی ہو یا لامذہبی اور لادینی ہو۔ جب کہ ایک ہی مذہب کے ماننے والوں میں بہت سے فرقے اور بہت سے مکتبۂ خیال موجود ہوں تو ''سب مذہبی نظام حکومت'' ناممکن العمل بھی ہوگا اور اتحاد و یکجہتی پیدا کرنے کے بجائے تقسیم در تقسیم اور انتشار در انتشار پیدا کر دے گا۔

وطنی اور ملکی امور میں یکجہتی صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ مذہبیات سے الگ حکومت اور سیاست کا تعلق صرف ملکی امور سے ہو۔ مذہبی معاملات میں حکومت قطعاً غیر جانبدار ہے' نہ کسی مذہب کی پشت پناہ بنے' نہ کسی کی مخالف' لادینی حکومت کا یہی مطلب ہے جس کو سیکولر حکومت کہا جاتا ہے۔

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جو آزادی سے پہلے مسلم فرقہ واریت کے مقابلے پر سینہ سپر رہے اور خاص ۴۷ء کے ہنگامی حالات میں ہندو فرقہ واریت کے مقابلے میں سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔ پھر جیسے جیسے فسادات کے آتش فشاں شعلہ بار ہوئے مجاہد ملت کی سرگرمیاں ان کے مقابلے میں بڑھتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ شعلے سرد پڑے اور وہ سیلاب پایاب ہوا۔ ظاہر ہے وہ ہندیونین میں سیکولرزم ہی کے حامی ہو سکتے تھے۔ ۴۹ء اور ۵۰ء میں جب ہندوستان کا دستور اساسی منظور کیا جا رہا تھا۔ فرقہ پرست طاقتوں کی پوری کوشش یہ تھی کہ جب اسلامی حکومت کے نام پر پاکستان بنوایا گیا ہے تو لامحالہ ہندیونین میں ہندو حکومت ہو۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کے باقاعدہ ممبر نہیں تھے۔[1] صرف ایک سب کمیٹی کا ممبر آپ کو بنایا گیا تھا۔ مگر آپ کی تمام سرگرمیاں ان کو کمک پہنچانے میں صرف ہوتی رہیں جن کو بانی سیکولرزم کہا جا سکتا ہے یعنی دیش باپو گاندھی جی' مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم حکومت ہند۔

اس ماحول میں کہ فرقہ واریت شباب پر تھی اور ہر طرف فرقہ وارانہ جذبات کا دیو رقص کر رہا تھا۔ سیکولرزم کو دستور اساسی کی بنیاد قرار دینا ایک ایسی عجیب بات تھی جس کے لیے مذہب کی زبان مین کرامت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی ظاہری اسباب کا تقاضا یہ تھا کہ ہندوازم کامیاب ہو مگر جو نتیجہ ظہور پذیر ہوا وہ اس کے خلاف اور قطعاً غیر متوقع تھا۔

سیکولرزم کا تصور کامیاب ہو سکا یا نہیں۔ یہ ایک مستقل مسئلہ ہے۔ اگر پندرہ سال گزر جانے کے بعد بھی ناکام ہے تو اس کے اسباب پر بحث کی جا سکتی ہے۔ مگر جہاں تک مجاہد ملتؒ کی مساعی کا تعلق ہے ان کی درخشاں پیشانی داغ دار نہیں ہو سکتی۔ بلکہ حالات کی نامساعدت اس کو اور زیادہ آب دار بنا دیتی ہے۔

جب نظریات کا تصادم ہو تو اس کا اثر قومی کردار پر بھی پڑتا ہے۔ چنانچہ ایک طرف سیکولرزم کے بانی اور معمار صاحبان کی کوششیں سیکولرزم کو کامیاب بنانے میں صرف ہوتی رہیں تو دوسری جانب فرقہ پرست جماعتوں نے جہاں موقع ملا مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔

مسلمانوں کی مظلومانہ تباہی اور بربادی کا صدمہ مجاہد ملت سے زیادہ کس کو ہو سکتا ہے۔ مگر ہر موقع پر ایک اور صدمہ بھی آپ کے دل و دماغ کو متاثر کرتا رہا۔ یعنی ہر ایک ہنگامہ اور فساد سیکولرزم کی تحریک کے خلاف ایک حملہ ہوتا تھا' جس سے منزل دور ہو جاتی تھی۔ مجاہد ملت جیسے بااحساس مسافر کے لیے دوری منزل کا صدمہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ چند سال یقیناً ایسے گزرے کہ وہ جذبات جو ۱۹۴۷ء میں مشتعل ہو چکے تھے' وہی ان ہنگاموں کا سبب ہوتے تھے لیکن

۱۔ اس مقام پر انیس الحسن صاحب نے یہ حاشیہ لکھا ہے:

غالباً حضرت مولانا محمد میاں صاحب کو یہ سطریں تحریر فرماتے ہوئے سہو ہو گیا۔ مجاہد ملت جو دستور ساز اسمبلی کے باقاعدہ ممبر مسٹر رضوان اللہ کی سیٹ پر جولائی ۱۹۴۸ء میں منتخب ہوئے تھے اور اسمبلی کے اختتام تک باقاعدہ ممبر رہے۔ اس سے پہلے مئی ۱۹۴۹ء میں وہ یوپی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے' لیکن دستور ساز اسمبلی میں آ جانے کی وجہ سے انہوں نے یوپی اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔

۱۹۵۲ء کے الیکشن میں جب ملک کے عوام نے ۹۵ بلکہ ۹۹ فیصدی ووٹ غیر فرقہ پرست سیاسی جماعتوں کو دے کر یہ ثابت کر دیا کہ ملک کے عام باشندے اپنا مذہب کچھ بھی رکھتے ہوں وہ فرقہ پرستی کے حامی نہیں ہیں تو اس کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کی ذمہ داری عوام پر نہیں ڈالی جا سکتی تھی۔ بلکہ معقولیت پسندی کا تقاضا یہی تھا کہ فرقہ وارانہ ہنگاموں کا ذمہ داران مٹھی بھر غلط کار لیڈروں اور ان کے ساتھیوں کو قرار دیا جائے جو بنیادی طور پر سکولرزم کے مخالف ہیں اور اپنی غلط حرکتوں سے عوام کو گمراہ کر کے ہنگاموں کی آگ بھڑکاتے ہیں۔

چنانچہ مجاہد ملت رحمہ اللہ نے حکومت کے سربراہوں کو بارہا اس طرف توجہ دلائی۔ بعض سربراہوں سے اس سلسلے میں تلخ کلامی تک کی نوبت آئی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت یعنی ۵۳ء، ۵۴ء میں اگر صوبائی حکومتوں کے سربراہ معقولیت پسندی سے کام لیتے اور اگر مجاہد ملت کے درد دل کا ایک شمہ بھی ان کو میسر ہوا ہوتا تو وہ نتیجہ یقیناً سامنے نہ آتا جو ۵۹ء میں قوم کا سرطان بن کر سامنے آیا۔

ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ صوبائی حکومت کے بہت سے ذمہ داروں اور بعض مرتبہ مرکزی حکومت کے بھی بعض ذمہ داروں کی ذہنیت اسی رنگ میں رنگی رہی جو فرقہ پرست جماعت اور اس کے پریس کا خاص مشن تھا۔ انتہا یہ کہ ان خونیں ہنگاموں کو بھی جو ملک کے گوشے گوشے میں ہوتے رہے قوم پرستی ہی قرار دیا۔ بہت سے بہت لفظ ''جارحانہ'' کا اضافہ کر دیا (یعنی فرقہ پرستوں کی ہنگامہ آرائیاں قوم پرستی ہی کا تقاضا ہیں' فرق صرف یہ ہے کہ یہ جارحانہ قوم پرستی ہے) جب کہ مظلوم مسلمان کی آہ وزاری کو بھی فرقہ واریت اور صرف فرقہ واریت بلکہ پاکستانی ذہنیت کا شاخسانہ قرار دیا جاتا رہا۔

مجاہد ملت کا ظرف وسیع اور حوصلہ عالی یقیناً اپنی مثال آپ تھا کہ باوجود یہ کہ سربراہوں کی یہ مسموم ذہنیت مجاہد ملت کے لیے رات دن کی کڑھن تھی تب بھی سیکولرازم کی حمایت میں اٹھا ہو قدم تیز سے تیز تر ہو رہا تھا اور ناممکن تھا کہ کوئی لغزش اس قدم میں آئے۔

لیکن چند سال بعد ہی ذمہ داران حکومت کی اس چشم پوشی کا نتیجہ سامنے آ گیا۔ جب ۵۹ء میں انہوں نے دیکھا کہ خود ان کا ماحول ان کے خلاف ہو چکا ہے اور کارپردازان حکومت کی اکثریت فرقہ واریت کی وبا میں مبتلا ہو چکی ہے۔

۱۹۴۷ء کے وقتی ہنگاموں کے بعد جو فسادات گذشتہ پندرہ سال میں ہوئے ان کا شمار

مشکل ہے۔ ہر فساد کے موقع پر جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے وفود بھیجے جاتے تھے اور ستم رسیدہ مسلمانوں کی امداد کی جاتی تھی مگر ان وفود میں خود مجاہد ملت شریک نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ اہم موقع پر احقر کو بھیج دیا کرتے تھے۔ ورنہ اور ساتھیوں کو مامور فرما دیتے تھے۔ مگر ۵۹ء میں رمضان شریف کے ایام میں مبارک پور اور بھوپال میں جو ہنگامے ہوئے ان کا جائزہ لینے کے لیے خود مجاہد ملت نے سفر فرمائے۔

روزہ میں مجاہد ملت کی ریاحی تکلیفیں بڑھ جاتی تھیں۔ مگر ان سفروں کے لیے نہ روزہ عذر بن سکا نہ ریاحی تکلیف راستہ روک سکی احقر ان ایام میں کلکتہ گیا ہوا تھا۔

ابتدا میں احقر کا خیال یہی رہا کہ چونکہ احقر مرکز سے دور ایک ہزار میل کے فاصلے پر جمعیۃ کے ضروری کام میں مصروف ہے اس لیے ان سفروں کی زحمتیں خود مجاہد ملت نے برداشت کی ہیں۔ مگر بعد میں احقر کو محسوس ہوا کہ احقر کی غیر حاضری نہیں بلکہ ان فسادات کی عجیب وغریب نوعیت نے حضرت مجاہد ملت کو مضطرب کر دیا ہے اور آپ نے خود بہ نفس نفیس مقابلے کا عزم کر لیا۔

۱۹۵۷ء کے ہنگاموں میں مراد آباد وغیرہ میں بھی بعض موقعوں پر یہ ثابت ہوا تھا کہ مقامی حکام اور پولیس نے مظلوموں کے بجائے ظالموں کا دست و بازو بن کر کام کیا ہے مگر واقعات کچھ اس قسم کے تھے کہ حکام کی اس غلط کاری کا عذر قابل تسلیم ہو سکتا تھا۔ لیکن مبارک پور بھوپال کے ہنگاموں نے کھلے طور پر ظاہر کر دیا کہ فرقہ واریت کی وبا سرکاری حلقوں کو بھی یہاں تک متاثر کر چکی ہے کہ بدامنی کے زمانے میں پولیس بھی وہ کرتی ہے جو فرقہ وارانہ جماعتوں کے والنٹیر اور رضا کار کر سکتے تھے۔

مجاہد ملت کانگریسی حلقوں میں بہت کافی مقبولیت رکھتے تھے۔ کانگریس ان کو الیکشن کے موقع پر ٹکٹ دیا کرتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ مقبولیت اور کانگریسی حلقوں میں محبوبیت امیدواروں کی عملی طاقت کو کمزور اور ان کی قوت گویائی کو سلب کر دیتی ہے لیکن مجاہد ملت کی ہمت عالی اس کمزوری سے پاک تھی۔ آپ نے خاموشی کے بجائے بے پناہ خطابت سے کام لیا۔ مبارک پور اور بھوپال وغیرہ کے ہنگاموں پر وہ بیانات دیئے جنہوں نے ان ریاستوں کے چیف منسٹروں کو چراغ پا کر دیا۔ ان کے جوابی بیانات نے مجاہد ملت اور چیف منسٹروں کے درمیان ایسا محاذ قائم کر دیا جس کو توڑنے کے لیے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کو بھی دخل دینا پڑا۔

ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں ایک طرف مجاہد ملت تھے اور دوسری جانب مدھیہ پردیش اور

یو پی کے چیف منسٹر اوران کے حامی، مگر صداقت، انصاف اور حقیقت پسندی نے حضرت مجاہد ملت کی قوت خطابت میں استدلال کی وہ بے پناہ طاقت پیدا کر دی تھی جس نے صرف ان چیف منسٹر صاحبان کولا جواب ہی نہیں کیا بلکہ پوری ورکنگ کمیٹی کو مجاہد ملت کی حمایت پر مجبور کر دیا۔

یہ درست ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی جماعتی طاقت اس کی مجلس عاملہ کی تجاویز، وہ متعدد میمورنڈم جو مرکزی حکومت کے ارکان اور کانگریس کے ہائی کمانڈ کو بار بار پیش کیے گئے تھے حضرت مجاہد ملتؒ کی پشت پر تھے، مگر یہ بھی درست ہے کہ مسلمانوں بالخصوص جمعیۃ علماء ہند کی خوش نصیبی تھی کہ مجاہد ملت کی پر شوکت خطابت اور نا قابل تسخیر قوت استدلال ان کو میسر آئی تھی۔ آج اس قوت و طاقت کے فقدان پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔

(۱۲)

انڈین مسلم کنونشن

یہ صورت حال کہ سرکاری عملہ بھی فرقہ واریت کے زہر سے متاثر ہو چکا تھا' پورے ملک کے لیے باعث تشویش تھی۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کا احساس صرف مسلم اقلیت کو تھا جو فرقہ پرستی کی تباہ کاریوں سے آئے دن متاثر ہوتی رہتی تھی۔ اور یہ فرقہ پرستی صرف فسادات کی صورت میں ہی ظہور پذیر نہیں ہوتی تھی بلکہ ملازمت' لوکل باڈیز' اسمبلی اور پارلیمنٹ وغیرہ سرکاری اداروں میں نمائندگی' کاروباری سلسلے میں لائسنس وغیرہ غرض سماجی' سیاسی اور کاروباری زندگی کا ہر ایک شعبہ اس سے متاثر ہو رہا تھا۔ چند ماہ تک جمعیۃ علماء ہند کے پیش نظر یہ رہا کہ مسلمانوں اور صاف دماغ سلجھی ہوئی ذہنیت رکھنے والے ہندو رہنماؤں کا کنونیشن کیا جائے۔ پھر مشترک نمائندگی کے ذریعے حکومت کو اس خطرناک صورت حال سے آگاہ کر کے اس کے علاج کا مطالبہ کیا جائے۔

لیکن ایک عبرت انگیز دشواری اس مشترک کنونیشن کے راستے میں سنگ گراں بنی رہی۔ دشواری یہ تھی کہ جن ہندو رہنماؤں کو صاف دماغ سمجھا جاتا ہے ان کو ان حالات کا علم تک نہیں' جن میں مسلمانوں کا تن من گھل رہا ہے۔ کیونکہ ان کے معلومات کا ذریعہ اخبارات ہوتے ہیں اور انگریزی یا ہندی وغیرہ کے جو اخبارات ان کے سامنے آتے ہیں وہ گویا قسم کھا چکے ہیں کہ مسلمانوں کے مصائب کا تذکرہ نہیں کریں گے۔ اردو کا وہ پریس جو مسلمانوں کا پریس کہلاتا ہے مسلمانوں کے حالات اور ان کے مصائب کا شکوہ ضرور کرتا رہتا ہے۔ مگر غیر مسلم تو کیا خود مسلمانوں کا اونچا طبقہ بھی اردو کے اخبارات پڑھنا پسند نہیں کرتا دوسرا ذریعہ معلومات ریڈیو ہے تو وہ ہندی اور انگریزی پریس سے بھی زیادہ محتاط یا سنگ دل' کیا مجال مسلمانوں کے شکوہ و شکایت کا کوئی ایک حرف بھی اس کی زبان پر آ جائے۔ ایسے غیر مسلم رہنماؤں کو کنونیشن میں دعوت دینے سے پہلے ضروری تھا کہ فرداً فرداً ہر ایک سے مل کر یا انگریزی پمفلٹوں کے ذریعے

مستقل پروپیگنڈہ کر کے پہلے ان کو آشنائے درد کیا جائے پھر کنونیشن میں شرکت کی دعوت دی جائے۔ بلاشبہ اس وقت ہی نہیں بلکہ ہمیشہ مسلمانوں کے ایک انگریزی روزنامہ کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی رہی۔ لیکن اپنی کم ہمتی اور بے بضاعتی کا شکوہ کیا جائے یا اہل ثروت مسلمانوں کی لاپروائی کا یہ شدید اور اہم ضرورت پوری نہیں ہوئی۔ بیشک بعض غیر مسلم رہنما مثلاً دہلی کے وہ غیر مسلم رفیق اور ساتھی جن سے رات دن کا واسطہ رہتا ہے وہ واقف بھی تھے ان کو دعوت دینا بھی سہل تھا اور ان کی شرکت بھی یقینی تھی مگر بدقسمتی سے وہ پہلے ہی سے مسلم نوازی میں بدنام ہو چکے ہیں۔

یہ مسئلہ ابھی زیر بحث تھا کہ اجین میں جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس عام کا وقت آ گیا۔

مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ نے اس اجلاس عام سے ہی کنونیشن کا مقصد پورا کرنا چاہا۔ چنانچہ جمعیۃ علماء ہند کے اراکین کے علاوہ اور بھی بہت سے مسلم رہنماؤں کو شرکت کی دعوت دی ایک حد تک یہ مقصد پورا بھی ہوا۔ چنانچہ اس اجلاس میں کھل کر موجودہ حالات پر بحث ہوئی جس کی بنا پر مدھیہ پردیش کے پریس نے (جہاں یہ اجلاس ہوا تھا) بہت کافی کیچڑ اچھالی۔ فرقہ پرستی کا آخری حربہ جو اس پریس کے پاس تھا اس کو پوری چالاکی اور ہوشیاری سے استعمال کیا اور جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس کو فرقہ پرستی کا نشان قرار دیا وغیرہ وغیرہ۔

لیکن اس اجلاس کے چند روز بعد ہی جبل پور کا حادثہ مسلمانوں کے حق میں بھونچال بن کر رونما ہوا مجاہد ملتؒ نے پہلے ایک وفد جبل پور بھیجا پھر وہ خود تشریف لے گئے اور حالات کا معائنہ کیا اور واپس آنے کے بعد پارلیمنٹ میں وہ تقریریں کیں جن سے نہ صرف ہندوستان کے ایوان سیاست میں ہلچل پڑ گئی بلکہ پارلیمنٹ کی صدا پوری دنیا میں گونج گئی۔

ہندوستان کے مسلمان جو پہلے اخبارات کی زبان سے جبل پور ساگر وغیرہ کے ناتمام حالات سن رہے تھے اور ہندوستان کے دوسرے فسادات کی طرح اس کو بھی ایک بڑے پیمانے کا ہنگامہ تصور کر رہے تھے۔ جب انہوں نے مجاہد ملت کی پارلیمنٹ کی تقریریں پڑھیں تو گویا ان کی شکستہ پائی تیز گامی سے بدل گئی۔ تن نیم جان میں نئی زندگی کی روح مضطرب ہو گئی اور لاکھوں روپیہ سے مالی امداد کر کے اپنی بیداری کا ثبوت دیا۔ مگر یہ مسئلہ پھر بھی باقی رہ گیا کہ ارباب اقتدار کو اجتماعی طور پر اپنی شکایتوں سے کس طرح آگاہ کیا جائے۔ اس کا ذریعہ کنونیشن ہو سکتا تھا۔ لہٰذا کنونیشن کا مسئلہ پھر ابھر کر سامنے آیا اور غیر مسلم رہنماؤں کی شرکت سے چونکہ

مایوسی تھی۔ لہٰذا مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند نے یہی طے کیا کہ صرف مسلمانوں کا کنونشن کیا جائے۔

مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس مورخہ ۴/اپریل ۱۹۶۱ء نے کنونشن کی تجویز پاس کرتے ہوئے تمام مکاتب خیال کے مسلمانوں سے شرکت کی اپیل کی اور کنونشن کے انتظامات کی ذمہ داری مجاہد ملت کے سپرد کردی (رحمہ اللہ)

مجلس عاملہ کی تجویز کے بعد جیسے ہی مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ نے اخبارات میں کنونشن کا اعلان کیا۔ تو جیسا کہ خطرہ تھا اس سے بھی زیادہ بھیانک صورت میں غیر مسلم پریس کی یورش شروع ہوگئی۔ حد سے زیادہ تکلیف دہ رویہ ان دوستوں کا تھا جو پہلے کنونشن کے لیے مصر تھے اور جیسے ہی یہ شورش شروع ہوئی وہ حملہ آوروں کے ساتھ ہوگئے۔ اور کنونشن کے خلاف بیانات دینا شروع کردیئے۔

کچھ دوستوں نے پنڈت نہرو' وزیر اعظم حکومت ہند کے پاس باقاعدہ ڈیپوٹیشن لے جا کر کنونشن کے نقصانات پنڈت جی کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی۔

سمپورنانند جی چیف منسٹر یوپی اور اجیت پرشاد جین جیسے کانگریسی لیڈروں کی دلیل یہ تھی کہ اس کنونشن سے فرقہ پرستی کو شہ ملے گی۔ وہ بھی اس کا جواب دیں گے۔ (یعنی آج تک فرقہ پرست طاقتیں خاموش اور قطعاً غیر متحرک تھیں اور اب ان میں حرکت پیدا ہوگئی۔)

ایک ایسا لیڈر جو آج تک مقبول اور واجب الاحترام ہی رہا ہو اس پر جب سب طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہو تو بہت مشکل ہے کہ اس کا قدم لغزش سے محفوظ رہے مگر مجاہد ملت کی لیڈری مصنوعی نہیں تھی بلکہ آپ کی لیڈری لازمی ثمرہ تھی جذبات صادق اور ان مخلصانہ کوششوں کا جو مجاہد ملت کی فطرت ثانیہ بن گئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اخلاص' صداقت پسندی اور بے پناہ قوت عمل کے ساتھ وہ جرأت اور وہ استقامت بھی عطا فرمائی تھی کہ گردوپیش کی زیادہ سے زیادہ مخالفت بھی آپ کو متاثر نہیں کرسکتی تھی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جس کی پوری زندگی ''محاذ'' پر گزری ہو۔ وہ کسی حملے سے کیسے مرعوب ہوسکتا ہے۔

تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس موقعے پر آنریبل حافظ محمد ابراہیم صاحب (وزیر برق و آب) نے بھی غیر معمولی جرأت و استقامت کا ثبوت پیش کیا۔ آپ جس طرح پہلے دن کنونشن کے حامی تھے آپ کی حمایت میں اگر فرق آیا تو صرف یہ کہ ''حمایت'' صرف زبانی نہیں رہی بلکہ عملی

ہوگئی۔آپ نے سرکاری حلقوں کی غلط فہمی کو دور کر کے ان کے اندر بھی حمایت کا جذبہ پیدا کیا۔

مجاہد ملت کی وفات سے تیسرے روز کارپوریشن کی طرف سے جلسہ تعزیت کیا گیا تو لال بہادر شاستری وزیر داخلہ حکومت ہند نے اپنی تقریر میں مجاہد ملت کی قوت خطابت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ کنونیشن کے متعلق ہماری رائے نہیں تھی۔ چنانچہ مجاہد ملت سے ایک شب کو تفصیلی گفتگو کی گئی اگرچہ ہم مطمئن نہیں ہو سکے مگر مجاہد ملت کو جواب بھی نہیں دے سکے۔

بہرحال مجاہد ملت نے صرف استقلال و استقامت سے ہی نہیں بلکہ حسن تدبیر سے ایک طرف پریس کو ہموار کیا۔ انگریزی زبان پر عبور نہ رکھنے کے باوجود انگریزی اخبارات کے نامہ نگاروں، بیرونی ممالک کے نمائندوں کو مطمئن کر دینا آسان بات نہیں ہے۔ مگر مجاہد ملت نے کنونیشن کے مسئلے پر پریس کانفرنس کی تو پہلی تقریر نے ہی ہر ایک کو متاثر کر دیا۔ پھر سوالات کے برمحل اور معقول جوابات نے نامہ نگاروں کے اطمینان کو گرویدگی کا رنگ دے دیا۔ اسی طرح صدر کانگریس سنجیوا ریڈی سے گفتگو کر کے انہیں اس درجے مطمئن کر دیا کہ مخالفت کرنے کے بجائے انہیں کہنا پڑا کہ مسلم کنونیشن سے جمہوریت اور قومی یکجہتی کے مقصد کو تقویت پہنچے گی۔

بہرحال مسلم کنونیشن ہوا۔ اور جس شان سے ہوا اس کا علم صرف شرکائے کنونیشن کو نہیں بلکہ ہر اس صاحب بصیرت انسان کو ہے جو اخباری دنیا سے واسطہ رکھتا ہے۔

جس طرح دینی تعلیم کے سلسلے میں (بمبئی کنونیشن منعقدہ ۱۹۵۴ء) تاریخ کا اعجوبہ تھا کہ مختلف مکاتب خیال کے علما اور نمائندگان نے اس میں شرکت کر کے دینی تعلیم کے سلسلے میں اتحاد نظر اور وحدت خیال کی ایسی مثال قائم کی جس کی نظیر تاریخ میں نایاب ہے۔ اسی طرح اس کنونیشن نے ان سب کو جو سیکولرزم کے حامی تھے ایک مرکز پر متحد کر کے ثابت کر دیا کہ خوف زدہ مرعوب اور پست ہمت کرنے کی پندرہ سالہ کوششوں کے باوجود اس تن مجروح میں قوت مقابلہ باقی ہے اور بہترین قیادت کی یہ برکت ہے کہ اس حقیقت کے باوجود کہ "تن ہمہ داغ داغ شد" وہ اپنے زخموں سے بے پروا میدان زندگی میں آگے قدم بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

مسلم کنونیشن۔۔۔ایک پیغام:

مسلم کنونیشن جس طرح مسلمانوں کے لیے ایک پیغام تھا کہ جبل پور اور ساگر جیسے مہلک اور جاں گسل حوادث کے باوجود بزدلی اور پست ہمتی حرام ہے۔ بے شک وہ مظلوم ہیں۔ وہ

مظلوم کا شکوہ اور مظلومیت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں' مگر طوق غلامی کے لیے اپنی گردنوں کو خم نہیں کر سکتے۔

اسی طرح وہ پورے ہند یونین اور اس کے سیکولر نظام حکومت کے لیے ایک پیغام تھا کہ جمہوریت اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے کہ اس کا ہر عضو زندہ ہو اور وہ حیات نو کی امنگوں کے ساتھ متحرک بن سکے۔

وہ قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے نصب العین کے لیے بھی ایک نشان تھا کہ گلہائے رنگا رنگ کو شاداب رکھ کر ہی گلدستہ کی شیرازہ بندی ہو سکتی ہے۔ مرجھائے ہوئے پھولوں کی گڈی کو گلدستہ نہیں کہا جا سکتا۔

بین الاقوامی دنیا کے گلدان میں اگر آپ اپنا گلدستہ سجانا چاہتے ہیں تو آپ کی پہلی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اس کا ہر پھول شگفتہ اور ہر کلی مسکراتی ہوئی ہو۔ مرجھائے ہوئے پھولوں کا گلدستہ گلدان میں سجایا نہیں جاتا بلکہ خس و خاشاک کی طرح اس کو کوڑے پر پھینک دیا جاتا ہے۔

ملک کا پریس اگر تعصب کی گندگی سے پاک ہوتا' اگر اس میں یہ حوصلہ ہوتا کہ وہ مجاہد ملتؒ کے منشا اور مسلم کنوینشن کے صحیح مقصد کو سمجھ سکے تو کنوینشن کے ان مقاصد کی اشاعت وہ خود کرتا۔ مگر جس پریس کی تنگ نظری وزیراعظم حکومت ہند کی تقریروں میں بھی کتر بیونت کرتی رہتی ہو' اس کا یہ حوصلہ کہاں تھا کہ وہ کنوینشن کے مقاصد کی اشاعت صحیح طور پر کرتا' پھر اس کو اجیت پرشاد جین اور سمپورنانند جیسے ''بدنام کنندگان نکونامے چند'' کے بیانات کا بہانہ مل گیا جنہوں نے مسلم کنوینشن کو فرقہ واریت کا نشان بتا کر فرقہ پرستوں کو شہ دینی شروع کر دی۔ فرقہ پرست رہنما خاموش تھے۔ وہ خود مسلم کنوینشن کو اپنی ترقی کا سبب نہیں سمجھ رہے تھے مگر ملک اور قوم کے ان نیم طبیبوں نے بلاوجہ مسلم کنوینشن پر تنقید کر کے بہانہ تلاش کرنے والوں کے لیے بہانہ مہیا کرنے کی خدمت اپنے ذمہ لے لی۔

رانچی کا سفر:

کسی کام کو شروع کرنے کے بعد نا تمام چھوڑ دینا مجاہد ملت کی فطرت کے خلاف تھا۔ جب آپ نے محسوس کیا کہ تنگ نظر پریس اور اس کے تعصب پرست سرپرست کنوینشن کو اس طرح مشتبہ بنا کر اس کی افادیت کو ختم کر دیں گے تو پھر آپ نے خود بہ نفس نفیس یہ عزم کیا کہ

ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچ کر کنونشن کا پیغام وہ خود پہنچائیں گے۔ چنانچہ پورے ہندوستان کے دورہ کا آپ نے پروگرام بنا لیا۔ اسی اثنا میں رانچی میں ایک ہنگامہ ہوگیا۔ وہاں سے تاروں کا تانتا بندھ گیا کہ مجاہد ملت خود تشریف لائیں۔

مرض کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا اور جب خلاف معمول تقریباً ایک ماہ تک کھانسی اور حرارت کی شکایت رہی تو ایکسرے کرایا گیا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب نے فوٹو کا ایکسرے دیکھ کر مجاہد ملت کے رفیق خاص مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب سے ''کینسر'' کا خطرہ بھی ظاہر کیا۔ مگر اتفاق سے چند روز بعد اطبا کی دواؤں سے افاقہ محسوس ہونے لگا۔ حتیٰ کہ مجاہد ملت چلنے پھرنے اور تقریریں کرنے کے قابل ہوگئے تو پھر آپ کے رفقا نے اس خطرے کو اہمیت نہیں دی اور خود مجاہد ملت کی یہ طبیعت نہیں تھی کہ ایسے خطرات سے متاثر ہو کر اپنے پروگراموں کو موقوف کریں۔ چنانچہ آپ رانچی تشریف لے گئے۔

مسلم کنونشن کے بعد مقبولیت کا دامن اور بھی زیادہ وسیع ہوگیا تھا' چنانچہ آپ کی تقریر سننے کے لیے پورے صوبہ بہار سے لوگ کھنچ کھنچ کر رانچی پہنچے۔ حکومت بہار کے منسٹر بھی تقریر سننے کے ایسے ہی مشتاق تھے۔ چنانچہ مجاہد ملت کی تقریباً نوے منٹ کی تقریر نے پورے مجمع پر جادو کا اثر کیا۔ بالخصوص منسٹر صاحبان بہت متاثر ہوئے۔

آندھیرا اور بمبئی کے سفر کا عزم:

رانچی سے واپسی کے بعد آپ بمبئی تشریف لے گئے اور واپسی اس وقت ہوئی جب ۱۹۶۲ء کے الیکشن کے لیے امیدواروں کی نامزدگیوں کا اکھاڑا دہلی میں جما ہوا تھا اور جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں ہر وقت جم غفیر جمع رہتا تھا۔ پھر جیسے ہی ٹکٹ تقسیم ہو چکے اور امیدواروں کی یورش ختم ہوئی مجاہد ملت نے آندھرا کے دورے کا قصد فرما لیا جس کا تقاضا بہت عرصے سے تھا۔

اب مرض میں اضافہ ہوگیا تھا اور ایک معمولی سی تشویش یہ پیدا ہونے لگی تھی کہ خلاف معمول اس مرتبہ طبیعت بحال نہیں ہوئی۔ عارضی افاقے کے بعد پھر اسی طرح مضمحل ہو جاتی ہے۔

آندھرا سے واپسی کے بعد گرتی ہوئی صحت کا تقاضا یہ تھا کہ مجاہد ملت آرام فرماتے' مجاہد ملت خود بھی آرام کرنے کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ مگر آپ نے آرام کرنے کا پروگرام یہ بنایا تھا کہ حلقہ انتخاب کا ایک مرتبہ دورہ کر چکنے کے بعد آپ آرام فرمائیں گے اور آپ کے

رفقا الیکشن کی خدمات انجام دیں گے۔

۲۳ر فروری ۱۹۶۲ء کو بمبئی میں سنٹرل حج کمیٹی کی میٹنگ ہونے والی تھی۔ مجاہد ملت کا پروگرام یہ تھا کہ ۲۲ر جنوری کو اپنے حلقہ انتخاب کا دورہ پورا کرنے کے بعد دہلی پہونچیں گے پھر فوراً ہی رات کے ہوائی جہاز سے بمبئی روانہ ہو جائیں گے۔ چنانچہ اسی پروگرام کو کامیاب کرنے کے لیے آپ ۲۲ر کی شام کو دہلی جنکشن پر پہنچے۔ اس سفر میں متعدد بار دورے پڑ چکے تھے۔ ایک روز تو تقریر کے بعد ایسی بے ہوشی ہوئی کہ نبضیں چھوٹ گئیں۔ لیکن جیسے ہی ہوش آیا پروگرام کی تکمیل کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔

مختصر یہ کہ ۲۲ر کی شام کو مراد آباد سے واپس ہوئے اسٹیشن پر پہنچے تو کمزوری کا یہ عالم تھا کہ اٹھنا بیٹھنا مشکل تھا، مگر اس کے باوجود آپ نے ہوائی جہاز کے اڈے پر پہونچنے کی کوشش شروع کر دی تا کہ اگلے روز بمبئی میں حج کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کر سکیں جس کے آپ ''چیئرمین'' تھے۔ اس ارادے سے آپ مکان سے باہر آ کر کار میں بیٹھ بھی گئے۔ مگر آپ کے احباب بالخصوص شیخ محمد احمد صاحب وکیل نے کمزوری کا یہ عالم دیکھا تو پورا اصرار کر کے سفر ملتوی کرا دیا۔

ہسپتال میں ایڈمیشن:

اگلے روز مجاہد ملت جوشی ہسپتال میں تشریف لے گئے جہاں چار سال پہلے ہرنیا کا آپریشن آپ نے کرایا تھا۔ اس کے بعد یہی ہسپتال آپ کے متعلقین کا گویا گھریلو ہسپتال بن گیا تھا۔ ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر ''پانڈے'' مجاہد ملتؒ سے اتنے متاثر تھے کہ مجاہد ملت کی خوشنودی اور ان کی خدمت کو اپنی خوش نصیبی سمجھتے تھے۔

بہر حال ۲۳ر کو آپ ڈاکٹر جوشی کے ہسپتال میں تشریف لے گئے اور ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر پانڈے نے آپ کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ پھیپھڑوں میں پانی بہت بھرا ہوا ہے۔ فوراً مجاہد ملت کو ہسپتال کے اسپیشل کوارٹر میں قیام کرنے پر مجبور کیا اور پانی نکالنے کا انتظام شروع کر دیا۔

احقر بھی اتفاق سے باہر تھا۔ ۲۲ر کی شب کو ۸ بجے مجاہد ملت دہلی پہونچے اور ۲۳ر کی صبح کو ۷:۳۰ بجے احقر دہلی پہونچا۔ تقریباً ۹ بجے دفتر میں گیا تو معلوم ہوا کہ مجاہد ملت مکان پر ہیں اور آرام فرما رہے ہیں، احقر نے آرام میں خلل اندازی مناسب نہیں سمجھی۔ اپنے غربت کدے

پر جا کر کچھ کام میں مشغول ہو گیا۔ تقریباً ۱۲ بجے قاضی اکرام الحق صاحب نے مکان پر پہنچ کر ہی احقر کو اطلاع دی کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جوشی ہسپتال میں تشریف لے گئے' ڈاکٹر صاحب نے واپس نہیں آنے دیا اور وہیں قیام کا انتظام کر دیا ہے۔

ظہر بعد احقرِ ہسپتال پہونچا تو معلوم ہوا کہ پھیپھڑوں سے ۵۶ اونس پانی نکالا جا چکا ہے۔ کئی روز بعد اس وقت مجاہد ملت سے ملاقات ہوئی تھی۔ عام انداز مجاہد ملت کا یہ تھا کہ ذرا سی بات پر برافروختہ ہو جاتے تھے اس ظاہر برافروختگی سے معلوم ہوتا تھا کہ مزاج میں تحمل اور برداشت نہیں ہے لیکن خود احقر کو معلوم ہے کہ بہت سی باتیں جو انتہا درجے ناگوار خاطر ہوتی تھیں ان کی برداشت اس طرح کرتے تھے کہ کسی کو ناگواری کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ لوگ ہمیں احمق بناتے ہیں اور ہم جان بوجھ کر احمق بنتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جماعت کے ذمہ دار کے لیے تحمل اور برداشت ایک لازمی چیز ہے۔ بہر حال یہ قوت برداشت مرض کی حالت میں خاص طور پر نمایاں ہوتی تھی۔

اس روز جب احقر حاضر ہوا تو ۵۶ اونس پانی نکل چکا تھا اس کا اثر طبیعت پر لامحالہ ہوگا۔ مگر ملاقات کے وقت کسی تاثر کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کروٹ لینے کے وقت غیر اختیاری طور پر کراہ نکل گئی۔ تو پھر خود ہی فرمایا کہ جہاں سے پانی نکالا گیا ہے وہاں ٹیس ہو رہی ہے۔

مولانا وحید الدین صاحب قاسمی جو دفتر ہی سے ساتھ گئے تھے ان سے احقر نے علیحدگی میں دریافت کیا تو مولانا موصوف نے بتایا کہ پانی ابھی اور باقی ہے پرسوں کو نکالا جائے گا۔ البتہ پانی کے ساتھ کچھ خون بھی آیا ہے ڈاکٹر صاحب کو تشویش ہے کہ خون کیوں آیا۔

احقر کو اسی روز حضرت مولانا موصوف کے الیکشن کے سلسلے میں امروہہ وغیرہ جانا تھا' چنانچہ احقر شب کو روانہ ہو گیا۔ ۲۵ ر کو دوبارہ ۴۵ اونس پانی نکالا گیا۔ تو ''کینسر'' نمایاں ہوا۔ فوراً حافظ محمد ابراہیم صاحب' وزیر حکومت ہند جو حضرت مولانا کے خالہ زاد بھائی بھی ہیں' بہنوئی بھی اور سمدھی بھی' ان کو اطلاع دے کر ''بمبئی'' بذریعہ ہوائی جہاز پہونچانے کا انتظام کیا گیا۔

سفر بمبئی' پھر سفر امریکہ اور مرض الوفات کے حالات شاید کوئی اور صاحب تحریر فرمائیں احقر تو مجاہد ملت کی قوت برداشت کے سلسلہ میں ایک اور حیرت انگیز واقعہ لکھنے کے بعد اس طویل مضمون کو ختم کر رہا ہے۔

غیر معمولی ضبط وتحمل:

مرض الوفات کے زمانے میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں بزرگوں' دوستوں نے مجاہد ملت سے ملاقات کی ہے لیکن زندگی کے آخری دن تک بھی کسی نے یہ محسوس نہیں کیا کہ حضرت مجاہد ملت کسی درجے میں بھی اپنی زندگی سے مایوس ہیں۔

یکم اگست کی شام کو بعد عصر بار بار کچھ ایسی غنودگی سی طاری ہو رہی تھی کہ خود احقر کو ایک مرتبہ خطرہ ہوا۔ چنانچہ نبض پر ہاتھ رکھ کر احقر نے دیکھا۔ نبض کی رفتار نہایت سست تھی۔ خاص اسی حالت میں بمبئی کے مشہور لیڈر ریسٰین نوری صاحب آ گئے۔ احقر نے ان کو اشارہ کیا کہ وہ توقف کریں مگر وہ سمجھ نہیں سکے۔ جیسے ہی مولانا کے کان میں آواز پڑی کہ یسٰین صاحب کھڑے ہیں فوراً چونک کر آنکھ کھولی اور ایسی بشاشت اور خندہ پیشانی سے گفتگو کی کہ احقر خود حیران ہو گیا۔ آواز نہایت کمزور پست تھی' مگر انداز میں وہی شگفتگی تھی' جو دوستوں سے ملاقات کے وقت ہوا کرتی تھی۔ پھر نماز مغرب کے بعد جب سفر آخرت میں چند گھنٹے باقی رہ گئے تھے دیر تک اس پر گفتگو کرتے رہے کہ علاج تبدیل کر دیا جائے پھر خود ہی فیصلہ کر کے فرمایا کہ مولوی وحید سے کہہ دو کہ وہ بریلی چلے جائیں اور حکیم صدیق صاحب کو لے آئیں۔ بہرحال زندگی کے آخری دن کے آخری لمحات تک گفتگو یا کسی بھی انداز سے مایوسی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جیسے ہی کینسر کی تشخیص ہوئی مولانا اپنی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب ابتدائے مرض میں ٹاٹا میموریل ہسپتال بمبئی میں زیر علاج تھے احقر کو ایک طویل خط تحریر کرایا۔ احقر ان ایام میں امروہہ میں مقیم تھا۔ احقر کے ہم نام اور مجاہد ملت کے چہیتے دوست سید محمد میاں صاحب رضوی کی معرفت وہ طویل گرامی نامہ احقر کو وصول ہوا۔ اس میں الیکشن کے متعلق تو ایک دو سطریں ہی مضمون تھا کہ احقر محمد میاں کو جملہ معاملات سپرد ہیں اور سید محمد میاں صاحب رضوی مولانا (مرحوم) کی طرف سے جنرل ایجنٹ ہیں۔ باقی تمام خط میں علاج کی تفصیل تھی اور اسی مکتوب گرامی میں اشارۃً مایوسی کا اظہار بھی تھا۔

جب مجاہد ملت بمبئی سے واپس آ چکے اور ڈاکٹروں نے یہ اطمینان دلا دیا کہ ایسا عمل کیا جا چکا ہے کہ چھ ماہ تک مرض نہیں بڑھے گا اس وقت کی بات ہے کہ احقر ایک روز تنہائی میں گفتگو

کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ مایوسی دور کرے تو بگڑ کر احقر کی سخن گستری کی تردید کی اور اپنے مکتوب کا حوالہ دیا کہ میں آپ کو پہلے ہی خط میں اشارہ کر چکا ہوں آپ سمجھے نہیں۔

ایک طرف یہ مایوسی اور خاتمہء زندگی کا یقین اور دوسری طرف یہ ضبط وتحمل کہ آخری دن کے آخری لمحات تک کسی بھی دیکھنے والے کو مایوسی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ اس کو مجاہد ملت کی کرامت ہی کہا جاسکتا ہے۔ کرامت کے علاوہ اور کوئی لفظ نہیں ہے جس سے اس کیفیت کی تعبیر ہو سکے۔

ایک خواب:

اس پوری مدت میں صرف ایک روز ایسا ہوا کہ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے۔

یہ امریکہ جانے سے پہلے کا واقعہ ہے کہ صبح کے وقت خواب دیکھا کہ حافظ صاحب کی کوٹھی کے اسی کمرہ میں جہاں مولانا قیام فرماتے تھے ایک کالا سانپ ہے اور دو نیولے ہیں ایک چھوٹا اور دوسرا بڑا۔ کالا سانپ کہہ رہا ہے کہ میں موت ہوں اور بڑا نیولا کہہ رہا ہے کہ میں ہندوستان والوں کی دعا ہوں اور چھوٹا نیولا کہہ رہا ہے کہ میں بیرون ہند کے مسلمانوں کی دعا ہوں۔ اور ہم اس لیے موجود ہیں کہ اس سانپ کو باہر نکالیں' مولانا نے فرمایا کہ تم کس طرح لے جاؤ گے۔ کمرے کے تمام دروازے بند ہیں تو نیولوں نے جواب دیا کہ جب لے جانا چاہیں گے تو بند دروازے ہمارے راستہ میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتے۔ جب یہ الفاظ آپ فرما رہے تھے تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ مگر پھر فوراً قضائے مبرم اور قضائے غیر مبرم کی بحث ہوگئی اور مجاہد ملت نے اس بحث میں شدومد سے حصہ لیا۔ بہرحال

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔'' رحمہ اللہ۔

(۱۴)

مجاہد ملت کی زندگی کے دوسرے رخ

مضمون نے بڑھتے بڑھتے کتاب کی طوالت اختیار کر لی پھر بھی مجاہد ملت کے کارناموں کا صرف وہی حصہ ضبط تحریر میں آ سکا جس کا تعلق انقلابی اور سیاسی مساعی سے تھا۔ درس تدریس، تصنیف و تالیف، تحریر و خطابت جیسے ممتاز کمالات کے متعلق ایک حرف بھی نہیں لکھا جا سکا، اس کمی کو امید ہے دوسرے حضرات پورا کریں گے۔

سیاسی اور انقلابی خدمات کے سلسلے میں بھی بعض ایسے کارنامے باقی رہ گئے جن کی تفصیلات کا احقر کو علم نہیں ہے مثلاً۔ ڈانڈی مارچ' یا آغاز تحریک (۲۱ء) کے زمانے کی گرفتاری وغیرہ کیونکہ اس دور میں احقر کو شرف رفاقت حاصل نہیں تھا۔ خاص یہ دور جس میں شب و روز رفاقت کی سعادت حاصل رہی اور اس دور کے بھی بہت سے نہایت اہم اور ضروری کارنامے باقی رہ گئے جن کی تفصیل کے لیے سیکڑوں صفحات کی ضرورت ہے۔ مثلاً:

۱۔ مجاہد ملت کی زندگی کا اہم باب وہ خدمات ہیں جن کا تعلق ریلیف سے ہے۔ یہ باب اتنا وسیع ہے کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ صبح سے شام بلکہ رات کے گیارہ بجے تک مجاہد ملت کا دروازہ ہر ایک ضرورت مند کے لیے کھلا رہتا تھا اور پورے ہندوستان کے گوشے گوشے سے لوگ اپنی ضرورتیں لے کر آتے تھے جن کی ضرورت جمعیۃ علماء کے راستے سے پوری ہو سکتی۔ ان کے لیے جمعیۃ علماء کا لیٹر فارم اور اس کی مہریں کام میں لائی جاتیں۔ جن معاملات کا تعلق جمعیۃ علماء سے نہیں ہو سکتا تھا ان کے لیے ممبر پارلیمنٹ کا لیٹر فارم اور اس کی مہر استعمال کی جاتی۔ جہاں زبانی گفتگو کی ضرورت ہوتی وہاں زبانی جہاں ٹیلی فون کام دیتا اس کے لیے ٹیلی فون' غرض صرف مجاہد ملت ہی نہیں بلکہ جمعیۃ علماء کا پورا دفتر مجاہد ملت کے احترام میں ہمہ وقت انہیں کاموں میں مشغول رہتا تھا۔ جن کا تعلق ریلیف سے تھا۔

ایک خاص واقعہ:

غالباً ۴۸ء کا واقعہ ہے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ حضرت مجاہد ملت لو کے طمانچوں اور آفتاب کی تمازت سے بچ کر دفتر کے تاریک کمرے میں آرام فرما رہے تھے کہ دہلی کے ایک لکھ پتی سوداگر گھبرائے ہوئے آئے۔ کہ ۱۵ لاکھ انکم ٹیکس کے لازم کر دیئے گئے ہیں اور اگر ادائیگی نہیں کی گئی تو کارخانہ بند کر دیا جائے گا جس سے ساکھ خراب ہو جائے گی۔ اول تو اتنی بڑی رقم کمر توڑ رہی ہے پھر ساکھ بھی گر گئی تو سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ ضرورت ہے کہ فوراً پنڈت نہرو کے ذریعے اسٹے آرڈر حاصل کیا جائے۔ مجاہد ملت کے کانوں میں جیسے ہی یہ فریاد پڑی اپنا آرام بھول گئے۔ پنڈت جی سے ٹیلی فون پر اجازت حاصل کی اور دہکتے ہوئے دوپہر کی لپٹوں میں چار میل طے کر کے پنڈت جی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

پنڈت جی عام طور پر انکم ٹیکس کے معاملے میں کوئی سفارش نہیں سنتے۔ مگر اس واقعے سے اتنے متاثر ہوئے کہ فوراً ہی ان کو مہلت دلوا دی اور جب ان صاحب نے نظر ثانی کی درخواست کی تو پندرہ لاکھ کے صرف ڈھائی لاکھ رہ گئے۔

مجاہد ملت کی شہادت:

۲ دسمبر ۱۹۶۲ء کو میواتی صاحبان کی کانفرنس ضلع الور (راجستھان) کے مشہور قصبہ تجارہ میں ہوئی تھی۔ آنریبل حافظ محمد ابراہیم صاحب نے بھی اس کانفرنس میں شرکت فرمائی۔ نواب محمد امین خاں صاحب آف لوہارو مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ معزز مہمان کا استقبال کرتے ہوئے استقبالیہ کے ذمہ دار رکن ولی محمد خاں صاحب وکیل نے جمعیۃ علماء بالخصوص مجاہد ملتؒ کی خدمات کا ذکر کیا۔ پھر خود اپنے متعلق فرمایا کہ میری یہ آزادی مجاہد ملتؒ کا طفیل ہے۔ کچھ مخالفوں نے مجھے قتل کے مقدمے میں جکڑ دیا تھا۔ مجاہد ملت نے شہادت دی کہ اس وقت میں دہلی میں ان کی خدمت میں حاضر تھا۔ یہی شہادت میری براءت کا ذریعہ بن گئی۔

اس قسم کے انفرادی معاملات طرح طرح کے مقدمات' ملازمتوں کی برخاستگی' ترقی' تنزل' طلبہ کے اسکالرشپ یا مثلاً کسی یونیورسٹی یا کالج میں داخلہ' پاکستان جانے آنے والوں یا تلاشی کے وقت کسی قابل اعتراض چیز کی برآمدگی وغیرہ کے متعلق سیکڑوں بلکہ ہزاروں معاملات ہیں جو مجاہد ملت کی نظر توجہ سے کامیاب ہوئے۔

اگر دفتر میں کوئی رجسٹر ہوتا تو اس کے سیکڑوں صفحات پر ہو جاتے مگر مجاہد ملت نے رجسٹر کے اندراج کے بجائے اپنے نامہ اعمال میں ان کا اندراج کافی سمجھا اور اسی کی وہ کوشش کرتے رہے کہ ان کا صحیفہ اعمال زیادہ سے زیادہ مزین اور آراستہ ہو۔ امید ہے کہ یہ کوشش کامیاب ہوئی ہوگی اور حضرت مجاہد ملتؒ کا صحیفہ اعمال صدیقین اور شہداء کے اعمال ناموں کے ہم پلہ ہوگا۔ (انشاءاللہ)

بہت سے ایسے معاملات بھی تھے جن کی نوعیت انفرادی تھی مگر پھر ان کی حیثیت ''نظیر'' کی ہوگئی جس سے بے شمار خلق خدا کو فائدہ پہونچا۔

حاجی محمد دین کیس:

۲۔ مثلاً حاجی محمد دین صاحب کا کیس انفرادی تھا۔ انہوں نے ۲۵ ہزار کی ایک جائداد کراچی میں ایک صاحب سے خریدی تھی۔ یہ صاحب جب پناہ گزیں بن کر ہندوستان پہونچے تو انہوں نے اپنے کلیم میں اس جائداد کا تذکرہ کر دیا۔ کسٹوڈین کو بہانہ مل گیا اور ان کی تقریباً ۶۰ لاکھ کی جائداد جو دہلی میں تھی ضبط کر لی۔ قانون کے الفاظ اسی طرح کے تھے کہ اگر کسی نے کوئی بھی فائدہ پاکستان میں حاصل کیا ہے تو اس کی جائداد ہندوستان میں نکاسی قرار دی جائے گی۔

اگر کسی شرنارتھی کی ضبط شدہ جائداد کا کوئی حصہ پاکستان میں کسی نے پاکستانی ہونے کی حیثیت سے حاصل کر لیا ہے تب تو ہندوستان میں اس کی جائداد ضبط کر لینا کسی درجہ پر معقول ہوسکتا تھا۔ مگر اس کیس میں حاجی محمد دین صاحب نے پاکستانی کی حیثیت سے کوئی جائداد نہیں حاصل کی تھی بلکہ ایک خریدار کی حیثیت سے خریدی تھی اور قیمت بھی مناسب ادا کی تھی۔

بہر حال یہ کیس چلا۔ کسٹوڈین کا فیصلہ اول سے لے کر آخر تک ایک ہی رہا ''سرا چھر رام'' جنرل کسٹوڈین نے نظر ثانی کے بعد فیصلہ بحال رکھا۔ بالآخر کیبنٹ نے حاجی صاحب کے حق میں فیصلہ صادر کیا۔ جس پر اچھر و رام صاحب نے برافروختہ ہو کر استعفاء دے دیا۔ اس واقعے نے ہندوستان میں خاص شہرت حاصل کر لی۔ پھر کیبنٹ کا فیصلہ ایک نظیر بن گیا جس سے خدا جانے کتنے مظلوموں کو فائدہ پہنچا۔

یہ درست ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کیس میں دلچسپی لی۔ مگر

جس نے مولانا آزاد اور پنڈت نہرو کو دلچسپی لینے پر مجبور کیا وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی (قدس اللہ سرہ العزیز) صدر جمعیۃ علماء ہند کی شخصیت تھی۔ یا مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی جدوجہد جو مسلسل جاری رہی۔

کسٹوڈین کے قانون میں ترمیم:

کسٹوڈین کے قانون میں جو ترمیمات ہوئیں ان کی تفصیل مشکل بھی ہے اور طویل بھی۔ صرف اتنی بات آسانی سے لکھی بھی جا سکتی ہے اور اس کا سمجھ لینا بھی آسان ہے کہ مجاہد ملت کی غیر معمولی جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترمیمات کے بعد اس کالے قانون کا نقصان صرف ایک چوتھائی رہ گیا۔

شروع میں نکاسی جائیدادوں کا قانون نافذ ہوا تو پورے ہندوستان میں کہرام مچ گیا کیونکہ اس کی نوعیت ایسی تھی کہ تمام ہی صاحب جائداد مسلمان اس کی زد میں آ سکتے تھے۔ چنانچہ اسی وسیع پیمانے پر کسٹوڈین نے دست درازی شروع کر دی۔

مجاہد ملت کے سامنے معاملات آئے تو آپ فی الواقع بے چین ہو گئے راحت و آرام سب ختم ہو گیا۔ دن رات وکلا سے مشورے' بار بار ماہرین قانون کا جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں اجتماع' ان سے بحث مباحثہ شیخ محمد احمد صاحب آج کل ''ایڈووکیٹ'' ہیں۔ اس وقت تک وکالت پاس نہیں کی تھی۔ مگر قانون پر نظر بہت گہری تھی۔ وہ حضرت مجاہد ملت کا دست راست تھے۔

مختصر یہ کہ یکے بعد دیگرے ترمیمات منظور کرا کر اس قانون کے دامن کو اتنا تنگ کر دیا کہ شاید ایک چوتھائی معاملات بھی اس کی زد میں نہیں آ سکے۔ تین چوتھائی معاملات ان ترمیمات کی رو سے ختم ہو گئے۔

۳۔ ملازمتوں کے سلسلے میں جن لاکھوں مسلمانوں نے عارضی پاکستان لکھوا دیا تھا جب وہ چھ ماہ بعد پاکستان کے بجائے ہندوستان میں ملازمت کے خواہاں ہوئے تو سخت دشواری پیش آئی۔ قانون بنانے والوں اور رول طے کرنے والوں کو قانون یا رول بنانے کے وقت اس کا وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔

دشواری یہ پیش آئی کہ مسلمان تو ہزاروں کی تعداد میں پاکستان سے واپس آ گئے مگر

جو شرنارتھی پاکستان سے آ کر ان کی جگہ پر تعینات ہوئے تھے ان میں سے ایک بھی پاکستان واپس نہیں ہوا۔ اب عارضی پاکستان والے محروم رہ گئے۔

ریلوے میں یہ ستم ظریفی بھی کی گئی تھی کہ محض مسلمان ہونے کی بناء پر پاکستانی قرار دے دیا۔ این۔ ڈبلیو۔ آر میں عموماً یہی کیا گیا تھا۔

جودھپور سے ایک لائن سندھ جاتی تھی۔ یہاں اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کیا گیا کہ سب مسلمانوں کو یک قلم برخاست کر دیا گیا حالانکہ ان میں سے بہت سے وہ تھے کہ انہوں نے نہ عارضی پاکستان لکھوایا تھا نہ مستقل۔

ان ہزاروں بلکہ تقریباً ایک لاکھ ملازموں کے حق میں پالیسی تبدیل کرنا مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کا خاص کارنامہ تھا۔

جو جگہیں خالی تھیں وہاں مسلمان لے لیے گئے اور جن مسلمانوں کو اس وقت جگہ نہیں مل سکی ان کے متعلق یہ طے کر دیا گیا کہ خالی جگہ پر پہلے ان کو لیا جائے گا۔

حالات کا جبر اور اظہار اسلام کی سعادت:

(۴) وہ منظر کبھی بھی فراموش نہیں ہوگا جب دوپہر کے وقت سکھ نما پنجابیوں کی ایک جماعت دفتر میں دفعتہً پہونچ گئی۔ یہ پندرہ سولہ آدمی تھے۔ اردو سے ناوقف ان سے گفتگو شروع ہوئی تو کچھ دیر تک یہی رہا کہ ''زبان یار من ترکی و من ترکی نمیدانم'' مگر پوری توجہ سے کام لیا گیا تو ان کا مطلب سمجھ میں آ گیا کہ:

> ''وہ مسلمان ہیں، ضلع پٹیالہ کے دیہات کے باشندے، محض جان بچانے کے لیے یہ وضع اختیار کر رکھی ہے۔ اب مطالبہ یہ ہے کہ اس طرح اپنے ضمیر کے خلاف دو سال زندگی گزار چکے ہیں، آئندہ یہ صورت باقی نہیں رکھنا چاہتے۔ ان کے لیے انتظام کیا جائے کہ وہ مسلمان بن کر آزادی سے زندگی گزار سکیں اور یہ ممکن نہ ہو تو ان کو پاکستان پہونچا دیا جائے۔''

مجاہد ملتؒ کی جرأت اور پنڈت جواہر لال نہرو وزیراعظم حکومت ہند کی شرافت اس کی مستحق ہے کہ مسلمانان مشرقی پنجاب کی تاریخ میں ہمیشہ سنہری حروف سے لکھی جائے کہ مجاہد ملتؒ نے ایک لمحے کی تاخیر بھی گوارا نہیں کی سب سے پہلی فرصت میں پنڈت جی سے ملاقات

کر کے صورت حال پیش کی۔ پنڈت جی نے یہ تو گوارا نہیں کیا کہ وہ وفادار ہندوستانیوں کو پاکستان کے حوالہ کریں البتہ ایک سرکلر جاری کر دیا کہ جو لوگ ۱۹۴۷ء سے پہلے مسلمان تھے وہ اب بھی مسلمان ہی ہیں۔ وہ آزادی سے اپنے اسلام کا اظہار کر سکتے ہیں ان پر کوئی قانونی پابندی نہیں اور نہ کوئی شخص یا جماعت ان کی مذہبی آزادی میں رکاوٹ ڈال سکتی ہے۔

یہ سرکلر دیہات کے پٹواریوں اور چوکیداروں تک پہونچا دیا گیا۔ کچھ دنوں بعد احقر مولانا لقاء اللہ صاحب وغیرہ کے ساتھ مشرقی پنجاب کے دیہات میں گیا تو دیہات کے مسلمانوں کو اس پس منظر کا تو علم نہیں تھا' البتہ اس سرکلر کا ان کو علم تھا۔ جب ہم نے ان سے حالات دریافت کیے' تو انہوں نے بتایا کہ ہم چھپ چھپ کر نمازیں پڑھتے رہے' اپنے مذہبی مراسم انجام دیتے رہے اور جب مذہبی آزادی کا اعلان ہوا تو ہم نے بھی پردہ اٹھا دیا۔

اللہ تعالیٰ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات قبول فرمائے اور امید ہے کہ ایسا کارنامہ جس کا متعدی اثر ہزاروں مسلمانوں تک پہونچا اور ان کی آنے والی نسلیں بھی اس کارنامہ کی رہین منت رہیں گی۔ انشاء اللہ یہ کارنامہ مجاہد ملت کے صحیفہ اعمال کا روشن اور درخشاں باب ہوگا۔

الجمعیۃ اخبار اور پریس کا اجراء:

ہنگامی حالات نے جس کی زندگی کے ایک ایک لمحے کو ہنگامہ بنا دیا ہو اس کے لیے بہت ہی مشکل ہے کہ کوئی تعمیری خدمت انجام دے سکے' جس کے لیے سکون' اطمینان اور خاموشی ضروری ہے۔ مگر مجاہد ملت کی زندگی میں یہ تضاد موجود تھا کہ ہنگامی حالات کی انتہائی مصروفیت اور انہماک کے باوجود تعمیر ملت کے فرائض سے وہ غافل نہیں ہوتے تھے۔

ابھی ۴۷ء کا پرآشوب دور ختم نہیں ہوا تھا کہ لکھنؤ میں ۲۷ / ۲۸ دسمبر کی تاریخیں آزاد کانفرنس کے لیے طے کر دی گئیں۔ وسط دسمبر میں احقر چند ضرورتوں سے دہلی سے باہر گیا ہوا تھا۔ غالباً ۲۰ دسمبر کو سہارن پور میں مجاہد ملت کا تار پہونچا۔ اور احقر خطرناک راستے طے کرتا ہوا خدا کے فضل سے دہلی پہونچ گیا۔ یہاں مجاہد ملت روزنامہ الجمعیۃ کے جاری کرنے کا عزم فرما چکے تھے اور احقر کو اسی لیے طلب فرمایا تھا کہ بلا توقف روزنامہ جاری کر دیا جائے۔ چنانچہ ۲۳ دسمبر ۴۷ء سے یہ روزنامہ پھر جاری ہو گیا جو ۹ سال پہلے برطانوی حکومت کے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کی نوازشوں کا شکار ہو چکا تھا۔ فرق یہ ہوا کہ پہلے سہ روزہ تھا اور اس مرتبہ مجاہد

ملت کے حوصلہ عالی نے اس کو روز نامہ قرار دیا۔

روز نامہ الجمعیۃ کی اشاعت دہشت زدہ، صامت و ساکت فضا میں پہلی آواز تھی جس نے پھر زندگی کی لہر دوڑائی اور ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے لیے صبح صادق ثابت ہوئی۔

الجمعیۃ پریس بھی اسی طرح مجاہد ملت کے عزم راسخ کا طفیل ہے جیسے ہی روز نامہ الجمعیۃ جاری ہوا تھا مولانا موصوف کی فرمائش یہ بھی تھی کہ پریس بھی قائم کیا جائے۔ مگر احقر کو پریس کی مشکلات کا تجربہ تھا۔ مجلس عاملہ میں پریس کا تذکرہ آیا تھا تو حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ جو پریس کے پرانے زخم خوردہ تھے انہوں نے فرمایا کوئی انتظام کرنے والا ہو تو پریس کامیاب ہوسکتا ہے۔ پھر مجلس عاملہ نے کمیٹی بنادی کہ پریس کے امکانات پر غور کر کے فیصلہ کرے۔ اس کی رپورٹ بھی مخالف ہی رہی۔ جب یہ سب صورتیں مجاہد ملت کے منشاء کو پورا نہ کرسکیں تو آپ نے فرمایا کہ نفع نقصان تو بعد کی بات ہے۔ میرا منشاء تو یہ ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی ایک جائداد ہو جائے۔ مجاہد ملت کے اس جذبے کی حمایت سب ساتھیوں نے کی اور الحمدللہ الجمعیۃ پریس وجود میں آگیا۔

اسی طرح انگریزی اخبار کے متعلق بھی مجاہد ملت کی آرزو ساتھیوں کے دلوں میں امنگ پیدا کرتی رہی اور ایک مرتبہ ہفتہ وار اخبار ''میسج'' جاری کر دیا گیا۔ جس کے لیے مجاہد ملت اور ان کے رفقا نے بمبئی سے تقریباً ستر ہزار روپیہ اور مالی گاؤں سے تقریباً بارہ ہزار روپیہ فراہم کیے تھے۔ مگر افسوس اس کی مشکلات پر قابو نہ پایا جاسکا۔

دینی تعلیم کنونشن کا انعقاد:

مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ جس طرح سیکولرزم کے بہت بڑے حامی اور اس کی کامیابی کے لیے سرگرم جدو جہد کو اپنا فرض سمجھتے تھے وہ پہلے دن سے اس کے تقاضے سے بھی غافل نہیں رہے کہ سیکولر حکومت اور لازمی تعلیم کے منصوبہ کے جھمیلے میں دین و ایمان کا باقی رہنا اس پر موقوف ہے کہ مسلمان دینی تعیلم کے فرض کو اپنی جماعتی زندگی کا نصب العین بنالیں اور انفرادی طور پر نہیں بلکہ جماعتی قوت کے ساتھ اپنی کوششیں اس مقصد عظیم کے لیے وقف کر دیں۔

مجاہد ملت کی یہ تحریک اور اس سلسلے میں جمعیۃ علماء ہند کی تجویزیں (جن کا سلسلہ انقلاب سے چند ماہ بعد یعنی ۳ رفروری ۴۸ء سے شروع ہوگیا) اس وقت ''ملا گردی'' کا ایک شاخسانہ

سمجھی گئیں۔ مگر جب بار بار تقریروں، مضمونوں اور رسالوں کے ذریعے اس طرف مسلمانوں کی توجہ منعطف کرائی جا رہی تھی تو ایک احساس پیدا ہوا۔ اور اب یہ سوال سامنے آیا کہ دینی تعلیم کا انتظام خود مسلمان کریں یا حکومت سے سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ اس کی ذمہ داری اپنے سر لے۔

یہ سوال اتنا بڑھا کہ نہ صرف خصوصی اجتماعات بلکہ عام مجلسوں کا موضوع بحث بن گیا۔ اب ضرورت محسوس کی گئی کہ مسلمانوں کا ایک کنونشن طلب کیا جائے اور اس کنونشن میں اس موضوع پر بحث کر کے کسی متفقہ فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کی جائے۔

ایک طرف موجودہ حالات میں دینی تعلیم کی غیر معمولی اہمیت کے احساس کو عام کرنا اور دوسری جانب دینی تعلیم کی ذمہ داری کے سوال کو حل کرنا اس دینی تعلیمی کنونشن کا مقصد تھا، جس کے لیے مجاہد ملت کی تجویز کے بموجب بمبئی کا مقام تجویز کیا گیا اور پھر مجاہد ملت ہی کی کوششوں نے اس کو اس درجہ کامیاب بنایا کہ اس کو بے نظیر کنونشن سمجھا گیا۔

تاریخ کوئی ایسی مثال آسانی سے نہیں پیش کر سکتی کہ سنی، اہل حدیث، شیعہ اور شیعوں کے مختلف گروہ، ان کے علاوہ مہدوی، آغا خانی وغیرہ سب فرقے ایک پلیٹ فارم پر سر جوڑ کر بیٹھے ہوں اور پورے اتفاق اور یک جہتی کے ساتھ ایک فیصلہ کیا ہو۔ یہ مجاہد ملت کے اخلاص اور آپ کے جذبہء صادق کی برکت تھی کہ دسمبر ۱۹۵۴ء کے کنونشن نے یہ مثال قائم کر دی۔

جزاہ اللہ احسن ماجازی بہ عبادہ الصالحین.

عمر بگذشت و حدیث درد ما آخر نہ شد
شب آخر شد کنوں کو نہ کنم افسانہ را

(۱)

حضرت مجاہد ملتؒ افکار و اعمال کے آئینہ میں

انیس الحسن

زندگی پر ایک طائرانہ نظر:

۴۴ء ۴۵ء کو گزرتے ہوئے اٹھارہ انیس برس ہو گئے۔ وہ زمانہ ہندوستان میں سیاسی کش مکش کے انتہائی بحران کا زمانہ تھا۔ ایک طرف کانگریس کی تحریک آزادی اپنی آخری منزل میں قدم رکھ چکی تھی۔ دوسری طرف مسلم لیگ کا مطالبۂ پاکستان اپنے عروج و شباب پر تھا۔ پورے ملک کی فضائیں سیاسی چرچوں سے گونج رہی تھیں۔ پھر دہلی کو تو ملکی زندگی کے ہر معاملے میں ہی مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ سیاسی کش مکش کا جو تلاطم یہاں بپا تھا اس کا اندازہ دشوار نہیں۔ آئے دن ملک بھر کے صف اول کے رہنماؤں اور لیڈروں کی آمد و رفت، جلسے، جلوس، مخالف و موافق تقریریں، بیانات، ایک طوفان تھا جس نے فضا کو سر پر اٹھا رکھا تھا، مسلمانوں کے درمیان لیگی قائدین میں مرحوم نواب زادہ لیاقت علی خاں، مسٹر جناح اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور قوم پرور رہنماؤں میں امام الہند مولانا آزاد، مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ، شیخ الاسلام حضرت مدنی، سحبان الہند مولانا احمد سعید، بطل حریت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا نور الدین بہاری قدس اللہ اسرارہم اور بیرسٹر آصف علی صاحب مرحوم کی تقریریں، کانفرنسیں، جلسے، جلوس دہلی تمام سرگرمیوں اور دلچسپیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

(۲)

اپنے اساتذہ کرام اور علماء ذی احترام کے اثر سے عربی و دینی مدارس کی فضا ان دنوں

عام طور پر کانگریس، جمعیۃ علماء اور مجلس احرار کی پرجوش ہم نوا تھی۔ میں نے بھی ان ہی دنوں مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں درس نظامی اور مشرقی علوم کے مروجہ نصاب کی تکمیل کی تھی۔

قوم پرور رہنماؤں اور بزرگان جمعیۃ سے قلبی تعلق اور ان کے جلسوں، جلوسوں میں شرکت کا شوق اسی ماحول کی بخشش تھی۔ دوسرے بزرگوں کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی بھی کوئی دلآویز تقریریں ان دنوں سننے کا موقع ملا۔ خاص طور پر ''یوم فلسطین'' کے موقع پر برطانوی حکومت کے مسلم آزار رویہ پر تنقید کرتے ہوئے لب ولہجہ کی پوری پوری قوت اور جوش کے ساتھ مولانا مرحوم کے یہ الفاظ گویا آج تک کانوں میں گونج رہے ہیں:

> ''برٹش اقتدار کو گھمنڈ ہے کہ اس کے حدود سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا ہے، لیکن میں آج فلسطین کانفرنس کے اس اسٹیج سے پکار کر برطانوی سامراج کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ اس گھمنڈ میں نہ رہے۔ یہ سورج، سورج نہیں ہے بلکہ دست قدرت کی وہ ٹارچ ہے جو رات و دن برٹش استبداد اور آمریت کا تعاقب کر رہی ہے کہ آج کہاں یہ نہتے انسانوں پر ستم ڈھا رہے ہیں اور آج کہاں اپنی غلامی کا وبال غریبوں کے سر تھوپ رہے ہیں۔''

(۳)

ان ہی دنوں (۴۵ء میں) دہلی میں ایک آل پارٹیز مسلم کانفرنس ہوئی تھی۔ اس کی سبجیکٹ کمیٹی میں کسی تجویز کی تائید میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے تقریر کی۔ پرجوش انداز بیان کے ساتھ ساتھ اس وقت ان کے جس امتیاز پر میں سب سے زیادہ حیران ہوا۔ وہ زبان کی طلاقت اور روانی تھی۔ مولانا کی تقریر کیا تھی، الفاظ وکلمات کی ایک بوچھاڑ تھی یا ایک موسلا دھار بارش، صف اول کے مقرروں میں یہ وصف مولانا مرحوم کا امتیاز تھا۔ ان ہی دنوں کچھ دوستوں سے سنا کہ شارٹ ہینڈ کے مشاق رپورٹر بھی جس تقریر کو نوٹ کرنے سے عاجز آ جاتے تھے۔ وہ صرف مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی تقریر ہوتی تھی۔ ان کی طلاقت زبان اور تیز رفتاری کے سامنے شارٹ ہینڈ کی تکنیک بھی مات کھاتی تھی۔ آزادی ہند سے پہلے حضرت مولانا کی جتنی بھی

تقریریں سنیں۔ ان میں یہ خصوصیت نمایاں نظر آئی۔ آزادی کے بعد اگرچہ جوش خطابت اور قوت بیان میں فرق نہیں آیا۔ لیکن زبان کی اس تیز یلغار اور رفتار میں ضرور کچھ فرق آ گیا تھا اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ آزادی سے پہلے ایک بیرونی اقتدار کا مقابلہ تھا۔ طبیعت میں ایک سیلابی جوش تھا اور بے چین امنگ آزادی کے بعد حالات د ماحول نے غیر متوقع طور پر جو رنگ بدلا اس میں نہ جذبات کا وہ تلاطم باقی رہا' نہ امنگوں کا وہ جوش و خروش۔

بہر حال مجاہد ملتؒ کو شروع شروع دیکھ کر اور سن کر یہی تاثر تھا جو میرے دل و دماغ میں ان کی عقیدت و گرویدگی کا نقش بنا۔ اس وقت یہ گمان بھی نہ تھا کہ عنقریب ہی ان کے ساتھ اتنا قریبی تعلق ہو جائے گا کہ ان کے جیتے جی سترہ برس مسلسل رات و دن سفر میں اور حضر میں پیاسے کی طرح ساتھ رہنے اور دست و بازو بن کر ان کی شفقت و رہنمائی میں کام کرنے کی سعادت میسر آئے گی۔

(۴)

ادھر آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شریک تمام قوم پرور مسلم نمائندوں نے یہ طے کیا کہ آنے والے انتخابات میں ایک مشترکہ ''مسلم پارلیمنٹری بورڈ'' کی قیادت میں صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کی ہر ہر سیٹ پر مسلم لیگ کے خلاف قوم پرور مسلم نمائندے الیکشن لڑیں' تاکہ دستوری لحاظ سے ان کی رائے کا وزن ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں اثر انداز ہو سکے۔ جمعیۃ علماء ہند کے مرکزی دفتر میں مسلم پارلیمنٹری بورڈ کا دفتر قائم ہو گیا۔ مرحوم و مغفور مولانا بشیر احمد صاحب بھٹہ اس کے کنویز تھے۔

مولانا عبداللہ مصری کا قیام ان دنوں جمعیۃ کے دفتر ہی میں تھا اور مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے پبلسٹی سیکشن کی کچھ ذمہ داری ان کے سپرد تھی۔ اکتوبر' نومبر ۴۵ء میں مولانا مصری ہی داعی ہوئے اور مجھے ان کے ساتھ بورڈ کے پبلسٹی ورک میں شریک ہو جانے کا موقع ملا۔ اسی زمانے کے مطبوعہ رسائل و لٹریچر سے الجمعیۃ بک ڈپو کی بنیاد پڑی جس کے نگراں حضرت مولانا محمد میاں صاحب تھے۔ آہستہ آہستہ انتخابات کی وقتی مہم سمٹتی گئی۔ لیکن دوسری طرف مرکزی جمعیۃ کے کام کا پھیلاؤ بڑھنے لگا جمعیۃ اس وقت تمام قوم پرور مسلم جماعتوں کا محور و مرکز بن چکی تھی۔ ادھر

آزادی ہند اور ملک کے مستقبل کے فیصلے تدبیروں اور گفتگوؤں کی آخری منزل میں تھے۔ گاندھی، جناح اور لیگ، کانگریس گفتگوئیں، شملہ کانفرنس، کیبنٹ مشن، ماؤنٹ بیٹن مشن کے سین یکے بعد دیگرے تیزی سے گزر رہے تھے۔ ان تمام مراحل میں قوم پرور مسلمانوں کی نمائندگی جمعیۃ ہی کے ذریعے انجام پارہی تھی۔ تاریخ کا مصروف ترین اور فیصلہ کن دور تھا اور اس میں جمعیۃ کا سیاسی کردار ایک اہم پارٹ ادا کر رہا تھا۔ جمعیۃ کا مرکزی دفتر جس کے سرپرست اعلیٰ حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مدارالمہام مولانا سید محمد میاں صاحب تھے، شبانہ روز سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس سے پہلے دفتر کی سرگرمیاں مقابلۃً محدود تھیں۔ لیکن اب بڑھتے ہوئے کاموں کے ساتھ ساتھ مزید کارکنوں کی بھی ضرورت سامنے آئی۔ چنانچہ مولانا سید محمد میاں صاحب نے پارلیمنٹری بورڈ کا کام سمٹنے کے ساتھ ہی مجھے مرکزی جمعیۃ کا پبلسٹی سیکشن سپرد کر دیا اور اس طرح میرا تعلق براہ راست مرکزی دفتر سے ہو گیا۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا قیام ان دنوں قرول باغ میں تھا، دن ندوۃ المصنفین کے سلسلۂ تصنیف و تالیف میں گزار کر روزانہ عصر کے بعد دفتر جمعیۃ میں تشریف لایا کرتے تھے اور دیر رات گئے تک رہ کر دن بھر کی ڈاک دیکھتے اور اہم معاملات و مشاغل کی تکمیل فرمایا کرتے تھے۔ کاموں کا سلسلہ دن بدن تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا ایک عظیم سیاسی انقلاب ملک کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا۔ جمعیۃ علماء ہند کی نظامت عمومی جیسی اہم ذمہ داری کو سنبھالے ہوئے مجاہد ملتؒ کی شخصیت، ان حالات میں تیزی کے ساتھ ابھرتی جارہی تھی۔ خط و کتابت اور دوسرے مشاغل کا سلسلہ بھی تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ بہت جلد مولانا موصوف کو ایک معاون کار کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی۔ اور بالآخر اگست ۴۶ء سے انہوں نے اپنی خط و کتابت اور دوسرے دفتری مشاغل میں ہاتھ بٹانے کے لیے میرا کچھ وقت حضرت مولانا محمد میاں صاحب سے کہہ کر اپنے لیے حاصل کر لیا۔ اس وقت سے دستور یہ رہا کہ دن بھر کی ڈاک روزانہ شام کو میں حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کرتا۔ اہم خطوط کے جواب وہ خود تحریر فرمایا کرتے یا مجھے املا کرادیا کرتے۔ باقی خطوط کے لیے زبانی ہدایات کر دیتے کہ یہ جواب لکھ دینا۔ پھر خود جوابات کو دیکھ کر دستخط فرمایا کرتے اور ڈاک روانہ کر دی جاتی۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً بیانات و پیغامات کی تدوین و ترتیب، اسفار اور پروگراموں کی تنظیم بھی میرے سپرد رہتی۔ چند ہی روز کے تجربہ کے بعد حضرت مولانا کو

میری کارگزاری پر اتنا اعتماد اور اطمینان ہوگیا کہ انہوں نے اپنی انتہائی عدیم الفرصتی اور آئے دن کے اسفار کے باعث اپنی ڈاک کی پوری ذمہ داری مجھے تفویض فرما دی۔ آنے والے برسوں میں مسلسل ان کی مصروفیتوں کا جو حال رہا اس میں بہت ہی کم اس کا موقع ملتا تھا کہ وہ کسی دن کی پوری ڈاک یہاں تک کہ گھریلو اور ذاتی خطوط بھی لفظ بلفظ خود پڑھ لیتے یا سن لیتے۔ ورنہ عام طور پر صبح' دوپہر' شام کی کسی بھی فرصت میں وہ بیٹھ جاتے' خطوط کا ماحصل سن کر جواب نوٹ کرا دیتے۔ مجھے بھی شب و روز ساتھ رہنے اور مستقل طور پر اس خدمت کو انجام دیتے ہوئے ان کے مزاج' ان کے انداز فکر اور انداز تحریر کا اتنا تجربہ ہوگیا تھا کہ ان کے چند اشارے تفصیل و تعبیر سے بے نیاز کر دیتے تھے۔ خود مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اتنا اطمینان تھا کہ پھر میرے لکھے ہوئے کسی جواب کو انہوں نے کبھی خود پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں خطوط لکھ کر سامنے رکھ دیتا اور وہ قلم برداشتہ دستخط کرتے چلے جاتے۔

مولاناؒ کے دوسرے اہم کاموں' مثلاً ان کے اسفار اور پروگراموں کی ترتیب متعلقہ مقامات کو ان کی اطلاع' ان کے مشاغل کی تعیین اوقات اور یادداشت دہلی میں رہتے ہوئے ان کے مختلف اپوائنٹ منٹس کا اہتمام وغیرہ وغیرہ ان تمام امور کے ساتھ ساتھ ان کی مراسلت کا سلسلہ مستقل طور پر میرے سپرد تھا اور بحمد اللہ میں نے ۴۶ء سے مسلسل یہ خدمت انجام دی۔ میری نوعمری اور ناتجربہ کاری یقیناً اس کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی کہ ایک ملک گیر حیثیت رکھنے والی ذمہ دار شخصیت' صف اول کے سیاسی رہنما' بلند پایہ عالم دین اور ساتھ ہی صاحب فکر و قلم فاضل ادیب و مصنف کی اہم سے اہم خط و کتابت' احتیاط اور ذمہ داری کی جو نزاکتیں اپنے ساتھ لیے ہوتی ہے' اس اہم ذمہ داری کو سنبھال اور نباہ سکتا۔ پھر بھی اگر میں نے اس خدمت کو سنبھالا اور بارہ تیرہ سال مسلسل اس طور پر انجام دیا کہ اس پورے عرصے میں مولانا مرحوم کے اعتماد و اطمینان کو کبھی شکایت اور نا امیدی کا موقع نہیں مل سکا تو یہ بھی حقیقتاً خود حضرت مولانا ہی کی کرامت تھی۔

(۵)

بہر حال ۴۶ء سے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جو وابستگی مجھے حاصل ہوئی' مولاناؒ کی زندگی بھر نہ صرف قائم رہی بلکہ ان کے بے اندازہ اعتماد' محبت اور

شفقت نے اس وابستگی کو دفتری اور رسمی حدود سے کہیں بڑھ کر ایک ایسے گہرے تعلق میں تبدیل کر دیا تھا جو کسی ایک گھر اور خاندان کے روابط اور قرابت داری میں بھی ہر جگہ نظر نہیں آتا۔ مجھے جب کبھی انہوں نے کہیں سے کوئی تحریر بھیجی تو ''برادر عزیز'' کے شفقت بھرے خطاب ہی سے شروع کی۔ پھر پندرہ برس مسلسل شب و روز ان کے ساتھ گزارنے' ان کے کاموں میں شریک رہنے اور نہ صرف دہلی کے قیام میں بلکہ دہلی سے باہر ملک کے کونے کونے تک ان کے اسفار اور دوروں' بری' بحری اور ہوائی سفروں میں ساتھ رہنے کی جو سعادت میسر آئی' اس کی بدولت جہاں اور بہت کچھ دیکھنے' سیکھنے کا موقع ملا وہاں سب سے زیادہ خود حضرت مولانا کی شخصیت' ان کے افکار و عزائم' ان کے اعمال جلیلہ اور مقاصد عالیہ کو دیکھنے اور سمجھنے کی بھی وہ سعادت حصے میں آئی جو میرے لیے زندگی کا ایک قیمتی سرمایہ اور سامان صد بصیرت و موعظمت ہے۔

(۶)

آج جب کہ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ رفیق اعلیٰ کے حضور میں پہنچ چکے ہیں اس پوری مدت میں ان کے ساتھ گزاری ہوئی زندگی نگاہوں میں سمائے ہوئے قلم برداشتہ قلب و ذہن کے کچھ نقوش ''صفحہ قرطاس پر ثبت'' کر رہا ہوں۔ اگرچہ یہ بھی ان کے احسان و کرم' شفقت و نوازش اور محبت بھرے سلوک کا بس ایک دھندلا سا نشان ہے یا ایک بے مایہ اعتراف اور بس۔

(۷)

دل کا تقاضہ تو یہی تھا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی اور سوانح حیات پر از اول تا آخر اپنے علم اور مشاہدے کے مطابق مفصل لکھوں۔ لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ کام شروع کرتا' کچھ دوسرے حضرات اور بالخصوص مخدوم حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کے ارادوں سے واقفیت ہوگئی۔ یقیناً یہ حق مجھ سے کہیں زیادہ مولاناؒ کے ان پرانے رفقائے کار کو پہنچتا ہے کہ ان کی زندگی اور کارہائے نمایاں پر' ان کے اوصاف و کمالات کے ہر ہر پہلو پر قلم اٹھائیں اور حضرت مولانا کا ایک مبسوط و یادگار تذکرہ آنے والی نسلوں کے لیے باقی چھوڑ

جائیں۔

چنانچہ اسی مجموعہ میں حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کا جو جامع مقالہ آپ کے پیش نظر ہے اور ساتھ ہی مولانا مقبول احمد سیوہاروی صاحب اور حضرت مجاہد ملت ؒ کی تصنیفی زندگی اور اس کے ثمرات طیبہ پر مولانا قاضی زین العابدین صاحب کے مقالات حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات کے دور اول پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ لیکن حضرت مولانا کی زندگی کا دوسرا زرین دور جو تقریباً آزادی ہند سے شروع ہوتا ہے اور جو شاید مشیت الٰہی میں بھی ان کی تخلیق کا اہم مقصد تھا اس پر بہت کچھ لکھا جانے کے باوجود یقیناً اس کا مستحق ہے کہ اس پر زیادہ سے زیادہ کام کیا جائے اور بکھرے ہوئے نقوش کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر سمیٹا جائے۔

اسی خیال سے آنے والے صفحات میں حضرت مولانا ؒ کی سوانح حیات اور شخصیت و کردار کا مختصر خاکہ پیش کیا جا رہا ہے اور اس کے بعد ان کے افکار و اعمال جلیلہ خاص طور پر ۴۷ء میں اور اس کے بعد ان کی عظیم الشان خدمات پر اختصار و احتیاط کے ساتھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۲)

شخصیت و کردار

شکل وشباہت:

ایک سیدھے سادے انسان کا تصور کیجئے گندمی رنگ' اوسط درجہ کا بدن' نکلتا ہوا قد' کتابی چہرہ جس پر سادگی بھی برستی ہو۔ اور علم و فضل کا وقار بھی' فکر و تدبر سے معمور کشادہ پیشانی۔ آنکھوں میں ایک حسین چمک' بھاری بھاری فلسفیانہ بھویں (جنہیں دیکھ کر ایک دوست جارج برنارڈ شا کی بھوؤں سے تشبیہ دیا کرتے تھے) چہرے پر گھنی داڑھی' آواز میں گرج اور گفتار میں بے ساختگی بس یہی حلیہ تھا مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا۔

وضع قطع:

وضع قطع میں سادگی بھی تھی اور استقامت بھی۔ لباس ہمیشہ سادہ' سفید کھدر کا کرتہ' اسی کا کسی قدر تنگ مہری کا پاجامہ' کھدر ہی کی شیروانی' سردیوں میں عموماً کسی عمدہ کھال کی اور گرمیوں میں سادہ سفید کھدر کی اونچی باڑ کی ٹوپی جس کا تراش ان کا خود ایجاد مخصوص تراش تھا۔ جوتا ہمیشہ عمدہ پہننے کے شوقین تھے۔ کبھی کھلا ہوا (نیوکٹ) پمپ اور کبھی جے پوری۔

غذا و شوق:

خورک بہت معمولی اور سادہ ہوتی تھی۔ اور مقدار میں بھی بہت کم' سادہ تندوری روٹی ہو اور معمولی دال' سبزی یا گوشت کی ترکاری' یہی ان کی پسندیدہ غذا تھی۔ وقت پر جو کچھ بھی میسر آ جائے' چند منٹ میں دس پانچ لقمے لیے اور بس فارغ ہو گئے۔ کھانے پینے کے ذوق اور لذتوں کے اہتمام سے وہ تقریباً نا آشنا ہی رہے۔ احباب و مخلصین بڑے ارمانوں سے دعوت کرتے۔ مگر ان کی دعوت کرنے والے ہمیشہ مایوس ہی رہتے۔ دسترخوان پر کتنی ہی مرغن اور مکلف غذائیں سجاتے۔ مگر مولانا کا ہاتھ جب اٹھتا تو کسی معمولی کھانے کی طرف اور اتنی جلدی فارغ ہو جاتے کہ ساتھ کھانے والوں کے لیے بھی بڑی دشواری ہوتی اچار اور ترشی انہیں بہت

مرغوب تھی۔ اپنی تندرستی سے بے فکر اور اصول صحت سے بے نیاز' کھانسی و نزلہ کی حالت میں بھی اپنی مرغوب کھٹائی اور ترشی کے استعمال سے بھی باز نہیں رہتے تھے۔ سردیوں میں رس کی کھیر (رساول) کے بہت شوقین تھے۔ پھلوں میں ان کو خربوزے کا بے حد شوق تھا۔ صبح شام چائے کے پابند تھے' وہ بھی بہت ہلکی جس میں دودھ بھی کم ہوتا اور مٹھاس بھی برائے نام۔ گرمیوں میں تیز برف کا پانی انہیں پسند تھا۔ پھلوں میں آم سے بھی کافی رغبت رکھتے تھے۔ کئی برس سے احباب کے اصرار پر یہ معمول ہو گیا تھا کہ آموں کے موسم میں اپنے رفقاء سمیت کاندھلہ جاتے تھے اور وہاں بڑی پر رونق محفل رہتی تھی۔ ادھر نئی دہلی میں ہر سال انڈیا گیٹ کے قریب آموں کی ایک محفل جما کرتی تھی۔ جس میں چالیس پچاس بے تکلف احباب کا اجتماع ہوا کرتا تھا۔ اس کے اہتمام میں مولانا فقیہہ الدین' حاجی محمد صالح' سلطان یار خاں صاحب وکیل اور ہم رفقائے دفتر شریک رہتے تھے۔

سفر اور سوتے میں عادت:

لباس اور خوراک کی طرح اپنے رہن سہن میں بھی بے حد سادگی پسند اور تکلفات سے بہت دور تھے۔ دفتر جمعیۃ میں ہمیشہ فرش پر بچھی ہوئی چاندنی یا چٹائی ہی ان کی مسند تھی۔ یا رات میں ایک کھوڑا پلنگ اور ایک تکیہ' سونے میں تنہائی پسند تھے۔ یہاں تک کہ ریل کے سفر میں بھی ہمیشہ ان کی فرمائش یہ ہوتی کہ کوپے میں (یعنی فرسٹ کلاس کا وہ کمپارٹمنٹ جس میں صرف دو برتھ ہوتی ہیں) سیٹ حاصل کی جائے۔ کار میں ہمیشہ اگلی سیٹ پر بیٹھتے۔

غرض کہ سادگی ان کے مزاج کا وہ عنصر تھی جو ان کے لباس' خوراک' وضع قطع' رہن سہن' اور زندگی کے تمام ہی پہلوؤں پر چھائی ہوئی تھی۔ مزاج کی دوسری خصوصیت تیز رفتاری تھی۔ یہ وصف بھی ان کے ہر کام میں نمایاں نظر آتا۔ بولتے بھی تیز' چلتے بھی تیز' کوئی اہم سے اہم سوال ہو یا کوئی پیچیدہ مسئلہ' انہیں نہ فیصلہ کرتے دیر لگتی نہ جواب دیتے' مخاطب کے منشا کو سمجھنے اور اس کے رجحان کا اندازہ لگانے میں بھی سبقت لے جاتے تھے۔ رفتار کی تیزی ان کے ہر عمل میں نمایاں رہتی۔ یہاں تک کہ نماز پڑھنے اور قرآن حکیم کی تلاوت میں بھی۔ لکھنے پڑھنے اور تقریر و خطابت میں بھی ان کی رفتار ہمیشہ تیز رہی۔

ذوق وسر گرمی عمل:

کام کی لگن اور دھن مولانا مرحوم کو حد سے زیادہ تھی۔ سکون اور فرصت سے نہ ان کی زندگی کبھی آشنا ہوئی' نہ انہیں کبھی اس کی جستجو ہوئی' کاموں کے ہجوم میں گھرا رہنا ہی انہیں راس آتا تھا اور خود بھی وہ کبھی چین سے بیٹھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ جس وقت سے انہوں نے اپنے ہوش و حواس کی زندگی میں قدم رکھا تھا۔ آخر تک تقریباً پینتالیس برس وہ مسلسل تگ و دو' انہماک وعمل' بے شمار تحریکوں اور خدمت گزاریوں میں اس طرح مصروف رہے کہ آج بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا مرحوم نے اپنی عمر کی تھوڑی مہلت میں جو کام انجام دیئے' دوسرے انسانوں کے لیے وہ کئی عمروں اور صدیوں کے کام تھے۔

ان کی مصروفیتوں اور ہجوم مشاغل کا صحیح اندازہ تو درحقیقت وہی کر سکتے ہیں جنہیں زندگی میں ان سے قریب رہنے کا موقع ملا ہے۔ کوئی تذکرہ نگار لکھنا چاہے بھی تو ان کی مصروف ترین زندگی اور بھرپور سرگرمیوں کو آخر کہاں لکھ سکتا ہے۔ ان کی لگن اور دھن کا حال ہی کچھ عجیب تھا۔ دفتر جمعیۃ کے اندرونی کمرے میں بیٹھے ہیں۔ ذمہ دار شخصیتوں سے گفتگو ہو رہی ہے اور وہیں سے باہر اپنے کاموں میں لگے ہوئے کارکنوں کو چھوٹے سے چھوٹے معاملات میں ہدایت دیتے جا رہے ہیں۔ دفتر میں کوئی ملکی یا غیر ملکی مہمان آنے والا ہے تو مدارات اور تواضع کے ہر اہتمام میں خود شریک ہیں۔ مہمان کو پانچ بجے آنا ہے۔ قاضی اکرام الحق صاحب اپنے کمرے میں پڑے بے خبر سو رہے ہیں۔ چار بجتے ہی مولانا خود جا کر قاضی جی کو جگا رہے ہیں کہ آپ ابھی تک سو رہے ہیں' نہ پھل فروٹ آئے' نہ چائے پانی کا انتظام ہوا۔ قاضی جی نے ایک کروٹ لی اور پھر۔۔۔ حضرت ابھی تو چار ہی بجے ہیں۔ ابھی جاتا ہوں۔ سب کچھ ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کیجئے اور مولانا مسکراتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔

جمعیۃ کا کوئی سالانہ اجلاس ہو یا کوئی مقامی کانفرنس' مختلف ذمہ داریاں مختلف کارکنوں کے سپرد ہیں اور وہ انجام بھی دے رہے ہیں۔ مگر مولانا کی فکرمندیوں کا یہ حال ہے کہ گویا سب کچھ انہیں کی ذمہ داری ہے۔ کبھی مہمانوں کی قیام گاہیں دیکھ رہے ہیں' ابھی اسٹیج اور پنڈال کی بناوٹ کو جانچ رہے ہیں۔ روشنی اور پانی کے انتظامات کرا رہے ہیں یا کھانے اور ناشتہ کی تفصیلات کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے ہیں پھر تھوڑی ہی دیر میں اجلاس کے زیر غور مسائل' تجاویز

اور تقریروں کے پروگرام مرتب کرا رہے ہیں۔ کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے مولانا کسی سفر پر جانے والے ہیں۔ چند دوسرے رفقا بھی ساتھ ہوں گے۔ سب کی سیٹوں کا انتظام' پھر راستہ میں کھانے وغیرہ کا بندوبست' گزرتے ہوئے اسٹیشنوں پر چائے' ناشتے کی جستجو' ہر چیز کا فکر مولانا کو ہے اور اس کی تکمیل کے لیے وہی سب سے آگے آگے دوڑ رہے ہیں۔

جذبہ خدمت:

جمعیۃ کے تو وہ ناظم عمومی تھے ہی' مگر افتاد طبع اور ذوق عمل نے انہیں پورے قافلہ' امت کا منتظم عمومی بنا دیا تھا اور سچ یہ ہے کہ ان ہی کی تنہا ذات تھی جو گزشتہ پندرہ برس میں تو گویا تمام ہی قومی اور ملی سرگرمیوں کا محور بن کر رہ گئی تھی۔ پھر خوبی یہ کہ اپنی تمام تر ذمہ داریوں اور بے اندازہ مصروفیتوں پر بھی وہ کبھی شکوہ مند نہیں ہوئے۔ بلکہ حوصلہ مند طبیعت ہل من مزید کی متقاضی اور آمادہ کار ہی رہتی تھی۔ دہلی میں ہوں یا کہیں باہر سفر میں' چھوٹے سے چھوٹے ذاتی کاموں' اپنی پریشانیوں' سفارشوں اور مشوروں کے لیے عوام و خواص کی ایک بھیڑ ہر وقت ان کے ارگرد رہتی تھی۔ اور مولانا ہر ایک کا معاملہ خود سنتے اور معاملے کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے بات کر کے جواب بھی دیتے اور جدوجہد بھی فرماتے۔ اس طرح ان کے قیمتی اوقات کا کافی حصہ چھوٹے چھوٹے شخصی اور جزوی معاملات پر صرف ہو جاتا اور یہ معمول ہی بن گیا تھا۔ یہاں تک کہ ان سے قریب رہنے والے ہم جیسے خدام بھی بعض اوقات یہ محسوس کرتے اور مولانا سے کہتے بھی رہتے کہ آپ کا قیمتی وقت زیادہ اہم اور وسیع کاموں پر صرف ہونا چاہیے۔ چھوٹے چھوٹے گھریلو جھگڑوں اور معاملوں کو تو آپ اپنے دوسرے خدام پر چھوڑ دیں۔ لیکن وہ اپنی طبیعت سے مجبور تھے اور کبھی بھی نہ اپنے اوقات کے تحفظ کے لیے آمادہ ہو سکے نہ اپنی ملاقاتوں میں انہوں نے کبھی ریز رو ہونا گوارا کیا۔ دفتر جمعیۃ میں بیٹھتے تب اور سفر میں کہیں جاتے تب' ہمیشہ کھلے بندوں عوام سے قریب رہتے کہ ہر صاحب معاملہ بہ آسانی اور براہ راست ان تک پہنچ سکے۔ زندگی کے آخری تیرہ برس وہ مسلسل دستور ساز اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ممبر رہے۔ پارلیمنٹ کے ممبروں کو نئی دہلی میں پارلیمنٹ ہاؤس کے قریب ہی کم خرچ پر سرکاری بنگلے رہائش کے لیے دیئے جاتے ہیں۔ جہاں کافی سکون اور آرام کی رہائش میسر آتی ہے۔ مولانا سے بھی بارہا کہا گیا۔ لیکن انہوں نے کبھی بھی پرانے شہر کی گلی قاسم جان کو چھوڑ کر نئی

دہلی میں رہنا پسند نہیں کیا اور ہر بار یہی جواب دیا کہ یہاں تو ہر ضرورت مند دن رات کے کسی بھی حصہ میں وقت بے وقت مجھ تک پہنچ جاتا ہے۔ میں نئی دہلی میں رہنے لگوں تو ان غریبوں کو وہاں تک پہنچنا دشوار ہو جائے گا۔ میں یہ گوارا نہیں کر سکتا۔ یہ حال تھا ان کے جذبہ خدمت اور کاموں کی دھن کا!

آخری بیماری:

زندگی کے آخری سال جنوری ۶۲ء میں جب کہ ان کی صحت کافی گر چکی تھی اور مرض اندر ہی اندر پل رہا تھا' سخت سردی کے دنوں میں' انتہائی نزلہ' کھانسی' بخار اور پلورسی کی حالت میں انہوں نے کان پور اور امروہہ میں جمعیۃ کی کانفرنسوں میں شرکت فرمائی۔ اور اسی حال میں اپنے حلقہء انتخاب کے دیہات وقصبات کا دورہ کیا اور اسی حالت میں پندرہ دن کے شبانہ روز سفر کے بعد ۲۲ر جنوری ۶۲ء کو شام کے آٹھ بجے مراد آباد سے دہلی واپس پہنچے۔ اگلے روز بمبئی میں سنٹرل حج کمیٹی کی میٹنگ تھی اور رات ہی کے ہوائی جہاز سے مولانا بمبئی جانے والے تھے۔ ۱۰.۳۰ بجے مولانا کو ہوائی اڈے پہنچنا تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے مولانا گھر پہنچے' عشا کی نماز پڑھی اور بمبئی کے لیے سامان سفر تیار کرایا۔ ادھر میں ملنے کے خیال سے پہنچ گیا۔ قاضی اکرام الحق صاحب بھی دروازہ پر موجود تھے۔ ۹ بجے مولانا باہر آئے تو یہ حالت تھی کہ ۱۰۲ ڈگری بخار تھا۔ کھانسی دم نہیں لینے دیتی تھی۔ پھیپھڑوں میں پانی بھرا ہوا تھا اور سانس بھی بہت تکلیف کے ساتھ چل رہا تھا۔ اپنی گرم چادر گلے میں لپیٹے ہوئے نہایت مضمحل اور نڈھال چہرہ پیلا اور ناتوانی سے بے حال۔ مگر اس حال بھی دن بھر کے سفر کے بعد اب رات بھر ہوائی جہاز کے سفر کے لیے آمادہ وعازم' یہ حال دیکھ کر میں نے اور قاضی اکرام صاحب نے باصرار گزارش کیا کہ اس وقت سفر کا ارادہ ملتوی کر دیجیے۔ مولانا نے سختی سے انکار کیا اور سامان کار پر رکھنے کے لیے شفیق کو بھیج ہی دیا۔ سامان کار پر جا رہا تھا اور ہم لوگ مولانا کو گھیرے کھڑے تھے۔ ادھر سے محمد احمد صاحب وکیل بھی آ گئے۔ حالت دیکھ کر حیران۔ انہوں نے بھی سفر ملتوی کرنے پر بہت زور دیا۔ سامان کار پر رکھا جا چکا تھا۔ مولانا فرما رہے تھے۔

''حجاج کے بعض اہم معاملات درپیش ہیں۔ ضروری میٹنگ ہے۔ وہاں سب کو انتظار ہوگا۔ بمبئی سے واپس آ کر دو چار روز آرام کر لوں گا اس وقت تو مجھے جانا

ہی ہے۔"

لیکن جب ہمارے اصرار نے انہیں بالکل مجبور ہی کر دیا تو بادل ناخواستہ سفر کا ارادہ ملتوی کیا اور گھر واپس ہوئے۔ اگلے روز ہم سب مولانا کو ان کے معالج ڈاکٹر پانڈے کے پاس لے گئے اور مرض کی گہرائی کا اندازہ ہوا۔ اور اسی وقت سے' زندگی بھر کی تھکن اپنے ساتھ لے کر مولانا بستر علالت پر گرے اور اسی علالت میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان دن کے بعد دفتر جمعیۃ میں جو عمر بھر ان کی سرگرمیوں کا مرکز رہا مولانا کو آنا نصیب ہی نہ ہوا۔

خلوص وایثار:

مولانا کی اس مجاہدانہ زندگی کا اندازہ کیجئے اور پھر ساتھ ہی یہ دیکھئے کہ اس تمام بھاگ دوڑ' مسلسل خدمات وعمل' رات دن کی سرگرمیوں اور انتھک محنتوں سے مولانا نے خود اپنے لیے کیا حاصل کیا۔ ظاہر ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کے خطیب تھے' صاحب فکر وقلم تھے' بلند پایہ مصنف تھے۔ ملک گیر شہرت ومقبولیت کا اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ حکومت واقتدار کے دایروں میں اونچی اونچی شخصیتوں سے ان کے برابر کے تعلقات تھے۔ اگر کسی درجے میں بھی انہیں اپنا اور اپنی راحت ومنفعت کا خیال ہوتا تو وہ اپنے لیے کیا کچھ نہ حاصل کر سکتے تھے۔

لیکن انہوں نے اپنے لیے جو زندگی اختیار کی وہ غریبی اور بے سروسامانی کی زندگی تھی۔ زندگی بھر کرایہ کے مکان میں رہے۔ اپنے بیٹے اور بیٹیوں کا مستقبل بنانے کے لیے بھی وہ اپنے وسائل کبھی کام میں نہ لا سکے۔ نہ ان کے لیے اپنے بعد کوئی اثاثہ چھوڑ کر گئے۔ اپنی بھرپور صلاحیتوں اور زندگی بھر کی محنتوں اور کاوشوں کا پورا سرمایہ انہوں نے صرف کیا تو صرف ملک و وطن کی خدمت اور قوم وملت کی خوش حالی اور سربلندی کے لیے' پارلیمنٹ کے ممبر ضرور ہے' مگر سچ یہ ہے کہ ان کی رکنیت پارلیمنٹ بھی سراسر دوسروں ہی کے کام آئی۔

قومی اور وطنی خدمت کی سعادتیں دوسروں کو بھی میسر آئی ہیں۔ مگر بے غرضی اور خلوص وایثار کا یہ مقام صرف مولانا ہی کو نصیب ہوا کہ وہ ملک کے گوشے گوشے تک پہنچے اور کوئی نہیں کہا جا سکتا جو عوام سے اتنا قریب رہا ہو لیکن اکثر رات دن کے جماعتی رفقاء کار کو بھی آج تک یہ معلوم نہیں کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی اولاد بھی ہے بحمد اللہ ان کا بیٹا بھی ہے اور بیٹیاں بھی۔ ان کے ہمہ گیر تعارف اور بے پناہ اثر ورسوخ کی فیض رسانیوں میں جس کا کوئی حصہ نہ تھا

وہ صرف ان کی اپنی ذات تھی اور اپنی اولاد' اپنے اسفار یا اپنی مجلسی اور جماعتی سرگرمیوں میں انہوں نے اپنے بیٹے تک کو ساتھ رکھنا اور متعارف کرانا کبھی گوارا نہیں کیا۔

کئی بار ذہن میں یہ سوال ابھرا کہ ایسے بلند پایہ اور صاحب بصیرت عالم اور ایسے اکابر کے صحبت یافتہ ہوتے ہوئے یہ کیوں نہیں ہوا کہ مولانا کم از کم بڑھاپے کی اس زندگی میں تو رات دن کی بھاگ دوڑ اور مشاغل کے ہجوم و ہنگامہ سے کنارہ کش ہو کر تسبیح و مصلیٰ سنبھال کر کسی گوشہ میں بیٹھ گئے ہوتے۔ آخر اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا وہ بھی ایک راستہ ہے۔ پھر زیادہ سوچا تو اس کی توجیہہ خود ہی ذہن میں آنے لگی کہ مولانا خلوص و ایثار اور جذبہ ٔخدمت' کی جن بلندیوں پر فائز تھے وہاں عزت نشینی کا ایسا تصور بھی عملاً دشوار ہی تھا کہ آخر ''فکر خویش'' کا جو داعیہ اس کا محرک ہوتا ہے۔ مولانا کے خلوص کا لبریز پیمانہ اس کی آمیزش بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔

استغناء و بے غرضی:

طبیعت کے استغناء کا یہ حال تھا کہ زندگی کے اس دور میں تو بڑے بڑے دولت مند و تاجر' نواب اور اصحاب اختیار ان کے احترام میں دو زانو رہتے تھے۔ اپنے ہاں دعوتوں پر بلاتے' بڑے بڑے قیمتی ہدیے پیش کرنا چاہتے۔ مگر مولانا کی بے نیازی اور بے رخی نے کبھی کسی کو موقع ہی نہ دیا۔ جمعیۃ علماء کی انہوں نے عمر بھر خدمات ہی نہیں کی بلکہ اس کی عزت اور عظمت و شہرت کو چار چاند لگا دئے۔ اٹھارہ برس اس کے سربراہ رہے اور اپنی بھرپور صلاحیتیں اس کی آبیاری پر صرف کیں۔ لیکن کبھی کسی قسم کا کوئی معاوضہ' کوئی الاؤنس' آنریریم یا کسی طرح کی کوئی منفعت اس سے حاصل نہیں کی۔ اپنی کتابوں کی آمدنی ہی ان کا کسب و معاش تھا۔

کانگریس کے حلقوں میں بھی ان کا جو مقام تھا وہ ظاہر ہے۔ کانگریس کے ٹکٹ پر انہوں نے تین بار پارلیمنٹ کے الیکشن لڑے (۵۲ء میں حلقہ بلاری اور ۵۷ء' ۶۳ء میں حلقہ ضلع مراد آباد سے) مگر پیش کش اور اصرار کے باوجود انہوں نے کبھی کانگریس کے انتخابی فنڈ سے کوئی امداد قبول کرنا گوارا نہیں کیا۔

ہمدردی خلایق:

مخلوق خدا کی ہمدردی ان کے رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ بلا استثناء و بلا امتیاز ہر کس و ناکس اپنے اور بیگانے' مسلم اور غیر مسلم سب کی خدمت ان کا عزیز ترین شغل تھا اور دن رات

کا بیشتر حصہ اسی میں گزرتا تھا۔ کوئی سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت کا خواہاں ہے، کوئی وظیفہ اور امداد کے لیے سرگرداں، کسی کو کالج کے داخلہ میں دشواری پیش آ رہی ہے تو کوئی امتحان میں دو چار نمبروں سے رہ گیا ہے۔ کوئی اپنے پرمٹ کی میعاد میں توسیع چاہتا ہے۔ کوئی اپنی مقدمہ بازی کے لیے وکیل سے فیس میں رعایت کے لیے کوشاں ہے۔ کسی کو مکان یا دکان کی ضرورت ہے تو کوئی بجلی اور پاور کا کنکشن لینا چاہتا ہے۔ کسی کی فصل اور کھیتی خراب ہوگئی ہے اور پورا لگان دینے کے قابل نہیں ہے۔ تو کسی کی بیٹی جوان بیٹھی ہوئی ہے اور کوئی مناسب رشتہ نہیں آ رہا ہے۔ غرضیکہ صبح سے شام تک انسانی زندگی کے صدہا کام تھے جن کے لیے لوگ بے تکلف مولانا ہی کی مدد، مشورہ اور سفارش کا سہارا لیتے تھے اور مولانا مرحوم ہر ضرورت مند کے لیے وہ سب کچھ کرتے جو ان کے امکان میں ہوتا۔ کسی سرکاری افسر کو ٹیلی فون کر رہے ہیں، کسی کو سفارشی خط لکھ کر دے رہے ہیں، کسی کو اپنے ساتھ لے جا کر اس کا کام کرا رہے ہیں اور کسی کے لیے واسطہ در واسطہ سفارشیں کرا رہے ہیں۔ خاص طور پر تقسیم ہند کے بعد تو سرکاری حلقوں میں ان کی قدر و منزلت اور ایک عوامی رہنما ہونے کے لحاظ سے یا پارلیمنٹ کے رکن کی حیثیت سے ان کے اثر و رسوخ پر لوگوں نے گویا جھولنا شروع کر دیا تھا۔ مولانا کی طبعی شرافت اور ہمدردیوں کا دامن بھی اس قدر وسیع تھا کہ جس نے بھی ان کے سائے میں سر چھپانا چاہا انہیں نہ راستہ چلتے کسی ضرورت مند کی مدد سے گریز تھا نہ آدھی رات گئے کسی کے آنے پر کوئی ناگواری بعض اوقات تو بڑی بڑی اونچی شخصیتیں بھی اپنے کاموں کے لیے ان ہی کی مدد اور سفارش ڈھونڈتی تھیں۔ آج کون اندازہ کر سکتا ہے کہ کتنے ہزار خاندان ہیں جن کی معاش اور پرورش میں بڑا دخل مولانا ہی کی کوششوں کو تھا اور کتنے گھر ہیں جن میں آج چراغ بھی جل رہا ہے تو اس کی بتی مولانا ہی کے ہاتھوں نے بٹی ہے۔

وسعت قلبی اور عالی ظرفی:

ان کے پائے کے انسان ہزاروں نہیں، لاکھوں میں بھی شاید دو چار ہی اتنے وسیع القلب اور اعلیٰ ظرف مل سکیں۔ یوں تو ہر وقت ہی ان کی وسعت قلبی کے مشاہدات آنکھوں سے گزرتے رہتے تھے اور ہم خدام کار کے ساتھ تو ان کے سلوک مہر و شفقت کا تو ذکر ہی کیا کہ ان کے جیتے جی افسر و ماتحت کا کوئی امتیاز کبھی درمیان میں حائل ہی نہیں ہوا۔ لیکن اس کا خاص منظر

اس وقت سامنے آتا تھا جب وہی لوگ جنہوں نے مولانا کی دلآزاری اور بے وجہ مخالفت و ایذا رسانی میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔ ہر طرح سے مجبور ہو کر اپنی کسی ضرورت کے لیے ندامت اور شرمساری کے ساتھ ان تک پہنچتے اور مولانا اپنی شفقت اور محبت سے اس طرح ان پر چھا جاتے اور ان کی مدد کرتے کہ ان کی ندامت اور شرمساری کا بوجھ بھی سر سے اتر جاتا۔ انتقام اور عداوت کے تو گویا نام سے بھی وہ ناآشنا تھے۔ ان کی زندگی کے دیکھنے والے اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ عمر عزیز کے کسی ایک لمحے میں بھی مولانا کی زبان سے اپنے سخت سے سخت مخالفین بلکہ معاندین کے لیے بھی کلمۂ خیر کے سوا کوئی دوسرا حرف نہیں نکلا۔ ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے نظریے کی انہوں نے ہمیشہ کھلم کھلا مخالفت کی اور اصولی طور پر مولانا کبھی بھی اس کو تسلیم نہ کر سکے۔ لیکن پاکستان بن گیا تو اس کے بعد جب بھی کسی نے ذکر کیا تو پوری جرأت قلب و نظر کے ساتھ انہوں نے یہ ہی کہا کہ اب جب کہ وہ ایک ملک بن چکا ہے۔ ہماری آرزو یہی ہے کہ وہ خوش حال ہو اور اسے استحکام نصیب ہو۔ یہ ان کے قلب کی وسعت ہی تھی کہ ٹھیٹھ کانگریسی ہونے اور عقیدتاً دیوبندی مکتب فکر سے پختہ وابستگی کے باوجود انہوں نے اپنی نفع رسانی اور خدمت گذاریوں میں کبھی کوئی امتیاز روا نہیں رکھا۔ بلکہ بعض بعض مواقع پر بتقاضائے حالات وہ خدمات بھی خود انجام دیں جن سے وہ کوئی نظریاتی لگاؤ نہیں رکھتے تھے۔ مثلاً ۴۷ء میں دہلی کی تباہی کے بعد محرم کے تعزیوں اور بزرگان دین کے مزارات پر عرسوں کا سوال آیا تو مولانا نے خود اس کا اہتمام کیا۔ کہیں کہیں خود شریک بھی ہوئے۔ قوالیاں بھی کرائیں اور عرسوں کی مروجہ رسوم سب ہی پوری کرائیں۔ یہ کہہ کر کہ اگرچہ ہم تعزیوں اور عرسوں کے اس رواج کے خلاف ہیں' تاہم یہ بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ ملکی حالات کے دباؤ سے مجبور ہو کر مسلمان بادل ناخواستہ ان منکرات کو جنہیں وہ اسلام سمجھتے ہیں' چھوڑیں۔

اپنے عقیدے اور مسلک پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے جہاں تک خدمت و عمل کا تعلق ہے۔ ان کی دردمندیوں کے سایہ میں دارالعلوم دیوبند اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ایک ہی درجہ تھا۔ جدید و قدیم' مقلد اور غیر مقلد' شیعہ اور سنی' خوجے اور بوہرے' مسلم لیگی اور کانگریسی۔ بلکہ مسلم اور غیر مسلم ہر انسان کی خدمت وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ عقیدے اور مسلک کا اختلاف ان کو کسی کی خدمت سے باز نہیں رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام حلقوں میں یکساں طور پر ان کو احترام اور اعتماد کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور کسی بھی گروہ نے ان کو اپنے لیے غیر اور اجنبی محسوس

نہیں کیا۔

رواداری اور اعتماد:

ان کی شرافت نفس کا قدرتی نتیجہ یہ بھی تھا کہ دوسروں کیساتھ بے انتہا رواداری، احترام اور اعتماد کا معاملہ کرتے تھے، ہمیشہ ہر معاملے میں دوسروں کا احترام ملحوظ رکھتے اور ہر موقع پر دوسروں کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔ اپنے ساتھیوں اور کارکنوں پر حد درجہ اعتماد کرتے۔ کسی سے شکایت کا موقع بھی ملتا تو وقتی ناگواری کا اظہار ضرور کرتے۔ مگر دلی تعلق میں کبھی بال برابر فرق نہ آنے دیتے۔

جرأت حق اور مقام عزیمت:

مولانا مرحوم کے افکار و کردار کا سب سے اہم اور جوہری وصف ان کی جرأت حق اور استقامت و عزیمت تھی۔ ان کی پوری زندگی اس وصف و کمال کا ایک مسلسل اور شان دار مظاہرہ رہی ہے۔ اہم اور نازک معاملات میں بھی جب وہ اپنی کوئی رائے قائم کرتے، تو کسی خوف، کسی اندیشے اور کسی لالچ کی پرچھائیں بھی اس پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ ہر معاملے کو کھلے دل سے اپنے اور اپنے خدا کے درمیان سوچنا اور فیصلہ کرنا اور فیصلہ کر لینے کے بعد اس پر پختگی کے ساتھ جم جانا ان کا خاص وصف اور یہی ان کا صحیح موقف تھا۔ ان کی زندگی میں بارہا ایسے موقعے بھی آئے جہاں ان کی جرأت و حوصلہ اور ثبات فکر و نظر کے لیے بڑی آزمائشیں درپیش تھیں۔ مگر ان کے کردار میں کوئی تزلزل راہ نہ پاسکا۔ چند برس پہلے ہی ایک صاحب نے گاندھی جی کی پرارتھنا پر شرعی نقطہ نظر سے فتویٰ چاہا۔ اگرچہ عام طور پر فتویٰ لکھنے سے مولانا ہمیشہ بچتے تھے اور دوسرے علماء کرام پر محول کر دیتے تھے۔ لیکن جب یہ خاص سوال سامنے آیا تو مولانا نے پوری اہمت کے ساتھ فوراً اس کا جواب خود لکھا اور بہت صاف لفظوں میں مسلمانوں کے لیے یہ پرارتھنا شرعاً ناجائز قرار دی۔ یہ سوال حقیقتاً ایسا تھا کہ مولانا تو خیر پکے کانگریسی اور گاندھی جی کو لیڈر ماننے والوں میں سے تھے۔ اگر کسی غیر کانگریسی عالم کے سامنے بھی رکھا جاتا تو ملک کے حالات اور گرد و پیش میں بہت مشکل ہوتا کہ اس صفائی اور جرأت کے ساتھ اس پر نکیر کا فیصلہ دے دیتا۔

۵۱ء کا واقعہ مجھے یاد ہے۔ مولانا جنوبی ہند کے سفر میں تھے۔ ایک ایسے مقام پر جہاں

خالص مسلمانوں کا (اور وہ بھی مسلم لیگی) اجتماع تھا۔ کسی نے کشمیر کے متعلق سوال کیا۔ ایک منٹ کے تامل کے بغیر مولانا نے اپنی صاف اور قطعی رائے ظاہر کر دی اور فرمایا کہ ہماری خواہش تو یہی ہے کہ کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ الحاق ہوتا کہ ہندوستان کی حدود میں کم از کم ایک ریاست خالص مسلم اکثریت کی نظر آ سکے اور اس سے ہندوستانی مسلمانوں کا وزن بڑھ سکے۔

اب آخری دنوں مسلم کنونشن کا معاملہ بھی مولانا کی جراُت فکر و عمل کی ایک مثال بن گیا۔ کیونکہ وزیر اعظم ہند پنڈت نہرو تک شروع میں اس کے خلاف تھے۔ لیکن مولانا کے لیے یہ بھی کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی۔ کسی نے پوچھا کہ پنڈت جی کی قطعی مخالفت کے بعد بھی کیا آپ کنوینشن ضرور بلائیں گے۔ مولانا نے پوری مضبوطی کے ساتھ جواب دیا کہ ہم نے جو فیصلہ کیا ہے وہ خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ پنڈت جی کی رائے بھی اس کے خلاف ہے تو ہو' ہم ان کی مخالفت کے ڈر سے کنوینشن کا خیال ترک کر دیں' یہ ممکن نہیں۔

مقام علم و فضل:

سیاسی اور جماعتی ذمہ داریاں مولانا کے وقت عزیز پر اس طرح چھا گئی تھیں کہ عوام کے سامنے زیادہ تر ان کی سیاسی زندگی رہی۔ لیکن حقیقتاً اپنی دینی بصیرت اور علم و فضل کی گہرائی میں بھی ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ جس کا اندازہ ان کی فاضلانہ اور محققانہ تصانیف سے ہوتا ہے خاص طور پر ''قصص القرآن'' اور ''اسلام کا اقتصادی نظام'' جو اپنے موضوع پر اردو میں پہلی کتابیں ہیں۔ مولانا کی علمی عظمتوں کے روشن نقوش ہیں۔

اپنی گفتگوؤں میں جب کبھی کسی دینی اور خالص علمی مسئلے پر ان سے بحث و تمحیص کا موقع ملتا تھا خواہ مسئلہ فقہی ہو یا تفسیر و حدیث کا کوئی عنوان' مولانا کے فاضلانہ تبصرے سامعین پر ان کی وسعت نظر اور ذہانت و ذکاوت کا سکہ جما دیتے تھے۔

انداز فکر:

قلب و نظر کے وہی ممتاز اوصاف جن کا اوپر تذکرہ ہوا۔ مولانا کے افکار و رجحانات کے بنیادی عوامل تھے ان کے انداز فکر میں جراُت حق' خلوص نیت' وسعت قلبی اور استقامت و عزیمت کے جوہر صاف جھلکتے تھے۔ زندگی اور اس کے تقاضوں کو مثبت اور ایجابی نقطہ منظر سے دیکھنا۔ ہر حال میں ناامیدی اور مایوسی سے گریز' حوصلہ مندی اور تحمل و برداشت کے ساتھ وقت

کی نزاکتوں سے گزر جانا' صحت مند شعور اور خود داری کے احساس کے ساتھ اپنے دین اور دنیا کی خدمت گذاری' اپنے وطن کی بے لوث محبت اور عام انسانی ہمدردی' یہی مولانا کے بنیادی افکار تھے اور عمر بھر اپنی تقریروں' تحریروں اور قول وعمل سے یہی پیغام انہوں نے دیا۔

حب وطن:

وطن کی محبت مولانا مرحوم کے لیے جزوایمان تھی۔ انہوں نے ایک طرف خود وطن عزیز کی آزادی اور آزادی کے بعد اس کی تعمیر وترقی سربلندی وخوش حالی' عزت ونیک نامی کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا کر وہ سب کچھ کیا جو ایک سچے وطن پرور کا کردار ہو سکتا ہے اور دوسری طرف اپنے برادران ملت کو ہمیشہ یہی نصیحت کی کہ وہ وطن عزیز کی خدمت میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ اپنی تقریروں میں برملا فرمایا کرتے تھے کہ وطن کی محبت کا نعرہ ہم کسی کی خوشامد یا نمود ونمائش کے لیے نہیں بلند کرتے۔ بلکہ یہ ہمارا دین وایمان ہے۔ ہمیں یہ سبق اسوۂ رسول کریمؐ سے حاصل ہوا ہے۔ ہندوستان ہمارا وطن ہے ہمارا اس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس کی خوش حالی ہماری خوش حالی اور اس کی بربادی اپنی بربادی ہے۔ سرزمین ہند پر ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کسی دوسرے ہندوستانی کا' ہم یہاں اجنبی یا تماشائی نہیں ہیں۔ اس دیس کو بنانے میں دوسروں کے ساتھ ساتھ ہم نے بھی اپنی جان کھپائی ہے۔ کسی کے دکھاوے اور خوشنودی کے لیے نہیں۔ بلکہ اپنا فرض سمجھ کر ہم اپنے اس فریضہ وطن اور اس کے تقاضوں سے کبھی غفلت کے روادار نہیں ہو سکتے۔

(۳)

حیات مستعار کے مختلف دور

مختصر تذکرہ اور سوانح نگاری کے لحاظ سے دیکھا جائے تو حضرت مولاناؒ کی زندگی مشاغل ومہمات کے تین دوروں میں پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔

زندگی کا پہلا دور:

جو زیادہ تر مدرسہ فیض عام سیوہارہ' کچھ جامعہ قاسمیہ مراد آباد اور پھر دارالعلوم دیوبند میں گزرا' دارالعلوم کے قیام میں مولانا مرحوم کو خاتم المحدثین حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے شرف تقرب وتلمذ حاصل ہوا۔ یہ تعلق ان کی عظیم شخصیت کے بنانے والے عوامل میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دور کے خاص رفقاء حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی۔ حضرت مولانا محمد بدر عالم میرٹھی (مقیم حال مدینہ منورہ) اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی ہیں۔

فراغت کے بعد کچھ عرصہ دارالعلوم ہی میں تدریس کا شغل رہا۔ پھر مدراس سے ایک فرمائش پر حضرت علامہ انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مجاہد ملت کو مدراس بھیج دیا۔ وہاں پیرامیٹ میں کم وبیش سال بھر درس وتبلیغ کی خدمت انجام دی۔ یہیں سے حضرت مولانا کی فکری اور قلمی کاوشوں نے انگڑائیاں لینی شروع کیں۔ چنانچہ جنوبی ہند کے اس قیام میں دو مختصر رسالے ''حفظ الرحمٰن لمذہب النعمان'' اور 'مالا بار میں اسلام'' تالیف کیے (یہ رسالے اب نایاب ہیں) مولانا مرحوم ذکر کیا کرتے تھے کہ مدراس کے قیام مین جو مشاہرہ مجھے حاصل ہوتا تھا۔ اسی کو جمع کر کے میں نے ۲۴ء میں حجاز مقدس کا سفر کیا اور حج وزیارت سے بہرہ مند ہوا۔ حج سے واپس آ کر جلد ہی اپنے استاذ محترم حضرت شاہ صاحب کے ہمراہ ڈابھیل ضلع سورت چلے گئے۔ جہاں بڑے پیمانے پر جامعہ ڈابھیل کی تشکیل عمل میں آئی۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے ساتھ ساتھ تقریباً تین برس (۲۸ء

تا ۳۰ء) حضرت مجاہد ملتؒ نے بھی وہاں درس و تدریس کی خدمت انجام دی۔ سیرۃ رسول کریمؐ جو ذوق و مطالعہ اور بیان و تقریر میں زندگی بھر مولانا موصوف کا خاص سبجیکٹ (موضوع) رہا ہے۔ ڈابھیل کے قیام میں اسی عنوان پر مولانا نے ایک مختصر مگر جامع اور سلیس کتاب مرتب کی جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ڈابھیل اور مدراس کے قیام میں ہر آٹھویں' دسویں روز اپنے مستقر کے آس پاس دیہات و قصبات میں وعظ و تقریر کا سلسلہ بھی رہتا تھا۔ گویا خطابت و تقریر کی خداداد صلاحیت ان فرصتوں میں اپنا نکھار حاصل کر رہی تھی۔ کم و بیش تیس سال کے اس عرصے میں عمر کے ساتھ ساتھ مولانا مرحوم کے فطری اوصاف کمال بھی تربیت پا کر تکمیل و شباب کی منزل میں قدم رکھ چکے تھے۔ اب وہ ایک مستقل شخصیت' ایک بلند پایہ اور صاحب بصیرت عالم دین' ایک فطری خطیب و مقرر اور صاحب فکر مصنف بن کر افق پر نمودار ہو رہے تھے۔ قدرت کا ہاتھ آہستہ آہستہ ان کو اس منصب بلند کی طرف لے جا رہا تھا جو ان کی زندگی کا منشائے تخلیق تھا۔

کانگریس کی وطنی تحریک میں سرگرمیوں کا آغاز:

مولانا مرحوم کی قومی اور جماعتی سرگرمیوں کا آغاز یوں تو ۱۹۱۹ء ہی سے ہو گیا تھا جب کہ ملک میں تحریک خلافت کا غلغلہ تھا اور آزادی ہند کی تحریک بھی وسیع پیمانے پر ملک بھر میں منظم ہو رہی تھی۔ جمعیۃ علماء ہند کی تاسیس بھی ان ہی دنوں عمل میں آئی۔ مولانا مرحوم کی جماعتی جدوجہد اسی زمانے سے شروع ہوئی۔ اور اسی سلسلہ میں وہ سب سے پہلی بار ۲۲ء میں گرفتار بھی ہوئے تھے لیکن کانگریس کے پلیٹ فارم سے مولانا مرحوم کی سرگرمیوں کا سلسلہ زیادہ تر ڈابھیل کے قیام ہی سے شروع ہوا۔ حضرت مفتی صاحب سے معلوم ہوا کہ ان ہی دنوں جب گاندھی جی نے ڈانڈی مارچ کی تحریک شروع کی اور نمک پر محصول کے بائیکاٹ کا پروگرام پیش کیا۔ ان دنوں گاندھی جی کا قیام دھراشٹہ میں تھا۔ مولانا مرحوم اور حضرت مفتی صاحب ڈابھیل سے چل کر دھراشٹہ پہنچے اور گاندھی جی سے ملے اور تحریک میں اپنی پوری خدمات پیش کیں۔ گاندھی جی ان حضرات کے جذبات اور تعاون کی پیش کش سے بہت متاثر ہوئے۔ ساتھ ہی کہا کہ میں نے سنا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ کی کوئی ایسی حدیث ہے کہ نمک' پانی اور گھاس رفاہ عام کی چیزیں ہیں' اس لیے اسلام میں بھی ان کو سرکاری محصول سے مستثنٰی رکھا گیا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے۔

مولانا مرحوم نے حضرت مفتی صاحب نے اس کی تصویب کی۔ اور ساتھ ہی حضور سرور کائناتؐ کی حدیث مبارک بمعہ اردو ترجمہ لکھ کر گاندھی جی کو دی۔ جس کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ ان ہی دنوں باردولی میں سردار پٹیل نے کانگریس کے کارکنوں کا ایک بڑا اجتماع کیا تھا۔ جہاں یہ طے کیا گیا کہ عدم ادائیگی ٹیکس کی بنا پر پبلک کی جو جائدادیں برٹش حکومت ضبط کر کے سستے داموں نیلام کر رہی ہے عوام کو ان کی خرید سے باز رکھنے اور نیلام کے بائی کاٹ کی ترغیب کی جائے۔ اسی موقع پر حضرت مفتی صاحب (مولانا عتیق الرحمٰن صاحب) نے اسلامی نقطہ نظر سے مشہور فتوی صادر کیا تھا۔ جس میں ضبط شدہ جائدادوں کو نیلام میں خریدنے کی شرعی ممانعت کا حکم تھا۔ کیوں کہ برٹش حکومت کی طرف سے جائیدادوں کی ضبطی ایک صریح ظلم تھا۔ اور ایسی ضبط شدہ جائدادوں کو خریدنا شرعاً ظلم وعدوان کی تائید اور تقویت کے حکم میں آتا تھا۔ مفتی صاحب کا یہ فتویٰ سورت کے مشہور مسلم گجرات پریس میں چھپا اور اس کی پاداش میں فتویٰ کے ساتھ ساتھ پریس بھی ضبط کر لیا گیا تھا۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب پہلے ہی گرفتار ہو چکے تھے۔ مفتی صاحب کی گرفتاری کے احکام لے کر سپرنٹنڈنٹ پولیس مفتی صاحب کے پاس پہنچا۔ لیکن اس سے چند گھنٹے پہلے گاندھی اردن پیکٹ ہو چکا تھا۔ اس لیے تمام وارنٹ واپس لے لیے گئے۔

بہر حال ان دونوں بزرگوں کی سیاسی سرگرمیوں سے اس وقت جامعہ ڈابھیل کے منتظمین کو بڑی پریشانی لاحق ہوگئی تھی۔ ان حضرات نے بھی اس کو محسوس کیا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب تو جیل ہی میں تھے۔ مفتی صاحب بھی چند ماہ کے بعد مستعفی ہو کر وطن واپس آ گئے۔ اس طرح ڈابھیل کا تعلق منقطع ہو گیا اور رہائی کے بعد مولانا بھی واپس ڈابھیل نہ گئے۔

دوسرا دور:

۳۰ء میں جیل سے رہائی کے بعد حضرت مولانا نے امروہہ پہنچ کر جمعیۃ علماء ہند کے اس معرکۃ الآرا اجلاس میں شرکت کی جہاں سے جمعیۃ کے حلقوں میں ان کے قائدانہ دور کا آغاز ہوا۔ اس اجلاس میں حضرت مفتی اعظم، مولانا مفتی محمد کفایت اللہؒ، حضرت شیخ مدنیؒ، حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ جیسے اکابر ملت شریک تھے اور جنگ آزادی وطن میں جمعیۃ کے موقف کی تعیین کا اہم سوال درپیش تھا۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی (جو اس وقت ملک کے مشہور

لیڈر تھے) ان کی رائے کے خلاف مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے پوری قوت اور جوش کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر پیش کیا کہ جمعیۃ کو آزادی وطن کی راہ میں کھلے بندوں انڈین نیشنل کانگریس کا ساتھ دینا چاہیے اور بلا شرط تعاون کرنا چاہیے۔ مولانا مرحوم کی اس تحریک، زور بیان اور قوت استدلال نے علماء وافاضل کے اس مجمع کو بے حد متاثر کیا اور اس کی تائید میں بطل حریت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ولولہ انگیز تقریر کے بعد آخر کار یہی اجلاس کا فیصلہ قرار پایا۔

۳۳ء کے شروع میں انجمن تبلیغ الاسلام کی دعوت پر (جس کے سرپرست حضرت مولانا آزادؒ تھے) مجاہد ملتؒ کلکتہ تشریف لے گئے۔ ڈھائی سال وہاں قیام رہا درس قرآن حکیم خاص شغل تھا۔ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب پہلے ہی کلکتہ پہنچ چکے تھے۔ یہاں روزانہ صبح کو دفتر تبلیغ سراج بلڈنگ میں اور عشاء کے بعد مسجد جمال الدین میں درس قرآن حکیم کا سلسلہ جاری رہا۔ کلکتہ کی وسیع آبادیوں میں ان دونوں بزرگوں کی تقریروں نے بہت ہی جلد اپنا سکہ جما دیا۔ نئے اور دل نشین انداز میں قرآن حکیم کے مطالب و معارف کے بیان میں جو امتیاز ان کو حاصل تھا اس کی شہرت دور دور تک پھیلی اور آج تک وہاں کے لوگ ذکر و بیان کی ان مجلسوں کو یاد کرتے ہیں۔

اسی دوران میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو مولانا آزاد مرحوم سے بہت قریب رہنے کا موقع ملا اور ان کی رفاقت نے مولانا کے سیاسی ذوق ولگن کو اور بھی دو آتشہ کر دیا۔ آنجہانی شری سبھاش چندر بوس نے کلکتہ سے ان ہی دنوں کانگریس کے حلقوں میں ماس کنٹریکٹ کی تحریک چلائی۔ مجاہد ملتؒ اور مفتی صاحب نے بھی اس میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔

خرابی صحت کے باعث کلکتہ سے واپسی کے بعد مجاہد ملتؒ کچھ عرصہ امروہہ میں مقیم رہے اور وہاں کے دو عربی مدارس کے اہتمام و نگرانی کی خدمت انجام دیتے رہے اس کے بعد ۳۸ء میں حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے ساتھ ندوۃ المصنفین دہلی کی بنیاد ڈالی اور اس کی ساخت و پرداخت میں مشغول ہو گئے۔ بحمد اللہ اس ادارہ کی معیاری علمی خدمات آج پورے ملک کے سامنے آ چکی ہیں اور اس کا شمار ہندوستان کے نامور علمی اداروں میں ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ ۳۰ء سے ۴۶ء تک حضرت مولانا کی مصروف زندگی کا یہ دوسرا دور کہا جا سکتا ہے جو زیادہ تر سیاسی ہنگاموں، آزادی وطن کی خاطر مسلسل جدوجہد، سفروں اور جلسوں میں، کچھ قید و بند میں اور ذاتی مشغلوں کے لحاظ سے تصنیف و تالیف میں گزرا، مولانا مرحوم کی جلیل القدر علمی تالیفات

قصص القرآن' اسلام کا اقتصادی نظام وغیرہ اسی دور کی قیمتی یادگاریں ہیں۔ تالیفات کا بیشتر حصہ سفروں میں مدون ہوا یا جیلوں میں۔

زندگی کے اس دوسرے دور سے گزرتے ہوئے مولانا مرحوم کی شخصیت ایک طرف جہاں تنہا اپنی شعلہ بار تقریروں اور سحر آفریں خطابت کے ذریعے اپنی فاضلانہ اور محققانہ تالیفات کے ذریعے اور دوسری طرف چوتھائی صدی سے مسلسل اپنی سیاسی سرگرمیوں اور تحریک آزادی کے ایک نہایت موثر و فعال کیریکٹر کی حیثیت سے ملک بھر میں شہرت و تعارف کی بلندیوں پر پہنچ چکی تھی اور ان کا شمار صف اول کے ارباب فکر و بصیرت اور سیاسی رہنماؤں میں ہونے لگا۔

تحریک آزادی میں قائدانہ رول:

علم و فضل کے اعلیٰ محاسن' فاضلانہ تصنیف و تالیف اور خطابت و تقریر کی ممتاز صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کے خمیر میں سیاست و تدبیر کا ذوق' حریت پسندی کے جذبات اور خدمت ملک و ملت کی بے مثال لگن بھی گوندھی ہوئی تھی۔ یہی اوصاف کمال ان کی شخصیت کے جوہری عناصر تھے۔ جن کی آب و تاب ان کی زندگی کے ہر دور میں نمایاں رہی ہے۔ خدمت ملک و ملت نوعمری ہی سے ان کا محبوب مشغلہ رہا۔ نوجوان ہی تھے کہ وطنی سیاست اور تحریک آزادی میں انہوں نے نہایت بے باکی اور اولوالعزمی کے ساتھ حصہ لینا شروع کیا جس وقت وہ دارالعلوم دیوبند میں تھے' ملک کی فضائیں خلافت اور انقلاب انقلاب کی صداؤں سے گونج رہی تھیں۔ مولانا مرحوم اسی وقت سے ایک سرگرم سیاسی کارکن بن گئے اور قوم پرور تحریکوں میں گرم جوشی کے ساتھ حصہ لینے لگے۔ سیاست سے وابستگی اور تحریک آزادی وطن میں شرکت ان کے لیے گویا ایمان و عقیدہ کا درجہ رکھتی تھی۔ اسی لیے کوئی خوف' کوئی فکر' کوئی لالچ اور کوئی بھی طاقت زندگی کے آخری سانس تک ان کے سیاسی مشاغل اور سرگرمیوں میں حائل نہ ہو سکی۔ بلکہ اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ اپنے اسی عشق و لگن کے ہاتھوں انہوں نے نوعمری' جوانی اور بڑھاپے کے ہر عیش و راحت اور مفاد و منفعت کو بے دریغ قربان کیا۔ سعی و عمل کی اس دشوار گزار اور صبر آزما زندگی کو اپنا کر انہوں نے عمر بھر اپنے ضمیر کے اطمینان کے سوا کوئی انعام حاصل نہیں کیا۔ درس قرآن حکیم اور تصنیف و تالیف (جس کی اعلیٰ صلاحیتوں سے

وہ بہرہ مند تھے) ان کا پسندیدہ شغل تھا‘ لیکن سیاسی سرگرمیوں کی بدولت اس کا ربط بھی قائم نہ رہ سکا۔ بڑی حسرت کے ساتھ فرمایا کرتے تھے:

> ’’کاش میرے حالات مجھے اس کا موقع دیں کہ اپنے اصل کام (وہی درس قرآن حکیم اور تصنیف و تالیف) کی طرف لوٹ سکوں۔ افسوس کہ ہنگامی مصروفیتوں نے میرا تمام وقت مجھ سے چھین لیا ہے۔‘‘

سیاست کی تیزی رفتاری اور ہنگامی تقاضے کچھ اس طرح ان کے دامن سے لپٹ چکے تھے کہ کبھی جم کر اپنے اس محبوب مشغلے سے وابستہ نہ ہو سکے۔ بار بار گرفتاری اور نظر بندی کے مواقع پیش آتے رہے۔ کبھی سال بھر کبھی دو سال‘ جیلوں میں گزارے۔ مجموعی طور پر لگ بھگ پانچ سال وہ تحریک آزادی میں نظر بند رہے۔ سب سے آخری بار ’’کوئٹ انڈیا‘‘ (ہندوستان چھوڑ دو) کی مشہور تحریک ۴۲ء میں گرفتار ہوئے۔ تقریباً دو سال نظر بند رہ کر ۱۴ر جولائی ۴۴ء کو بریلی سنٹرل جیل سے رہا ہوئے اور ۱۸ر جولائی کو دہلی پہنچ کر پھر اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ بار بار کی گرفتاری اور نظر بندی محض سیاسی سرگرمیوں اور تحریک آزادی وطن میں جرأت مندانہ شرکت کی پاداش تھی‘ جس نے مولانا مرحوم و مغفور کی صحت پر بھی بہت برا اثر کیا۔ دردسر کا مرض مراد آباد جیل ہی سے ان کے حصہ میں آیا تھا۔ اپنے گھربار‘ متعلقین یہاں تک کہ اولاد کی ساخت پرداخت اور دیکھ بھال کے لیے بھی بہت ہی کم ان کو مہلت مل سکی۔ عام انسانی زندگی کے لیے یہ آزمائشیں کچھ آسان نہیں ہیں۔ لیکن مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے بطیب خاطر ایثار و ابتلا کی اس زندگی کو اپنایا اور اس کے ہر تقاضے کو حوصلہ مندی کے ساتھ پورا کیا۔ شروع ہی سے وہ انڈین نیشنل کانگریس کے سرگرم رکن اور اس کی تمام انقلابی تحریکوں میں پیش پیش رہے‘ کچھ عرصہ یوپی کانگریس کی ایگزیکٹیو میں شریک رہے۔ ۴۹ء میں مسٹر رضوان اللہ کی خالی کردہ نشست پر دستور ساز اسمبلی کے ممبر اور ۱۴ر جنوری ۵۰ء کو بلا مقابلہ ہند پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔

آزادی وطن کے بعد کانگریس ٹکٹ پر ہی جنوری ۵۲ء میں حلقہ بلاری ضلع مراد آباد سے اور پھر ۵۷ء میں اور ۶۲ء میں حلقہ امروہہ سے ہند پارلیمنٹ کے الیکشن لڑے اور ہر مرتبہ معاندین کی انتہائی زور آزمائیوں کے باوجود اپنے حلقے سے مسلم و غیر مسلم ووٹروں کے بھرپور اعتماد اور کثیر تعداد ووٹوں کے ساتھ کامیاب ہوئے سب سے آخری الیکشن (فروری ۶۲ء) کے

موقع پر وہ اپنی علالت کے باعث حلقہ انتخاب میں خود نہ جاسکے۔ پھر بھی الیکشن کے نتیجے میں سخت مقابلے کے باوجود انہیں شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔

جمعیۃ علماء ہند سے تعلق

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی و عملی سرگرمیوں کا دوسرا محور وہ جماعتی زندگی تھی جس کی قیادت و زعامت حاملین امانت دین اور مصلحین امت علمائے حق کے سپرد تھی اور جو ''جمعیۃ علماء ہند'' کے نام سے عوام و خواص میں متعارف ہے۔ مولانا مرحوم یوں تو ابتداء ہی سے جمعیۃ علماء کے رفیق کار رہے۔ لیکن ڈابھیل سے واپسی کے بعد سے وہ جمعیۃ علماء کے ساتھ بہت زیادہ مربوط ہو گئے تھے۔

۳۰ء میں جمعیۃ علماء کے اجلاس امروہہ میں مولانا مرحوم نے اہم ترین کردار پیش کیا اور آپ ہی کی تجویز اس اجلاس کا ماحصل تھی۔ جمعیۃ کی تاریخ میں اجلاس میں امروہہ کا یہ فیصلہ ایک انقلابی فیصلہ تھا جس نے جمعیۃ علماء کو انڈین نیشنل کانگریس کے شانہ بشانہ اپنی جماعتی قوتوں کے ساتھ براہ راست تحریک آزادی سے مربوط کر دیا۔ آنے والے برسوں میں جمعیۃ علماء ہند نے حریت وطن کے ہر محاذ پر جس جرأت و استقامت کے ساتھ اپنا قیمتی کردار پیش کیا اس کی پشت پر اس انقلابی فیصلے کی قدریں ہمیشہ کارفرما ہیں۔

حضرت مجاہد ملتؒ اس کے بعد مسلسل جمعیۃ کی ورکنگ کمیٹی کے رکن رکین اور اس کی قیادت میں شریک کار رہے یہاں تک کہ ۴۲ء میں جمعیۃ کے تیرہویں سالانہ اجلاس (منعقدہ لاہور۔ ۲۰ تا ۲۲ مارچ۔ بصدارت حضرت شیخ مدنیؒ) میں جمعیۃ کی نظامت عامہ کا اہم ترین منصب آپ کے سپرد کر دیا گیا۔ اس اجلاس میں حضرت مولانا (آزاد بھی شریک تھے اور یہیں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو ''مجاہد ملت'' کا خطاب دیا گیا۔

اجلاس امروہہ (۳۰ء) سے اجلاس لاہور (۴۲ء) تک جمعیۃ علماء ہند کی عملی سرگرمیوں میں جہاد آزادی کا تسلسل اتنا غالب رہا کہ اس دور کی تاریخ میں جمعیۃ کی دوسری اصلاحی اور تعمیری خدمات زیادہ نمایاں نہ ہوسکیں۔ یوں بھی یہ عرصہ تحریک آزادی کے انتہائی شباب کا دور تھا۔ قوم پرور حلقوں اور کارکنوں کو اس عرصے میں بیرونی اقتدار سے مسلسل تصادم اور کش مکش کے باعث قدم قدم پر پکڑ دھکڑ قید و بند اور تعاقب و نگرانی کا سامنا رہا۔

مارچ ۴۲ء میں مجاہد ملتؒ نے جمعیۃ کی نظامت عامہ سنبھالی' لیکن چند ہی مہینوں کے بعد ''کوئٹ انڈیا'' تحریک پورے ملک میں برپا ہوگئی اور دوسرے قائدین حریت کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا بھی نظر بند کردیئے گئے۔

دوسال کے بعد جب ۱۴ر جولائی ۴۴ء کو آپ رہا ہوکر آئے تو ملک انقلاب آزادی کے دروازے پر کھڑا تھا اور دہلی اور لندن میں ہندوستان کے مستقبل کے خاکے تیار ہورہے تھے۔ سب سے اہم کام اس فیصلہ کن مرحلہ پر ملک کے مستقبل سے متعلق جمعیۃ کے نقطہ نظر کی وضاحت اور اس کی پیروی تھی۔

مجاہد ملتؒ نے وقت کے اس اہم تقاضے کو محسوس کرتے ہوئے جمعیۃ مرکزیہ کا چودھواں سالانہ اجلاس مئی ۴۵ء میں بصدارت حضرت شیخ مدنیؒ منعقد کرایا۔ ستمبر ۴۵ء میں دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس بلائی اور اس کے متفقہ فیصلہ کے مطابق مسلم پارلیمنٹری بورڈ کی تشکیل عمل میں لائی گئی۔ پھر مئی ۱۹۴۷ء میں جمعیۃ مرکزیہ کا دوسرا اہم اجلاس لکھنو میں منعقد کرایا اور لندن سے آنے والے مختلف وفود کے سامنے بھی اور خود کانگریس کے ارباب حل وعقد پر بھی جمعیۃ علماء کے موقف کی پوری وضاحت فرمائی۔ خاص طور پر آزادی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی وحدت کو برقرار رکھنے پر پورا زور دیا اور آخر تک اس کے لیے کوشاں رہے یہاں تک کہ ۹ر جون ۴۷ء کو جب کانسٹی ٹیوشن کلب نئی دہلی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی تقسیم ہند کے فارمولے پر اپنی منظوری صادر کرنے کے لیے جمع تھی۔ پنڈت پنتھ نے اس کی تحریک اجلاس میں پیش کی اور مولانا آزادؒ نے بھی تائید میں تقریر کرتے ہوئے بتقاضائے حالات تقسیم کو منظور کر لینے کا مشورہ دیا۔ اس وقت بھی مجاہد ملتؒ نے بھرے اجلاس میں تقسیم ہند کی پوری قوت کے ساتھ مخالفت کی اور فرمایا!

> ''حالات کے جس دباؤ اور جن الجھنوں کے باعث آج ہندوستان کی تقسیم کو منظور کر لینے کا مشورہ دیا جارہا ہے۔ میں اپنے لیڈروں کے پورے احترام کے ساتھ یہ کہوں گا کہ ہندوستان کی تقسیم کا نتیجہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہوگا اور آج اگر کانگریس کے اسٹیج پر تقسیم ہند کی اسکیم منظور کر لی گئی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم آج اپنی پوری تاریخ اور ہمیشہ کے اپنے یقین واعلان پر خود اپنے ہاتھ سے خط تنسیخ کھینچ کر اٹھیں گے اور دوقومی نظریے کے سامنے سرینڈر ہو جائیں

گے‘‘(مجاہد ملتؒ)

جو ہونا تھا وہ ہوا۔ تاریخ کا ورق پلٹا‘ لیکن مولانا مرحوم کے یہ کلمات بھی تاریخ کی ایک قیمتی امانت بن گئے۔

تیسرا دور:

مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عزیز زندگی کا پہلا دور تعلیم وتعلم‘ تبلیغ دین‘ خدمت خلق‘ وعظ وبیان کے وقتی مشاغل میں گزارا۔ دوسرے دور میں ان کا تمام ہی وقت سیاسی سرگرمیوں‘ دوروں اور تقریروں‘ اسارت ونظر بندی اور تحریک آزادی وطن کو اپنی بھرپور صلاحیتوں سے آگے بڑھانے میں گزرا۔ اس دوران میں سکون وفرصت کے کچھ لمحات کبھی کبھی میسر آئے تو وہ تصنیف وتالیف کے فاضلانہ شغل میں گزرے۔

۴۷ء میں تحریک آزادی کامیابی کے ساتھ اپنی آخری منزل کو پہنچی۔ ہندوستان برطانوی اقتدار کی گرفت سے آزاد ہوا۔ اور تاریخ نے وطن عزیز کو ایک عظیم انقلاب اور ایک نئے دور کی گود میں دے دیا‘ مگر تاریخ کا یہ واقعہ بھی کتنا عجیب ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی جتنی پرامن اور پرسکون فضاؤں میں لڑی گئی اس کا خمارا اتنا ہی تیز وتند اور اعصاب شکن ثابت ہوا۔ کاش ہندوستان کے وسیع افق پر سیاسی انقلاب اور اقتدار واختیار کی تبدیلی ’’طلوع فجر‘‘ کی طرح رونما ہوتی کہ اس کے کیف آور لمحات اور حیات بخش پیغام سے ملک کے در ودیوار جگمگا اٹھتے۔ اس کے برعکس یہاں آزادی کی صبح‘ صبح محشر‘ بن کر نمودار ہوئی جس کے دامن میں انقلاب کی ہولناکیاں تھیں اور قہر وغضب کا وہ طوفان جو پچھلی چوتھائی صدی سے ملک میں پھیلی ہوئی کش مکش‘ جذبات ونظریات کے تصادم اور فرقہ وارانہ ہوسناکیوں کا انجام بد اور ردعمل تھا۔ اس لحاظ سے ہندوستان کی تاریخ میں یہ وقت اتنا نازک اور بھیانک دور بن کر سامنے آیا کہ بڑے بڑے ارباب فکر وتدبیر کے ہوش وحواس کھو گئے۔ یہی تاریک اور بھیانک دور تھا جس میں حضرت مجاہد ملتؒ کی عزیمت اور استقامت کے تابناک جوہر مشعل راہ بن کر چمکے اور ملک وملت کے کھوئے ہوئے قافلوں کی دستگیری ان کے حصے میں آئی۔ مولانا موصوف اس وقت ملکی سیاست وقیادت کا اہم ترین جز تھے اور صف اول کے راہنماؤں میں اعتماد واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ کمال علم وفضل کے ساتھ ساتھ جہد وعمل کے میدانوں میں بھی وہ اپنی جوہری

صلاحیتوں کا اتنا شاندار اور اولوالعزم کردار پیش کر چکے تھے کہ اب ملک وملت کے اہم سے اہم مسائل میں ان کی رائے اور رہنمائی کا انتظار کیا جاتا تھا۔ایک فاضل اور نامور مصنف' سحر آفریں خطیب اور بے لوث رہنما کی حیثیت سے ان کی شہرت و مقبولیت ایک ہمہ گیر حقیقت بن چکی تھی۔اپنی اس ممتاز اور دقیع حیثیت اور عظیم کردار کے ساتھ مجاہد ملتؒ نے اپنی زندگی کے تیسرے دور میں قدم رکھا اور اس دور میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جو انہی کا حصہ تھے۔ جن کی مثالیں دیکھنے کے لیے گردش روزگار کو صدیوں انتظار کرنا پڑتا ہے اور جن کو بلا مبالغہ انسانی تاریخ کا ایک سنہرا ورق قرار دیا جاسکتا ہے۔حضرت مولاناؒ کی زندگی میں سعی وعمل کا یہ تیسرا دور سب سے زیادہ تابناک اور زریں دور تھا جو آزادی وطن (۴۷ء) سے شروع ہو کر ۶۳ء میں اس وقت تک جاری رہا کہ حضرت موصوف اپنی اہمیت وافادیت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ کر "رفیق اعلیٰ" سے جا ملے۔

مجاہد ملتؒ نے اس دور میں جمعیۃ علماء کے اسٹیج سے جو عظیم الشان' ہمہ گیر اور دور آفریں خدمات انجام دیں' حقیقت یہ ہے کہ وہ بجائے خود ایک مستقل تاریخ ہیں۔کسی مختصر تذکرہ کے ضمن میں ان کا شمار بڑی ناقدری اور ناانصافی کی بات ہے۔اسی لیے ہم آئندہ صفحات میں ان بے بہا خدمات کے صرف عنوان پیش کر رہے ہیں۔ یہ مولانا مرحوم کی عالی ظرفی تھی کہ انہوں نے کاموں کا تمام بوجھ اپنے اوپر سنبھالتے ہوئے بھی ان خدمات کا کریڈٹ کبھی خود نہیں لیا اور ہمیشہ جمعیۃ علماء ہی کے سر یہ سہرا باندھا۔اس لیے کہ جمعیۃ علماء ہی ان کی سرگرمیوں اور دلچسپیوں کا محور تھی انفرادیت اور انانیت کے تصور سے بھی ان کو گریز تھا۔وہ صرف جماعتی زندگی کے قائل تھے اور ان کا یہ عقیدہ بھی اسلام کی سچی تعلیم اور اسوہ رسول کریمؐ کے عین مطابق تھا۔اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس پورے دور میں جمعیۃ کے رفقاء کار کا تعاون اور اعتماد مولانا کو قدم قدم حاصل رہا۔لیکن فکری اور عملی قیادت اور پہل اور اقدام (INITIATIVE) کا جوہر خاص حضرت مولانا ہی کی ذات گرامی تھی۔

(۴)

لکھنو کانفرنس سے مسلم کنونشن تک

مجاہد ملت کی دور آفریں خدمات

۱۹۴۷ء۔۔۔دہلی کی قیامت صغریٰ:

۱۵/اگست ۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا۔اسی شب کے بارہ بجے پارلیمنٹ ہاؤس نئی دہلی میں انتقال اختیارات کا منشور پڑھا گیا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہاتھوں رسمی تقریبات انجام پائیں۔اس کے فوراً بعد ''گورنمنٹ ہاؤس'' میں (جو اس وقت تک ''وائسرائے ہاؤس'' کہلاتا تھا) منعقدہ ایک بڑی بارونق اور بھرپور محفل میں ہندوستان کے نئے گورنر جنرل کا استقبال کیا۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے خوشی خوشی ان تمام تقریبات میں شرکت کی۔تماشائیوں میں ہم دفتر کے ساتھی بھی ان کے ہمراہ تھے۔مولانا مرحوم نے آزادی وطن کے لیے جس طرح جان کی بازی لگائی تھی۔اور جوانی کی تمام امنگیں اس کے لیے قربان کردی تھیں۔۱۵/اگست ۴۷ء کو جب ہندوستان کی فضاؤں پر حریت واستقلال کی صبح مقصود نمودار ہورہی تھی۔اس کی مسرتوں اور طرب آفرینیوں کا پورا لطف بھی کچھ ان ہی کو حاصل ہوا ہوگا۔اور ان ہی کا حق تھا۔

بہر حال ملک کو آزاد ہونا تھا۔ایک تاریخ آئی اور آزادی کی رسم پوری ہوگئی۔آزاد ہندوستان کے جھنڈے لہرانے لگے۔آزادی کے ترانوں سے فضائیں گونج اٹھیں۔یہ سب کچھ ہوا، لیکن تھوڑی دیر کے لیے۔۔۔اور اس کے بعد یکا یک ایک سناٹا اور گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ایک ہیبت ناک منظر اور جان لیوا دہشت: گویا اس دھرتی پر بلاؤں کا دیوتا اپنے پورے غیظ وغضب کے ساتھ برس ہی پڑا ہو۔تاریخ کو شاید انتظار تھا ایک ایسے وقت کا جو ہمیں ۱۵/اگست کی خوشیاں بھلا دے وہ وقت بھی کچھ دور نہیں تھا۔مگر یہ کسے معلوم تھا!

ادھر حضرت مولاناؒ کی چہیتی بیٹی خالدہ مرحومہ ان دنوں مرض دق کی آخری منزل میں تھی۔ تشویشناک حالت کی خبر آتے ہی ۲۵ راگست کو مولانا سیوہارہ تشریف لے گئے۔ چند ہی روز بعد خالدہ کا انتقال ہو گیا۔ غم میں ڈوبے ہوئے دل کے ساتھ مولانا ۳ ستمبر ۴۷ء کو اس حالت میں دہلی واپس ہوئے کہ گھر کے سب ہی عزیزوں نے روکا' مگر کسی غیبی کشش نے بے اختیار مولانا کو دہلی پہنچا ہی دیا۔ بعد کے حالات نے بتایا کہ مشیت الٰہی کس اہم خدمت کے لیے مولانا کو دہلی لا رہی تھی۔

دہلی ---آزاد ہندوستان کی راجدھانی' اس وقت تاریخ کے بدترین دور کے دروازے پر تھی۔ مغربی اور مشرقی پنجاب اس وقت قتل و غارت کی آگ میں جھلس رہے تھے۔ مغربی پنجاب سے برباد قافلے دھڑا دھڑ مشرقی پنجاب کی طرف کوچ کر رہے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ وحشت و بربریت کا بے قابو سیلاب' دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پنجاب سے آنے والے برباد و مجروح پناہ گزینوں کی ٹرینیں دہلی اسٹیشن تک پہونچیں اور یہاں بھی ایک آگ بھڑک اٹھی۔ تین روز تک نہ صرف دہلی اسٹیشن پر قتل عام ہوتا رہا۔ بلکہ شہر کے اندر بھی کشت و خون کی وہ گرم بازاری ہوئی کہ آنا فانا نئی دہلی کی وسیع آبادی۔ پہاڑ گنج' قرول باغ سبزی منڈی' شاہدرہ اور قرب و جوار کے دیہات سے لاکھوں مسلمان اجڑ کر جامع مسجد اور مقبرہ ہمایوں میں پناہ گزیں ہو گئے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب دہلی پہنچے ہی تھے کہ شہر کا یہ بھیانک نقشہ ان کو دیکھنا پڑا۔ ۷ر ستمبر سے بہتر (۷۲) گھنٹے کے لیے کرفیو آرڈر نافذ کر دیا گیا۔ پورے شہر پر موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا' جس میں کوئی آواز آتی تھی تو صرف گولیوں کی یا بے بس مظلوموں کی چیخ و پکار کی۔ رات بھر خوفناک نعروں کے ساتھ پورے پورے محلوں پر مسلح چڑھائیاں' دور دور تک آگ کی لپٹیں اور دھوئیں کے غول ہر طرف چھرے بازوں اور بے باک لٹیروں کی گویا حکومت قائم ہو گئی تھی۔ ایک اندازہ کے مطابق چالیس ہزار کے قریب بے گناہ تین چار روز کے اندر اندر موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ یہ قیامت جن کے سروں سے گزری ان کا تو ذکر ہی کیا' جو باقی تھے وہ بھی دم بخود' پوری مایوسی کے ساتھ اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ اس بھیانک اور ہیبت ناک فضا میں جب کہ بڑے بڑے لیڈروں کے ہوش و حواس جواب دے رہے تھے۔ یہ سوچنا بھی کہ اس سیلاب بلا کو روکنے' بے گناہوں کو موت کے جنگل سے نکالنے اور ان کے تحفظ

کے لیے کوئی قدم اٹھانے کی کوئی گنجائش بھی باقی ہے' کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ ایک مولانا ہی کا دم تھا جو سر سے کفن باندھ کر اٹھے اور بنام خدا ان کی ہمت نے کچھ ساتھی بھی تلاش کر لیے۔ جمعیۃ کا دفتر یکا یک ریلیف کیمپ بن گیا۔ حالات انتہائی سنگین تھے۔ مگر مولانا مرحوم کی ہمت اور جوش عمل ان سے بھی کچھ سوا تھا۔ انہوں نے فوراً مقامی ایڈمنسٹریشن کو للکارا' جمعیۃ اور کانگریس کے باہمت کارکنوں کو جمع کیا اور اصلاح حال کی موثر تدبیر شروع کی۔

گاندھی جی کی آمد:

اسی اثناء میں ۹ رستمبر کو گاندھی جی دہلی پہنچ گئے۔ دہلی اسٹیشن کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ گاندھی جی کو شہر سے چار میل دور شاہدرہ اسٹیشن پر اتار لیا گیا اور وہ برلا ہاؤس نئی دہلی میں مقیم ہوئے۔

مولانا مرحوم پنڈت نہرو' مولانا آزاد اور سردار پٹیل کو شہر کی حالت سے سے آگاہ کر ہی چکے تھے' گاندھی جی کے پہنچتے ہی حضرت مولانا احمد سعید صاحب کو ساتھ لے کر گاندھی جی کے پاس پہنچے اور تمام سرگزشت سنائی۔ دوسرے روز گاندھی جی کو ساتھ لا کر مقامی پناہ گزینوں کی حالت دکھائی۔ شہر کے وہ علاقے جہاں سے مسلمانوں کی وسیع آبادیاں نیست و نابود کر دی گئی تھیں' دکھلائیں' اصلاح حال کی تدابیر ان کے سامنے رکھیں۔ لاکھوں برباد شدہ مسلمان جو جامع مسجد' مقبرہ ہمایوں اور پرانے قلعے میں پناہ گیر تھے۔ ان کے لیے کھانے پینے کا' کپڑوں کا' بیماروں کی دوا دارو کا اور دوسری ضروریات کا بندوبست کیا۔ جب تک یہ کیمپ باقی رہے۔ دن میں کئی کئی بار ان کا چکر لگانا' پناہ گزینوں کے لیے خوراک اور دوسری ضروریات مہیا کرانا۔ ہسپتالوں میں جا کر زخمیوں کو دیکھنا۔ مایوس دلوں کو تسلی دینا ادھر شہر کے باقی ماندہ مسلم محلوں کی حفاظت' راہ گیروں کے ساتھ قتل و غارت کے واقعات کی روک تھام' صبح سے شام تک ان سیکڑوں امدادی کاموں میں مولانا اس طرح مصروف رہتے کہ تنہا ان کی ذات باقی ماندہ مسلمانوں کی امیدوں کا مرکز بن گئی تھی۔ جہاں تہاں واقعات کے تسلسل اور خطرات نے بچے ہوئے مسلمانوں کو اپنی گلیوں' محلوں میں محصور کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ روزمرہ کی ضروریات کے لیے اپنے محلے سے باہر قدم نہیں نکال سکتے تھے۔ غیر مسلم علاقوں سے غذائی راشن' بیماروں کے لیے دوائیں اور دوسری ضروریات زندگی فراہم کرنا' کوئی میت ہو جائے تو اس کی تکفین و

تدفین کا بندوبست' زخمیوں کو ہسپتال لانا' لے جانا وغیرہ وغیرہ یہ سب کام مدت تک حفاظتی دستوں کی نگرانی میں انجام پاتے رہے۔ مولانا مرحوم نے اپنے رفقاے کار کو فرداً فرداً ڈیوٹیوں پر لگا رکھا تھا۔ مولوی فقیہہ الدین' سلطان یار خاں وکیل' مسٹر محمد احمد وکیل' شیخ عبدالحق پراچہ' محمد عثمان آزاد' عنایت الرحمٰن فاروقی اور بعض دوسرے رفقا نے ان دنوں بڑی تندہی کے ساتھ شب و روز امدادی کاموں میں ہاتھ بٹایا۔ جمعیۃ کا مرکزی دفتر ان تمام کوششوں کا مرکز بنا رہا اور تمام کاموں کی نگرانی مولانا مرحوم فرماتے رہے۔

ادھر گاندھی جی حکومت کے ذمہ داروں سے بھی زیادہ خود تمام حالات کی نگرانی کر رہے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب' مولانا احمد سعید صاحب اور دوسرے جماعتی رفقا کو ساتھ لے کر ہر روز گاندھی جی کے پاس جاتے اور دن بھر کی روداد ان کو سناتے' پنڈت نہرو' ڈاکٹر راجندر پرشاد' مولانا آزاد' سردار پٹیل اور بسا اوقات دہلی کے چیف کمشنر وڈپٹی کمشنر سب وہیں جمع ہوتے اور ضروری ہدایات جاری ہوتیں۔ دلی کانگریس کے صاف دماغ دوستوں' بالخصوص چودھری برہم پرکاش' برج موہن' چودھری شیر جنگ' شریمتی سبھدرا جوشی' مس مردولا سارابھائی نے بھی پوری تندہی کے ساتھ حالات کو بہتر بنانے کے لیے دن رات کام کیا۔ جمعیۃ کے کارکن اپنے اپنے محلوں کے ضروری کاموں کو سنبھالنے میں بڑی جاں بازی کے ساتھ مصروف رہے۔ ہر روز نئے حوادث اور مشکلات سامنے آتیں اور ان کے لیے تدابیر عمل میں لائی جاتیں۔ ان تمام سرگرمیوں کا مرکز حکومت کی اعلیٰ سطحوں میں گاندھی جی کی ذات تھی اور مسلمانوں میں مجاہد ملتؒ کا تنہا دم تھا۔

رات دن کی مسلسل اور جان توڑ کوششوں کے بعد بھی کئی مہینے گزرے تب جا کر حالات میں بہتری کے آثار پیدا ہوئے لیکن قتل و غارت گری کے ہنگامے جوں جوں کم ہوتے گئے مسلمانوں کے لیے زندگی کی نئی نئی الجھنیں سامنے آتی رہیں اور ہر ہر معاملے کے لیے مستقل جدوجہد کرنی پڑی۔

جو علاقے مسلمانوں سے بالکل خالی ہو گئے تھے ان کے کچھ مکانوں میں مدفون دفینوں کی برآمدگی کا سوال آیا۔ چنانچہ بہت معقول پولیس فورس کے انتظام میں یہ دفینے برآمد کرائے گئے۔ ان علاقوں میں واقع مسجدوں' درگاہوں وغیرہ پر ناجائز قبضے ہو گئے تھے۔ بہت سی مسجدوں کو توڑ پھوڑ کر' یا آگ لگا کر برباد کر دیا گیا تھا۔ ان کی حفاظت' مرمت' انخلا و اصلاح کا

معاملہ بڑا پیچیدہ بھی تھا اور خطرناک بھی۔ تاہم ناسازگار حالات میں اس کی جدوجہد بھی شروع کی گئی اور مدتوں مسلسل جاری رہی۔

سیکڑوں مسلمان سرکاری محکموں کے ملازم تھے۔ جوان حالات میں گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے تھے۔ آہستہ آہستہ ان کو ان کی ڈیوٹیوں پر پہونچانا' ان کی رکی ہوئی تنخواہیں یا پنشنیں دلوانا بھی ناممکن ہو رہا تھا۔ بالآخر اسپیشل پولیس کی معیت میں آمدورفت شروع کرائی گئی اور مہینوں یہ معمول جاری رہا۔ دسیوں محکموں میں ایسے لوگوں کے ہمراہ مولانا مرحوم نے کبھی مجھے اور کبھی مولوی فقیہہ الدین کو بھیجا۔

ایک اہم سوال:

ایک اہم سوال یو۔پی اور دوسرے صوبوں کے ان ہزاروں مسلمانوں کا تھا جو دہلی کے ان ناگہانی حالات میں گھر کر رہ گئے تھے اور بے چین تھے کہ کسی طرح اپنے اپنے وطن پہنچ سکیں۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے کوشش کر کے اسپیشل ٹرینوں کا انتظام کرایا۔ دہلی کا بڑا اسٹیشن چوں کہ خطرات کا گڑھ بنا ہوا تھا اس لیے یہ اسپیشل ٹرینیں نظام الدین اسٹیشن سے چلائی گئیں۔ مگر نظام الدین اسٹیشن تک صحیح سلامت پہنچنا بھی مسلمانوں کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس لیے شہر کے مسلم علاقوں میں ملٹری ٹرک مہیا کرائے گئے اور ان کے ذریعے ہزاروں ہزار خوف زدہ اور پریشان حال مسلمانوں کو نظام الدین لے جا کر اسٹیشن پر سوار کرایا گیا۔ مولانا مرحوم یہ تمام کام اپنے کارکنوں کے سپرد کر کے بھی خود ساتھ ساتھ ضرور رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے' ان ہی دنوں جب ایک ٹرک کے ساتھ میں نظام الدین پہنچا تو ایک صاحب جو کسی اونچے گھرانے کے معلوم ہوتے تھے اور اسپیشل ٹرین پر سوار ہونے والے تھے۔ اتفاق سے ان کی بیوی کو اسی وقت وضع حمل کی تکلیف شروع ہو گئی' چہرہ سے بے انتہا پریشانی ظاہر تھی۔ بالآخر انہوں نے مولانا پر اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ مولانا مرحوم نے فوراً ان کو اپنی کار میں ساتھ لیا اور شہر واپس لا کر ان کی بیوی کو خود اسپتال میں داخل کرایا اور کئی روز تک برابر ان کی خیریت طلبی کے لیے ہسپتال جاتے رہے۔

ایک ناگہانی مصیبت:

اسی طرح ایک اور ناگہانی صورت حال سامنے آئی۔ وہ یہ کہ مغربی پنجاب سے آئے ہوئے مشتعل اور زخم خوردہ پناہ گزیں جب مسلمانوں کے خالی کیے ہوئے تمام علاقوں اور ان

سے لوٹی چھینی ہوئی دوکانوں' بازاروں پر قابض ہو چکے تو انہوں نے شہر کے چند باقی ماندہ مسلم محلوں میں گھسنا شروع کیا' عام قتل و غارت گری کے لیے اب حالات میں زیادہ گنجائش نہ تھی تو انہوں نے ڈرا دھمکا کر یا نقد لالچ دے کر ان محلوں میں مسلمانوں سے مکان اور دکانیں حاصل کرنے کی طرح ڈالی۔ ایسے بدنصیب مسلمانوں کی بھی کمی نہیں تھی جو آسانی سے ان کا شکار ہو جاتے تھے' اگر یہ صورت حال جاری رہتی تو دہلی' مسلمانوں کے نام ونشان سے بالکل خالی ہو جاتی۔

مولانا مرحوم نے یہ معاملہ جب گاندھی جی کے سامنے رکھا تو خود گاندھی جی نے اس کا یہ حل تجویز کیا کہ ان مسلم محلوں کو ''مسلم زون'' قرار دے دیا جائے اور ان میں غیر مسلموں کی آبادی کو ہر قیمت پر روکا جائے۔ اس تدبیر کی بدولت دہلی کی باقی ماندہ مسلم آبادی کو بڑا تحفظ حاصل ہوا' ورنہ خدا ہی جانے آج دہلی کا کیا حال ہوتا۔

مشرقی پنجاب پر مصائب کے پہاڑ:

ایک طرف دہلی اپنے اس نازک اور بھیانک دور سے گزر رہی تھی۔ دوسری طرف شر وفساد کی فوجیں دہلی سے متصل ضلع گوڑگانوہ' پانی پت' اور' بھرت پور کی مسلم آبادیوں پر یلغار کر رہی تھیں۔ پانی پت کے مسلمان تو پہلے ہی حملہ میں اکھڑ گئے۔ اور سوائے مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی کے سب ہی نے ترک وطن کے ارادہ سے بستر باندھ لیے' لیکن میوات کے سخت جان اپنے وطن میں رہنے کے لیے آخر تک مصیبتوں کا سامنا کرتے رہے۔ مولانا مرحوم ان ہی دنوں گاندھی جی کے ساتھ بار بار میوات بھی گئے اور پانی پت بھی۔ دونوں رہنماؤں نے وہاں کے مسلمانوں کو کافی سمجھایا اور اپنی کوششوں کا یقین دلایا۔

میوات کے مشہور قصبہ گھاسیٹرہ میں پنجاب کے چیف منسٹر ڈاکٹر گوپی چند بھارگو بھی اس وقت موجود تھے۔ جب گاندھی جی اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب وہاں پہنچے اور میواتیوں کے بڑے اجتماع کو تلقین کی کہ اپنے وطن میں ہمت کے ساتھ رہیں اور وقتی مصیبتوں کو جرأت مندی کے ساتھ برداشت کریں۔ افسوس کہ پانی پت کے مسلمانوں نے اثر نہ لیا' لیکن میوات کے مسلمانوں نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو' ہم اپنے وطن کو نہیں چھوڑیں گے۔ بحمد اللہ آج تک ہر گونہ مصائب کے بعد بھی ان کی بڑی تعداد اپنے وطن میں آباد ہے۔

دہلی کی قیامت صغریٰ اور مجاہد ملتؒ:

بہر حال ہماری تاریخ میں جہاں ۱۹۴۷ء کے بھیانک دور کا تذکرہ ہوگا اور آنے والی نسلیں یاد کریں گی کہ ایک ایسا وقت بھی آیا تھا جب کہ حالات کے غضب ناک تیور ایک ہی ضرب میں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ کو مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ وہاں مجاہد ملتؒ کے عزم وکردار' مجاہدانہ کارناموں اور دور آفریں خدمات کا تذکرہ بھی تاریخ کا ایک زرین باب بن کر چمکتا رہے گا اور دنیا اس حقیقت کو محسوس کرے گی کہ ہندوستان کی راجدھانی ''دہلی'' میں ۱۹۴۷ء کی قیامت صغریٰ سے گزر کر مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ اپنے ظاہری اسباب وعوامل میں بڑی حد تک جس اولوالعزم کردار کی مرہون منت ہے وہ صرف ''حفظ الرحمٰن'' ہی کا کردار تھا جس کے عزم وثبات نے' جس کی بے پناہ جرأت واستقلال نے حوادث کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا رخ پھیر دیا اور جس کی بدولت دہلی میں مسلمانوں کو انتہائی نازک حالات سے گزر کر ایک نئی زندگی نصیب ہوئی۔ اور ساتھ ہی وطن عزیز کی آبرو اور نیک نامی بھی باقی رہ سکی۔

واقعہ یہ ہے کہ (عالم اسباب میں) اگر مجاہد ملت کی ذات درمیان میں نہ ہوتی تو نہیں کہا جا سکتا کہ ۱۹۴۷ء کا انقلاب دہلی کی سرزمین پر اسپین کی تاریخ دہراتا یا بغداد پر تاتاری یلغار کی یاد دلاتا اور پھر کون کہہ سکتا ہے کہ پایہ تخت ''دہلی'' کا جب یہ حال ہوتا تو اس کے اثرات کہاں کہاں تک پہنچتے اور کیا رنگ لاتے۔ اللہ تعالیٰ مجاہد ملتؒ کو اپنی بے اندازہ بخششوں سے نوازے اور مسلمانان ہند کی تاریخ پر ان کے گراں بار احسانات کی جزائے خیر عطا فرمائے کہ ایک ایسے بھیانک دور میں ان کی ذات ملت اسلامیہ کے وجود وحفاظت کا سہارا بنی اور آج دہلی ہی نہیں پنجاب ومیوات ہی نہیں بلکہ وہ تمام علاقے جہاں انقلاب روزگار کی محشر سامانیوں نے مسلمانوں کی قسمت سے کھیلنا چاہا' اگر پھر زندگی کی توانائیوں سے سرسبز وشاداب نظر آ رہے ہیں تو درحقیقت ان کی آبیاری اور پرورش میں مولانا مرحوم کا خون جگر پیوست ہوا ہے اور ان کی فکری اور عملی صلاحیتوں کا بڑا قیمتی سرمایہ بے دریغ صرف ہوا ہے۔

لکھنو کانفرنس:

شمالی ہند میں خونیں حوادث کی اس گرم بازاری اور دور دور تک اس کے مہیب اثرات نے پورے ملک کی زندگی پر ایک لرزہ اور بحران طاری کر دیا تھا' خاص طور پر مسلم اقلیت تو انتہائی

دہشت اور سراسیمگی کی گرفت میں تھی۔ اقلیت و اکثریت میں باہم انتشار اور بے اطمینانی بڑھتی جارہی تھی اور یہ احساس وسیع پیمانہ پر پھیلتا جارہا تھا کہ شاید تقسیم کے بعد ہندوستان کے مستقبل میں مسلمانوں کا کوئی موقف نہ ہوگا۔ بدحواسی کا سب سے زیادہ شکار وہ طبقہ تھا جو تقسیم ہند سے پہلے بڑی قوت کے ساتھ مسلمانوں کی دردمندی اور قیادت کا دم بھرتا رہا تھا۔ بہرحال بددلی' بے اطمینانی اور مایوسی کے یہ بڑھتے ہوئے احساسات جس طرح مسلمانوں کے حق میں خطرناک تھے اسی طرح ملک کی جمہوری زندگی اور صحت مند فضا کے لیے بھی ان کی ہمت اور ہلاکت آفرینی ظاہر تھی۔ اس صورت حال کا شدید تقاضہ تھا کہ ملک گیر پیمانے پر کوئی اور قدم اٹھایا جائے جو ناخوش گوار حالات میں ملک کو ایک نئی روشنی دکھائے' اکثریت و اقلیت میں باہم اعتماد پیدا کر سکے۔ اور دلوں کے خوف و ہراس کو دور کر کے مسلمانوں کے ماضی اور حال کو مستقبل کے ساتھ جوڑ سکے۔ وقت کے اس تقاضے کو پوری قوت کے ساتھ امام الہند مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے محسوس کیا اور ان ہی کے ایما پر ۲۷/۲۸ دسمبر ۴۷ء کو لکھنو میں آزاد مسلم کانفرنس بلائی گئی جس کے پہلے ہی اعلان نے دور دور تک مسلمانوں کی نگاہوں میں امید کی ایک نئی چمک پیدا کی اور بڑی توقعات کے ساتھ جوق در جوق مسلم عوام و خواص اس میں شرکت کے لیے لکھنو پہنچ گئے۔

مقررہ تاریخوں میں یہ کانفرنس اپنی بے مثال کامیابی کے ساتھ منعقد ہوئی اور اس میں مولانا آزادؒ کے قائدانہ خطاب اور مجاہد ملت کی ولولہ انگیز تقریر نے حالات سے سہمے ہوئے مسلمانوں کو جرأت مندانہ زندگی اور اعتماد و خودداری کا جو پیغام دیا اور زندگی کے جو عزم اور حوصلے بخشے' اس نے پورے ملک کی فضا ہی بدل کر رکھ دی اور آج پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ لکھنو کے اس تاریخی اجتماع میں ان دونوں بزرگوں نے ملک و ملت کو جو رہنمائی عطا کی' وہ درحقیقت اس برصغیر میں جمہوری زندگی کا حرف آغاز اور ہندوستان کے مستقبل میں مسلمانوں کے باوقار موقف کا سنگ بنیاد تھا۔

(۵)

دینی تعلیم کی ملک گیر تحریک

آزاد ہندوستان کی جمہوری زندگی میں ملت اسلامیہ کی حفاظت اور اس پر منڈلاتی ہوئی آفات ومشکلات کے انسداد و مدافعت کی خاطر حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جہاں دوسرے بے شمار کارہائے نمایاں انجام دیئے' وہاں دین وملت کی سب سے اہم بنیادی اور تعمیری خدمت جس کی سعادت انہیں نصیب ہوئی۔ وہ دینی تعلیم کی ملک گیر تحریک اور اس کی آبیاری ہے۔

۴۷ء کے سیاسی انقلاب کے بعد اگرچہ فوراً ہی ہنگامی حالات اور ناگہانی مصائب پر سعی وعمل کی بیشتر فرصتیں ضائع ہوتی رہیں۔ تاہم دوراندیش نگاہیں ان حالات میں بھی فکر مستقبل سے غافل نہیں رہیں۔

جمعیۃ علماء نے امام الہند مولانا آزادؒ کی رہنمائی میں ۲۰/ مارچ ۴۸ء کے اجلاس دہلی میں پارلیمنٹری سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے اور اپنی تمام صلاحیتیں تعلیمی اور تہذیبی خدمات کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ کیا۔ ادھر ملک کی جمہوری زندگی تیزی کے ساتھ نئے افکار ورجحانات کی طرف بڑھ رہی تھی اور یہ خیال ایک قطعی فیصلہ بنتا جارہا تھا کہ کروڑوں انسانوں کی اس وسیع آبادی کو جہالت و پس ماندگی سے نکالنے کے لیے دنیوی تعلیم کی عام اور جبری اشاعت بے حد ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ رہنمایان وطن کا یہ نظریہ اپنی جگہ بالکل درست' بلکہ قابل قدر و تحسین تھا اور وطن عزیز کی اصلاح وترقی کے لیے اس کی افادیت سے نہ مسلمان انکار کرسکتے تھے۔ نہ غیر مسلم! تاہم دنیوی تعلیم کی عام اور جبری ترویج کی تہ میں جو اشکال لازمی طور پر پیش آنا تھا۔ وہ یہ تھا کہ جب ملک بھر میں بچوں اور بچیوں کے لیے دنیوی تعلیم حاصل کرنا اور پانچ یا چھ سالہ سرکاری نصاب کی تکمیل ضروری ہوجائے گی اور بلا استثناء ہر بچہ بچی کو تعلیم کی ابتدائی مدت سرکاری اسکولوں میں گزارنی ہوگی اور ساتھ ہی یہ بھی قطعی تھا کہ

ملک کے سیکولر جمہوری نظام میں کسی بھی فرقہ اور مذہب کی تعلیم سرکاری نصاب کا جز نہ ہوگی تو پھر مسلمان بچے جو عام طور پر قرآن اور دینیات کی تعلیم ٹھیک اسی عمر میں گھروں پر یا مدرسوں میں حاصل کرتے ہیں اس کی گنجائش کیوں کر باقی رہے گی اور ملک بھر میں ان کے لیے کیا بندوبست ممکن ہوگا۔

اس عام اور لازمی اشکال کے ساتھ ساتھ کچھ دور اندیش نگاہوں کو گردش لیل ونہار کے آثار وقرائن میں وہ خطرہ بھی نظر آ رہا تھا جو بہت جلد امر واقعہ بن کر سامنے آنے والا تھا اور بالآخر سامنے آ کر کہ ایک خاص مسموم ذہنیت نے سرکاری نصاب تعلیم کو سیکولرزم اور دستور ہند کی ہر منشا کے خلاف اکثریت کے مخصوص مذہبی رجحانات میں رنگنا شروع کر دیا اور ایک خاموش کوشش شروع ہوگئی کہ نصاب تعلیم کے ذریعے ابتدا ہی سے آنے والی نسل کا ذہن اس طرح ڈھالا جائے کہ اسلامی عقائد ونظریات سے اس کو کافی دور کر دیا جا سکے۔

وطن عزیز کے مستقبل میں پیش آنے والی اس نازک صورت حال کا تدارک اگر ہو سکتا تھا تو صرف اس طور پر کہ پورے ملک میں مسلمانان ہند کے شعور واحساس کو بیدار کیا جائے اور ان کو آمادہ کیا جائے کہ حرارت ایمانی کے ساتھ مستعد ہو کر آگے بڑھیں اور وقت کی نئی آزمائشوں اور ناسازگار حالات میں دین مبین کی مقدس امانت کو اپنے سینوں سے لگائے رکھنے اور اپنی نسلوں کے لیے یہ حفاظت باقی چھوڑنے کی تدابیر میں لگ جائیں۔ اس کے ساتھ ہی ملک گیر پیمانے پر ایسی کوششیں منظم کی جائیں کہ مسلمان بچے ابتدائے عمر ہی میں (دنیوی لازمی تعلیم کے ساتھ ساتھ) اپنے مذہب اور دینیات کی تعلیم اور عقائد واحکام کا ضروری حصہ بھی حاصل کر سکیں اور دین حق کی روشنی آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے قابل ہو سکیں' تاکہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے بعد جس طرح وہ وطن عزیز کے معزز شہری ہوں اسی طرح خدائے واحد کے سچے پرستار اور دین محمدی کے علم بردار بھی بن سکیں۔

اس کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ ایک مختصر اور سہل دینی نصاب مرتب کیا جائے جو کم سے کم وقت میں مسلمان بچوں کو دین کے مبادیات' عقائد' احکام اور اخلاق سے آراستہ کر سکے اور سب سے بڑی ضرورت اس کی تھی کہ بے حسی' تعطل اور انتشار کی عام فضا میں ایک منظم اور وسیع تحریک پھیلا کر مسلمانان ہند میں اتحاد وعمل کی اسپرٹ پیدا کی جائے اور ان کو غفلت وجمود سے نکال کر سعی واقدام کے لیے بیدار ومستعد کیا جائے۔

انقلاب ۴۷ء کے بعد ہندوستان کی وسعتوں میں ملت اسلامیہ کی یہ ٹھوس اور بنیادی خدمت اپنے دور رس نتائج اور اہمیت کے لحاظ سے کتنی قیمتی خدمت ہے۔ اس کا پورا احساس شاید مسلمانوں کی آئندہ نسلیں کر سکیں گی۔ بہر حال ایک ایسے وقت میں جب کہ مسلمانان ہند کی کوئی تحریک اور تنظیم گردش روزگار کے سامنے قائم نہیں رہ سکی تھی صرف جمعیۃ علما ہی تھی جو اپنی شان دار روایات اور بے داغ کردار کے ساتھ انقلاب کی زور آزمائی کا مقابلہ کر سکی اور وہی قوت عمل کا ایک خزانہ تھی جو اس بار عظیم کو اپنے کاندھوں پر اٹھا سکتی تھی اور بالآخر اس نے اس فریضہ خدمت کو سنبھالا اور ناسازگار حالات میں باحسن وجود انجام دیا۔ جمعیۃ کے حلقوں میں اس احساس کو بیدار کرنے والی سب سے پہلی شخصیت حضرت مولانا آزادؒ کی تھی۔ حضرت موصوف نے اپنی بے مثل ذہانت اور دور اندیشی کے ساتھ مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند میں بیٹھ کر ۴۸ء ہی سے اس کی سلسلہ جنبانی فرمائی اور رفقاے جماعت کو مشورہ دیا کہ جماعتی مقاصد میں دینی تعلیم کی مہم کو سب سے مقدم رکھ کر آگے بڑھیں۔ چنانچہ اس کامیاب اور مفید رہنمائی کی روشنی میں جمعیۃ نے اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنو (اپریل ۴۹ء) میں دینی تعلیم کی مہم کو اپنا سب سے اہم پروگرام قرار دیا۔ اور اس کے خدام اس مہم کی ساخت و پرداخت میں لگ گئے۔ مجوزہ نصاب کی تدوین وترتیب کی سعادت اکثر و بیشتر حضرت مولانا محمد میاں صاحب کے حصہ میں آئی اور ملک گیر پیمانہ پر اس مہم کو برپا کرنے کا شرف مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ تعطل وانتشار کے اس دور میں اپنے اثر ونفوذ کے ساتھ پورے ملک پر اثر انداز ہونے اور مسلمانان ہند کو اس خالص تعمیری اور خاموش دینی خدمت کے لیے آمادہ و مستعد کر دینے والی جوہری شخصیت تنہا مجاہد ملتؒ کی ہی شخصیت تھی۔ اپنی ہر دلعزیزی اپنے ملک گیر تعارف واعتماد، بے نظیر خطابت اور جذبہ عمل کے ساتھ جب مولانا مرحوم اس مہم کو لے کر اٹھے تو ایک ہی آواز پر ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسلمانان ہند کے جمود و غفلت نے دم توڑ دیا' ان کے شعور و احساس میں ایک حرکت رونما ہوئی اور ملک کی فضا ''دینی تعلیم'' کی پکار سے گونج اٹھی۔

حضرت مولانا مرحوم خدمت و عمل کی دوسری ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اس پیغام کو لے کر ملک میں نکلے تو بہت ہی جلد انہوں نے ایک ملک گیر انقلاب بپا کر دیا۔ مسلمانان ہند کے تمام ہی حلقے' کاتب فکر' امیر وغریب' عوام وخواص یہاں تک کہ خالص جدید تعلیم یافتہ

حضرات بھی اس تحریک کی ضرورت اور وقت کے تقاضوں سے آشنا ہو گئے اور ملک کے چپہ چپہ پر مجاہد ملتؒ کی تقریروں اور بیانوں نے ایک ایسا سماں پیدا کر دیا کہ ہر طرف یہاں تک کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے خالص جدید ماحول سے بھی استعداد و آمادگی کی صدائیں اٹھنے لگیں اور دینی تعلیم کی مہم وقت کی ایک پکار بن گئی۔ ہر طرف بیداری کی ایک لہر آمادگی عمل اور اس تعمیری مہم سے وابستگی کا مظاہرہ' ان شاندار اجتماعات اور کانفرنسوں میں ہوا جو اس دوران میں جا بجا منعقد ہوئیں اور جن کی رہنمائی مجاہد ملتؒ اور دوسرے بزرگان جمعیۃ نے فرمائی' خصوصیت سے احمد آباد کی بے مثال دینی تعلیمی کانفرنس جو ۱۹/۲۰ اکتوبر ۵۲ء کو حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن کی صدارت میں منعقد ہوئی' کل راجستھان دینی' تعلیمی کانفرنس جے پور جو ۲۳/۲۴ دسمبر کو حضرت مولانا سید محمد شاہد فاخری کی صدارت میں ہوئی۔ الہ آباد کی دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ ۲/۳ اپریل ۵۵ء زیر صدارت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی' بھورا ضلع بلیا کی دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ ۲۸ مئی ۵۵ء بصدارت مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی۔

مشرقی یوپی کی دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ خلیل آباد ضلع بستی ۳۱ مارچ ۵۶ء اور ان سب کے بعد رائے پور (مدھیہ پردیش) کی دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ ۱۳/۱۴ مئی ۵۸ زیر صدارت سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحبؒ جس کا افتتاح وزیر اعظم کشمیر بخشی غلام محمد صاحب نے کیا۔ بمبئی کی دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ ۸/۹ مارچ ۵۹ء زیر صدارت دیوان سید عنایت حسین صاحب مرحوم سجادہ نشین آستانہ خواجہ اجمیریؒ (جس میں وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو بھی شریک ہوئے)' اجین میں مدھیہ بھارت دینی تعلیمی کانفرنس بصدارت مولانا مسعود احمد صاحب صدیقی منعقدہ ۶/۹ نومبر ۵۹ء' مرہٹواڑہ کی دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ میرج ۲۳/۲۴ اکتوبر ۶۰ء اور پالن پور (گجرات) کی دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ ۲۵/۲۶ جون ۶۱ء بصدارت مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی۔

یہ اور ان کے علاوہ اور بیسیوں اجتماع جو ملک کے مختلف حصوں میں جمعیۃ کانفرنس کے عنوان سے اس دوران میں منعقد ہوئے۔ ان تمام اہم اجتماعات اور کانفرنسوں میں جس طرح مجاہد ملتؒ نے شرکت فرمائی اور دینی تعلیمی تحریک پر اپنی ولولہ انگیز تقریروں اور دور آفریں پیغام عمل سے مسلمانان ہند کے قلوب و اذہان کو منور کیا' اسی طرح یہ تمام اجتماع اس عام بیداری'

لگن اور تحریک سے گہری وابستگی کے شان دار مظاہرے تھے جو مجاہد ملتؒ کے انقلاب آفریں پیغام نے ایک خالص تعمیری خدمت کے لیے پورے ملک میں پیدا کر دی تھی۔ یقیناً ناسازگار حالات اور بے سروسامانی کے عالم میں اس دینی تحریک کی کامیابی اور تیز رفتار پیش رفت کا محور مجاہد ملتؒ کی عظیم شخصیت اور ان کی ان تھک جدوجہد تھی۔ جس کی بدولت وہ ملک کی ایک زندہ اور پائیدار تحریک بن سکی اور بفضلہٖ تعالیٰ ملک کے گوشے گوشے میں آج ملت اسلامیہ اس کی نفع بخشیوں سے مستفید ہو رہی ہے۔

دینی تعلیمی کنونشن بمبئی:

۴۹ء سے مسلسل اپنے اسفار اور دوروں، تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ حضرت مولانا مسلمانان ہند کے شعور و جذبات کو بیدار اور دینی تعلیم کے تقاضوں سے آشنا کر چکے تو ضرورت محسوس ہوئی کہ اس عام بیداری اور آمادگی کو ایک مربوط و منظم عملی پروگرام دے کر کام میں لگا دیا جانا چاہیے، چنانچہ مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند نے اپنے اجلاس۔ بمبئی منعقدہ مارچ ۵۲ء میں کل ہند پیمانہ پر ایک نمائندہ اجتماع بلانے کا فیصلہ کیا تاکہ فکر و شعور کی وحدت اور ہم آہنگی کے ساتھ مسلمانان ہند کے تمام مکاتب خیال تعلیمی مہم کا ایک دستور کار مرتب کر سکیں اور اس کے مقاصد کو بروئے کار لا سکیں۔ اپنی نوعیت کے اس بے مثال اور تاریخی اجتماع کے اہتمام و انصرام کی ذمہ داری مجاہد ملتؒ کے سوا کون نباہ سکتا تھا۔ بمبئی کے رفقاے کرام نے حضرت مولانا کو فراخ دلی کے ساتھ اپنا پورا اعتماد اور تعاون پیش کیا اور بالآخر ۹/۸ جنوری ۵۵ء کو قیصر باغ ہال بمبئی میں ملت اسلامیہ کا وہ تاریخی اجتماع ''کل ہند دینی تعلیمی کنونشن'' کے نام سے منعقد ہوا۔ جو ظاہری شان و شوکت، حسن انتظام و انصرام کے علاوہ اپنی اثر آفرینی اور افادیت، مکمل نمائندگی بے مثال کامیابی اور وحدت فکر و عمل کے لحاظ سے بھی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک بے مثال اجتماع تھا۔ جہاں ملت اسلامیہ کے وہ تمام گروہ حنفی، شافعی، مالکی، مقلد، غیر مقلد، شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی، خوجے، بوہرے، حسینی، فاطمی وغیرہ جدید اور قدیم ماحول و مزاج کے اہل علم و ماہرین تعلیم، سربرآوردہ زعماء جن کے فکر و عمل کے دائرے ہمیشہ جدا جدا رہے ہیں ملک کے گوشے گوشے سے آئے اور وحدت کلمہ کی بنیاد پر ایک خالص دینی نصب العین کے لیے سر جوڑ کر بیٹھے اور صفائی قلب و ذہن کے ساتھ دینی تعلیمی مہم کو اپنا کر اٹھے اور اتحاد و عمل کا ایک یادگار

نمونہ تاریخ کے حوالے کر گئے۔

کنونشن کا افتتاح صدر جمعیۃ علماء ہند حضرت شیخ اسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ نے فرمایا ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب صدر شعبہ فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن کنونشن کے صدر' ملا یوسف نجم الدین صاحب صدر استقبالیہ اور الحاج احمد غریب صاحب جنرل سیکریٹری مجلس استقبالیہ مہمان داری اور انتظامات کے روح رواں تھے۔ کنونشن نے اپنے غور و فکر کے نتائج ایک کل ہند دینی تعلیمی بورڈ کے سپرد کیے جس کی تشکیل میں پینتالیس نامور زعمائے ملت و ماہرین تعلیم شریک ہوئے اور جنرل سکریٹری مجاہد ملتؒ بنائے گئے۔

جس وقت بمبئی میں یہ کنونشن منعقد ہو رہا تھا پورے ملک کی نگاہیں اس پر لگی ہوئی تھیں۔ ملک بھر کے مسلم اخبارات اور ارباب صحافت یہاں تک کہ جمعیۃ کے سیاسی مخالفین نے بھی جمعیۃ کی اس تحریک اور مجاہد ملتؒ کے اس دور آفریں کارنامہ پر بے اختیار تحسین و آفرین کی صدائیں بلند کیں اور اس کی بے مثل کامیابی پر دلی تہنیت و تبریک کے پیغام بھیجے۔

دینی مدارس اور تعلیمی اداروں کی سرپرستی:

اپنے دوسرے اہم قومی و ملی مشاغل اور ہنگامی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو عام تعلیمی سرگرمیوں سے بھی مسلسل شغف رہا۔ وہ خود دینی مدارس کے تعلیم و تربیت یافتہ تھے۔ فراغت کے بعد انہوں نے اپنی زندگی ایک استاذ اور معلم ہی کی حیثیت سے شروع کی تھی۔ ابتداءً دارالعلوم دیوبند میں پھر پیریا میٹ مدراس اور اس کے بعد ڈابھیل' امروہہ وغیرہ میں انہیں علمی خدمت کی کافی سعادت حاصل ہوئی۔ آزادی وطن کے بعد ان کے قیمتی اوقات کا بیشتر حصہ ہنگامی اور وقتی مسائل میں گزرا' لیکن اس دور میں بھی انہوں نے ملت کی جو سب سے اہم تعمیری خدمت انجام دی وہ جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے ملک گیر پیمانہ پر دینی تعلیم کی مہم برپا کرنا اور مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو الحاد و بے دینی سے بچا کر ان میں دینی حمیت و شعور اور حرارت ایمانی کا تحفظ و بقا ہی تھا' جس کے لیے انہوں نے پورے ملک کے دورے کر کے تحریر و تقریر کے ذریعے برادران ملت کے شعور کو بیدار کیا اور وقت کے تقاضوں سے روشناس کرایا۔

دہلی کی تعلیم گاہیں:

اس اہم بنیادی خدمت کے ساتھ ساتھ وہ موجودہ دینی مدارس اور دوسری تعلیم گاہوں کی ہر ممکن مدد اور سرپرستی بھی برابر فرماتے رہے۔ تقسیم ہند کے بعد دہلی کے مشہور دینی مدارس' مدرسہ امینیہ' مدرسہ عالیہ فتح پوری' مدرسہ حسین بخش' مدرسہ مولانا عبدالرب مرحوم نیز فتح پوری مسلم ہائی اسکول' دلی کالج اجمیری گیٹ اور اس کا اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول' دہلی کی مسلم آبادی کے ساتھ ساتھ ویران ہو کر رہ گئے تھے۔ ان سب مدارس اور تعلیم گاہوں کو نئے سرے سے زندہ کرنے اور باقی رکھنے میں اور ان کی مشکلات کو دور کرانے میں بہت بڑا حصہ حضرت مجاہد ملتؒ کی مسلسل کوششوں کا ہے۔ وہ بذات خود ان تمام اداروں کی مجالس کے رکن رکین اور مددگار رہے اور اپنی انتہائی عدیم الفرصتی کے باوجود ان کی میٹنگوں میں پورے فکر و اہتمام کے ساتھ شریک ہوتے اور ان کے مسائل کو حل کراتے رہے۔

مدرسہ معینیہ اجمیر:

اجمیر کی بربادی کے بعد جہاں درگاہ معلیٰ حضرت خواجہ اجمیریؒ کے تحفظ اور اس کے انتظامات کی اصلاح کے لیے مولانا مرحوم نے بھرپور کوششیں کیں۔ وہاں مدرسہ معینیہ اجمیر کی نشاۃ ثانیہ بھی حضرت مرحوم ہی کی مساعی جمیلہ کے سہارے عمل میں آئی اس مدرسہ کا افتتاح بھی خود حضرت مولاناؒ نے ۲۱ / مارچ ۱۹۵۲ء کو اپنے دست مبارک سے فرمایا اور پھر زندگی بھر اس کے معاملات و مسائل میں مدد فرماتے رہے۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ:

تقسیم بنگال کے ہاتھوں کلکتہ کا مشہور مدرسہ عالیہ جو مقامی اصطلاح میں ''کلکتہ مدرسہ'' کہا جاتا ہے' ختم ہو گیا تھا۔ مجاہد ملتؒ نے حضرت مولانا آزادؒ وزیر تعلیم حکومت ہند کو توجہ دلا کر حکومت مغربی بنگال پر زور دلایا اور کافی جدوجہد کے بعد اس کا اجراء عمل میں آیا۔ مدرسہ کا تمام اثاثہ لٹ چکا تھا۔ از سر نو اس کی زندگی کے سروسامان مہیا کیے گئے۔ ابتداء حضرت مولانا کے رفیق خاص ''مولانا سعید احمد اکبر آبادی'' اس کے پرنسپل رہے۔ بحمد اللہ آج مشرقی ہندوستان کا بڑا مدرسہ علوم دینیہ و اسلامیہ کی خدمت گزاری میں مصروف ہے۔

دوسری درس گاہیں:

جامعہ قاسمیہ مراد آباد' قدرت ہائی اسکول سیوہارہ' مسلم انٹر کالج اٹاوہ اور دوسری کتنی ہی درس گاہوں کو مسلسل حضرت مولانا کی عظیم شخصیت سے فیض پہنچا۔ وہ ایسے متعدد علمی اداروں کے رکن مجلس انتظامیہ رہے اور ہمیشہ ان کی مدد و رہنمائی فرماتے رہے۔

مدرسہ عالیہ رام پور' حمید کالج بھوپال' مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ اور بعض دوسری اہم درس گاہیں جو تقسیم ہند سے پہلے سرکاری طور پر مستند اور اسلامی درس گاہیں رہیں اور دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی کے مضامین اور دینی علوم بھی ان کے نصاب میں شامل رہے۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد متعلقہ ریاستی حکومتوں کے ذمہ داران محکمہ تعلیم مسلسل درپے رہے کہ ان کے نصاب سے اسلامی و مشرقی مضامین خارج ہو جائیں۔ بلکہ عملاً ان درس گاہوں کے سرکاری استناد (ریکوگنیشن) کو ختم کر دیا گیا اور مروجہ امداد روک دی گئی۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلے میں برسوں ریاستی حکومتوں سے مراسلت اور زبانی گفتگوؤں کا سلسلہ جاری رکھا اور بالآخر ان کی قدیم حیثیت کو بڑی حد تک بحال کر دیا گیا۔

دسیوں چھوٹے بڑے مدارس جو ٹونک' ہاپوڑ' بلند شہر' میرٹھ' مظفر نگر' امروہہ' بریلی' شاہجہان پور' ہردوئی' مبارک پور' غازی پور' وغیرہ میں چل رہے ہیں۔ اپنے معاملات و مشکلات میں حضرت مولانا مرحوم کی شفقتوں سے فیض یاب ہوتے رہے۔ ان مدارس کے سالانہ جلسوں میں بارہا مولانا مرحوم نے شرکت فرمائی ان کے لیے مالی امداد فراہم کرانے میں بھی کوشش اور سفارش کا بڑا وسیلہ حضرت مولانا ہی کی باا ثر شخصیت تھی۔

جامعہ ملیہ دہلی:

کے عمائدین و سربراہ بھی ۱۹۴۷ء کے بعد نئے اور الجھے ہوئے حالات میں مجاہد ملتؒ کی ملی دردمندیوں سے جامعہ کے معاملات اور مشکلات میں مدد حاصل کرتے رہے اور بالآخر ان کو جامعہ کی بااختیار "مجلس جامعہ" کا رکن بھی بنالیا گیا۔ ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء میں جب کہ جامعہ ایک اندرونی کش مکش اور الجھن سے گزر رہا تھا' حضرت مولاناؒ ہی کی سعی و تدبیر نے اس کے لیے مسیحائی کا کام کیا اور ایک بڑے خلفشار سے جامعہ کو نجات حاصل ہوئی۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ:

علی گڑھ یونی ورسٹی جو ہندوستان کی واحد مسلم یونیورسٹی اور ہماری پچھلی ایک صدی کی ایک عظیم الشان علمی وراثت ہے۔ لیکن ملکی سیاست میں اس کا ماحول' اس کی روایات اور سیاسی رجحانات تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات میں بالکل بے ربط اور اجنبی بن کر رہ گئے تھے۔ تحریک آزادی کے بالکل آخری دنوں میں علی گڑھ اسٹیشن پر قوم پرور ملکی رہنماؤں اور خاص طور پر حضرت مولانا آزادؒ اور خود حضرت مجاہد ملتؒ کے ساتھ جو حوادث پیش آچکے تھے ان کی یاد دلوں میں تازہ تھی۔ ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کی صبح اس عظیم درس گاہ کے لیے خطرات و آزمائش کا پیغام بن کر نمودار ہو رہی تھی۔ مگر یہی دونوں اولوالعزم رہنما تھے جو مسلم یونیورسٹی کے پشت پناہ بن کر سامنے آئے اور ان کی چارہ گری و دستگیری ملک کے نئے حالات میں مسلم یونیورسٹی اور اس کے عزت و وقار کو باقی رکھنے کا وسیلہ ثابت ہوئی۔ مولانا آزادؒ نے محترم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (بعد کے صدر جمہوریہ ہند) کو بحیثیت وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کا سربراہ بنا کر بھیجا۔ ادھر شروع ۱۹۴۸ء ہی سے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے یونیورسٹی کے معاملات و مسائل سے دلچسپی لینی شروع کی اور ہر موقع پر اس کی مدد و رہنمائی میں پیش پیش رہے۔ یونیورسٹی کے ارباب اختیار نے بھی پورے احترام اور قدر شناسی کے ساتھ حضرت مولانا کے تعاون اور مشوروں کو اپنایا اور یونیورسٹی کی ایگزیکٹو اور کورٹ کے معزز رکن کی حیثیت سے مسلسل ان کی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا۔ واقعہ یہ ہے کہ ملک کے تنگ نظر حلقے ۱۹۴۷ء سے مسلسل مصروف کار رہے ہیں کہ اس یونیورسٹی کا نام تبدیل کر کے اس کی مخصوص حیثیت کو ختم کر دیا جائے۔ حکومت یوپی جس کے حدود کار میں مسلم یونیورسٹی واقع ہے اس کا رویہ شروع ہی سے بہت ہمدردانہ اور دوستانہ نہیں رہا۔ مرکز میں بھی ایک خاص طبقہ آج تک معاندانہ اور نکتہ چین رہا ہے۔ مسلم یونیورسٹی کا نام بدل دینے کی بحثیں تو بارہا چھیڑی جا چکی ہیں۔ لیکن ۱۹۵۹ء' ۱۹۶۰ء میں ہند پارلیمنٹ تک میں مسلم یونیورسٹی کے خلاف کچھ کوششیں صف آرا ہوگئی تھیں۔ اس موقع پر تنہا مجاہد ملتؒ کی ذات تھی جو پارلیمنٹ میں مسلم یونیورسٹی کے دفاع اور مدافعت کے لیے سینہ سپر ہوئی۔ انہوں نے پارلیمنٹ میں ہی ان تمام الزامات اور نکتہ چینیوں کا جواب دیا جو یونیورسٹی کے خلاف عائد کیے گئے تھے۔ ساتھ ہی مرکزی وزارت تعلیم کی نظر میں

یونیورسٹی کے دامن کو شکوک والزامات سے صاف کرنے کے لیے پوری جدوجہد فرمائی۔ الغرض مسلم یونیورسٹی کے خلاف معاند اور تنگ نظر حلقوں کی ان تمام کوششوں کو تدارک اور روک تھام کے لیے جو سرگرمیاں پچھلے پندرہ برس میں مسلسل عمل میں آتی رہی ہیں اور جن کی بدولت مسلم یونیورسٹی کو تقسیم ہند کے بعد بقا واستحکام نصیب ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تمام سرگرمیوں کا محور امام الہند مولانا آزادؒ ہمارے محبوب وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ ہی رہے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند:

دارالعلوم دیوبند جو ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی و دینی درس گاہ ہے۔ مجاہد ملتؒ نے اس کے دامن فیض میں پرورش پائی تھی۔ مادر علمی کا حق خدمت جس گہرے احساس اور لگن کے ساتھ عمر بھر انہوں نے ادا کیا وہ درحقیقت بڑی سعادت و کرامت تھی۔ جو ان کے حصہ میں آئی۔ مجاہد ملتؒ نہ صرف یہ کہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین رہے ہے بلکہ دارالعلوم کی فلاح و بہبود ان کے فکر و عمل کا نمایاں عنوان رہی ہے' خاص طور پر تقسیم ہند کے بعد کتنے ہی نئے اور پیچیدہ مسائل سامنے آئے جن کی عقدہ کشائی میں مولانا مرحوم کی با اثر شخصیت پیش پیش رہی۔ پاکستان اور دوسرے ممالک سے آنے والے طلبہ کے لیے پاسپورٹ اور ویزا کے نت نئے قوانین نے جب بھی کوئی پیچیدگی اختیار کی' مجاہد ملتؒ ہی کا اثر و رسوخ اس کو حل کرا سکا۔ ابھی آخری دنوں میں جب دارالعلوم پر ایک ناگہانی افتاد نازل ہوئی اور ریاستی حکومت نے بھی اس موقع پر غیر ہمدردانہ موقف اختیار کیا تو مولانا مرحوم ہی تھے جو سینہ سپر ہوئے اور پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں سے دارالعلوم کا دامن بے داغ رکھ سکے۔

دارالعلوم میں اسلامی ممالک کے سربراہ آئیں یا صدر جمہوریہء ہند ان کے خیر مقدم میں دوسرے عمائدین کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کا یہ نامور فرزند عالی مقام بھی پیش پیش نظر آتا۔

حجاج کرام کی خدمت:

حضرت مولانا مرحوم کو اپنی دوسری گراں بار مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ مسافران حرم کی خدمت گزاری اور ان کی سہولت و رفاہیت کا فکر بھی ہمیشہ عزیز رہا۔ اور ہر ضرورت کے موقع پر مولانا مرحوم کی مساعی جمیلہ زائرین حجاز مقدس کے کام آ سکیں۔ کم وبیش ۱۹۴۹ء سے مسلسل

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سنٹرل حج کمیٹی کے رکن اور پورٹ حج کمیٹی بمبئی کے صلاح کار و مددگار رہے۔ اپنی وفات کے وقت مولانا ہی سنٹرل حج کمیٹی کے چیئرمین تھے۔ حکومت ہند بھی حجاج کے معاملات میں زیادہ تر آپ ہی کے قیمتی مشوروں پر اعتماد کرتی تھی۔ کئی بار حکومت کی فرمائش پر آپ نے بمبئی جا کر حجاج کے انتظامات' جہازوں کی ضروریات' کسٹم چیکنگ' بمبئی کے قیام وغیرہ کا خود تفصیلی جائزہ لیا اور اپنی مفصل رپورٹ اور تجاویز حکومت کے سامنے رکھیں جو بیشتر عمل میں لائی گئیں۔

سب سے پہلی مرتبہ مولانا مرحوم نے ۷ر ستمبر ۱۹۵۰ء کو بمبئی پہنچ کر اپنے رفقائے کار حکیم اعظمی صاحب' مولانا حامد الانصاری غازی' الحاج احمد غریب صاحب وغیرہ کے ہمراہ زائرین حرم کے انتظامات اور اسلامی جہاز کا معائنہ کیا۔ جہازوں میں حجاج کو دی جانے والی خوراک' پلنگ' روشنی' صفائی' ہوا' طبی ضروریات وغیرہ' کسٹم چیکنگ' مسافر خانہ میں قیام' راشن' ٹیکہ وغیرہ تمام ہی معاملات پر ایک مبسوط رپورٹ مرتب کی جس کی بدولت آنے والے برسوں میں بہت کچھ اصلاحات عمل میں آئیں۔ پھر ۹ر جولائی ۱۹۵۱ء کو۔ ۱۵/۱۶ جولائی ۱۹۵۴ء کو ۲۳ر جون ۱۹۵۵ء کو اور ۲۵ر اپریل ۱۹۵۸ء کو بمبئی پہنچ کر اسی طرح تمام معاملات کا معائنہ کیا اور برابر اپنے مفید مشورے حکومت ہند کے سامنے رکھتے رہے۔ اور وقتاً فوقتاً حجاج کو پیش آنے والی تکالیف و مشکلات کو بھی دور کراتے رہے۔ اپریل ۵۴ء میں ہندوستان سے باہر جانے والوں پر انکم ٹیکس کلیرنس سارٹیفیکیٹ کی پابندی عائد ہوئی اور اس کی عملی دشواریاں حجاج کی کثیر تعداد کے لیے ایک مستقل الجھن بنیں تو مولانا مرحوم نے فوراً سکریٹری سنٹرل حج کمیٹی کو لکھا کہ حجاج کو اس پابندی سے مستثنیٰ کیا جائے۔ لیکن وزارت مالیات اس کے لیے آمادہ نہ ہو سکی تو ۲۹ر مئی کو عید الفطر کے روز حضرت مولانا خود وزیراعظم ہند مسٹر نہرو سے ملے اور ان کو حجاج کی اس تکلیف پر توجہ دلائی۔ محترم وزیراعظم نے دوسرے ہی دن متعلقہ وزارتوں کو ہدایت فرما دی اور عام حجاج اس پابندی سے مستثنیٰ کر دیئے گئے۔

جون ۱۹۵۵ء میں عازمین حجاج کی تعداد معمول سے بہت زیادہ تھی' تمام جہاز پر ہو چکے تھے۔ ہزاروں حاجی مایوس و ناکام بمبئی سے واپس ہو رہے تھے حضرت مولانا نے بمبئی ہی سے ٹرنک کال پر وزارت خارجہ کو توجہ دلائی اور بالآخر ان کی اس تجویز کو حکومت ہند نے منظور کر لیا کہ ہر جہاز میں مقرر تعداد سے دس فیصدی اضافہ کر دیا جائے۔ اس طرح مایوس عازمین کی

بڑی تعداد زیارت حرمین سے بہرہ مند ہو سکی۔

۱۹۵۶ء میں حضرت مولانا خود سفر حجاز مقدس پر تشریف لے گئے۔ اس موقع پر بھی ہندوستان واپسی کے بعد آپ نے ساحل ہند سے حجاز مقدس تک ہندی حجاج کے مسائل پر اپنی مفید تجویزیں حکومت کے سامنے رکھیں۔

عام طور پر ہر سال حج کے سیزن میں مولانا مرحوم بمبئی کا ایک سفر ضرور کرتے اور وہاں حجاج کی روانگی اور انتظامات کی دیکھ بھال' مسافر خانہ میں عام حجاج سے ملاقات و گفتگو ضرور فرماتے۔

ستمبر ۱۹۵۶ء میں وزیر مالیات حکومت ہند مسٹر کرشنما چاری نے ''خرچہ ٹیکس'' کا بل پارلیمنٹ میں پیش کیا' مجاہد ملتؒ نے حج و زیارت کے مصارف' عام مذہبی اخراجات' خیراتی اداروں کے چندوں اور بیرون ہند مقدس مذہبی مقامات کے لیے دی جانے والی رقوم کو اس بل سے مستثنیٰ کرانے کے لیے بڑی جدوجہد کی اور بالآخر ان کی کوششیں کامیاب ہو گئیں۔

عالم اسلام سے روابط اور خیر سگالی کے تعلقات:

جمعیۃ علما ہند کے مقاصد کار کا ایک اہم جز ممالک اسلامیہ اور خاص طور پر بلاد عربیہ سے روابط کی استواری اوروں کی خیر خواہی و خیر سگالی بھی ہے۔ اس عنوان کے تحت جمعیۃ نے اپنے پچھلے دور میں تقسیم فلسطین کے عزائم اور صیہونی تحریک کے خلاف مسلمانان ہند کی رائے عامہ کو بیدار کرنے اور ان کے جذبات کو بین الاقوامی سیاسی اسٹیج تک پہنچانے میں اپنا شاندار کردار پیش کیا۔ مجاہد ملتؒ بھی جمعیۃ کی اس تحریک میں پیش پیش رہے۔

ادھر مغرب اقصیٰ (شمالی افریقہ) کے مسلم ممالک' مراکش' تیونس اور الجزائر کی تحریک آزادی نے جب شدت اختیار کی تو ان کے برحق مطالبہ آزادی کی پرجوش تائید و حمایت کے لیے جمعیۃ علماء کے اسٹیج سے مسلسل آواز بلند کی گئی۔ مجاہد ملت نے ۴۸ء میں اور اس کے بعد بار بار اپنے بیانات اور تقریروں میں جمعیۃ علما کے نقطہ نظر کو پیش کیا۔ فرانس نے جب مطالبہ آزادی کو بجر دبانے کے لیے الجزائر میں وحشیانہ مظالم ڈھائے۔ حضرت مولانا نے ہر موقع پر اس کے خلاف آواز بلند کی۔ ملک بھر کی ماتحت جمعیتوں کو ہدایات بھیج کر ''الجزائر ڈے'' کا اہتمام کیا۔ تیونس کے رہنما حبیب بورقیبہ' مراکش کے طیب سلیم اور الجزائر کے

نمائندے حسین الاحوال نے ہندوستان کے دورے کیے تو ان کے خیر مقدم اور تائید میں دوسرے ملکی رہنماؤں کے ساتھ ساتھ جمعیۃ علماء کی جانب سے مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ بھی پیش پیش رہے۔

نہر سوئیز کے قومیائے جانے پر برہم ہو کر جب فرانس اور برطانیہ نے ستمبر ۱۹۵۶ء میں مصر پر یلغار کی۔ حضرت مولانا ان دنوں سفر حجاز سے واپس ہو رہے تھے۔ ہندوستان پہنچتے ہی انہوں نے اکتوبر ۱۹۵۶ء میں جمعیۃ کے سالانہ اجلاس منعقدہ سورت میں ایک خاص قرارداد کے ذریعے مصر کے ساتھ دلی ہمدردی اور اس کی مظلومیت پر رنج و ملال کا برملا اظہار کیا۔ سورت سے دہلی واپس پہنچتے ہی مصر کے سفیر ڈاکٹر مصطفیٰ کامل سے ملے اور مسلمانان ہند کی پیش کردہ امداد برائے مظلومین سوئیز ان کے سپرد کی۔ ان کے علاوہ جب بھی مسلم ممالک کی نمایاں شخصیتیں ہندوستان آئیں مثلاً کرنل انوار السادات سکریٹری موتمر اسلامی (مصر) وسطی ایشیا کے بلاد سمرقند و بخارا سے مفتی ضیاء الدین ایشان بابا خان' دمشق سے استاد سعید رمضان' شیخ بھجۃ البیطار۔ استاذ عبداللہ المبارک وغیرہ وغیرہ ان کے خیر مقدم اور برادرانہ تعارف' تقرب میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اسی ذیل میں آپ نے ہندوستان کی تشریف آوری کے موقعے پر جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے ۲۹ر نومبر ۱۹۵۹ء کو تال کٹورہ گارڈن نئی دہلی میں اور ۱۰ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو بمبئی میں سعودی عرب کے سربراہ جلالۃ الملک سعود کے نہایت شاندار خیر مقدم اور عصرانہ کا اہتمام فرمایا۔ پھر ۱۷ر فروری ۱۹۵۶ء کو کانسٹی ٹیوشن کلب نئی دہلی میں شہنشاہ ایران ہز مجسٹی رضا شاہ پہلوی اور ہر مجسٹی ملکہ ثریا کا' ۱۴ر فروری ۱۹۵۸ء کو کانسٹی ٹیوشن کلب نئی دہلی میں' شہنشاہ افغانستان ہز مجسٹی ظاہر شاہ کا اور ۳۰ر مارچ ۱۹۶۱ء کو اسی کلب میں زعیم مصر صدر جمال عبدالناصر کا اسی طرح مہتم بالشان خیر مقدم کیا۔

(۶)

اسلامی اوقاف کا تحفظ

مسلم وقف ایکٹ کی منظوری اور ریاستی وقف بورڈوں کی تشکیل:

ملک بھر میں پھیلے ہوئے لاکھوں اسلامی اوقاف' مساجد' مقابر' خانقاہوں' درگاہوں اور ان سے وابستہ دینی مقاصد کا تحفظ اور بقاء بھی ایک اہم تعمیری مسئلہ تھا جس پر آزاد ہندوستان کے نئے جمہوری نظام وقوانین میں ایک متعین پالیسی کے ساتھ ملک گیر پیمانے پر کوشش ضروری تھی۔

۱۹۴۷ء میں اور اس کے بعد دہلی' پنجاب' میوات' اجمیر اور راجستھان کے سرحدی اضلاع میں برباد شدہ اور مقبوضہ ہزاروں مساجد و مقابر' درگاہوں اور دیگر اوقاف کی بحالی' ناجائز قبضوں کا ازالہ' مرمت وصفائی' ان سے وابستہ زمینوں اور ملکیتوں کی بحالی وغیرہ تو وہ ہنگامی مسائل تھے جن پر پندرہ برس مسلسل حضرت مولانا نے جدوجہد جاری رکھی۔ ایک ایک مسجد' ایک ایک وقف' ایک ایک درگاہ کے لیے ان کو بار بار متعلقہ حکام کو خطوط بھی لکھنے پڑے' وفود بھی بھیجنے پڑے دسیوں مرتبہ' پنجاب' راجستھان اور اجمیر میں خود جا کر حالات کا مشاہدہ کرنے اور وزراء اور حکام سے مل کر اصلاح حال کی کوشش بھی کرنی پڑی۔ مرکزی حکومت میں برسوں حضرت مولانا آزادؒ وزیر بحالیات اور جنرل بھونسلے نائب وزیر بحالیات اور دوسرے ذمہ داروں سے سیکڑوں ہی مرتبہ مولانا مرحوم کو خود مل کر ایک ایک معاملے کو ٹھیک کرانا پڑا۔

ان تمام کوششوں اور جانفشانیوں کے ساتھ ساتھ ایک نہایت اہم اور مستقل ضرورت تھی کہ یونین پارلیمنٹ اوقاف اسلامی کے بارے میں ایک جامع اور ملک گیر قانون وقف بنائے اور تمام ریاستوں میں اس کے مطابق ایسے ذمہ دار وقف بورڈ بنائے جائیں جو مسلم اوقاف کے تحفظ اور انتظام کے بااختیار ذمہ دار ہوں بحمداللہ مولانا نے مسلمانان ہند کی اس اہم تعمیری خدمت کو بھی جمعیۃ علماء کے اسٹیج سے انجام دیا اور ان کی مساعی جمیلہ کامیاب ہوئیں۔ ۱۹۴۷'

۱۹۴۸ء کے ہنگاموں سے کچھ مہلت پاتے ہی یہ اہم مسئلہ جمعیۃ کی مجلس عاملہ میں اپریل ۱۹۴۹ء میں پیش کیا اور مسلسل دو سال کے غور وفکر کے بعد ماہرین قانون کے مشورے سے شرعی نقطہ نظر کے مطابق اسلامی اوقاف کے لیے ایک مسودہ قانون مکمل کیا گیا جو جمعیۃ کی طرف سے مرحوم محمد احمد کاظمی صاحب ایڈووکیٹ ممبر پارلیمنٹ نے ۱۲راپریل ۱۹۵۱ء کو پارلیمنٹ میں پیش کیا۔ اور حضرت مولانا نے اس کی ضرورت پر وضاحتی تقریر فرمائی۔ پارلیمنٹ نے مسودہ کو غور وفکر کے لیے منتخبہ کمیٹی کے سپرد کیا اور پھر رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے مشتہر کیا گیا۔ جمعیۃ علماء سے اختلاف رکھنے والے کچھ ناعاقبت اندیشوں نے اس موقع پر پورے ملک میں مخالفت کا ایک طوفان کھڑا کر دیا اور یہ مغالطہ دے کر کہ اس میں بل کی آڑ میں جمعیۃ علماء اور وہابی مولوی اوقاف اسلامی پر اپنا تسلط جمانا چاہتے ہیں۔ ایک نہایت ضروری تعمیری خدمت کی راہ میں حائل ہونے کی مذموم وناکام کوشش کی۔ ان غلط کاروں کی روش نے معاملے میں جو الجھن پیدا کر دی تھی۔ حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کو کافی محنت کر کے اس صورت حال کا تدارک کرنا پڑا۔ آخر کار اکثر صوبوں کے معتمد عوام وخواص نے بل کی ضرورت اور افادیت کی تصویب کی اور ۱۳رمارچ ۵۴ء کو جب منتخبہ کمیٹی کی سفارش پر بحث ومباحثہ اور حضرت مجاہد ملتؒ کی وضاحتی تقریر کے بعد مسلم وقف بل ہند پارلیمنٹ میں منظور ہو گیا۔

اس سلسلے میں ریاستی حکومتوں کا رجحان شروع ہی سے یہ رہا کہ ایک جمہوری نظام میں سب ہی فرقوں کے اوقاف کا مشترک بندوبست کسی ایک قانون کے تحت ہونا چاہیے۔ مسلم اوقاف کے لیے الگ مستقل قانون بنانا غیر ضروری ہے۔ لیکن دستور ہند کے مسلمات کی رو سے چوں کہ یہ خیال سراسر غلط تھا اور عملاً مسلم اوقاف کے لیے بڑا خطرناک ہو سکتا تھا۔ اس لیے مجاہد ملت نے پوری پامردی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔ تاہم وقف ایکٹ کے نفاذ کے بعد اس کی تعمیل اور وقف بورڈوں کی تشکیل میں ریاستی حکومتوں کی طرف سے ٹال مٹول اور دفع الوقتی کی پالیسی جاری رہی اور مجبوراً اس مرحلے پر بھی مسلسل ایک مہم کی طرح کام کرنا پڑا۔

دہلی، یوپی، بہار اور بنگال میں ریاستی سطح پر پہلے سے اپنے اپنے وقف ایکٹ نافذ العمل تھے۔ ضرورت صرف اتنی تھی کہ تمام ریاستوں میں انتظامی سہولتوں اور یکسانیت کے لیے صوبائی وقف بورڈ نئے مرکزی ایکٹ کو اپنے یہاں اپنا کر دستور العمل بنالیں، لیکن دوسری ریاستوں

مثلاً' پنجاب' راجستھان' مدھیہ پردیش' مہاراشٹر' آندھرا وغیرہ میں قانون کا نفاذ اور وقف بورڈوں کی تشکیل باقی تھی۔ اور اس کے لیے فرداً فرداً ہر ہر ریاست کے معاملے میں حضرت مولانا کو خود بار بار جدوجہد کرنی پڑی۔ مرکزی وزراء سے بار بار توجہ مبذول کرائی۔ خود بھی مولانا مرحوم ان ریاستوں کے وزراء سے بار بار ملے۔ صوبائی جمعیتوں نے بھی تقاضے جاری رکھے۔ تب بھی یہ مسلسل جدوجہد آندھرا' پنجاب' مدھیہ پردیش تک کامیاب ہوئی۔ راجستھان کا وقف بورڈ مولانا مرحوم کی آخری علالت ہی کے زمانہ میں بن پایا۔ کچھ ریاستیں ابھی تک باقی ہیں۔

اوقاف پر ناجائز قبضے اور قانون تمادی:

اسی ذیل میں ایک اور اہم سوال سامنے آیا کہ پنجاب' میوات' دہلی وغیرہ میں جن مسلم اوقاف کے ناجائز قبضے ۱۹۴۷ء سے ابھی تک جاری ہیں اور مسلسل جدوجہد کے باوجود بحال نہیں ہوسکے ہیں۔ بارہ سالہ قبضے کا قانون تمادی ان کے لیے ایک مستقل خطرہ بن رہا تھا اور ناجائز قابضین اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو خدا تعالیٰ جزائے خیر دے کہ اس کے لیے بھی انہوں نے پوری بھاگ دوڑ کی۔ وزیر قانون سے ملے' ہوم منسٹر سے بات کی قانون دانوں سے مشورہ کیا اور بالآخر صدر جمہوریہ ہند سے مل کر معاملے کی نزاکت ان پر واضح کی اور اس کی نتیجہ میں ۲۱ رجولائی ۱۹۵۹ء کو صدر جمہوریہ نے ایک خصوصی آرڈی نینس جاری کر کے ناجائز تصرفات میں تمام مسلم اوقاف کی حد تک قانون تمادی کی مدت ۱۲ سال سے بڑھا کر ۲۰ سال کر دی اور مسلم اوقاف ایک بڑے خطرہ سے محفوظ ہو گئے۔

اسی طرح ایک اور خطرہ اس وقت سامنے آیا جب کہ ستمبر ۱۹۵۷ء میں گورنمنٹ آف انڈیا کا ایک لاکمیشن اس غرض کے لیے مقرر کیا گیا کہ وہ ہندوستان بھر کے خیراتی اداروں' اوقاف اور موہوبہ عوام سکنائی عطیات کے ملے جلے انتظام کے امکانات پر اپنی رپورٹ اور سفارش مرتب کرے۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اس رجحان میں لپٹے ہوئے خطرات کو بروقت محسوس کرتے ہوئے ایک بار پھر جدوجہد کی کہ اس کمیشن کے حدود کار سے اسلامی اوقاف کو دور رکھا جائے اور ان کا انتظام واختیار مستقل حیثیت سے مسلمانوں ہی کے

ہاتھ میں باقی رہے۔ مولانا مرحوم کی موثر جدوجہد اس مرحلے پر بھی کامیاب ہوئی اور مسلم اوقاف کے تحفظ کی جان توڑ کوششیں فرماتے رہے، غرض یہ کہ اس تمام عرصے میں ملک وملت کی دوسری ہزاروں ذمہ داریوں اور اہم سے اہم معاملات کے فکر کے ساتھ ساتھ مولانا مرحوم کے قیمتی وقت اور توانائیوں کا بڑا حصہ اس راہ میں بھی صرف ہوتا رہا اور بفضلہٖ تعالیٰ اس نازک ترین دور میں اوقاف اسلامی کے تحفظ اور بقاء وفلاح کے لیے حضرت مولانا مرحوم بہت کچھ مفید اور کامیاب خدمات انجام دے کر دنیا سے رخصت ہوئے۔

(۷)

قومی زبان کا مسئلہ

ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ساتھ ملک کی غیر قدرتی تقسیم نے ''عمل اور ردعمل'' کی جو ناگہانی صورت حال برپا کی اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ فکر و نظر کے تمام قالب بدل گئے اور متعدد بنیادی مسائل جو تحریک آزادی کے دنوں اپنی متعین صورت میں مسلمات کا درجہ رکھتے تھے' ملک کی وحدت کے ساتھ ساتھ ان کی متعین پوزیشن بھی بکھر کر رہ گئی۔ ان ہی مسلمات میں قومی زبان اور اردو کا مسئلہ بھی تھا۔

''آزاد ہندوستان کی قومی زبان وہ عام فہم ہندوستانی ہوگی جو پورے شمالی ہند میں رائج اور ملک کے دوسرے حصوں میں متعارف و مشہور ہے' اس کے رسم الخط اردو اور دیوناگری رہیں گے''

یہ تھا گاندھی جی کا واضح نظریہ جو کانگریس کے حلقوں میں طے شدہ مسئلہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن تقسیم ہند کی بدولت جوش و جذبات کا تلاطم ایسے سب ہی اصول اور مسلمات کو بہا لے گیا اور ان کی جگہ غور و فکر کی نئی ادائیں بروے کار آئیں۔ ٹھیک اس فضا میں (۴۹ء میں) قومی زبان کا سوال جب کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے سامنے آیا تو دونوں نقطہ نظر زیر غور تھے۔ خود کانگریس پارٹی کا بڑا حصہ اس اہم سوال کو خالص وقتی جذبات کے رنگ میں دیکھ رہا تھا اور پوری قوت کے ساتھ اس پر تلا ہوا تھا کہ ہندوستان کی قومی زبان' ہندی ہو' بہت کم دماغ تھے جو جذبات کی سطح سے بالاتر ہو کر حقیقت بینی اور دور اندیشی کے ساتھ اس سوال کو طے کرنا چاہتے تھے۔ ان کی واضح رائے یہی تھی کہ عملاً پورے ملک کے لیے جو فیصلہ قابل قبول ہو سکتا ہے وہ یہی ہے کہ گاندھی جی کی قطعی رائے کو بروے کار لایا جائے' اور قومی زبان ''ہندوستانی'' رکھی جائے۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اس گروپ کی صفوں میں پیش پیش تھے۔

مجھے آج تک وہ منظر یاد ہے کہ اس بنیادی مسئلے کے تصفیے کے لیے جس روز دستور ساز

اسمبلی کی کانگریس پارٹی کا ایک ہنگامی اجلاس کانسٹی ٹیوشن ہاؤس نئی دہلی میں ہو رہا تھا۔ دونوں نقطہائے نظر کی کش مکش اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی' مولانا مرحوم اور مسٹر رفیع احمد قدوائی مرحوم کے دست راست آنجہانی خورشیدی لال ''ہندوستانی'' کی حمایت اور پیروی میں سرگرم کار تھے۔ مولانا بار بار اجلاس میں جاتے اور آتے۔ اپنے ساتھی ایک ایک ممبر کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے اور بے چین تھے کہ کانگریس پارٹی حقیقت پسندی کے ساتھ قومی زبان کے مسئلے کو طے کرے۔ اور پھر جب جذبات کی رو میں ڈوبی ہوئی عددی اکثریت' ہندی کا فیصلہ کرا چکی گاندھی جی کی رائے کے مطابق ''ہندوستانی'' کو ہمیشہ کے لیے نظر انداز کر دیا گیا۔ مولانا مرحوم اپنے گہرے تاثر اور ملال کے ساتھ واپس آئے۔ ان کے دل پر ایک چوٹ تھی اور چہرے پر اپنی ناکامی سے زیادہ کانگریس کے بنیادی اصولوں کی شکست کا احساس تھا۔

ان دنوں کانگریس پارٹی میٹنگ میں اور پھر دستور ساز اسمبلی میں قومی زبان کے عنوان پر حضرت مولانا نے جس وضاحت اور دلیری کے ساتھ اپنے نقطہ نظر کو پیش کیا اس کی یادگار مولانا کی وہ تقریر ہے جو اس تالیف میں بھی پیش کی جا رہی ہے۔ بہر حال دستور ساز اسمبلی میں لگاتار کوشش اور پیروی کے بعد بھی اردو زبان کے لیے صرف اسی قدر کامیابی ہو سکی کہ ملک کی دوسری تیرہ زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی ہندوستان کی ایک زبان تسلیم کر لیا گیا اور اس کے حقوق کی راہ متعین ہو سکی۔ لیکن فیصلہ اور دستور کی حد تک اردو کی ایک متعین حیثیت ہوتے ہوئے بھی جہاں تک عملی دنیا کا تعلق ہے اردو کے حق میں ہندوستان کی فضائیں برابر تنگ و تاریک رہی ہیں۔ بلکہ سرکاری دائروں میں اردو کے ساتھ معاندانہ سلوک اور قدم بقدم اس کو پامال کرنے کی روش بدستور آج تک قائم ہے اور واقعتہً ہماری تاریخ کا یہ عجیب المیہ ہے کہ آزادی کے دور میں خود اسی ملک کی ایک زبان اردو کے حق میں ملک کی فضائیں اس قدر گھٹ کر رہ گئی ہیں کہ بڑی سے بڑی جمہوری اور دستوری کوششیں ہر فرد اور خیال کے اونچے سے اونچے ارباب فکر و نظر اور محبوب وزیر اعظم ہند کی انتہائی بااثر بانفوذ شخصیت بھی اردو کی قدر و قیمت کے برملا اعتراف سے زیادہ عملاً اس کے جائز حقوق دلانا تو در کنار اس کے حقوق کی پامالی کو بھی آج تک نہ روک سکیں۔

بہر کیف تاریخ کے اس منفی ریکارڈ اور حالات کی انتہائی ناسازگاری کے باوجود ملک کا ایک سنجیدہ حلقہ پچھلے پندرہ سولہ برس میں مسلسل سرگرم کار رہا اور اس کی تحریک آج بھی جاری

ہے کہ اردو کے حق میں دستور ہند کی دی ہوئی گنجائشیں عملاً بروے کار لائی جائیں اور ہندوستان کی اس ''یتیم'' زبان کو بھی ہندوستان میں زندہ رہنے اور پھولنے پھلنے کے مواقع حاصل ہوں۔

اس تحریک کے قائدین میں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جتنی جانفشانی اور سرگرمی کے ساتھ کام کیا وہ ان ہی کا حصہ تھا۔ اپنی معروف ترین زندگی اور کاموں کے بے اندازہ ہجوم میں بھی انہوں نے پچھلے پندرہ برس مسلسل اردو کے لیے وہ سب کچھ کیا جو کسی بڑی سے بڑی تحریک کا قائد اپنے نصب العین کے لیے کر سکتا ہے۔ ہند پارلیمنٹ کے اندر اور اس سے باہر اردو تحریک کے ہر قدم پر وہ پیش پیش رہے۔ کل ہند انجمن ترقی اردو کا کوئی اہم سے اہم فنکشن ہو یا دلی کی مقامی اردو سبھا کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا جلسہ' مولانا مرحوم پورے اہتمام اور لگن کے ساتھ اس میں شریک ہوتے اور اس کے افکار و اعمال میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔

اس پورے دور میں اردو تحریک کا بنیادی پروگرام یہ رہا کہ دہلی' پنجاب' یو' پی وغیرہ شمالی ہندستان میں اردو کو علاقائی زبان کے طور پر پورے حقوق حاصل ہوں اور دوسری کوشش یہ کہ سرکاری تعلیم گاہوں میں' دفاتر اور عدالتوں میں تعلیمی نصاب اور سرکاری لٹریچر میں اردو کے ساتھ جہاں جہاں معاندانہ سلوک ہو رہا ہے اس کی روک تھام ہو اور اردو کے ساتھ انصاف کے لیے مسلسل پیروی و چارہ جوئی کی جائے۔ حضرت مولانا مرحوم نے جس سرگرمی کے ساتھ اردو تحریک کے دونوں پہلوؤں پر کام کیا۔ افسوس کہ اس کی تفصیل تو ان مختصر صفحات میں نہیں سما سکتی۔ البتہ اپنی ڈائری کی یادداشتوں سے کچھ واقعات پیش کر رہا ہوں۔

سب سے پہلے ۲۲ / مئی ۱۹۵۱ء کو انجمن ترقی اردو کا ایک وفد اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کی شکایات کا ایک محضر نامہ لے کر لکھنو میں یو' پی کے وزیر تعلیم شری سمپورنا نند سے ملا۔ اس وفد میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب' حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب' قاضی عبدالغفار مرحوم شریک تھے۔

۲۲ / ۲۳ دسمبر ۱۹۵۱ء میں کل ہند اردو کانفرنس ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اردو کے حقوق کی قانونی اور دستوری جدوجہد کے لیے بیس لاکھ دستخطوں کی مہم کا فیصلہ ہوا۔ حضرت مولانا نہ صرف یہ کہ کانفرنس میں شریک ہوئے۔ بلکہ اس کے اہتمام و انصرام میں بیشتر حصہ مولانا مرحوم ہی کی کوششوں کا تھا۔

۲۱ / ۲۲ مارچ ۱۹۵۲ء اجمیر میں کل ہند اردو کانفرنس (قاضی عبدالغفار مرحوم کی صدارت

میں) ہوئی۔ اس کا افتتاح مجاہد ملتؒ نے ہی فرمایا تھا۔

بیس لاکھ دستخطی مہم کو کامیاب بنانے میں جہاں جہاں ضرورت ہوئی، مجاہد ملتؒ خود سفر کر کے گئے۔ جلسوں میں شریک ہوئے۔ جمعیۃ علماء کی شاخوں اور کارکنوں کے ذریعے اس مہم کو کامیاب بنانے میں پوری مدد فرمائی، جب مسلسل جدوجہد کے بعد بیس لاکھ دستخط پورے ہو گئے تو ۲۵/۲۶ جولائی ۱۹۵۳ء کو لکھنو ہی میں انجمن ترقی اردو کی دوسری کانفرنس ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں دستخطی مہم کی روداد اور فراہم شدہ دستخطوں کو صدر جمہوریہء ہند کے سامنے لے جانے کا پروگرام زیر غور تھا۔ اس کانفرنس کے افکار و اعمال میں بھی حضرت مولانا نے پورا حصہ لیا۔

۱۵ر فروری ۱۹۵۴ء کو نئی دہلی میں انجمن کا معزز وفد ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی سرکردگی میں ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہء ہند سے ملا اور یو پی میں اردو کو علاقائی زبان قرار دینے کے لیے بیس لاکھ سے زائد انسانوں کے تحریری مطالبہ کا گراں بار ریکارڈ صدر موصوف کو دیا۔ اس وفد میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے علاوہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، پنڈت ہردے ناتھ کنزرو، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، شری کشن پرشاد کول، شریمتی اومانہرو، قاضی عبدالغفار، پنڈت سندر لال، پروفیسر مسعود حسن رضوی، حیات اللہ انصاری، بیگم حیات اللہ، شری کرشن چندر اور قاضی عزیز احمد شریک تھے۔

صدر جمہوریہ سے ملاقات کے دوسرے روز نئی دہلی کے ہوٹل وینگرز میں وفد کی جانب سے ایک پریس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں اردو کے مطالبات کی وضاحت اور وفد کی کوششوں کا تذکرہ تھا۔ کانفرنس میں وفد کی جانب سے بولنے والے حضرات ڈاکٹر ذاکر حسین، پنڈت کشن پرشاد کول اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب تھے۔

۲۹ر مارچ ۱۹۵۶ء کو جے پور میں کل راجستھان اردو کنونشن میں اور پھر ۴/۵ر جولائی ۱۹۵۶ء کو علی گڑھ میں منعقدہ اردو کانفرنس میں حضرت مولانا نے شرکت فرمائی۔

۴ر اگست ۱۹۵۶ء کو مولانا مرحوم نے جے پور پہنچ کر راجستھان کے وزیر اعظم، وزیر تعلیم اور ڈائریکٹر تعلیمات سے ملاقات کی اور راجستھان کے اسکولوں میں اردو کو نظر انداز کیے جانے کی شکایات ان کے سامنے رکھیں۔ ملاقات میں سید الطاف احمد خیری صاحب صدر راجستھان اردو کانفرنس اور مولوی احترام الدین شاغل سکریٹری بھی مولانا مرحوم کے

ساتھ تھے۔

۱۵؍فروری ۱۹۵۸ء کو دہلی میں کل ہند اردو کانفرنس ڈاکٹر تاراچند کی صدارت میں منعقد ہوئی، جس کا افتتاح وزیراعظم ہند مسٹر نہرو نے کیا اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنی زندگی کی آخری تقریر بھی یہیں ارشاد فرمائی۔ کانفرنس کے اہتمام و انصرام کے ذمہ دار اعلیٰ اور صدر مجلس استقبالیہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ہی تھے۔ اور بحیثیت صدر استقبالیہ حضرت مولانا مرحوم نے جو خطبہ اس کانفرنس میں پڑھا تھا۔ وہ بلا مبالغہ اردو تحریک کی ایک اہم تاریخ کہا جا سکتا ہے۔ کانفرنس کے بعد ۲۹؍اپریل ۱۹۵۸ء کو نئی دہلی میں انجمن ترقی اردو کا وفد دوسری بار صدر جمہوریہ ہند سے ملا۔ اس میں بھی دوسرے عمائدین تحریک کے ساتھ حضرت مولانا پیش پیش تھے۔ اردو کے سلسلے میں مجاہد ملتؒ کی مسلسل کاوش و دل سوزی کا آخری نقش وہ مکتوب ہے جو انہوں نے اپنے مرض الموت کے دوران جب کہ وہ میڈیسن (امریکہ) میں زیر علاج تھے۔ بستر علالت سے یوپی کے چیف منسٹر شری سی بی گپتا کو لکھا اور اس کی نقل وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو بھیجی اور جس میں یوپی کے سہ لسانی فارمولے میں اردو کو نظر انداز کرنے پر پرزور احتجاج کے ساتھ ساتھ یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ مجوزہ فارمولے میں جس طرح جنوبی ہند تک کی زبانوں کے لیے گنجائش رکھی گئی ہے، غریب اردو کے لیے بھی کچھ رحم دلی اور انصاف پسندی کا ثبوت دیا جائے۔

وزیراعظم ہند پنڈت نہرو نے حضرت مولانا کو اپنا جواب امریکہ بھیجتے ہوئے ان کی رائے سے پورا اتفاق کیا اور لکھا کہ میں چیف منسٹر یوپی کو بھی ساتھ ہی خط لکھ رہا ہوں۔

(۸)

تعلیمی اداروں کی غلط روش

نصابی کتابوں اور مسلم آزار تحریروں کا مسئلہ

مجاہد ملت کے بعض بصیرت افروز مکاتیب:

۱۹۴۷ء کے بعد خاص طور پر مسلمانان ہند کے لیے جو حوادث زیادہ سر اٹھاتے رہے' ان ہی میں ایک اہم مسئلہ جو کبھی تو غیر مسلم مصنفین کی ناواقفیت کے سبب اور کبھی فرقہ وارانہ تنگ دلی کی بدولت رونما ہوتا رہا وہ توہین آمیز' غلط اور مسلم آزار تحریریں تھیں جو آئے دن اخبارات و رسائل اور پبلک لٹریچر میں بھی شائع ہوتی رہیں اور جن سے ملک کے مختلف حصوں میں تعلیمی نصاب کے صفحات بھی داغ دار ہوتے رہے۔

مثلاً ''وشوا تہاس کی روپ ریکھا'' جو ۱۹۵۱ء میں یو پی کے نصاب تعلیم میں شریک کی گئی۔

''فلم انڈیا بمبئی'' اور ''تو مرجیاں کلکتہ'' کے بعض شمارے' جو اپریل' مئی ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئے ''امرت پتریکا الہ آباد'' کا ایک شمارہ جولائی ۱۹۵۲ء کا پانیر لکھنؤ سوتنتر بھارت' جنوری ۱۹۵۶ء۔

دویا بھون بمبئی کی ایک بدنام کتاب ''ریلجیس لیڈرز'' جو اگست ۱۹۵۶ء میں سامنے آئی۔ ان کے علاوہ دسیوں نصابی کتابیں جن کی فہرست پیش کرنا یہاں غیر ضروری ہے۔

ان کتابوں' رسالوں اور اخبارات میں اکثر و بیشتر ایسے مضامین شائع ہوئے جن میں ذات اقدس سرور کائنات ﷺ اور صحابہ کرامؓ یا اسلامی عقائد و نظریات کی توہین و تضحیک تھی اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات پر بزدلانہ حملے یا ہندوستان کے گذشتہ مسلم فرماں رواؤں کا

اشتعال انگیز مذاق اڑایا گیا تھا۔ قابل اعتراض نصابی کتابوں میں ایسے اجزا بھی شامل ہوتے تھے اور ساتھ ہی ایسے اسباق بھی جو معصوم بچوں کو زبردستی ان کے اپنے مذہب کے برخلاف' دوسرے مذہب کی تلقین کریں۔

اس قسم کی تمام تحریریں نہ صرف یہ کہ مسلمانان ہند کے لیے ناقابل برداشت اور اشتعال انگیز تھیں' بلکہ خود دستور ہند اور سیکولرزم کے تقاضوں کو بھی پامال کرتی تھیں۔

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے پچھلے پندرہ برس میں ایسی سیکڑوں نصابی کتابوں پر برملا احتجاج کیا۔ ریاستی اور مرکزی وزراء کو پرزور خطوط لکھے' وقتاً فوقتاً ان سے خود ملاقات کر کے توجہ دلائی پارلیمنٹ میں تقریریں کیں (چنانچہ مولانا مرحوم کی اس سلسلے کی بعض پارلیمنٹری تقریریں اسی تالیف میں آپ کے مطالعہ میں آئیں گی) اور آخر تک ان کا تعاقب کیا۔ بالآخر اکثر و بیشتر وہ کتابیں یا تو نصاب سے خارج ہو گئیں یا ان کی اصلاح کرائی گئی۔

جہاں تک اخبارات و رسائل کے ایسے توہین آمیز مضامین کا تعلق ہے' حضرت مولاناؒ نے بڑی پامردی کے ساتھ ان کا نوٹس لیا' ملک گیر پیمانے پر احتجاج کی صفیں آراستہ کیں اور حکومت ہند کے ذمہ داروں کو خطوط لکھ کر توجہ دلائی۔ اس سلسلے میں کئی بار وہ محترم وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو تک سے ملے اور ہر موقعے پر مسلمانان ہند کے جذبات کی پوری پوری ترجمانی کی۔

کیرالا تعلیمی بل:

شروع ۱۹۵۸ء میں ریاست کیرالا نے ایک تعلیمی بل منظور کیا جس کی دفعات اقلیتوں کو اپنے مذہبی تعلیم کے حق سے محروم کرتی تھیں۔ مجاہد ملتؒ نے جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے اس بل کو سپریم کورٹ آف انڈیا میں چیلنج کرایا۔ دہلی کے مشہور بیرسٹر مسٹر نورالدین احمد نے اس پر بحث کی اور بالآخر سپریم کورٹ نے اس بل کو دستور ہند کے خلاف قرار دیتے ہوئے ناجائز ڈیکلیر کر دیا۔

اسکولوں میں پرارتھنا اور مسلم طلبہ:

۳۰ر اپریل کو ہیڈ ماسٹر صاحب ہائی اسکول پپری ضلع مظفر پور (بہار) کا ایک خط مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو موصول ہوا' جس میں سوال کیا گیا تھا کہ گاندھی جی کی مشہور پرارتھنا اگر

مسلمان بچے سرکاری اسکولوں میں صبح کے وقت گائیں تو کیا ان کے مذہبی نقطہ نظر سے اس میں کوئی بات قابل اعتراض ہے' ایسے ہی سوالات بعض دوسرے اسکولوں کی طرف سے بھی کیے گئے۔ بلکہ بعض جگہ یہ شکایت بھی تھی کہ مسلمان بچوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اس پرارتھنا میں شریک ہوں اگرچہ کسی پرارتھنا یا دعائیہ گیت کے متعلق مسلمانوں کے مذہبی نقطہ نظر اور جواز و عدم جواز کا اظہار چنداں دشوار نہیں۔ تاہم اس پرارتھنا کے ساتھ گاندھی جی کے نام کی نسبت نے معاملے میں ایک خاص اہمیت اور نزاکت پیدا کر دی تھی۔ بہر حال حضرت مولانا نے اس اہم سوال کا بہت واضح جرأت مندانہ اور بصیرت افروز جواب تحریر فرمایا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب پیری ہائی اسکول کا خط:

''پیارے مولانا صاحب! گاندھی جی کی پرارتھنا جو ذیل میں درج ہے' ہمارے ہوسٹل میں گائی جاتی ہے۔ پہلے ہندو مسلمان بچے مل کر اس کو گاتے تھے۔ لیکن اب مسلمان بچوں نے اپنی مذہبی بنیاد پر اعتراض شروع کر دیا ہے۔ اس لیے آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی اس میں اسلامی نقطہ نظر سے کوئی بات قابل اعتراض ہے؟ پرارتھنا:

رگھوپتی راد ھے راجہ رام پتت پتاون سیتا رام
پتت پتاون سیتارام ایشور اللہ تیرے نام
بھج پیارے تو سیتا رام سب کو سمپتی دے بھگوان
رگھوپتی راد ھے راجہ رام پت پتاون سیتا رام''

حضرت مولاناؒ کا جواب:

''محترمی! آپ کا خط ملا۔ شکریہ' گاندھی جی کا یہ مشہور گیت اسلام کے عقیدہ توحید کے بالکل خلاف ہے اس لیے کہ اسلام کا سب سے بڑا اور بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اللہ' ایشور' خدا اس ذات کا نام ہے جو نہ کسی کا باپ ہے' نہ کسی کی اولاد' نہ کسی کا شوہر' نہ بیوی' وہ ان تمام رشتوں سے پاک ہے' اس کا کوئی ہمسر اور برابر نہیں (سورہ اخلاص۔ قرآن حکیم)

جس گیت میں رام۔ ایشور اور اللہ کو ایک ہی بتایا جا رہا ہے اور ساتھ ہی رام کو سیتا جی کا پتی۔ اور سیتا جی کو رام کی دھرم پتنی کہا جا رہا ہے تو ظاہر بات ہے کہ اسلام اس کو قبول نہیں کر سکتا۔ مسلمان بچے اگر پہلے اس پر اعتراض نہ کرتے تھے تو ممکن ہے کہ وہ اس حقیقت سے

ناواقف ہوں۔ لیکن اب اگر واقف ہونے کے بعد ان کو اعتراض ہے تو بجا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ان کو اس گیت کے گانے پر مجبور کیا جائے اس لیے کہ ایک سیکولر اسٹیٹ میں یہ کبھی جائز نہیں ہوسکتا۔

آپ کو غلط فہمی نہ ہو۔ گاندھی جی نے اس گیت کو کیوں پسند کیا۔ اور اگر پسند کیا تو مسلمان جو گاندھی جی کو اپنا پیارا اور محبوب لیڈر مانتے ہیں اس کی اس پرارتھنا کو کیوں پسند نہیں کرتے۔ اس لیے کہ گاندھی جی خود اس اصول کے زبردست حامی تھے کہ کسی کے مذہبی عقائد کو دوسروں پر زبردستی نہیں ٹھونسا جاسکتا اور صحیح اصول بھی یہی ہے۔

رہی یہ بات کہ خود گاندھی جی اس پرارتھنا میں دونوں باتوں میں کیوں کر مطابقت کرتے تھے اور اس کو عقیدہ توحید کے خلاف کیوں سمجھتے تھے۔ یہ گاندھی جی ہی جان سکتے تھے ہم اس کے لیے مجبور نہیں ہیں۔

اس لیے یہ ذہن ہرگز نہیں بننا چاہیے کہ ہر وہ بات جو گاندھی جی نے اپنے لیے پسند کی، ہر مذہب والا اس کو اپنے لیے ضرور روا رکھے، خواہ اس کے مذہب کے بنیادی اصول اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ والسلام

آپ کا مخلص

محمد حفظ الرحمٰن کان اللہ لہ

تصاویر کا مسئلہ:

ذیل میں مجاہد ملتؒ کا ایک روشن مکتوب جو آپ نے ۱۲/اکتوبر ۱۹۵۸ء کو مسٹر عزیز الٰہی کے جواب میں ارسال فرمایا تھا، درج کیا جارہا ہے:

''محترم عزیز الٰہی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

آپ کا خط ملا۔ آپ نے اپنے خط میں دو سوال کیے ہیں، جو یہ ہیں:

۱۔ کیا یہ صحیح ہے کہ مذہب اسلام کی رو سے کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی بھی تصویر یا مجسمہ پر ہار پھول وغیرہ چڑھائے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے مذہبی بزرگوں اور پیغمبروں کی تصویروں اور مجسموں پر بھی ہار پھول چڑھانا اسلامی شریعت کی رو سے

قطعاً گناہ اور نا جائز ہے؟

۲۔ کیا ملک کا سیکولر آئین یا کانگریس کا دستور کسی شخص کے لیے یہ لازم قرار دیتا ہے کہ وہ ملک و وطن کے کسی لیڈر کی تصویر یا مجسمہ پر ضرور ہار پھول چڑھائے اور جو شخص ایسا کرنے سے اپنے مذہب کی پابندی کرتے ہوئے انکار کر دے اس کو مجرم سمجھا جائے۔

آپ نے اس ضمن میں مسٹر معین الحق وزیر آسام کے جس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے اور جو سوالات تحریر فرمائے ہیں ان کا جواب درج ذیل ہے:

۱۔ مسٹر معین الحق وزیر آسام نے جو عمل کیا وہ اسلامی بنیادی عقیدے کے اعتبار سے قابل ستائش ہے۔ میں ان کو اس جرأت حق کی داد دیتا ہوں' اسلام کے عقیدہ توحید کا تقاضہ ہے کہ کوئی عمل مسلمان ایسا نہ کرے جس سے اس کے بنیادی عقیدے پر بالواسطہ یا بلاواسطہ زد پڑتی ہو۔ اسلام نے اسی وجہ سے نبی اور پیغمبر کے ساتھ بھی اس طرح کے عمل کی اجازت نہیں دی جس سے پرستش کا شائبہ یا واہمہ بھی پیدا ہوتا ہو۔ اسلام نے اسی بنا پر نبیوں اور پیغمبروں حتیٰ کہ رسول پاک ﷺ کی تصویر بنانے کو حرام قرار دیا ہے اور اسلام اور پیغمبر ﷺ کی توہین تسلیم کیا ہے۔ اس لیے گاندھی جی کی عظیم شخصیت کی عظمت اپنی جگہ قابل تسلیم رہتے ہوئے بھی کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ گاندھی جی کی تصویر یا مجسمے یا کسی بھی مسلم یا غیر مسلم رہنما کی تصویر یا مجسمے پر ہار پھول چڑھائے۔

۲۔ ہماری قومی حکومت کسی خاص مذہبی عقیدے کی حکومت نہیں ہے' بلکہ ملک کے عوام کی ملی جلی جمہوری حکومت ہے جس کو ہم سب سیکولر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ سیکولر اسٹیٹ کا جو بہترین دستور بنایا گیا ہے۔ اس میں مذہب کی آزادی کو بنیادی حقوق میں اہم ترین حق تسلیم کیا گیا ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے اپنے عقیدے کے مطابق مذہبی آزادی حاصل ہو۔ یعنی کوئی شخص یا کوئی کمیونٹی دوسروں سے اپنے مذہبی عقائد و اعمال زبردستی منوانے کی مجاز نہ ہوگی۔

پس آسام صوبہ کانگریس کمیٹی کے بعض ارکان نے اگر مسٹر معین الحق کے اس عمل پر انڈین نیشنل کانگریس کے پریذیڈنٹ سے ایکشن لینے کی درخواست کی ہے تو ان کا یہ فعل قطعاً باطل اور دستور کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ ایک مسلمان ملک و وطن کے سب سے بڑے شخص اور موجودہ دنیا کی عظیم شخصیت مہاتما گاندھی کی ہر طرح عزت اور عظمت کرتا

ہے۔لیکن اپنے اسلامی عقیدہ کے خلاف کسی فعل یا عمل پر ہرگز ہرگز مجبور نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس سے گاندھی جی کی توہین لازم آتی ہے۔مسٹر معین الحق کا قومی جھنڈے کا لہرانا خود اس کی دلیل ہے کہ جہاں تک وطن اور ملک کی محبت کا تعلق ہے اور ملک کی آزادی اور آزادی دلانے والے کی شخصی عظمت کا تعلق ہے، مسٹر معین الحق کے دل میں ہے وہ دوسرے محبان وطن کے مقابلے میں کسی سے کم نہیں ہے۔اس لیے مسٹر معین الحق کا طرز عمل سرتا سر حق بجانب ہے۔

میں نے اس سلسلے میں محترم شری ڈھیبر بھائی صدر انڈین نیشنل کانگریس کو بھی خط لکھا ہے۔

محمد حفظ الرحمٰن

ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند

پردہ اور سرکاری ملازمت:

مارچ ۱۹۶۰ء میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو ریاست بہار کے بعض علاقوں بالخصوص ضلع چمپارن سے یہ شکایات موصول ہوئی تھیں کہ محکمہ تعلیم کی جانب سے پردہ نشین مسلمان استانیوں اور انسپکٹریس وغیرہ کو جو سرکاری ملازم ہیں محکمہ کی جانب سے مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ پردہ چھوڑ دیں یا سروس سے دست بردار ہو جائیں۔ممکن ہے ملک کے کسی دوسرے حصے میں بھی کہیں کوئی ایسی شکایت درپیش ہو۔بہر حال مولانا محترم نے اپنے خصوصی مراسلے کے ذریعہ وزیر اعلیٰ بہار اور وزیر تعلیم بہار کی توجہ اس افسوسناک شکایت پر مبذول کرائی اور لکھا:

> ''میں ان شکایات کو دیکھ کر حیران ہوں کہ اگر واقعتہً حکومت بہار نے کچھ ایسے احکام جاری کیے ہیں تو قانوناً وہ کہاں تک جائز اور قابل برداشت ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دستور ہند اور بنیادی حقوق کی دفعات ایسے احکام کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتیں۔میں چاہتا ہوں کہ ایسے غلط احکام کو اگر واقعتہً (وہ جاری کیے گئے ہیں) دستور کی روشنی میں چیلنج کروں۔براہ کرم آپ مجھے اپنے ذمہ دارانہ اور اطمینان بخش جواب سے مطلع فرمائیں۔میں منتظر رہوں گا''

وزیر اعلیٰ بہار شری ایس کے سنہا نے مولانا محترم کو اس سلسلے میں جو جواب بھیجا وہ بہت

صاف تھا جو ایسے امور پر سرکاری موقف کو برملا واضح کرتا تھا۔ ذیل میں اس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

پٹنہ ڈی او نمبر ۳۸۸

مارچ ۱۹۶۰ء

مائی ڈیئر مولانا صاحب! آپ کے شکایت نامے پر میں نے ایک مکمل انکوائری کرائی ہے اور میں مطمئن ہوں کہ جو شکایت آپ تک پہنچائی گئی' وہ سراسر بے بنیاد اور غلط ہے۔ اس لیے کہ میری حکومت کی ہمیشہ یہ پالیسی رہی ہے کہ سابق دستور اور ہدایات کو جہاں تک ممکن ہو سکے نباہا جائے اور ان میں کوئی مداخلت نہ کی جائے۔ چنانچہ مسلم خواتین کو خواہ وہ استانیاں ہوں' طالبات ہوں یا گورنمنٹ کی کسی دوسری سروس میں ہوں' بے پردگی پر مجبور کرنے اور پردہ سے دست بردار ہونے پر مجبور کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہو سکتا۔

آپ کا مخلص

دستخط: ایس۔ کے سنہا

(۹)

کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کی ستیزہ کاری

پچھلے پندرہ برس میں فرقہ واریت کے جنون اور بدمستیوں نے جس طرح شہری زندگی میں جابجا بدامنی، قتل و غارت، ہنگامہ وفساد برپا کر کے مسلمانان ہند کو وسیع پیمانہ پر پامال و برباد کیا ہے، اسی طرح قانون تخلیہ کنندگان کی قربانی بھی ان کے لیے مسلسل وبال جان بنی رہی ہے۔

حقیقتاً یہ قانون بھی اسی بھیانک ماحول کا ایک ثمر تلخ تھا جس کی بدولت تقسیم ہند کے ساتھ ساتھ ہندوستان و پاکستان کے لاکھوں بے گناہ، اپنی جان بچانے کی خاطر ترک وطن کرنے پر مجبور ہوئے اور انسانی تاریخ نے آبادیوں کے تبادلے کا حیرت انگیز تماشہ دیکھا۔ قانون تخلیہ کنندگان (ادیکوٹیز پروپرٹیز) کا منشا صرف یہ تھا کہ تارکین وطن کی چھوڑی ہوئی املاک اور جائیدادوں کو حکومت کا ایک محکمہ اپنی تحویل میں لے کر ان کا مناسب بندوبست کرے (اسی منشا کی تکمیل کے لیے محکمہ کسٹوڈین کا تقرر ہوا۔

لیکن محکمہ کے اسٹاف اور کارندوں نے اس قانون کو ایک انتظامی اور جنگی ہتھیار کی طرح گھمانا شروع کر دیا اور اپنے حدود سے تجاوز کر کے ہر اس جائیداد کو جس کی نسبت مسلمان سے تھی، یہاں تک کہ اوقاف، مساجد اور قبرستانوں تک کو اندھا دھند ''نکاسی جائیداد'' قرار دینا شروع کر دیا اور قانون کے نفاذ میں ایسی دیدہ دلیری اور چابکدستی کا مظاہرہ کیا کہ خود ہندوستان کے شہری مسلمانوں کی لاکھوں بلکہ کروڑوں کی جائیدادیں تھوڑے ہی عرصے میں ادیکوئی ڈیکلیر کر دی گئیں، اس طرح ہندوستان کے مسلمانوں پر جو پہلے ہی حالات کی سنگینی اور اقتصادی بدحالی کا شکار تھے، کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کی اس لاقانونیت نے اور بھی زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا۔

مسلمانان ہند کی مظلومیت اور بے چارگی کے اس محاذ پر بھی حضرت مولانا حفظ الرحمٰن

صاحبؒ ہی ان کی مدد اور مدافعت کے لیے آگے بڑھے اور اس صورت حال کے رونما ہوتے ہی مولانا مرحوم نے اس کے تدارک اور چارہ گری کی کوششیں شروع کر دیں۔ پھر آنے والے برسوں میں کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کی کارفرمائیوں کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا کی اصلاحی سرگرمیاں پوری قوت اور پامردی کے ساتھ آخر تک جاری رہیں۔

اس سلسلے میں دہلی کے ابتدائی واقعات جب سامنے آئے تو مجاہد ملتؒ نے فوراً ہی وزیراعظم ہند مسٹر نہرو اور حضرت مولانا آزادؒ کو ان سے آگاہ کیا اور محکمہء مذکور کی غلط روش کی روک تھام کے لیے حکومت ہند کی اعلیٰ سطح پر بھی جدوجہد کی اور قانونی راستہ سے بھی معاملات کی پیروی کے لیے جمعیۃ علماء کی جانب سے ایک قانونی امدادی کمیٹی بنائی' جس کے کنوینر سلطان یار خاں وکیل بنائے گئے اور دوسرے فاضل قانون دانوں کا تعاون حاصل کیا گیا۔ جمعیۃ کی یہ قانونی امدادی کمیٹی ۱۹۴۸ء سے مسلسل چھ سات سال تک کام کرتی رہی اور اس نے کسٹوڈین کی گرفت میں آئے ہوئے ہزارہا مظلوم مسلمانوں کے جن میں بڑی تعداد خود دہلی کے اجڑے ہوئے غریبوں کی تھی' معاملات کی پیروی کا حق ادا کیا۔

اس کے ساتھ ہی جب کسٹوڈین کی غلط کاریوں کا سلسلہ دہلی سے باہر ملک کے دوسرے حصوں میں بھی پھیلنے لگا تو مولانا مرحوم نے وسیع پیمانہ پر اس مصیبت کے انسداد کے لیے جدوجہد شروع کی۔ چنانچہ یکم ستمبر ۴۹ء کو جمعیۃ علماء ہند کے زیراہتمام ایک مخصوص میٹنگ بلائی گئی۔ جس میں دوسرے صوبوں کے ذمہ داران جمعیۃ بھی بلائے گئے اور حضرت مولانا آزادؒ کی موجودگی میں ان سب نے اپنے اپنے صوبوں کے واقعات و مشاہدات بیان کیے اور ان تمام واقعات کی روشنی میں ایک میمورنڈم تیار کیا گیا جس میں محکمہ کسٹوڈین کی ہمہ نوع غلط کاریوں پر واقعات کے حوالے دیئے گئے تھے۔ یہ میمورنڈم لے کر مجاہد ملتؒ اور حضرت مولانا احمد سعیدؒ وزیراعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو اور وزیر بحالیات سے ملے اور یہ مطالبہ کیا کہ اگر واقعی حکومت کا منشاء وہی ہے جو یہ محکمہ انجام دے رہا ہے تو ایک واضح اعلان کر کے مسلمانان ہند کو سوچنے سمجھنے کا موقع دیا جائے۔ ورنہ محکمہء مذکور کی غلط کاریوں کو سختی سے روکا جائے۔ اس کوشش کے نتیجے میں وقتی طور پر حالات میں کچھ اصلاح رونما ہوئی اور متعلقہ آرڈی نینس کو قانون کی شکل دیتے ہوئے کچھ ترمیمات عمل میں لائی گئیں کہ محکمہء مذکور کی مطلق العنانی کو روکا جاسکے۔ تاہم اس محکمے کے کارپرداز جس انتقامی جذبہ کے ساتھ مصروف کار تھے' اس نے

قانون میں طرح طرح کی موشگافیاں کر کے اپنی من مانی کارروائیوں کے لیے نئی نئی راہیں نکال لیں۔ ادھر مجاہد ملتؒ روزمرہ کے واقعات برابر پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور وزیر بحالیات کے نوٹس میں لاتے رہے۔ بہت جلد نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ حکومت ہند کی قطعی پالیسی پر بھی محکمہ کے افسران اعلیٰ نے اپنے حاشیے چڑھانے شروع کر دیئے۔ ایک معاملہ محکمۂ مذکور کی اعلیٰ سطحوں تک پہنچ کر بھی جب انصاف اور قانون کے تقاضوں سے بے ربط رہتا اور پھر مجاہد ملتؒ اس کو محترم وزیر اعظم ہند کے علم میں لاتے تو انہیں بھی حیرانی ہوتی۔ محکمہ کسٹوڈین کی اس مطلق العنانی نے یہاں تک طول کھینچا کہ دہلی کے ایک تاجر محمد دین چھتری والا کے کیس میں پوری یونین کیبنٹ نے غور کر کے اپنی واضح پالیسی سے جب کسٹوڈین جنرل آف انڈیا مسٹر اچھر ورام کو مطلع کیا تو انہوں نے کیبنٹ کے فیصلے سے بھی اتفاق نہ کیا اور اس کے خلاف اپنی رائے پر قائم رہے اور بالآخر ۲۰ ستمبر ۱۹۵۱ء کو وہ اپنی اس اعلیٰ ذمہ داری سے سبک دوش کر دیئے گئے۔

مسٹر اچھر و رام کسٹوڈین جنرل نے سبک دوشی کے بعد اخبارات میں بحث چھیڑ کر پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کے جذبات کو ابھارنا چاہا اور یکم اکتوبر ۱۹۵۱ء کو بعض پناہ گزیں ممبروں نے یہ سوال پارلیمنٹ میں پیش کر ہی دیا۔

جس کے جواب میں خود محترم پنڈت نہرو کو حکومت کے موقف پر اپنا وضاحتی بیان پارلیمنٹ میں پیش کرنا پڑا۔

اس تمام سرگزشت سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے شہری مسلمانوں کو کسٹوڈین ڈیپارٹمنٹ کی لاقانونیت سے بچانے کے لیے مجاہد ملتؒ نے کس پامردی اور تسلسل کے ساتھ اعلیٰ سطحوں تک اپنی موثر جدوجہد جاری رکھی۔

مرکز میں ان کوششوں کے ساتھ ساتھ مختلف صوبوں سے فرمائشیں موصول ہوئیں تو مولانا مرحوم نے اس قانون کے نشیب وفراز سے باخبر اپنے قانونی مشیروں کو بالخصوص مسٹر نور الدین بیرسٹر، مسٹر محمد احمد ایڈوکیٹ اور مسٹر سلطان یار خاں ایڈوکیٹ کو جے پور، جودھ پور، الٰہ آباد وغیرہ بھیج کر درپیش معاملات میں مدد دی۔ بمبئی کی فرمائش پر حضرت مولانا خود تشریف لے گئے اور جمعیۃ علماء صوبہ بمبئی کے وکلاء کے اجتماع میں حکومت ہند کی پالیسی اور طریق کار کی وضاحت فرمائی۔ ہندوستان بھر کے صوبوں کے وفود بھی وقتاً فوقتاً دہلی آ کر اس بلائے بے

درماں کے علاج کے لیے حضرت مجاہد ملتؒ کی ہدایات اور مشورے کرتے رہتے۔

پھر علاوہ اس کے کہ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۶ء تک کے واقعات اور تجربات کی روشنی میں ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے حضرت مولانا کی جدوجہد اور محترم پنڈت نہرو اور مولانا آزادؒ کے توسط سے خود قانون نکاسی جائیداد میں بار بار ضروری تبدیلیاں عمل میں لائی جاتی رہیں۔ جن سیکڑوں بلکہ ہزاروں انفرادی واقعات میں کسٹوڈین عدالتوں نے کسی نہ کسی بہانے اپنے غیر منصفانہ فیصلوں پر اصرار جاری رکھا۔ ان کے آخری تدارک اور درستگی کے لیے خود مجاہد ملتؒ نے کئی کئی برس تک وزارتی سطح پر جدوجہد جاری رکھی اور سیکڑوں معاملات کے تجربے سے حکومت ہند کے ارباب حل وعقد کو بھی جب یقین ہو گیا کہ اس محکمے کی مطلق العنانی کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے تو بالآخر محترم وزیراعظم پنڈت نہرو نے اپنے پرنسپل پرائیویٹ سیکریٹری مسٹر کول، حضرت مولانا اور وزارت بحالیات کے جوائنٹ سیکریٹری مسٹر دنتیا گی پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کر دی جس نے کم وبیش چھ، سات ماہ تک دسیوں ایسے معاملات کو جانچا اور درست کرایا جن میں کسٹوڈین کی اعلیٰ عدالتیں بھی آخر تک غلط فیصلے صادر کرتی رہیں۔

اس کمیٹی کے بعد بھی وزارتی سطح پر ملک بھر کے ہزاروں انفرادی معاملات کی پیروی اور اصلاح کی جدوجہد حضرت مولاناؒ نے اپنی زندگی کے آخر تک جاری رکھی اور ان ہی کی تنہا ذات اور سرگرمیاں کسٹوڈین کے مارے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کی آخری امیدگاہ بنی رہیں۔ اس سلسلے کی چودہ سالہ کش مکش اور کارگزاریوں پر خود حضرت مرحوم کا ایک حقیقت افروز بیان اس تالیف میں شامل ہے جو انہوں نے موجودہ وزیر بحالیات شری مہر چند کھنہ کے نام ایک کھلے خط کی شکل میں اگست ۱۹۶۱ء میں ارسال فرمایا تھا۔ اس کے مطالعہ سے ناظرین کرام مزید اندازہ فرما سکیں گے۔

(۱۰)

حیدر آباد کی تباہی اور اس کے بعد۔۔۔!

تقسیم ہند کے عواقب میں دہلی، پنجاب، الور، بھرت پور اور اجمیر کے بعد جہاں مسلم اقلیت کو ہولناک تباہی سے گزرنا پڑا، وہ ریاست حیدر آباد تھی۔ ستمبر ۱۹۴۸ء میں حیدر آباد پر پولیس ایکشن ہوا، اور اس کا پورا خمیازہ خاص شہر حیدر آباد کو چھوڑ کر ریاست کے وسیع علاقہ اور اضلاع ومفصلات کی مسلم اقلیت کو بھگتنا پڑا، تباہی اور بربادی کی جو گرم بازاری حدود ریاست میں رونما ہوئی، اس کی دہشت نے باقی ماندہ مسلم آبادی کو زندہ درگور کر دیا تھا۔ شمالی ہند کی طرح جنوبی ہند کی اس دم بخود اور نیم جان آبادی کو بھی جس مجاہد وقت کی دستگیری نے نئے سرے سے زندگی کی شاہراہ دکھائی وہ حضرت مولاناؒ کی ذات گرامی تھی۔

دردناک حوادث اور پیش آمدہ واقعات سے مضطرب ہو کر مجاہد ملتؒ نے دسمبر ۱۹۴۸ء میں جمعیۃ علماء کا سب سے پہلا وفد حیدر آباد بھیجا جس میں مولانا عبداللہ مصری اور پنڈت سندر لال شریک تھے۔ ارکان وفد نے حیدر آباد کا دورہ کیا اور اپنے مشاہدات کی رپورٹ مجاہد ملتؒ کے ذریعے پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور سردار پٹیل کے سامنے رکھی۔ پھر ایک دوسرا وفد ۳ر جنوری ۱۹۴۹ء کو بھیجا جس میں مرحوم مولانا بشیر احمد، مولانا نور الدین بہاری، مولانا سید محمد میاں صاحب اور مسٹر سید محمد جعفری شریک تھے۔ تیسرا وفد مولانا محمد اسماعیل صاحب سنبھلی اور مقبول جامعی صاحب پر مشتمل فروری ۱۹۴۹ء میں روانہ کیا۔

ان وفود نے ریاست کے اہم علاقوں کا دورہ کیا۔ حالات کو بچشم خود دیکھا۔ سہمے ہوئے مسلم وغیر مسلم عمائدین سے ملے۔ ان کی ڈھارس بندھائی، ہنگامی مسائل وضروریات کے ساتھ مسلم اقلیت کے تحفظ اور زندگی کی تدابیر ساتھ لے کر لوٹے اور دہلی واپس آ کر اصلاح حال کے لیے جدوجہد شروع کی۔

ان ہی دنوں حیدر آباد میں جمعیۃ علماء کی داغ بیل پڑی۔ مولانا عبدالسبحان صاحب، انور خاں صاحب، مسٹر یونس سلیم وکیل اور مولانا حمید الدین قمر اور ان کے رفقائے کرام نے جماعتی

زندگی کے پیغام پر سب سے پہلے لبیک کہا۔ یہ حضرات بڑے عزم و ہمت کے ساتھ کام کے لیے کھڑے ہوئے اور اس وقت سے کئی برس تک مسلسل دہلی آ آ کر حضرت مجاہد ملتؒ کے ذریعے حیدر آباد کے حالات کو بہتر بنانے کی جدوجہد کرتے رہے۔

نادار مظلوموں کی امداد' اجڑے ہوئے لوگوں کی آباد کاری' مساجد اور عبادت گاہوں کا تخلیہ اور بحالی' پولیس ایکشن میں کام آ جانے والوں کے لاوارث یتیم اور بیوہ پس ماندگان کی نگہداشت جیسے دسیوں وقتی مسائل کے ساتھ ساتھ دہشت زدہ مسلمانوں میں اطمینان واعتماد کی فضا پیدا کرنا اور ان کو ملک کے بدلے ہوئے حالات کے ساتھ مربوط کر کے عزت نفس' خودداری اور صحت مند زندگی کی راہ پر لانا حکومت اور برادران وطن کے حلقوں میں ان کے کھوئے ہوئے اعتماد کو لوٹانا۔ اس وقت سرزمین حیدر آباد پر یہ تمام الجھے ہوئے اور نازک کام جس خوبی تدبیر اور دور اندیشی کے ساتھ انجام پائے آج مسلمانان حیدر آباد کی باوقار شہری زندگی بڑی حد تک ان ہی کوششوں کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔

مرکز میں ان تمام وفود کی سرگرمیوں کا محور اور حکومت ہند تک ان کی رسائی کا وسیلہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ہی تھے۔ حضرت مولاناؒ کی سرپرستی میں مسلسل کوششوں کی بدولت ریاست کے حالات نے بتدریج اصلاح کی شکل اختیار کی۔ جب ہنگامی اور وقتی جدوجہد ایک مرحلہ تک پہنچ پائی تب مجاہد ملتؒ نے بذات خود ۹ راکتوبر ۱۹۴۹ء کو دہلی سے روانہ ہو کر دس روز تک اضلاع و مفصلات حیدر آباد کا دورہ کیا۔ بہت سے معاملات وہیں ملٹری گورنر مسٹر ولوڈی اور ریاستی چیف سیکریٹری مسٹر جین سے مل کر حل کرائے۔ جو کام مرکز کے تھے۔ ان کے لیے واپسی کے بعد مرکز میں مسلسل جدوجہد فرمائی۔ مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی پانی پتی اس دورہ میں حضرت مجاہد ملتؒ کے ہمراہ تھے۔

سال بھر کی ان تھک کوششوں کے بعد حضرت مولانا کے اس دورے نے حیدر آباد کی فضا پر جو گہرے اور مفید اثرات ڈالے اور ان کی حیات بخش تقریروں نے حیدر آباد کو جرأت و استقامت کا جو پیغام دیا اس کی شہادت کے طور پر ہم ''روزنامہ'' شعیب حیدر آباد اور ''ہمارا اقدام'' حیدر آباد کے بعض اقتباس ذیل میں پیش کر دیتے ہیں' جو اخبارات مذکور نے ان ہی دنوں شائع کیے تھے۔

معاصر ''شعیب'' حیدر آباد کا مقالہ افتتاحیہ:

''جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ان دنوں حیدر آباد میں تشریف فرما ہیں اور اضلاع کا دورہ کر رہے ہیں تاکہ مسلمانان حیدر آباد کے حقیقی دکھ درد کو معلوم کر سکیں اور اس کا علاج سوچیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ہندوستان اور مسلمانوں کی جو خدمات انجام دی ہیں' اگر ان کا شمار کیا جائے تو شاید ایک دفتر بن جائے۔ یہ شخص خلوص اور اصول پروری کا پیکر اور ایثار و قربانی کا مجسمہ۔ آپ وطن کی خدمت میں بھی صف اول میں رہے اور مسلمانوں کی خدمت میں بھی اول درجے پر' یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ میں وطن پروری کا جذبہ زیادہ ہے یا مسلم پروری کا' ایک سچے مسلمان کو کیسا ہونا چاہیے۔ مولانا حفظ الرحمٰن اس کے مجسم نمونہ ہیں اور ایک سچا ہندوستانی کیسا ہونا چاہیے۔ اس کا نمونہ بھی' آپ کی ذات بیک وقت ایک سپاہی' ایک والنٹیر' ایک رہنما' ایک مدبر' ایک جادو بیان مقرر سبھی کچھ ہیں۔ اور تمام خوبیوں کے بعد جو سب سے بڑی خوبی ہے وہ آپ کی کسر نفسی' بے غرضی اور بے لوثی ہے۔ مولانا قومی کاموں میں اس طرح مصروف رہتے ہیں کہ کبھی اپنے متعلق انہیں سوچنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ جن لوگوں کو آپ کے ساتھ قومی کام کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے' انہوں نے دیکھا ہے کہ اس شخص کو سوائے کام کے اور کوئی دھن ہی نہیں' مولانا کو جس شخص نے دہلی کے فسادات کے زمانے میں کام کرتے دیکھا ہے اسے یقیناً اس شخص کی عظمت اور خلوص کا قائل ہونا پڑتا ہے اور ہم نہایت احتیاط کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر دہلی میں مولانا حفظ الرحمٰن کی ذات گرامی نہ ہوتی تو آج وہاں ایک مسلمان بھی زندہ نہ بچتا۔

اس وقت جمعیۃ علماء ہند کی روح رواں یہی مولانا کی ذات ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن اس وقت جمعیۃ علماء کا سب سے بڑا سرمایہ اور اثاثہ ہیں۔ بہر حال حیدر آباد کے مسلمانوں کی خوش نصیبی ہے کہ مولانا یہاں تشریف لے آئے ہیں اور ہمیں توقع ہے کہ حیدر آباد کے مسلمان اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنا سیاسی لائحہ

عمل مرتب کرنے میں مولانا کی بصیرت سے فائدہ اٹھائیں گے۔''

روزانہ ''ہمارا اقدام'' کا مقالہ:

''آج سے دو سو سال پہلے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے ہندوستان کو مستحکم، خوش حالی اور بیرونی تسلط سے کامل آزاد سلطنت بنانے کے لیے اپنی مجاہدانہ مساعی سے وہ آگ روشن کی تھی جس نے ایک طرف بے ہمتی اور خوف کی تاریکی کو کافور کر کے لاکھوں ہندوستانیوں کے دل میں آزادی کی شمع فروزاں کی تو دوسری طرف سرفروشوں کا ایک گروہ پیدا کیا جو آزادی ہند کے لیے، بلا خانہء سلاسل کا مسکراتے ہوئے استقبال کرتے ہیں۔ اس راستہ میں زہر غم کے ہر پیالے کو قند و نبات کا شربت سمجھ کر پیتے رہے۔ بجلیوں سے کھیلتے اور موت سے ٹکراتے رہے۔ نہ سرحد کی صحرانوردی ان کے عزائم میں ضعف پیدا کر سکی، نہ مالٹا میں قید فرنگ کی ہوش ربا تکلیفیں ان کے جذبہ آزادی کو کچل سکیں۔ اگر کابل کی گلیوں میں عبیداللہ نے اسی آزادی کا ترانہ سنایا تو انڈیمان میں کالے پانی کی جاں گسل تکلیف برداشت کرتے ہوئے فضل حق خیر آبادی نے دنیا سے کوچ کرتے ہوئے اسی نعرے سے اس ہولناک ویرانے میں زندگی کے نقش و نگار قائم کیے۔ اسی قافلے کے ایک اولوالعزم رہبر اور اسی فوج کے ایک نڈر سپاہی یعنی مولانا حفظ الرحمٰن ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند کی زندگی کے چند گوشے ان کی تشریف آوری کی خبر سن کر بے اختیار سامنے آ گئے ہیں۔ جو منزل آزادی کے مسافر کے لیے سامان شباب اور مایوسیوں کے ماحول پر قابو پا لینے کا عملی نسخہ فراہم کرتے ہیں۔

مجسمہ کردار:

مولانا حفظ الرحمٰن کی زندگی کی ہر ادا کا اگر تجزیہ کیا جائے تو بہ آسانی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے ہر گوشے پر مستی کردار کا ایک خوش گوار اور جنون طراز جذبہ ابر نو بہار کی طرح چھایا ہوا ہے۔ ان کا پیکر خدا پرستی اور خدمت خلق کے ولولہ انگیز خمیر سے اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ سچائی کو منوانے کے لیے کسی بڑی سے بڑی قوت سے کبھی مرعوب نہیں ہوتے اور انتہائی معصیت کے وقت بھی

جب کہ قیامت پر قیامت ٹوٹ رہی ہو' حادثات خوفناک اژدہے کی صورت پھنکار رہے ہوں' خوف و سراسیمگی کی وجہ سے کلیجے منہ کو آ رہے ہوں' کسی طرف امید کی کوئی کرن نظر نہ آ رہی ہو' ایسی پر خطر گھڑی میں بھی موصوف کا دل امید کی ایک ایسی جلوہ گاہ معلوم ہوتا ہے جس میں مایوسی کی ہر تاریکی پہنچ کو روشن مستقبل کی بشارت دیتی ہے۔

چنانچہ تقسیم ہند کے بعد دلی میں قیامت خیز قتل و غارت گری کا وہ خونیں ہنگامہ جس نے ہزاروں گھروں کے چراغ گل کر دیئے۔ گلی کوچے انسانی خون سے لالہ زار بن چکے تھے۔ ہر طرف موت کی حکمرانی تھی' فرقہ پرستی کا جنون جنگل کے درندوں کو شرمندہ کر رہا تھا۔ ایسی حالت میں مولانا ہی کی ذات تھی جو موت و تباہی کی اس خوفناک جنگ میں ہر خطرہ سے بے پرواہ ہو کر دیوانہ وار میدان عمل میں کود پڑی اور مظلوم انسانیت کی خدمت کے لیے وہ نقش قائم کرتی گئی۔ جس پر جواں مردی ناز کرتی رہے گی' اور انسانیت فخر کرتی رہے گی۔

پاسبانی ملت:

''خدمت خلق کا راستہ ایک ایسا خارستان پر خطر ہے کہ جس میں راہی کو برہنہ پا دوڑایا جاتا ہے۔ قدم قدم پر غیروں ہی کی طرف سے نہیں' بلکہ اپنوں کی طرف سے بھی رکاوٹیں پیدا کی جاتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کے جسم میں طعنہ و تشنیع کے تیر و نشتر چبھا کر ان کے جذبے کو پرکھا جاتا ہے اور کبھی کبھی اس راہ میں اپنے خون کے سمندر میں خود ہی غوطہ لگانے کا تقاضہ کیا جاتا ہے۔ اس منزل کے یہ ایسے راہ و رسم ہیں جس میں آزمائش ناگزیر ہے' اور یہ آزمائش بالآخر کامیاب ہونے والوں کو حیات جاوید کی بشارت دیتی ہے۔ اس روشنی میں جب ہم مولانا کی سیاسی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو موصوف کے اس حوصلے کی بلندی پر سخت حیرت ہوتی ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے ایک فرقہ پرستی کے خلاف اعلان جنگ کے بعد وہ کون کون سی ذلتیں نہ تھیں جو ان پر لاد نہ دی گئی ہوں۔ اور آزادی ہند کے بعد دوسری فرقہ پرستی کے خلاف مورچہ قائم کرنے کی وجہ سے وہ کون کون سے

بدترین القاب اور ننگی گالیاں ہیں جو ان کے لیے استعمال نہ کی گئی ہوں، مگر ہر دور کی زندگی کو ہر طرف سے الٹ پلٹ کر دیکھ ڈالیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیسی مٹی کے بنے ہوئے پتلے ہیں جو ان تمام سامان ذلت کو اپنے لیے سب سے بڑی عزت سمجھتے ہوئے ایک والہانہ جذبہ کے ساتھ ایک ہی دھن اور ایک ہی سودے کو سر میں لیے ہوئے اپنے نصب العین کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

اسی والہانہ جذبے نے مسلمانان ہند کی پاسبانی کے لیے ایسی حالت میں جب کہ شدید انقلاب کے جابر جھٹکوں نے مسلمانوں کی زندگی کو بری طرح پراگندہ کر دیا ہے اور وہ ایک خطرناک قسم کی ذہنی طوائف الملوکی کا شکار ہو چکے ہیں۔ موصوف کے دردمند دل میں تڑپ پیدا کی ہے جو صبح و شام آپ کو بے چین رکھتی ہے۔

ناخدائی:

آزادی کے ان پانچ سال میں مسلمانوں کے تعلق سے جتنے تباہ کن معمے پیدا کیے گئے ان کو موصوف نے حسن و خوبی سے حل کیا ہے اس کی صحیح داد مابعد انقلاب، مؤرخ کا قلم ہی دے سکتا ہے۔ کسٹوڈین کے حیات سوز ہنگاموں، فرقہ پرستوں کے لرزہ انگیز منصوبوں اور اسلامی معابد و مآثر کو برباد کرنے والی صبر سوز تحریکوں کو جس سعی پیہم اور کاوش روز و شب کے بعد مولانا کی ہستی نے کہیں ختم کرنے اور کہیں اس کو بے اثر کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے، اس کی صحیح داد نہیں دی جا سکتی۔ موصوف کی ان مساعی سے جن کا اظہار ان کی زبان یا ذات سے کیا جاتا ہے ان کی تعداد کہیں زیادہ ہے، جہاں آپ اگرچہ خاموش نظر آتے ہیں۔ مگر حکومت کی ذمہ دار شخصیتوں کی زبان سے آپ ہی کے الفاظ اور آپ ہی کا منشا اس طرح گرجتا ہے جیسے کہ آپ ہی کی بے باک اور حقیقت پسند زبان مقرر کے منہ میں بول رہی ہے۔ موصوف کی دوسری بہت سی خصوصیات مثلاً ایک بے باک صحافی، مہتم بالشان مصنف، عمیق نظر اسلامی مورخ، قابل رشک خطیب، بلند نگاہ مفسر اور اولوالعزم مبصر ہونے کی صفات قدرت کی ایسی بخششیں ہیں جن کا خوبصورت اجتماع ایک ہی ذات میں بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ ان عنوانات پر

بحث طویل صحبت کی طالب اور فی الحال اس مختصر تعارف نامہ کے حدود سے خارج ہے۔ لہٰذا عقیدت کے ان چند ہی غیر مربوط جملوں کو مولانا کی خدمت میں پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

بہر حال مسلمانان حیدر آباد کی نشاۃ ثانیہ اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے مجاہد ملتؒ نے تدبیر و چارہ گری کا جو عظیم کردار پیش کیا اس کی مقبولیت اور برملا اعتراف کا پہلا نقش یہ تھا کہ مسلمانان حیدر آباد نے گرم جوشی کے ساتھ مجاہد ملتؒ کو دعوت دی کہ وہ جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس حیدر آباد میں بلائیں۔ دعوت قبول ہوئی کہ یہ بھی ان کوششوں کے سلسلے کی ایک موثر کڑی تھی۔ جنوبی ہند کے اطراف میں پہلی بار جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس ۲۷ تا ۲۹ / اپریل ۱۹۵۱ء کو اپنی بے مثال کامیابی کے ساتھ منعقد ہوا۔ جو اپنی شان و شوکت اور عظیم اجتماع و کامیابی کے لحاظ سے مجاہد ملتؒ کے ساتھ مسلمانان حیدر آباد کی عقیدت و شیفتگی کا ایک لازوال ثبوت تھا۔

سقوط ریاست کے بعد اپنے پہلے دورے میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے حیدر آباد کے جلسہ عام میں جو تقریر کی تھی اس کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

''میں نے حیدر آباد کے اضلاع' قصبوں' دیہات اور خود حیدر آباد کے بعض مقامات کا دورہ کیا ہے' مجھے حیدر آباد کے مسلمانوں کے مسائل کا پورا احساس ہے میں نے دیکھا کہ دیہات میں ابھی تک پوری طرح حالات اعتدال پر نہیں آئے۔ اور پوری طرح امن قائم نہیں ہوا۔ اب بھی دیہات کے مسلمانوں کو قتل و خون کا خوف ہے ان کی زمینوں پر دوسروں کا قبضہ ہے اور ان کے گھر اب بھی کہیں کہیں ویران ہیں' میں نے بعض مسجدیں بھی دیکھیں' جنہیں یا تو مندروں میں تبدیل کر دیا گیا ہے یا وہ شہید کر دی گئی ہیں اور ویران ہیں۔ بہت سے لوگ جو بے گناہ ہیں آج بھی جیلوں میں قید ہیں' اور ان کے خاندان پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ میں اس وقت نہیں کہہ سکتا کہ اس معاملے میں کیا خدمت مجھ سے ہو سکتی ہے اور میں دہلی میں کیا کروں گا۔ لیکن یہاں ایک بات میں کہنا چاہتا ہوں' انڈین یونین کے ان عہدہ داروں سے جنہیں یہاں حالات سدھارنے اور نظم و نسق سنبھالنے کے لیے متعین کیا گیا ہے۔ وہ حیدر آباد پر قابض نہیں ہیں۔ اگر

انڈین یونین کے عہدہ داروں کے ہاتھوں کسی کو یہاں تکلیف پہنچ رہی ہے تو کل انہیں جواب دینا ہوگا۔ وہ یاد رکھیں کہ نئے ہندوستان میں سرکاری عہدہ دار حاکم نہیں ہیں بلکہ خادم ہیں۔ لہٰذا جو ہدایات انہیں دہلی سے دی گئی ہیں ان پر خدمات کے جذبے کے ساتھ عمل کریں۔ جن کی زمینیں ہیں انہیں واپس دلائیں۔ مسجدوں کی بازیابی کا انتظام کریں اور جن کی مدد کرنی ہے ان سے غفلت نہ کریں اس طریقہ سے جب وہ دہلی واپس ہوں گے تو سرخ رو بھی ہوں گے۔ وہ یاد رکھیں کہ کسی کو تباہ کرنے والا کبھی آباد نہیں ہوسکتا' مجھے مسرت ہے کہ سوامی جی سے مل کر میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ میں سوامی جی سے اس وقت بھی کہوں گا کہ وہ فرقہ پرستوں پر پوری نگرانی کریں۔ میں اس شکایت سے اتفاق نہیں کرتا کہ حیدر آباد اسٹیٹ کانگریس نے مسلمانوں کو اس طریقے سے دعوت نہیں دی جس طریقے سے دینی چاہیے تھی۔ ان کا سواگت نہیں کیا گیا۔ خود مسلمانوں کا کام ہے کہ وہ تمام رکاوٹوں کی پروا کیے بغیر کانگریس میں گھس جائیں'' بعض فرقہ پرست عناصر کو جواب دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا: قومیں غدار نہیں ہوتیں' البتہ افراد غدار ہوتے ہیں اور مسلمانوں سے اس قسم کا مطالبہ کرنا قطعاً غلط ہے کہ وہ اپنی وفاداری کا اعلان کریں۔''

صدر کانگریس سوامی رامانند تیرتھ نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ:

''مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی تقریر نے میرے دل پر بے حد اثر کیا ہے۔ میں نے بڑے بڑے جلسوں میں شرکت کی بہت سے نیتاؤں کی تقریریں سنیں۔ لیکن پوری زندگی میں شاید ہی کبھی میں نے اتنی اچھی تقریر سنی ہو۔ میں اس موقع پر مسلمانوں کو یقین دلاتا ہوں کہ حیدر آباد اسٹیٹ کانگریس ان تمام شکایات کو دور کرنے کی پوری کوشش کرے گی۔''

(۱۱)

خدمات ملی وانسانی کے چند اور پہلو

اجڑے ہوئے انسانوں کی آبادکاری:

دہلی‘ پنجاب‘ الور‘ بھرت پور‘ اجمیر وغیرہ میں ۱۹۴۷ء کے قیامت خیز ہنگاموں کے بعد بقیۃ السیف لاکھوں مسلمان جو چھپ چھپا کر کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ان کی کچھ تعداد تو ہندوستان ہی میں قرب و جوار کی محفوظ بستیوں میں منتقل ہوگئی تھی اور کچھ وہ تھے جو اس غضب ناک فضا میں کوئی اور راہ نہ پاسکے اور بادل ناخواستہ پاکستان کی طرف جانکلے۔ پھر جوں ہی حالات کچھ سکون کی طرف آئے‘ ان بیگناہ مصیبت زدوں نے بڑی تعداد میں واپس ہوکر اپنے گھروں میں آباد ہونا چاہا‘ خود گاندھی جی دنیا سے جاتے جاتے اس کے لیے بے چین رہے کہ دونوں ملکوں کی اقلیتوں کو اپنے اپنے وطن میں واپسی کا موقع ملنا چاہیے۔ جہاں تک حکومت ہند کا تعلق ہے اس کی بھی طے شدہ پالیسی یہی تھی۔ لیکن عمل کے درجے میں صورت حال چوں کہ ایسی ہوچکی تھی کہ پاکستان سے آنے والے پناہ گزینوں کے لیے واپسی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا اور یہ لوگ ہندوستان کے ان علاقوں سے اجڑے ہوئے مسلمانوں کی جگہ لے چکے تھے اس لیے بڑی الجھن درپیش تھی۔

ان دنوں واپس آنے والے مسلمان پناہ گزینوں کی بڑی تعداد علاقہء میوات و الور‘ بھرت پور کی تھی اور سب سے پہلے ان ہی کے بسانے کی کوششیں شروع ہوئیں اور شری ونوبا بھاوے‘ سیتم بھائی‘ ایک نیک نہاد خاتون مس مردولا سارا بھائی نے اس مہم کے لیے خود کو بڑی تندہی کے ساتھ وقف کردیا اور حضرت مجاہد ملتؒ حضرت مولانا احمد سعید صاحب‘ مولانا لقاء اللہ صاحب پانی پتی‘ مولوی محمد ابراہیم میواتی اور دوسرے کارکنوں نے اس خدمت کا بیڑا اٹھایا۔ مرکز میں ان کوششوں کے سرپرست مولانا آزادؒ اور پنڈت جواہر لال نہرو تھے۔ اس طرح قدم قدم پر دشواریوں اور الجھنوں سے گزرتے ہوئے ماتحت سرکاری عمال کی عام بے دلی اور بے رخی کی فضا میں یہ کوششیں آہستہ آہستہ آگے بڑھیں۔ مجاہد ملتؒ نے بار بار میوات و پنجاب

ے سفر کر کے' نیچے سے اوپر تک سیاسی اور مرکزی حکام وافسران سے پیہم ملاقاتیں کر کے اور خود اجڑے ہوئے انسانوں کو صبر و برداشت کی بار بار تلقین کرتے ہوئے پوری دل سوزی کے ساتھ اس مہم کو آگے بڑھایا اور پھر بسائے جانے والوں کے لیے زمینیں' مکانات اور ہر طرح کے سروسامان زندگی کے فراہم کرانے میں پیہم جدوجہد کی۔ پھر یہ سلسلہ سال دو سال نہیں' بلکہ مستقل طور پر چلتا ہی رہا۔ بحمداللہ ان ہی ان تھک کوششوں کی بدولت آج میوات میں' اجمیر میں' مدھیہ پردیش اور پنجاب میں جابجا اجڑے ہوئے مسلمانوں کی آبادیاں نظر آ رہی ہیں۔ کاش پاکستان میں بھی کچھ ایسے ہی مخلص اور جاں باز کارکن سامنے آئے ہوتے اور وہاں بھی پناہ گزینوں کا کچھ حصہ واپس ہوا ہوتا۔

تارکینِ وطن کی واپسی:

جولائی ۱۹۴۸ء سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان آزادانہ آمدورفت پر پرمٹ سسٹم کی پابندی عائد ہوئی جس کے قوانین بھی دن بدن بدلتے رہے اور کچھ عرصہ بعد پرمٹ سسٹم کی جگہ پاسپورٹ کا نفاذ ہو گیا ادھر ہنگامی حالات اور مار دھاڑ سے مجبور ہو کر دہلی' یو پی وغیرہ سے پاکستان جانے والے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اپنے وطن میں واپس آنے کے لیے مضطرب رہی ہے۔ سیکڑوں بلکہ ہزاروں خاندان ایسے بھی ہیں جن' کے نابالغ بچے دوسرے عزیزوں کے ساتھ افراتفری کے عالم میں پاکستان پہنچ گئے۔ لیکن والدین آج تک ہندوستان ہی میں ہیں یا جوان اولاد یہاں رہ گئی اور ضعیف و بے وسیلہ ماں باپ وہاں پہنچ گئے۔ کوئی خاوند ادھر اور بیوی پاکستان جانکلی۔ اسی نوعیت کے ہزاروں کیس پرمٹ سسٹم کے نفاذ کے بعد سے اب تک برابر سامنے آتے رہے' جن کے لیے مستقل طور پر ہندوستان واپس آنے کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا اور پرمٹ سسٹم کی روز افزوں پابندیاں ان کی راہ میں برابر حائل رہیں۔

مجاہد ملتؒ نے شروع دن سے ایسے ہزاروں کیسوں میں فرداً فرداً کوشش شروع کی۔ حضرت مولانا آزادؒ اور محترم پنڈت نہرو کے توسط سے اصولی طور پر یہ پالیسی طے کر لی گئی۔ کہ ہندوستان کے شہری مسلمانوں کا یہ حق ہے کہ ان کی نابالغ اولاد' بیوی بچے یا خاص خاص صورتوں میں ضعیف ماں' باپ اور بے وسیلہ بہن بھائی کسی بھی وجہ سے پاکستان میں رہ گئے ہیں تو اب ان کو مستقل طور پر ہندوستان میں بسنے کی اجازت ملنی چاہیے۔ اس اصول کی روشنی میں

پاکستان سے واپس ہونے والے ہزاروں ہزار مسلمانوں کے معاملات کی فرداً فرداً پیروی حضرت مجاہد ملتؒ نے فرمائی۔ جمعیۃ کے دفتر میں یہ شعبہ حاجی حسام الدین صاحب کے سپرد رہا۔ آج ہندوستان میں جہاں جہاں ہزاروں ایسے مسلم افراد آباد ہیں جو پاکستان میں گھر کر رہ گئے تھے اور تنہا مجاہد ملتؒ کی سعی و سفارش کی بدولت انہیں اپنے وطن میں مستقل واپسی کا موقع ملا۔

اس کے ساتھ ہی عارضی طور پر پاکستان جانے والوں کے لیے پرمٹ و پاسپورٹ سسٹم کی الجھنیں، عورتوں کے فوٹو کی پابندی، انکم ٹیکس سرٹیفکیٹ کی پابندی یا مقررہ وقت سے زیادہ ٹھہرنے پر دارد گیر کی جو جو دشواریاں وقتاً فوقتاً مسلمانوں کو پیش آتی رہیں ان کے ازالے کے لیے بھی مولانا مرحوم ہمیشہ پیش پیش رہے۔

اغواشدہ خواتین کی بازیابی:

۱۹۴۷ء کے تاریک دور میں سرزمین ہندو پاکستان پر دوسری تمام حشر سامانیوں سے بڑھ کر جو شرمناک حرکت عمل میں آئی وہ مظلوم و بے کس خواتین کا وسیع پیمانہ پر اغوا اور ان کی پامالی تھی۔

چنانچہ ۱۹۴۷ء کے بعد دوسرے ہنگامی مسائل میں یہ مسئلہ بھی سرفہرست تھا۔ دونوں مملکتوں کے سربراہوں نے تاریخ کے اس شرمناک داغ کو دھونے کے لیے باہم ایگریمنٹ کر کے ایسی مغویہ خواتین کی بازیابی کے لیے راہ پیدا کی اور قومی کارکنوں نے اس خدمت کا بیڑا اٹھایا۔ ہندوستان میں خاص طور پر دہلی، پنجاب اور الور بھرت پور سے بڑی تعداد میں معصوم عورتیں اغوا کی گئیں تھیں اور جب بازیابی کی مہم شروع ہوئی تو اس خدمت کے لیے مردوں سے زیادہ کچھ نیک نہاد عورتیں آگے بڑھیں۔ خاص طور پر شریمتی رامیشوری نہرو، مس مردولا سارا بھائی، بیگم انیسہ قدوائی نے تو خود کو اس خدمت کے لیے وقف ہی کر دیا۔ اور پوری تندہی کے ساتھ انجام دیا۔ دوسرے قومی کارکنوں کا تعاون بھی ان کو برابر حاصل رہا۔ جنرل شاہ نواز صاحب بھی جو ہندوستان کے نائب وزیر ریلویز تھے، ۱۹۴۸ء میں مس مردولا سارا بھائی کے ساتھ اس خدمت میں سرگرم عمل تھے۔ اونچی سطح پر نگراں اور مشیر کار حضرات میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ بھی شامل تھے۔ ویسے جمعیۃ علماء کی جانب سے اس خدمت کی ذمہ داری مولانا مرحوم نے مجھے سونپی تھی۔ اور سرپرستی خود فرماتے تھے۔ ۱۹۴۸ء سے مسلسل پانچ چھ سال

یہ سلسلہ جاری رہا اور ان تھک کوششوں کی بدولت اغوا شدہ خواتین کی ایک بڑی تعداد اس مدت میں برآمد کر کے ان کے ورثا تک پہنچائی جا سکی۔

مجبورین کا دوبارہ اعلان اسلام:

اسی زمانے میں پنجاب' میوات' الور بھرت پور کے دیہات وقصبات میں ایک بڑی تعداد ایسے مسلمانوں کی رہ گئی تھی جو غضب ناک حالات اور کشت وخون میں اپنی جان بچانے کے لیے اس کے سوا کچھ نہ کر سکے کہ جس طرح ان پر جبر کیا گیا انہوں نے تبدیلی مذہب کے اصرار پر خاموشی اختیار کرنی تھی' حالات کے سدھرنے کے بعد بعض بعض مقامات میں ایسے لوگوں سے اچانک سابقہ پڑا اور پھر اندازہ ہوا کہ جابجا ایسے مسلمان موجود ہیں جنہوں نے تبدیلی مذہب کی آڑ میں اپنی جان بچا رکھی ہے اور حسرت ویاس کے ساتھ اپنی زندگی پر آنسو بہا رہے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اگر حکومت ان کی پشت پناہی کے لیے آمادہ ہو تو پھر وہ کھل کر اپنے اصل مذہب کی زندگی اختیار کریں۔ ایسے کچھ لوگ چوری چھپے دہلی پہنچ کر حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے ملے اور انہوں نے دوسروں کی بھی نشان دہی کی اور اپنی خواہش کا اظہار کیا تو مولانا مرحوم نے یہ معاملہ حضرت مولانا آزادؒ اور محترم پنڈت نہرو تک پہنچایا اور ان کی کوششوں سے ریاستی حکومتوں کے نام ایک ہدایت نامہ جاری ہو گیا جس کا مفاد یہ تھا کہ حکومت ہند ایسے جبری تبدیل مذہب کو چونکہ تسلیم نہیں کرتی ہے' اس لیے جہاں جہاں ایسے واقعات درپیش ہوں وہاں لوگوں کو سرکاری طور پر پوری مدد دی جائے تا کہ وہ اپنے اصل مذہب کو علی الاعلان ظاہر کر سکیں اور اس معاملے میں ان کی مشکلات کو دور کیا جائے۔

ہدایت نامہ اگرچہ کانفیڈینشل تھا تاہم پرائم منسٹر سکریٹریٹ سے اس کی ایک نقل حضرت مجاہد ملتؒ کو دے دی گئی۔ اس سے کام لے کر پنجاب وراجستھان میں ایسے مجبورین کی بڑی تعداد کو دوبارہ اعلان اسلام کا موقع بہم پہنچایا گیا۔ اور آج وہ لوگ کھل کر اپنی اسلامی زندگی گزار رہے ہیں۔ والحمد للہ

اقتصادی اور معاشی مشکلات میں رہنمائی:

تقسیم ہند کے ری ایکشن نے جس طرح زندگی کے دوسرے گوشوں کو متاثر کیا اس کا خاص اثر ہندوستان میں باقی ماندہ پانچ کروڑ مسلمانوں کی اقتصادی اور معاشی زندگی میں بھی

نمایاں ہوا۔ پاکستان بننے کے ساتھ ساتھ ایک طرف اونچے درجہ کے تاجر اور سرمایہ دار سمٹ کر پاکستان چلے گئے اور دوسری طرف سرکاری اور نیم سرکاری سروسوں میں بھی جو اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ انہوں نے اپنا مستقبل پاکستان ہی میں محفوظ سمجھا۔ پھر یہاں فرقہ واریت کے سیلاب اور آئے دن قتل و غارت کی گرم بازاری نے مسلمانوں کی رہی سہی امیدوں اور امنگوں کو خاک میں ملا دیا۔ وقت کی فضا اتنی مکدر اور حالات کے تیور اس قدر برہم تھے کہ نہ کاروباری زندگی میں مسلمانوں کے لیے کوئی خاص گنجائش باقی رہی' نہ سروسوں اور ٹھیکوں وغیرہ میں۔

پھر زمینداری اور جاگیرداری کے خاتمے نے اور بھی قافیہ تنگ کر دیا اور ان سب سے بڑھ کر جو ہمہ گیر مصیبت وبال جان بن رہی تھی وہ کسٹوڈین کی مار تھی جس نے مسلمانان ہند کی اقتصادیات کی رگیں خشک کر دی تھیں۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ آزادی کے بعد وطن عزیز کی تعمیر و استحکام' خوش حالی اور ہمہ گیر ترقی کی بنیادیں استوار کی جا رہی تھیں ملک کے اندر ایسی کثیر العدد اقلیت کی معاشی زبوں حالی اور بربادی خود ملکی اور وطنی نقطہ نظر سے بھی ناقابل برداشت اور باعث فکر و تشویش تھی۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ جن کے فکر و شعور پر بیک وقت ملک اور ملت دونوں ہی کے تقاضے اور فکر مندیاں چھائی ہوئی تھیں اس صورت حال کے تدارک اور اصلاح کے لیے بھی وہ اپنے اثر و رسوخ اور قوت عمل کے ساتھ برابر کوشاں رہے۔ ملک کے نئے نظام اور رجحانات میں اگرچہ اس کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ سروسوں' ٹھیکوں اور کاروباری سہولتوں میں مختلف فرقوں کا تناسب ملحوظ رکھا جائے۔ تاہم مولانا مرحوم اپنے ذاتی تعلقات اور اثرات کے بل پر فرداً فرداً سیکڑوں بلکہ ہزاروں امیدواروں کو سرکاری' نیم سرکاری اور پرائیویٹ سروسوں اور کاروباری سہولتوں کے حصول میں پوری مدد دیتے رہے اور بلا مبالغہ ان کی سعی و سفارش کی بدولت اس دور میں ہزارہا مسلمانوں کو روزگار اور معاش کے مواقع مل سکے اور ان ہزاروں گھرانوں کی اقتصادی زندگی سدھر سکی۔ انفرادی کوششوں کے ساتھ ساتھ وہ مجموعی طور پر برابر اس کی کوشش کرتے رہے کہ سرکاری ملازمتوں اور کاروباری وسائل میں اقلیت کو اس کے جائز حقوق سے بالکل محروم نہ رکھا جائے' اپنی پارلیمنٹری تقریروں میں بھی بار بار انہوں نے اس اہم قومی ضرورت کو پیش کیا اور انہی کی کوششوں کی بدولت مرکزی حکومت نے کئی بار ایسی ہدایات اپنے اداروں کو بھی اور ریاستی حکومتوں کو بھی دیں اور اس کا چیکنگ بھی کیا کہ مسلم اقلیت کے نظر انداز

کیے جانے کی شکایات کیوں درپیش ہیں۔

جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس سورت (اکتوبر ۱۹۵۶ء) میں ایک مستقل تجویز کے ذریعہ انہوں نے مسلمانوں کی اقتصادی فلاح و بہبود کا ایک مستقل پروگرام جمعیۃ کے سامنے رکھا اور اگر ہنگامی حالات و مشاغل نے مہلت دی ہوتی تو وہ اس راہ میں بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔

تقسیم ہند کے وقت خاص طور پر ریلوے ڈپارٹمنٹ' پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف اور دوسرے محکموں میں ایسے مسلم ملازمین کی تعداد ۳۵ ہزار سے زائد تھی جنہوں نے آپشن فارم میں مستقل ہندوستان' یا' عارضی پاکستان' کے فارم پر کیے تھے۔ لیکن بعد میں حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ ان میں سے بڑی تعداد جس نے ہندوستان ہی میں رہنا طے کیا تھا مختلف بہانوں سے نظر انداز کردی گئی اور ان کی سروسیں ختم کردی گئیں۔ ان کے وفود مولانا کے پاس پہنچے اور ۱۹۴۸ء سے مسلسل چار پانچ برس تک مولانا مرحوم ان کے معاملات کی پیروی کرتے رہے۔ مرکزی کیبنٹ میں ایک واضح پالیسی طے کرائی اور پھر اس پالیسی پر عمل درآمد کے لیے برابر جدوجہد فرماتے رہے۔ اور بحمد اللہ ان کی کوششوں سے ایسے ہزاروں ملازمین کو دوبارہ سروسوں میں لے لیا گیا۔

ان سلسلوں کے علاوہ آئے دن ماتحت اسٹاف کے فرقہ وارانہ جذبات کی بدولت مسلم ملازمین کو مختلف محکمانہ ناانصافیوں کی جو صدہا شکایات پیش آتی رہیں ان کے تدارک کے لیے مولانا کی فکرمندیاں برابر مصروف کار رہیں اور سیکڑوں معاملات کو خود انہوں نے اپنی گفتگوؤں اور خطوط کے ذریعہ طے کرایا۔

مسلمانوں کی طرح غیر مسلم اور خاص طور پر پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزیں بھی ان معاملات میں مولانا مرحوم کی نفع بخشیوں سے برابر فیض یاب ہوتے رہے' اور وہ یکساں دردمندی اور ہمدردی کے ساتھ مسلم و غیر مسلم کی خدمت اور سعی و سفارش فرماتے رہے۔

ریلویز ڈپارٹمنٹ میں جب مسلم ملازمین کو نماز جمعہ کی مہلت سے محروم کر دیا گیا تو یہ معاملہ بھی مولانا نے اس وقت کے ریلوے منسٹر مسٹر گوپالا سوامی آئینگر کے سامنے رکھا اور بالآخر وزیر موصوف نے یہ سرکلر جاری کر دیا کہ مسلم ملازمین کو نماز جمعہ کے لیے ایک گھنٹہ کی تعطیل بہ وضع تنخواہ بلا تامل دے دی جائے۔

ایک اور پریشانی ۱۹۴۹ء' ۱۹۵۰ء سے ظہور میں آئی جب کہ ریلوے اسٹیشنوں کو خاص

طور سے شمالی ہند میں مسلمان ٹھیکہ داروں کے ریسٹوران' ریفریشمنٹ رومز اور ٹی اسٹالس کے کنٹریکٹ ختم کر دیے گئے اور اس کے نتیجے میں سیکڑوں گھرانوں کے روزگار ہاتھ سے جاتے رہے۔ ان کی فریاد بھی مولانا مرحوم نے مرکزی وزرا اور بالخصوص وزیر اعظم ہند تک پہنچائی۔ اور ان کی توجہ سے اس وقت بڑی حد تک یہ مسئلہ حل ہو سکا۔

کلکتہ کی مشہور ''مسلم چیمبر آف کامرس'' کا سرکاری ریکوگنیشن ختم کر دیا گیا۔ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کا یہ تنہا چیمبر باقی رہا تھا۔ اس کے لیے بھی مولانا مرحوم نے کامیاب جدوجہد فرمائی اور بحمداللہ آج وہ ''اورنٹیل چیمبر آف کامرس'' کے نام سے باقی اور سرکاری ریکوگنیشن سے بہرہ مند ہے۔

اقتصادی اور معاشی زندگی کی طرح تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کی سیاسی زندگی اور اس کے تقاضے بھی پامال ہو کر رہ گئے تھے اور ٹھیک اسی طرح جس طرح ان کے اقتصاد و معیشت کی ازسرنو تعمیر کے لیے کوششیں کی گئیں' ملکی سیاست اور نظام جمہوریت کے دائروں میں بھی مسلمانوں کی واجبی نمائندگی اور صلاحیت کار کے لیے مولانا مرحوم نے اپنی ذاتی حیثیت سے مسلسل جدوجہد فرمائی۔ ایک طرف وہ مسلمانوں کو ہمیشہ یہ تلقین فرماتے رہے کہ وہ پوری جرأت مندی کے ساتھ وطن عزیز کی تعمیر اور پیش رفت میں حصہ لیں اور خود کو ملکی زندگی میں ایک لمحے کے لیے بھی اجنبی اور تماشائی نہ سمجھیں اور دوسری طرف اپنی جماعت ''کانگریس'' کے حلقوں میں برابر اس کی کوشش کرتے رہے کہ مسلمانوں کی وسعت قلبی کے ساتھ اپنایا جائے۔ مرکزی اور ریاستی مجالس قانون ساز میں ان کے تناسب کے بقدر ان کو پورے مواقع دیے جائیں۔ خاص طور پر جنرل الیکشنوں کے موقع پر تو مولانا ہی کی ذات گرامی پورے ملک کے مسلمانوں کی امیدوں اور کوششوں کا محور بنی رہتی تھی۔ دفتر جمعیۃ میں ایک میلہ سا لگ جاتا تھا اور تین تین مہینے سرگرمیاں جاری رہتی تھیں۔ ایک ایک سیٹ اور ایک ایک ٹکٹ کے لیے مولانا لڑتے تھے اور پوری کوشش فرماتے تھے۔

ان تمام مواقع پر مولانا کے اثر و رسوخ اور ان کی کوششوں سے مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم بھی برابر فیضیاب ہوتے اور مولانا کی سفارش کا سہارا پا کر اپنی کوششوں کو آگے بڑھاتے۔

آج جب کہ مولانا مرحوم ہم سے رخصت ہو چکے ہیں' ہزاروں اور لاکھوں دلوں پر یہ

احساس طاری ہے کہ عوام وخواص کی خدمت و مدد کا ایک بڑا سہارا جاتا رہا اور ایک ایسا ستون گر چکا ہے جس کی پشت پناہ ہزاروں کو سنبھالتی اور سہارا دیتی تھی۔

اوپر کے صفحات میں جو کچھ لکھا گیا وہ بھی مولانا کی ہمہ گیر اور دور آفرین خدمات اور ان کے جذبۂ عمل کا محض ایک مختصر خاکہ اور نا تمام نقش ہے' غریبوں اور مظلوموں کی مدد میں انہوں نے بیسوں خدمات وہ انجام دیں جن کا تذکرہ زبان وقلم تک لانا انہوں نے کبھی گوارا نہ کیا۔ اس ناتمام خاکے سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خاص طور پر زندگی کے آخری پندرہ برسوں میں ان کے جذبۂ عمل اور ان تھک خدمات کا کیا عالم تھا اور خدمات ملی وقومی کی کن کن راہوں کو انہوں نے بیک وقت آباد رکھا اور فکر و تدبیر کے کون کون سے محاذ تھے۔ جہاں تنہا ان ہی کی ذات برابر سینہ سپر رہی اور ان کے سایۂ خلوص و محبت و شفقت میں خدا کی کتنی مخلوق کو چین و سکون کا سانس لینا نصیب ہوا۔

(۱۲)

کل ہند مسلم کنونشن

ایک طرف خدمات کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ دوسری طرف مولانا کو گہرا احساس تھا' مسلمانان ہند کی اس عام بے چینی اور بد دلی کا جو شر پسندوں کی آئے دن کی شورشوں اور دردناک حوادث کے تسلسل اور گراں باریوں کا قدرتی نتیجہ تھی اور آزادی کے تیرہ برس بعد بھی ان سے چھٹکارے کی کوئی سبیل نظر نہیں آئی تھی۔ مولانا کو سخت اضطراب تھا کہ اگر ہندوستان کی اس عظیم الشان اقلیت پر بد دلی اور مایوسی کی گرفت یوں ہی مضبوط ہوتی رہی اور اس کے اسباب وعوامل یوں ہی قائم رہے تو وہ خود اس کے لیے بھی موت کا پیغام ہوگا اور وطن عزیز کی قدر و قیمت کو بھی خاک میں مل کر رہے گی' مولانا کی نگاہ میں تیرہ سال کی پوری سرگزشت تھی اور وہ مستقبل کے اندیشوں کو بھی پوری طرح محسوس کر رہے تھے۔ چنانچہ اپریل ۶۱ء میں جب مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند کے سامنے مولانا نے اپنے تاثرات رکھے تو جہاں اور کچھ چیزیں طے کی گئیں وہاں یہ بھی فیصلہ ہوا کہ جلد پورے ملک کے مسلمانوں کا ایک نمائندہ کنونشن بلایا جائے اور ملک میں فرقہ پرستی کی فتنہ سامانیوں کا کوئی موثر حل تلاش کیا جائے۔ چنانچہ مجاہد ملتؒ تو فوراً ہی کنونشن کی تیاریوں میں لگ گئے۔ لیکن ملک میں اس فیصلے کے اعلان نے ایک نیا موضوع بحث قائم کر دیا۔ فرقہ پرست افراد اور جماعتوں کا اختلاف تو متوقع تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ اور خلاف امید ملک کے بڑے بڑے سنجیدہ ارباب فکر و سیاست صف اول کے انگریزی' اردو' ہندی اخباروں اور خود کانگریس کے قوم پرور رہنماؤں اور لیڈروں کی تنقیدات سامنے آئیں۔ کسی نے اس کی اہمیت اور افادیت کو برملا سراہا اور کسی نے اس کو بے محل اقدام قرار دیا۔ شدہ شدہ کچھ دراندازوں نے معاملے کو تاریک بنا کر وزیراعظم ہند پنڈت نہرو تک پہنچا دیا اور جس طرح بات کو ان تک پہنچایا گیا تھا اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ پنڈت جی بھی کنونشن کے مخالفین کی صف میں آ گئے۔ مولانا مرحوم جس اضطراب اور فکر مندیوں کے ساتھ کنونشن کی تیاریوں میں

مصروف تھے۔ ملک کے تمام اخباری اور سیاسی حلقوں میں موافق و مخالف تنقیدات نے مولانا کے فکر و اضطراب میں کچھ اضافہ ضرور کیا' لیکن ان کے عزم راسخ اور جرأت عمل میں ایک لمحے کے لیے بھی کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہوئی۔ پرائم منسٹر کی مخالف رائے معلوم ہو جانے کے باوجود اپنی جگہ اٹل رہے اور بالآخر پنڈت نہرو اور صدر کانگریس نے بھی ان کی اصابت فکر اور برمحل اقدام کے حق میں اپنی رائے بدل دی اور ۱۰/۱۱ جون ۱۹۶۱ء کو سپرد ہاؤس نئی دہلی میں ڈاکٹر سید محمود ایم' پی کی صدارت اور مجاہد ملت ؒ کے اہتمام میں مسلمانان ہند کی تاریخ کا یہ دور آفریں اقدام (مسلم کنوینشن) بھرپور کامیابی اور حسن و خوبی کے ساتھ تکمیل پا سکا اور ملک و ملت کے مستقبل پر بہت گہرے اور دور رس اثرات قائم کر سکا۔

کنوینشن کی تیاریوں میں مولانا کے سب ہی رفقا اور ہم خدام شب و روز مصروف رہے اور تمام انتظامات کی نگرانی خود مولاناؒ فرماتے رہے مجلس استقبالیہ کے صدر بھی مولانا ہی تھے۔ (مولانا کا خطبۂ استقبالیہ ان کے افکار و عزائم کی آخری یادگار رہ گیا ہے جو آپ کے ملاحظہ سے گزرے گا)

جنرل سیکریٹری سید مظہر امام صاحب ایم' پی اور سیکریٹری مسٹر ظہیر الدین صدیقی ایم' اے' ایل' ایل' بی اور مسٹر یونس سلیم ایڈووکیٹ حیدرآباد تھے۔ کنونشن کی پبلسٹی اور نشر و اشاعت کا پورا کام مولانا نے ظہیر صاحب کے سپرد کر دیا تھا۔ اور انہوں نے بڑی محنت اور خوبی کے ساتھ اس کو انجام دیا۔ مولانا بھی آخر تک اس کے مداح رہے۔

۲۲ رمئی کو دہلی کے کنونشن کا دعوت نامہ جاری کیا گیا۔ جس پر ملک بھر کے ۶۳ نامور ارباب فکر و بصیرت کے دستخط تھے۔ اور اس میں کہا گیا تھا!

''جناب محترم!

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ وطن عزیز کی آزادی اور ملک میں سیکولر جمہوری دستور کے نفاذ سے لے کر آج تک مسلمانان ہند زندگی کے تقریباً تمام اہم شعبوں میں اپنے جائز حقوق سے بڑی حد تک محروم رہے ہیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اس سلسلے میں جماعتی اور انفرادی مسلسل جدوجہد کے باوجود جو ریاستی و مرکزی لجس لیچرز کے اندر اور باہر جاری ہے۔ خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکی ہے۔

یہ صورت حال نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے لیے انتہائی ہمت شکن اور شدید اضطراب کا

باعث ہے بلکہ خود ملک وقوم کی سالمیت' استحکام' وقار اور ترقی کی راہ میں بھی زبردست رکاوٹ ہے۔ اس لیے شدید ضرورت ہے کہ ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کے ارباب فکر وعمل اپنے اپنے جماعتی اختلاف ونقطہائے نظر سے بالاتر ہوکر وحدت فکر وعمل کے تعمیری جذبے کے ساتھ ایک جگہ جمع ہوں اور مسطورہ ذیل بنیادی امور پر متحد و متفق ہوکر غور کریں' اور کوئی موثر راہ عمل تلاش کریں۔

۱۔ ایسے طریقوں اور تدبیروں پر غور کرنا جن سے ملک کے تمام باشندوں کے درمیان اپنے اپنے مذہب اور کلچر پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے باہمی اتفاق واتحاد میں ترقی ہوتا کہ ملک کی ہر جہتی ترقی اور استحکام کو زیادہ سے زیادہ تقویت حاصل ہو۔

۲۔ مسلم اقلیت آئے دن فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں جن بھیانک جانی و مالی بربادیوں کا شکار ہوتی رہتی ہے۔ ان کے انسداد کے موثر وسائل و ذرائع معلوم کرنے کے لیے غور وفکر۔

۳۔ ایسی تجاویز جن کے بروئے کار لانے سے مسلمان سرکاری ملازمتوں میں اپنا واجبی حصہ پاسکیں اور لیجس لیچرز میں ان کو حق کے مطابق نمائندگی حاصل ہو سکے۔

۴۔ وہ تدابیر اور وسائل جن کو اختیار کرکے مسلمان تجارت اور معاش کے دیگر ذرائع مثلاً پرمٹوں' لائسنسوں' ٹھیکوں وغیرہ میں عملی طور پر اپنے حق کے مطابق نمائندگی حاصل کر سکیں۔

۵۔ اردو زبان سے متعلق ابھی تک اصل دستوری مطالبہ پورا نہیں ہوسکا ہے۔ اگرچہ انجمن ترقی اردو کی مشترکہ جدوجہد جاری ہے۔ تاہم اس مسئلے سے متعلق ایسی تدابیر کی تلاش جن سے اردو کو اس کا اصلی مقام حاصل ہوسکے اور ہماری ملی جلی تہذیبی زندگی کا حسن برقرار رہ سکے۔

۶۔ سرکاری نصاب تعلیم کی منظور شدہ کتابوں میں آئے دن ایسے اجزا کی شمولیت جو اسلامی نقطہ نظر سے ناقابل برداشت اور وجہ اعتراض ہیں ان شکایات کے ازالہ کے لیے موثر و اطمینان بخش تجاویز۔

۷۔ عام تعلیمی اداروں' بالخصوص میڈیکل اور ٹیکنیکل تعلیم کے اداروں میں داخلے اور سرکاری وظائف کے حصول میں معیاری قابلیت کے باوجود مسلم طلبہ کو امتیازی سلوک اور

ناانصافی کی عام شکایت ہے۔اس کے تدارک کے لیے ضروری تدابیر۔۔۔۔

مولانا مرحوم نے جس خوبی تدبیر کے ساتھ کنوینشن کے نازک مسائل اور کارروائی کو تکمیل تک پہنچایا۔اس کے بعد تمام اندیشے خود بخود کافور ہو گئے جو بعض حلقوں نے قبل از وقت محسوس کرنے شروع کر دیئے تھے۔

۲۲ رجون ۱۹۶۱ء کو نئی دہلی میں کنونشن کی طرف سے تمام تجاویز پنڈت نہرو وزیر اعظم ہند کی خدمت میں پیش کی گئیں۔پنڈت جی نے گہرے تاثر اور توجہ کے ساتھ اس کو قبول کیا اور ان ہی تجاویز کی صدائے بازگشت تھی جو ملک بھر میں قومی اتحاد اور یک جہتی کی مہم کی شکل میں رونما ہوئی اور جس کا بیڑا خود وزیر اعظم موصوف نے اٹھایا۔خود مسلمانوں کے حق میں اس کنونشن کی بڑی افادیت یہ تھی کہ ان کی پریشانیاں اور ان کے مسائل پوری وضاحت کے ساتھ ملک کے سامنے آئے اور تمام ہی سنجیدہ حلقوں نے ان کی تائید اور حمایت کی۔بہت سی غلط فہمیاں دور ہوئیں۔ساتھ ہی مسلمانوں میں بڑھتی ہوئی مایوسی اور بددلی کی جگہ عزم وعمل اور جرأت مندانہ زندگی کے نئے آثار پیدا ہوئے۔اور وطنی زندگی میں اپنے موقف کا زیادہ صحیح شعور بیدار ہوا۔

بحمداللہ آج اثرات ونتائج کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح ۱۹۴۷ء کی قیامت صغریٰ کے بعد "لکھنو کانفرنس" نے زندگی کی مایوسیوں میں عزم وعمل کی ایک نئی راہ دکھائی اور تاریخ کا رخ بدل دیا تھا۔ٹھیک اسی طرح مجاہد ملتؒ کی زندگی کا یہ آخری کارنامہ "مسلم کنونشن" بھی ملک وملت کی تاریخ کا ایک دور آفریں واقعہ تھا۔جس نے نہ صرف دلوں اور دماغوں کو ایک نئی روشنی بخشی۔بلکہ عزم وکردار کی خشک رگوں کو بھی زندگی کا نیا خون اور شادابی عطا کی۔یہ بھی مجاہد ملتؒ ہی کی مقبولیت اور ان کا نفوذ ورسوخ تھا کہ ایک آواز پر ملک کے گوشے گوشے سے پانچ سو سے زائد ڈیلی گیٹ گرمی کی شدت اور سفر کی صعوبتوں کو انگیز کر کے دہلی پہنچے اور وحدت فکر وعمل کا ایک شاندار مظاہرہ تاریخ کی نگاہیں دیکھ سکیں۔

(۱۴)

فرقہ وارانہ فسادات اور مجاہد ملت

سرزمین ہند پر فرقہ واریت کے جوش و خروش ۱۹۴۷ء میں جو طوفان اٹھا تھا' وہ بالآخر گاندھی جی کی قیمتی جان لے کر رہا۔ کاش سیہ بختی کی یہ تاریخ یہیں ختم ہوگئی ہوتی اور اس کے بعد ہندوستان کا دامن عزت حوادث قتل و غارت گری کے دھبوں سے داغ دار نہ ہوتا۔ مگر افسوس کہ ۱۹۴۷ء کے بعد بھی آئے ہوئے دن جنون فرقہ پرستی کی بدمستیاں جاری رہیں اور بعد کے برسوں میں لگ بھگ کوئی سال بھی ایسا نہ گزرا جس میں فرقہ وارانہ ہنگامے اور فسادات رونما نہ ہوئے ہوں۔

ملک کے اندر بدامنی اور حوادث کا یہ تسلسل اقلیت کے لیے تو ایک مستقل آزمائش' بددلی اور بے اطمینانی کا سبب بنا ہی تھا۔ مگر اس کے ہاتھوں وطن عزیز کی عزت و نیک نامی کا دامن بھی تار تار ہوا اور اس کی ترقی اور خوش حالی کی منزل بھی دور ہوتی رہی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آزادی ہند کے بعد فسادات کا تسلسل ہی سب سے بڑا حربہ تھا' جس سے دنیا کی نظر میں ہندوتان کی امن پسندی' شرافت اور تہذیب کو رسوا کرنے کے لیے کام لیا گیا اور جس نے دوسروں کے ہاتھ مضبوط کیے۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جیسے سچے وطن دوست جو آزاد ہندوستان کو امن و خوش حالی کا گہوارہ اور دنیا کی نظروں میں نیک نام اور سربلند دیکھنے کی تڑپ رکھتے تھے اور اسی جذبے کے ساتھ انہوں نے اپنی جان کی قیمت پر حریت و انقلاب کے جھنڈے اٹھائے تھے۔ آزادی کے بعد ملک کے اندر مسلسل ہنگامے اور آئے دن فساد کی خبریں ان کے لیے کس قدر کوفت اور قلبی اذیت کا باعث تھیں' اس کا اندازہ دشوار نہیں۔ پھر بھی یہ انھی کا ظرف اور حوصلہ تھا کہ پندرہ برس تک برابر یہ سب کچھ دیکھتے رہے اور مایوس ہونے کی بجائے آخر دم تک اصلاح حال کی کوششوں میں لگے رہے۔ ایک طرف بے سہارا اقلیت کا یہ حال تھا کہ جہاں کہیں کوئی

فرقہ وارانہ یورش ہوتی مولانا ہی کی طرف امید کی نگاہیں اٹھتیں اوران سے بڑھ کرتھا بھی کون جو خدمت گزاری کی لگن میں اپنی جان عزیز سے بھی بے نیاز ہو چکا ہو اور دوسری طرف خود مولانا کا یہ حال رہا کہ ملک کے کسی بھی گوشے سے فساد کی خبر آئی اور مولانا تلملا کر اٹھے۔ ہو سکا تو خود موقع واردات پر پہنچے یا اپنی طرف سے اپنے رفقاء کار کو بھیجا۔ صحیح واقعات پر فوراً حکومت کے سربراہوں کو توجہ دلائی۔ پارلیمنٹ کے بھرے اجلاس میں فرقہ پرستوں کی حرکتیں کھول کر بیان کیں اوران پر اپنے دل کی چوٹ کا برملا اظہار کیا۔ برباد ہونے والے مظلوموں کی مدد کی فکر کی۔ زخمیوں اور ستم رسیدگان کی ڈھارس بندھائی اور جو کچھ خدمت وہ کر سکتے تھے اس کی تکمیل کے بغیر چین سے نہ بیٹھے۔

۱۹۵۰ء میں:

اواخر ۱۹۵۰ء میں ہولی کے موقع پر یوپی کے مغربی اضلاع مراد آباد' بریلی' پیلی بھیت' شاہجہان پور اور علی گڑھ میں ہنگامے برپا ہوئے اور دوسری طرف کلکتہ ونواح کلکتہ میں خوفناک اور شدید نوعیت کے حوادث قتل و غارت کی گرم بازاری ہوئی۔ مولانا مرحوم نے ہم لوگوں (انیس الحسن۔ مولانا فقیہہ الدین' مسٹر خلیل باغ والا اور مولوی شفیق احمد مرحوم) پر مشتمل ایک وفد اضلاع یوپی میں بھیجا اور خود ۵/ مارچ ۱۹۵۰ء کو کلکتہ پہنچ کر وہاں کی مصیبتوں کا جائزہ لیا۔ واقعات کی سنگینی کے پیش نظر حضرت مولانا آزاد مرحوم اور وزیر اعظم نہرو بھی کلکتہ پہنچ چکے تھے۔ مجاہد ملتؒ نے پنڈت جی کے ساتھ فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا۔ مظلوموں اور پناہ گزینوں سے ملے اور اصلاح حال کی تدبیروں میں پورا ہاتھ بٹایا۔ پانچ روز کلکتہ میں کام کرنے کے بعد ۱۲/ مارچ کو مولانا لکھنو آئے اور وزیر داخلہ شری لال بہادر شاستری سے یوپی کے حوادث پر تفصیل سے بات چیت کی اور واپسی میں خود شاہجہان پور' بریلی' پیلی بھیت ہوتے ہوئے حالات کا خود مشاہدہ کر کے دہلی لوٹے۔

ان ہی دنوں فسادات کی آگ یوپی و بنگال کے علاوہ گوالیار اور سی' پی میں بھی بھڑک اٹھی۔ حضرت مولانا نے جمعیۃ کا دوسرا وفد (مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی اور مسٹر محمد احمد وکیل پر مشتمل) گوالیار' کٹنی وغیرہ بھیجا اور دہلی میں بیٹھ کر ریاستی اور مرکزی حکومتوں کو اصلاح حال پر متوجہ فرماتے اور تدبیر و چارہ جوئی میں مصروف رہے اور ۲/ مئی کو خود کٹنی' ساگر' جبل پور کا

دورہ کر کے پیش آمدہ مصائب ومشکلات کی مفصل رپورٹ مرکزی اور ریاستی حکومت کو دی۔ اور مصیبت زدوں کی مدد کے لیے ہر ممکن جدوجہد فرمائی۔

اسی دوران (اپریل ۱۹۵۰ء) ٹونک میں ہنگامے ہوئے تو حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب اور سلطان یار خاں صاحب وکیل کو ٹونک بھیجا اور پھر ۲۹ر جنوری کو مال پورہ (راجستھان) سے فساد کی خبر آئی اور مولانا نے مسٹر شاکر علی خاں ومولانا محمد عاقل صاحب الہ آبادی کو مال پورہ روانہ کیا۔ اسی مہینہ میں ایک طرف کاٹھیاواڑ کے علاقوں دھوراجی' سیدھ پورہ وغیرہ میں سخت ہنگامے رونما ہوئے' جہاں مرکزی جمعیۃ کی طرف سے حضرت مولانا محمد میاں صاحب اور مسٹر آفتاب احمد بی۔ اے پر مشتمل ایک وفد کو روانہ کیا اور دوسری طرف بڑنگر (مدھیہ بھارت) میں شرپسندوں نے سراٹھایا تو مولانا سید محمد میاں صاحب' مسٹر سلطان یار خاں وکیل اور مولانا مسعود احمد صدیقی کو ادھر بھی بھیجا۔

ملک بھر سے ان حوادث قتل وغارت کی پوری رپورٹیں موصول ہونے کے بعد حضرت مولانا ایک طویل یادداشت ساتھ لے کر ۱۰ر جولائی ۱۹۵۰ء کو دہلی میں وزیر اعظم ہند پنڈت نہرو سے ملے اور مظلوم اقلیت کی پریشان حالی اور تباہیوں کا پورا نقشہ ان کے سامنے رکھا۔

اسی اثنا میں آسام کے تنگ نظر فرقہ پرستوں نے غریب اور بے سہارا اقلیت کو ستانے کے لیے ایک نئی ٹیکنیک ایجاد کی اور جابجا' پاکستانی' ہونے کے الزام میں مسلمانوں پر دار و گیر شروع ہوگئی۔ حضرت مولانا نے اس صورت حال کی تحقیق اور ضروری کوششوں کے لیے مرکزی جمعیۃ کی جانب سے حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب' حضرت مولانا محمد میاں صاحب اور مسٹر سلطان یار خاں وکیل کو آسام روانہ کیا اور اس وفد کے پہنچنے سے حالات میں خوش گوار تبدیلی پیدا ہوئی اور مسلمانوں کی بے چینی بھی بڑی حد تک دور ہو سکی۔

۲۷ر ستمبر ۱۹۵۰ء کو چلمل ضلع بھاگل پورہ میں فساد ہوا۔ جہاں حضرت مولانا محمد میاں صاجب اور حضرت مولانا نورالدین صاحب بہاری بشکل وفد پہنچے اور مجاہد ملتؒ نے وزیر اعظم بہار مسٹر سری کرشن سنہا کو تار دے کر متوجہ کیا۔ پھر ۱۱ر ستمبر کو دہلی میں وزیر اعظم ہند سے دوبارہ ملاقات کی۔

۱۹۵۱ء میں:

۳۱ ر جنوری کو کمار دھوبی (دھعباد) میں سخت ہنگامہ ہوا۔ مولانا نے پہلے چیف منسٹر کو تار بھیجا۔ پھر ۹ ر فروری کو خود وہاں پہنچ گئے۔ ۲۳ ر مارچ کو نول گڑھ (راجستھان) سے بدامنی کی خبریں آئیں۔ مولانا نے ٹیلی فون پر چیف منسٹر شری جے نرائن ویاس سے مفصل گفتگو کی۔ شروع مئی ۱۹۵۱ء میں ودھد (گجرات) میں فرقہ وارانہ فتنوں نے سر اٹھایا تو فوراً مولانا محمد رفیق دہلوی اور چودھری شیر جنگ کو وہاں بھیجا۔ ۷ ر جولائی کو اجین شہر میں ہنگامے ہوئے تو مدھیہ بھارت کے چیف منسٹر شری تخت مل جین کو متوجہ کیا اور مولانا مسعود احمد صاحب صدیقی سے پوری رپورٹ طلب کی۔ اکتوبر میں محرم کے دنوں بارہ بنکی اور بہرائچ میں فسادات رونما ہوئے تو حضرت مولانا سید محمد شاہد فاخری صاحب کو فوراً وہاں بھیجا۔

۱۹۵۲ء میں:

۱۲ ر فروری کو جے پور میں کچھ حوادث پیش آئے۔ وہاں راقم السطور کو اور مسٹر عتیق احمد کو بھیجا۔ پھر ہولی کے دنوں میں آگرہ و فیروز آباد میں بدامنی ہونے پر مولانا اخلاق حسین قاسمی اور مسٹر اسرار احمد آزاد کو ۱۷ ر مارچ کو روانہ کیا۔ چند ہی روز بعد مظفر نگر میں بھی گڑبڑ ہو گئی اور مجاہد ملت ؒ خود وہاں تشریف لے گئے پھر ستمبر میں ۲۰ ر تاریخ کو علی گڑھ میں کچھ واقعات پیش آئے۔ جہاں مولانا فقیہہ الدین کو بھیجا گیا۔ ادھر ۲۸ ر ستمبر کو دہلی میں محرم کے جلوس پر ہنگامہ ہوا' تو مولانا نے اس کی روک تھام کے لیے بھی بروقت بھاگ دوڑ کی۔

۱۹۵۳ء میں:

سب سے پہلے یکم مارچ کو (عین ہولی کے دن) اور پھر ۵ ر مارچ کو (رنگ پنچمی کے روز) بھوپال میں شدید فساد ہوا' جہاں حضرت مولانا محمد میاں صاحب' مسٹر یوسف فیروزی اور مولانا فقیہہ الدین پر مشتمل وفد بھیج کر اصلاح حال کی پوری کوششیں فرمائیں۔ ۱۶ ر اپریل کو چومو (ضلع جے پور) میں گڑبڑ ہوئی اور وہاں مسٹر سلطان یار خاں وکیل کو بھیجا۔

اسی زمانے میں گجرات کے نواح میں شدھی تحریک نے پوری قوت کے ساتھ سر اٹھایا تو اس کے مقابلے اور روک تھام کے لیے ناظم جمعیۃ علماء حضرت مولانا محمد میاں صاحب گجرات

پہنچے اور مرحوم مولانا شمس الدین صاحب بڑودوی کے ساتھ انہوں نے نہایت موثر' مفید اور خاموش خدمات انجام دیں اور اس فتنہ کی سرکوبی ہو سکی۔

۱۹۵۴ء میں:

۵/جون کو علی گڑھ میں پھر مار دھاڑ کی شورشیں بپا ہوئیں۔ مولوی فقیہہ الدین اور مولانا محمد زبیر قریشی کو حالات کی دیکھ بھال کے لیے بھیجا ادھر جولائی و اگست میں پیلی بھیت' ہلدوانی' متھرا' جودھ پور پالی' ڈیڈوانہ وغیرہ میں جزوی وارداتیں ہوئیں اور بڑے پیمانہ پر دکن کی طرف نظام آباد' النڈ' جالنہ' عادل آباد' گلبرگہ وغیرہ میں ''پاکستانی جھنڈا لہرانے'' کا بے جا الزام دے کر شرپسندوں نے شہری امن و سکون کو برباد کیا۔ مولانا مرحوم نے ان تمام واقعات پر جمعیۃ کے ریاستی کارکنوں کو اصلاح حال کے لیے بھیجا۔ اور خود مرکزی و ریاستی حکومتوں سے ربط قائم کر کے حالات کی درستی کے لیے کوشاں رہے۔ ان فسادات کے سلسلے میں ۲۶/اگست ۱۹۵۴ء کو مولانا نے پارلیمنٹ میں ایک شارٹ نوٹس سوال رکھنا چاہا جو اڈمٹ نہیں کیا گیا' تاہم مولانا ۳۰/۳۱/اگست کو لکھنو پہنچے اور ریاستی ذمہ داروں سے ملے اور وہاں سے مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا عبدالرؤف صاحب کو ساتھ لے کر پیلی بھیت گئے۔ جہاں مسلم اقلیت پر حوادث کا بہت اثر تھا۔ ۲/ستمبر کو دہلی میں جمعیۃ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس تھا۔ مولانا نے تمام حالات اجلاس کے سامنے رکھے اور طے پایا کہ جمعیۃ کا ایک معزز وفد وزیر اعظم ہند سے مل کر مسلمانوں کی بربادی اور پریشانیوں پر ان کو توجہ دلائے۔ ۱۸/ستمبر کو یہ وفد (جس میں حضرت مولانا احمد سعید صاحب' سید محمد جعفری صاحب' مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب' مولانا شاہد فاخری صاحب' مولانا نورالدین صاحب بہاری' مولانا سید محمد میاں صاحب اور خود حضرت مجاہد ملتؒ شریک تھے) حضرت شیخ مدنیؒ کی قیادت میں محترم پنڈت نہرو سے ملا۔ پنڈت جی نے وفد کی گزارشات اور تجاویز کو بڑی توجہ اور دردمندی کے ساتھ سنا' اور اسی کے نتیجے میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی جانب سے تمام ریاستی شاخوں کو ایک سرکلر کے ذریعے ہدایات دی گئیں کہ فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام اور مقامی حکام کی کوتاہ کاریوں پر کانگریس کے عمائدین اور کارکن پوری توجہ رکھیں اور اقلیت کی پریشانی اور بے اطمینانی دور کرنے میں پوری دلچسپی لیں۔

ان ہی دنوں حضرت مجاہد ملتؒ کی فکرمندانہ دوڑ دھوپ کو دیکھتے ہوئے کلکتہ کے مشہور

زمانہ اخبار ''آزاد ہند'' نے اپنے اداریہ میں لکھا تھا۔

''بڑھاپے میں آدمی کم زور پڑ جاتا ہے' دل بجھ جاتا ہے' خون میں ٹھنڈک دوڑ جاتی ہے' کام کرنے کی نہ تو امنگ باقی رہتی ہے اور نہ حوصلوں میں بلندی' مگر ہندوستان کے دو بوڑھے ایسے ہیں جو نوجوانوں کو بھی مات دیئے ہوئے ہیں۔ ایک تو ہیں پنڈت نہرو وزیراعظم ہند اور دوسرے جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سیکریٹری مولانا حفظ الرحمٰن! ان دو بوڑھوں نے اس وقت ملک کو اپنے کم زور کندھوں پر جواں اور مضبوط ہمت کے ساتھ اٹھالیا ہے۔ یہ فرق اپنی جگہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ ایک شخص عوامی لیڈر شپ کے علاوہ سرکاری کرسی بھی سنبھالے ہوئے ہے اور دہری محنت کر رہا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے آج سے چند برس پیچھے کے ہمت شکن ہندوستان میں جواں مردی سے عوام کی جو خدمت کی ہے۔ وہ ان کی زندگی کا ایسا ورق ہے جسے زمانے کی کسی عمر میں بھی بھلایا نہ جا سکے گا۔ اور آج بھی وہ آسمان پر گھنگھور بادل دیکھ کر جس طوفانی انداز سے ملک کے ایک گوشے سے دوسرے کونے تک دوڑتے پھر رہے ہیں اور ٹوٹتی ہوئی ہمتوں کو سنبھال رہے ہیں۔ یہ انہیں کا کام ہے۔ اگر آج کوئی سمجھے کہ وہ صرف مسلمانوں کے لیے کام کر رہے ہیں تو موجودہ حالات میں ایسا سمجھنا غیر ضروری نہیں ہے۔ جب عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں تو دوست بھی دشمن نظر آنے لگتے ہیں۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ مولانا نے مظلوم مسلمانوں کے حق میں جو آواز بلند کی ہے وہ پورے ہند کے لیے آواز ہے۔ اس آواز کے مخاطب ہندوستان کے ۳۶ کروڑ آدمی ہیں۔ مولانا کا خطاب انہیں سے ہوتا ہے۔ وہ انہیں کو بتاتے ہیں کہ آخر تم کس قسم کے جنون میں مبتلا ہوگئے ہو کہ اپنے ہی ناک کان کاٹے لے رہے ہو۔ مسلمان اس ملک کی رونق ہیں۔ عزت ہیں' حرمت ہیں۔ تم نادان اسے پیروں تلے روندے ڈال رہے ہو! چاہے آج یہ باتیں سمجھ میں نہ آئیں۔ کل ضرور سمجھ میں آ جائیں گی۔ اور تب مولانا کی خدمت کو بلا تفریق مذہب و ملت سراہا جائے گا۔ آنکھوں سے لگایا جائے گا۔''

اسی سال اکتوبر میں مدھوبنی (دربھنگہ) اور ضلع مظفر پور کے قصبات مہولیا اور فتح پور میں

اور ۱۹ رنومبر کو برہم پور (اڑیسہ) میں افسوسناک حوادث پیش آئے مولانا محترم ان دنوں دینی تعلیمی کنونشن کی تیاریوں میں بے حد مصروف تھے۔ پھر بھی وہ ان ہنگاموں پر ریاستی حکام و وزراء کو برابر توجہ دلاتے رہے۔

۱۹۵۵ء میں:

۲ رمارچ کو مندسور میں ہنگامہ ہوا جہاں مولانا مسعود احمد صدیقی کو تحقیق حال کے لیے بھیجا۔ سرونج کے واقعات پر مجھے اور مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی کو بھیجا اور ۳۰ رکو کوٹہ میں فرقہ وارانہ حوادث کی گرم بازاری ہوئی۔ مولانا خود کوٹہ پہنچے (راقم السطور بھی ساتھ تھا) اور حادثات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے راجستھان کے چیف منسٹر شری سکھاڑیا' آئی' جی' پولیس اور ڈی' آئی' جی کو کوٹہ بلایا۔ یہ لوگ دوسرے روز پہنچ گئے۔ مولانا نے تمام حالات ان کے سامنے رکھے۔ چنانچہ کلکٹر اور ایس' پی کوٹہ کا تبادلہ عمل میں آیا اور حالات کی درستی کے لیے کافی کوششیں ہوئیں۔ ۱۵ر اکتوبر کو کاس گنج میں کچھ شورش ہوئی اور مولانا نے فوراً مجھے' مولانا فقیہہ الدین اور مولانا عبدالشاہد خاں شروانی کو وہاں بھیجا۔

۵۶ء میں:

۲۴ رفروری کو آلوٹ میں کچھ گڑبڑ ہوئی' جس پر ریاستی حکومت کو توجہ دلائی۔ ۷ار اپریل کو دہلی میں جمعیۃ کی ورکنگ کمیٹی کے عین اجلاس میں بھوپال سے ٹیلی فون پر شدید حوادث کی اطلاع ملی۔ دوسرے ہی روز مولانا شاہد فاخری صاحب کو اور مجھے بھوپال روانہ کیا۔ ادھر ۱۳ رمئی کو گودرا اور ۲۹ رمئی کو دھولیہ میں کچھ بدامنی ہوئی۔ اور پھر ستمبر میں "ریلیجیس لیڈرز" نامی کتاب نے ملک بھر میں جو فتنہ کھڑا کیا۔ اس کے نتیجے میں اورئی' جبل پور' کھام گاؤں' علی گڑھ' مراد آباد اور جگہ جگہ بڑے پیمانہ پر فسادات کی آگ بھڑکی۔ مولانا نے حافظ جمیل الرحمٰن صاحب اور مسٹر عبدالستار فاروقی کو جبل پور وغیرہ اور مولوی فقیہہ الدین' مسٹر سلطان یار خاں اور مولانا عبدالشکور ایم' پی کو علی گڑھ روانہ کیا۔ خود مراد آباد پہنچے اور دہلی آتے ہی پنڈت نہرو' پنڈت پنتھ اور صدر کانگریس سے ملے اور تمام حالات ان کے نوٹس میں لائے۔ پنڈت نہرو پر ان حوادث کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ ۲۳ رستمبر کو انہوں نے دہلی کے جلسہ عام میں فرقہ پرستوں کی فتنہ سامانی اور توہین مذاہب کے خلاف سخت الفاظ میں تنبیہ کی اور ان حرکتوں کو ملک کی عزت و

نیک نامی کے لیے ناقابل برداشت قرار دیا۔

۵۷ء، ۵۸ء میں فسادات کا تسلسل بڑی حد تک دبا رہا۔ رادیر، ساکلی، بھوساول، جل گاؤں وغیرہ میں کچھ جزوی واقعات ضرور پیش آئے، لیکن عام حالات پرسکون رہے۔

۵۹ء میں:

شرو فساد کی کوششوں نے پھر سر اٹھایا، چنانچہ ۹ر جنوری ۵۹ء کو کشن گنج (ضلع پورنیہ) میں ہنگامے برپا ہوئے اور مجاہد ملتؒ نے فوراً مولانا محمد میاں صاحب، مولانا محمد طاہر صاحب ایم پی اور مولانا سید محمد نوراللہ صاحب کو وہاں روانہ کیا۔ پھر ہولی کے موقع پر ۲۶ر مارچ کو مبارک پور دبہرائچ میں اقلیت کشی کے شدید حوادث پیش آئے اور ان سے بھی بڑھ کر پولیس کے مظالم نے حالات کو سنگین بنا دیا۔ رمضان کے دن تھے پھر بھی ۲۸ر مارچ کو مولانا خود روانہ ہوئے اور جو دردناک حالات وہاں دیکھ کر آئے۔ ان سے بے حد مغموم اور متاثر تھے۔ واپسی میں لکھنؤ ٹھیر کر چیف منسٹر یوپی کو مولانا نے اپنے تاثرات اور مشاہدات سے آگاہ کیا۔

دہلی پہنچے ہی تھے کہ دت نگر (ضلع میرٹھ) کا ایک وفد اپنی بپتا سنانے کے لیے مولانا کے پاس آیا۔ مولانا نے فوراً مولوی فقیہ الدین صاحب کو روانہ کیا۔ ادھر رنگ پنچمی کے دن (۲۹ر مارچ کو) بھوپال میں پھر قتل و غارت کی گرم بازاری ہوئی اور مولانا ۳ر اپریل کو مجھے ہمراہ لے کر بھوپال پہنچ گئے۔ حالات کو خود دیکھا اور سنا بھاری تعداد میں گرفتاریاں ہوئی تھیں۔ مولانا نے جیل کا وزٹ بھی کیا۔

ادھر ۱۷ر اپریل کو رام نومی کے دن سیتا مڑھی اور آختہ میں بڑے پیمانے پر مار دھاڑ شروع ہوگئی۔ مولانا نے فوراً جمعیۃ علماء بہار کا وفد وہاں بھیجا اور خود ریاستی وزیر اعظم کو تار دیئے۔ ساتھ ہی دہلی میں مرکزی جمعیۃ کی جانب سے صدر کانگریس کو ایک مفصل میمورنڈم دیا اور ۷ر مئی کو مسلم ممبران پارلیمنٹ کے نمائندہ وفد کے ساتھ پرائم منسٹر صاحب سے ملے اور فرقہ واریت کی بدمستیوں پر حالات و مشاہدات کی ایک موثر یادداشت ان کے سامنے بھی رکھی۔ چنانچہ ۹ر مئی کو کانگریس ورکنگ کمیٹی میں ملک کے ان افسوسناک حالات پر غور کیا گیا۔ خصوصی دعوت پر مولانا مرحوم بھی اس میں شریک ہوئے۔ مدھیہ پردیش کے چیف منسٹر شری کاٹجو بھی بلائے گئے۔ اس میٹنگ میں بہت صفائی۔ کے ساتھ مولانا نے فرقہ پرستوں کی حرکتوں کے ساتھ

مقامی حکام کے عملی تعاون اور گہری دلچسپیوں کے شواہد پیش کیے۔ ادھر سیتا مڑھی اور آختہ سے مولانا کو مسلسل بلاوا آ رہا تھا۔ چنانچہ ۲ر جولائی کو وہ خود وہاں پہنچے اور ضروری جدوجہد عمل میں لائے۔

۶۰ء میں:

۱۲ر اگست کو فیروز آباد کی جامع مسجد پر جو شدید حادثہ پیش آیا۔ اس کی یاد ابھی ذہنوں میں تازہ ہوگی۔ یہاں مولانا مرحوم نے پہلے جمعیۃ کے وفد کے طور پر مولانا فقیہہ الدین اور ڈاکٹر محمود قادری صاحب کو بھیجا اور خود ٹیلی فون پر یوٗپی کے وزراء سے بات کی۔ ادھر وزیر اعظم ہند سے ملے اور پھر جب حالات زیادہ بگڑے اور ۱۸ر ستمبر کو دوبارہ فیروز آباد سے آگرہ تک آگ پھیلی تو مولانا مرحوم خود دونوں جگہ پہنچے۔ آئی' جی' پی اور ڈی' آئی جی' کمشنر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے ملے اور دونوں فرقوں کی کش مکش ختم کرانے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔

۶۱ء کے بھیانک حوادث:

۶۱ء شروع ہوا تو اس کے تیور اور بھی غضب ناک تھے۔ ادھر مولانا ۲۳ر جنوری سے آسام اور بہار کے دورہ پر تھے۔ ۸ر فروری کو دہلی واپس پہنچے۔ ادھر ۶ر فروری سے جبل پور میں بھیانک اور دہشت ناک حوادث کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ دہلی واپس پہنچتے ہی مولانا نے ٹرنک کال پر چیف منسٹر مدھیہ پردیش ڈاکٹر کاٹجو سے بات کی۔ انہوں نے اطمینان دلایا کہ حالات قابو میں ہیں۔ مگر اگلے ہی روز ۹ر فروری کو وہاں قتل و غارت کا سلسلہ اور بھی تیز ہو گیا۔ آنے والی خبروں سے اندازہ ہوا کہ حالات زیادہ بگڑ چکے ہیں اور آگ دور دور تک پھیل رہی ہے۔ مولانا نے فوراً محترم پنڈت نہرو وزیر اعظم ہند کو ایک ذاتی خط لکھا اور اپنی گہری تشویش کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی حالات کی تحقیق کے لیے مرکزی جمعیۃ کا وفد جس میں راقم السطور (انیس الحسن) اور مولانا مسعود احمد صدیقی شریک تھے۔ جبل پور روانہ کیا۔ ہم لوگ ۱۳ر فروری کو بھوپال رہ کر انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر رستم جی سے ملے' جن کے لیے مولانا نے ایک مفصل خط ہمارے سپرد کیا تھا اور دوسرے روز جبل پور پہنچ کر ہم نے سب سے پہلے مسٹر عثمانی وکیل اور صدر جمعیۃ (سیٹھ احمد علی رجب علی) سے ملاقات کی اور پھر شہر کے فساد زدہ علاقوں' آتش زدہ اور برباد شدہ دوکانوں' مکانوں وغیرہ کو دیکھا زخمی ہونے والوں سے ملے اور شہر کے مختلف محلوں کا گشت کیا۔

جہاں مسلمان پناہ گزیں تھے۔ شہر کے مونسپل میئر شری بھوانی داس اور شری جگ موہن داس کے ساتھ بعض علاقوں میں ریلیف کا کام دیکھا۔ جمعیۃ کے عمائدین مولانا ریاست علی صاحب اور محمد رمضان پاپا صاحب برابر ہمارے ساتھ رہے۔ جبل پور سے واپسی پر ہم لوگ ساگر ٹھہرے اور وہاں کی تباہیوں کا نقشہ بھی دیکھا۔ اور حاجی محمد شفیع صاحب ایم' ایل' اے کے مکان میں پناہ گزینوں سے ملاقاتیں کیں۔ پھر مولانا مسعود صاحب اوجین واپس ہو گئے۔ اور میں نے دہلی پہنچ کر حضرت مولانا کو اپنے مشاہدات اور تاثرات سے مطلع کیا۔

یہاں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ ان دنوں جبل پور' سروپا' ساگر اور گردوپیش میں جو بھیانک اور دردناک حوادث پیش آئے۔ ان کی سنگینی کا چرچا دور دور تک ہوا۔ اور بعد میں کانگریس' کمیونسٹ' سوشلسٹ پارٹیوں کے وفود بھی پہنچے۔ ممبران پارلیمنٹ کی ایک جماعت بھی وہاں گئی اور دسیوں جماعتوں کے وفود اور لیڈر پہنچتے رہے مگر ان حوادث کے فوراً بعد خطرناک حالات میں سب سے پہلا وفد جو وہاں پہنچا۔ وہ ہم خدام پر مشتمل جمعیۃ علماء ہند ہی کا وفد تھا۔ ۱۴/۱۵ فروری کو ہم لوگ جبل پور میں تھے۔ وہیں ۱۵/ فروری کو ہم نے رمضان المبارک کا چاند دیکھا تھا۔

بہر حال ان حوادث کا جتنا گہرا اثر مجاہد ملتؒ پر ہوا اس کا کچھ اندازہ ان مضطرب اور دردمندانہ کوششوں سے ہی ہو سکتا ہے جو ان حوادث کے بعد مولانا مرحوم نے مسلسل انجام دیں۔ اور جو بالآخران کی تندرستی اور زندگی کا سودا ثابت ہوئیں۔

ہماری رپورٹ دیکھنے کے بعد مولانا مرحوم نے ایک طرف وزیراعظم ہند کو تمام حالات سے مطلع کیا اور دوسری طرف ۲۱/ فروری کو (اور پھر اسی سلسلے میں ۲۹/ مارچ کو) ہند پارلیمنٹ میں وہ معرکۃ الآراء تقریریں کیں جن پر پورے ملک سے تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہوئیں اور جن کو مجاہد ملتؒ کی جرأت گفتار و کردار کا آئینہ کہا جا سکتا ہے یہ دونوں تقریریں اس تالیف کے آخر میں شائع کی جا رہی ہیں۔ ساتھ ہی مولانا نے پورے ملک سے ان مظلومین کی امداد کے لیے اپیل کی تو اس کے کونہ کونہ سے امدادی سامان اور قوم کا ایک سیلاب امنڈ آیا۔ آخر تک کل تقریباً تین لاکھ روپیہ موصول ہوا۔ اس امداد کی سب سے پہلی قسط لے کر ۲۶/ فروری کو مولانا روانہ ہوئے۔ مسٹر مظہر امام ایم' پی اور ہمارے رفیق ادارہ مسٹر سلیمان صابر ساتھ تھے۔ پانچ روز وہاں ٹھہر کر مولانا مرحوم نے تمام حالات اور امدادی ضروریات کا خود مشاہدہ کیا۔

ساگر وغیرہ بھی گئے۔ پھر ۱۵؍مارچ کو دوبارہ تشریف لے گئے۔ اور اس کے بعد بار بار جبل پور وساگر جاتے آتے رہے۔ اپنے علاوہ جماعت کے رفقاء کار میں سے حضرت مولانا محمد میاں صاحب' مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی' مولانا محمد عاقل صاحب الہ آبادی۔ مولانا فقیہہ الدین' مولانا شاہد فاخری صاحب مسٹر ظہیر الدین صدیقی اور جمعیۃ کے دوسرے کارکنوں کی مستقل ڈیوٹیاں لگا دیں اور خدمت امداد کا ایک مستقل مشن قائم کر دیا۔ ساتھ ہی مقدمات کی پیروی اور انکوائری کمیشن کے سامنے واقعات کے پہلوؤں کو واضح کرنے کے لیے ممتاز قانون دانوں کی ایک قانونی امدادی کمیٹی بھی بنائی۔ دوسری جماعتیں اور افراد جو امدادی خدمات انجام دے رہے تھے ان کے ساتھ تعاون میں بھی مولانا نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

(۱۴)

مولانا حفظ الرحمٰنؒ اور کانگریس

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ اپنے ہوش و شعور کے وقت سے آخر تک پورے عزم و یقین کے ساتھ نہ صرف اپنے نظریات میں بلکہ عمل اور مجاہدوں میں بھی انڈین نیشنل کانگریس سے وابستہ رہے۔ ملک میں سیاسی ہماہمی اور تحریک کے ساتھ ساتھ یہ تعلق اور بھی پختہ ہوتا چلا گیا' یہاں تک کہ جذبات کے انتہائی عروج اور نظریات کے شدید تصادم کے دور میں بھی مولانا مرحوم کے اس تعلق میں کبھی کوئی کمزوری نہیں آئی۔

آزادی وطن کے بعد اگست ۵۰ء میں اجلاس ناسک کے موقع پر آنجہانی پرشوتم داس ٹنڈن کانگریس کے صدر ہوئے اور گیارہ مہینے انتہائی کش مکش میں گزار کر بالآخر انہیں صدارت سے دست بردار ہونا پڑا۔ ٹنڈن جی کا دور صدارت کانگریس کی تاریخ میں اندرونی خلفشار اور انتہائی کش مکش کا دور رہا ہے۔ یہاں تک مرحوم رفیع احمد قدوائی جیسے بڑے بڑے کٹر کانگریسی بھی اس زمانے میں الگ ہو گئے تھے۔ پنڈت نہرو اور مولانا آزادؒ نے بھی یہ دور انتہائی بیزاری اور ناراضی کے ساتھ گزارا۔ لیکن مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے (ٹنڈن جی کے بعض نظریات سے انتہائی بیزار ہوتے ہوئے بھی) اس دور میں اپنی پسندیدہ جماعت کو نہ چھوڑا۔ اس لیے کہ ملکی سیاست میں وہ انڈین کانگریس ہی کو سچے اصول و نظریات کا علم بردار سمجھتے تھے۔ پھر جب ہم اس پہلو پر بھی نظر رکھیں کہ کانگریس کے ساتھ اتنی گہری اور عملی وابستگی عمر بھر مولانا مرحوم کے لیے ایک کڑی آزمائش اور ایثار و فداکاری کا مسلسل امتحان بنی رہی ہے اور اس کی بدولت انہوں نے ہمیشہ اپنے ہم مذہبوں کے سخت سے سخت تیور بھی گوارا کیے' گالیاں بھی کھائیں' اذیتیں بھی سہیں' طرح طرح کے نقصان اور صدمے برداشت کیے اور ساتھ ہی اپنی زندگی کی راحتوں اور اپنے کسب معاش بلکہ صحت اور تندرستی سے بھی منہ پھیر لیا تو ان کی اصول پسندی' استقامت اور کردار کی بلندی اور بھی نمایاں ہوتی ہے۔

کانگریس سے تعلق رکھنے والے بہت سے ایسے بھی ہیں جنہوں نے پوری عافیت پسندی کے ساتھ اپنی کانگریست نباہ دی۔ لیکن مولانا مرحوم اس سطح سے بہت بلند تھے۔ انہوں نے کانگریس کو اپنایا تو ہر فکر و لالچ سے بلند ہو کر' اس کے مقاصد کی تکمیل اور اس کی تحریکوں کی کامیابی کے لیے اپنی جان کھپائی اور کھل کر اس کی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ آزادی وطن کی خاطر پچھلی چوتھائی صدی میں کانگریس کی جتنی تحریکیں اٹھیں اور جب جب گرفتاری اور قید و بند کی نوبت آئی' مولانا ہر موقع پر پیش پیش ہی نظر آئے۔

صوبہ یوپی کانگریس میں مدت تک مولانا اگیزیکٹیو کے رکن رہے۔ ۳۶ء سے آخر تک آل انڈیا کانگریس کے ممبر بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قائدین کی صف میں شامل رہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد کانگریس ٹکٹ پر ہی وہ چودہ سال مسلسل دستور ساز اسمبلی اور پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوتے رہے۔ اے آئی' سی' سی کے ہر اجلاس میں بڑے اہتمام کے ساتھ شریک ہوتے۔ ضرورت ہوتی تو درپیش مسائل پر تقریر بھی کرتے۔ الیکشن کا زمانہ آتا تو پورے جوش اور تندہی کے ساتھ کانگریسی امیدواروں کی کامیابی کے لیے جہاں تہاں دورے اور تقریریں کرتے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ۵۲ء اور ۵۷ء کے جنرل الیکشن میں مولانا مرحوم کا مقام ان گنے چنے کانگریسی رہنماؤں میں تھا جن کا بے پناہ اثر و نفوذ' جن کے بیان و تلقین اور ساحرانہ تقریروں پر کانگریس کی بھرپور کامیابی کا مدار ہوتا تھا اور جن کی کوششیں پورے ملک کی فضا بدل دیتی تھیں۔ مولانا کی ہمیشہ یہ عادت رہی کہ جب بھی کسی ہنگامی معاملے میں کسی جگہ جاتے تو سب سے پہلے کانگریس کے کارکنوں کو جمع کرتے اور ان کی ذمہ داری یاد دلاتے' ان کے تعاون ہی سے معاملے کا حل اور اصلاح کی تدبیر فرماتے۔ یہ بھی ان کے جماعتی احساس اور وضع داری کا نشان تھا۔

ملک کی آزادی سے پہلے کانگریسی ہونا جتنا خطرناک اور حوصلہ طلب تھا' آزادی کے بعد اتنا ہی آسان بلکہ مصلحت وقت بن گیا تھا۔ لیکن مولانا مرحوم نے جس عزم و استقامت' عالی حوصلگی' بے غرضی اور خلوص نیت کے ساتھ آزادی سے پہلے دور میں کانگریس کو اپنایا تھا' آزادی کے بعد بھی کردار کی اسی بلندی پر قائم رہے یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد جب ۴۷ء سے اکثریت کی فرقہ پرستی اور نفسا نفسی نے سر اٹھایا اور ہندوستان کے شہری مسلمانوں کو طرح طرح سے پامال کرنے پر کمر باندھی تو مولانا مرحوم تیور بدل کر اٹھے اور ان ہی رفقائے جماعت کو جو

کل تک جیل کے ساتھی اور آج اقتدار و اختیار کے مسند نشین تھے‘ مولانا نے قدم بقدم ٹوکا‘ گاندھی جی‘ پنڈت نہرو‘ سردار پٹیل اور مولانا آزادؒ کا ہاتھ پکڑا‘ بڑے بڑے منسٹروں اور چیف منسٹروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے کہا!

”اگر ہندوستان کا بنیادی دستور کوئی زندہ حقیقت ہے تو یونین کے پانچ کروڑ مسلم شہریوں کو یرغمال نہیں بنایا جا سکتا۔ ان مسلمانوں کی وفاداری کا مسئلہ ایک فرسودہ سوال بن چکا ہے۔ بار بار اس کو زیر بحث لانا نہ ملک کی کوئی خدمت ہے‘ نہ دماغ کی کوئی ذہانت‘ اگر کچھ مسلمان اس لیے غیر وفادار ہیں کہ انہوں نے ملک کی تقسیم کے لیے رائے دی تھی اور ایک ہی رات میں ان کے دل نہیں بدل سکتے تو آر ایس ایس اور دوسری فرقہ وار جماعتیں جو آج تک جمہوری مقاصد کو تباہ کرتی رہی ہیں۔ کانگریس میں شامل ہو کر بھی کس طرح ایک ہی رات میں اپنے دل و دماغ کو بدل سکتی ہیں اگر ان کو اپنانے کی تدبیریں کی جا سکتی ہیں تو یہ کیوں ناممکن ہے کہ انصاف و جمہوریت کی فضا پیدا کر کے ان مسلمانوں کے دلوں کو بھی اپنا لیا جائے۔“

”کسی بھی جائز شکایت کے موقع پر پاکستان یا لیگ کا نام لے کر ہماری آواز کو دبانے کی کوشش نہ کی جائے‘ ہم نے وطن کی آزادی کے لیے اسی طرح اپنی جان کی بازی لگائی ہے‘ جس طرح دوسروں نے۔ آج وطن کی سرزمین پر جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل اپنا حق رکھتے ہیں تو حسین احمد‘ کفایت اللہ اور حفظ الرحمٰن کو بھی وہی حق حاصل ہے اور ان کے اس حق کو چھینا نہیں جا سکتا۔“

آج بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحریک آزادی وطن اور کانگریس مین مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی شرکت اور سرفروشانہ جدوجہد جس طرح وطن عزیز کی سربلندی کا ذریعہ بنی‘ مسلمانان ہند کو بھی خاص طور پر پچھلے پندرہ برس میں اسی کردار کی بدولت بہت کچھ تحفظ اور سہارا حاصل ہو سکا‘ آج اس واقعے سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ۴۷ء‘ ۶۲ء تک آزادی کے دور میں مسلسل اکثریت کی فرقہ پرستی کو چیلنج کرنے اور مسلمانان ہند کے ساتھ کی جانے والی بے انصافیوں کے انسداد و اصلاح کے لیے انتہائی بے جگری اور تندہی کے ساتھ مجاہدانہ کارنامے انجام دینے کی جو سعادت مولانا مرحوم کے حصہ میں آئی اس کا سرچشمہ مولانا مرحوم کا یہی بلند و

بالا' بے باک اور بے غرض کردار تھا جو ہر موقع پر ان کی آواز میں اثر اور ارادوں میں قوت بن کرا بھرتا تھا اور ماحول پر چھا جاتا تھا۔

یوپی اور دہلی تو خیران کا گھر تھا۔ اس پوری مدت میں میرا خود مشاہدہ یہ ہے کہ وہ جب خالص مسلمانوں کے مسائل و معاملات کو لے کر ہندوستان کے کسی بھی حصہ میں جاتے خواہ پنجاب ہو یا راجستھان' مدھیہ پردیش ہو یا اڑیسہ' مہاراشٹر ہو یا گجرات' بہار' بنگال ہو یا آسام' حتیٰ کہ جنوبی ہند میں آندھرا' مدراس اور میسور تک کہیں بھی وہ پہنچتے' کسی پہلی ملاقات اور تعارف کے بغیر بھی' وہاں کے ریاستی حکام' وزرا اور وزیراعلیٰ بھی اسی احترام وعقیدت کے ساتھ ان سے ملتے۔ ان کی بات سنتے اور دھیان دیتے تھے جس کی توقع دہلی یا یوپی میں ہو سکتی تھی۔

یہ رتبہ بلند' ملا جس کو مل گیا

بھوپال کا واقعہ:

مارچ ۵۹ء میں بھوپال شہر میں سخت فساد رونما ہوا' رمضان شریف کے دن تھے۔ حالات کی سنگینی کو سن کر مولانا فوراً بھوپال پہنچے' میں ساتھ تھا۔ وہاں شہر کے حالات دیکھے۔ جمعیۃ کے مقامی ذمہ دار حضرات سے پوری سرگزشت سنی۔ اتفاق سے وزیراعلیٰ ڈاکٹر کاٹجو باہر گئے ہوئے تھے۔ اور ڈپٹی ہوم منسٹر صاحب ہی (جو گوالیار کے باشندہ تھے اور پہلے کبھی مولانا سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی تھی) صورت حال کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ مولانا نے ان سے وقت لیا اور ان کے بنگلہ پر ملاقات ہوئی۔ انسپکٹر جنرل پولیس بھی موجود تھے۔ مولانا کے ساتھ صرف میں تھا۔ گفتگو شروع ہوئی۔ مولانا نے اپنے مشاہدات بتا کر جب حکومت کی غلط روش اور بے محل اقدامات کا ذکر کیا تو وہ کچھ برہم ہونے لگے۔ مولانا تو پہلے ہی جوش میں تھے۔ گفتگو کی تلخی بڑھی اور منسٹر صاحب موصوف کے اکھڑے اکھڑے جواب سن کر اور بھی گرما گئے۔ منسٹر صاحب کو شاید اس جرأت گفتار سے پہلی بار سابقہ پڑا تھا۔ کچھ تیور دکھانے لگے پھر جو مولانا نے ان کو للکارا ہے۔

> ''میرے دیکھے ہوئے واقعات کو بھی جب آپ جھٹلا رہے ہیں تو اصلاح حال کی کیا امید ہو سکتی ہے۔۔۔۔ میں آپ کے سامنے مسلمانوں کی طرف داری کر رہا ہوں؟ آپ مجھے جانتے ہی نہیں۔ آج کاٹجو یہاں ہوتے تو وہ مجھے اس طرح

جواب نہ دیتے جس طرح آپ دے رہے ہیں۔۔۔‘‘ وغیرہ وغیرہ تو وہ بے چارے دم بخود ہو کر رہ گئے اور کچھ سوچنے کے بعد بڑی ندامت کا اظہار کیا اور کہنے لگے۔ واقعی مولانا میں نے دیر میں آپ کو پہچانا‘ میں تو آپ سے ملنے کا خود آرزو مند تھا آپ کو گوالیار بلانا چاہتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ رنگ ہی بدل گیا۔ بڑی محبت سے باہر تک پہنچانے آئے اور بہت کچھ اطمینان دلا کر رخصت کیا۔

جالور کا واقعہ:

اسی طرح ایک اور واقعہ جالور میں پیش آیا۔ دسمبر ۵۸ء میں مولانا نے جمعیۃ علماء جودھ پور ڈویژن کی دعوت پر پالی‘ سوجت‘ جودھ پور وغیرہ کا دورہ کیا اور جالور بھی پہنچے‘ جمعیۃ علماء راجستھان کے روح رواں الحاج حکیم محمد علی غوری‘ وکیل احمد بخش سندھی اور میں رفقاے سفر تھے۔ یہ ایک دور افتادہ بستی ہے۔ جمعیۃ کا نظام وہاں نیا نیا قائم ہوا تھا۔ دفتر کا افتتاح اور جھنڈا لہرانے کی رسم مولانا کے ہاتھوں انجام پائی تھی۔ مقامی مہاسبھائیوں نے بستی میں شور برپا کر دیا کہ آج یہاں مسلم لیگ کا جھنڈا لہرایا جا رہا ہے۔ ہم اس کو نہیں لہرانے دیں گے۔ شہر میں ایک ہیجان بپا ہو گیا۔ مسلمان بھی خائف مقامی کانگریسی بھی کچھ چھپے چھپے اور فکر مند جوں توں کر کے جھنڈا تو لہرا دیا گیا۔ مگر رات کو عام جلسے میں گڑبڑ کرنے کے ارادے قطعی تھے۔

جلسہ شروع ہوا۔ مہاسبھائی کوئی فتنہ اٹھانے کے لیے موقع کے منتظر ہی تھے۔ مولانا کو بھی صورت حال سے جوش آ گیا تھا۔ تقریر شروع کی تو اپنی عادت سے بڑھ کر اس قوت اور روانی کے ساتھ بولے کے ایک سماں بندھ گیا۔ تقریر کیا تھی۔ ایک بوچھاڑ تھی۔ جس میں بجلی کی سی کڑک اور سیلاب کا جوش تھا۔

’’میں یہاں مسلم لیگ بنانے آیا ہوں۔ یہی ہے آپ کی سمجھ بوجھ کی پرواز! مجھے آپ جانتے نہیں ہیں تو پہلے گاندھی جی کی سمادھی پر جا کر پوچھیے‘ جواہر لال نہرو کے دل سے پوچھیے کہ میں کون ہوں۔ میں یہاں مسلم لیگ کا جھنڈا لہراؤں گا اور آپ اس کو روکیں گے! آپ بھول میں ہیں۔ کان کھول کر سن لیجیے! جس دن مسلم لیگ کا جھنڈا لہرایا گیا تھا۔ اس کو روکنے کے لیے آپ میں ہمت نہیں تھی‘ میں ہی آگے بڑھا تھا۔ اور پھر سن لیجیے کہ آج بھی اگر لیگ کا جھنڈا لے کر کوئی

اٹھے گا۔تو آپ سے پہلے اس کا ہاتھ پکڑنے والا میں ہی ہوں گا اور یہ جمعیۃ کے غریب کارکن ہی اٹھیں گے۔ یہ آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔اب آپ ایک آزاد و باوقار دیش کے باشندے ہیں۔ ہوش و حواس کی بات کیجئے وغیرہ وغیرہ۔''

جالور والوں کے لیے یہ ایک نئی بات تھی کہ ایک انسان چاروں طرف سے بکھرے ہوئے ماحول میں کھڑا ہو کر اس جرأت' تیز رفتاری اور گھن گرج کے ساتھ بولے' حیرانی کے عالم میں وہ بھی سب کچھ بھول گئے' جن کے ارادے ہی کچھ اور تھے۔ دل ہی دل میں شرمسار اور کھوئے کھوئے الٹے پاؤں واپس ہو گئے۔ جمعیۃ اور کانگریسی کارکنوں میں اس کی جگہ ہمت اور جوش ابھرا۔ اگلے روز شہر بھر نے بڑی محبت اور قدر کی نگاہوں سے مولانا کو رخصت کیا۔

(۱۵)

جمعیۃ العلماءِ ہند۔۔تاریخ و تنظیم کا دور جدید

۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء کی تشکیل اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی قومی وملی سرگرمیوں کا آغاز تقریباً ساتھ ساتھ ہوا اس وقت سے مولانا مرحوم جمعیۃ علماء سے وابستہ رہے' جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ یہ وابستگی اور تعلق بھی بڑھتا رہا' یہاں تک کہ مارچ ۴۲ء کے اجلاس لاہور میں جمعیۃ علماء ہند کی نظامت عامہ مجاہد ملتؒ کو تفویض کر دی گئی' جمعیۃ کے اس اجلاس میں حضرت شیخ الاسلامؒ' حضرت مولانا آزادؒ' حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ جیسے اکابر امت کی موجودگی میں اس منصب جلیل پر باتفاق رائے مولانا مرحوم کا انتخاب ہوا۔ اور آنے والے وقت میں مولانا مرحوم نے جس حسن وخوبی کے ساتھ اس عظیم منصب کا حق ادا کیا اور اس کی قدر و منزلت کو چار چاند لگائے۔ وہ درحقیقت ان ہی کا حصہ تھا۔ مولانا مرحوم اپنی زندگی کے آخری سانس تک یعنی بیس سال مسلسل ملت اسلامیہ کے اس عالی قدر اعزاز واعتماد پر فائز رہے۔

جمعیۃ علماء کی تاریخ میں مجاہد ملتؒ کا یہ دور اپنی بھرپور خدمات' وسیع تنظیم' دور آفریں کارناموں اور عوام وخواص میں اپنے اعتماد ومقبولیت کے لحاظ سے جمعیۃ کی تمام تاریخ پر بھاری نظر آتا ہے۔ نصب العین اور اغراض ومقاصد کے لحاظ سے اس سے پہلے بھی جمعیۃ علماء اپنا وہی موقف رکھتی تھی۔ لیکن ان دنوں جنگ آزادی کی ہماہمی اس شدت کے ساتھ جاری رہی کہ جماعتی خدمات اور سرگرمیوں کا بڑا حصہ اسی محاذ پر صرف ہوتا رہا۔ اسی لیے جمعیۃ علماء اس وقت ملک کی ایک حریت پسند سیاسی جماعت کی حیثیت سے نمایاں رہی۔

ایک دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ جمعیۃ علماء اس وقت عوام سے زیادہ علماء کی مخصوص تنظیم سمجھی جاتی تھی۔ دستوری لحاظ سے بھی اس کی تنظیم اتنی وسیع اور ہمہ گیر نہ تھی۔

مجاہد ملتؒ نے اس کی قیادت سنبھالی تو اس وقت وطن عزیز کی تحریک آزادی اپنی آخری منزل میں تھی۔ اسی سال (۱۹۴۲ء) کے وسط میں ''کوئٹ انڈیا'' کی آخری تحریک برپا ہوئی

اور دوسرے عمائدین جماعت کے ساتھ ساتھ مجاہد ملت بھی نظر بند کر دیئے گئے۔ دو سال قید و بند میں گزار کر ۱۴ر جولائی ۴۲ء کو آپ بریلی جیل سے رہا ہو کر آئے اور فوراً ہی اپنی جماعتی ذمہ داریوں کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ اس وقت سے اب تک جمعیۃ کے افکار و اعمال میں مجاہد ملتؒ کا قائدانہ کردار مسلسل نمایاں رہا۔ اور اس میں شک نہیں کہ مولانا مرحوم نے جس تندہی اور انہماک کے ساتھ بیس سال کے اس طویل عرصے میں خدمت و عمل کی راہوں کو آباد رکھا' اس نے جمعیۃ کو ایک نئی تاریخ اور ایک نیا کردار بخشا اور بلند سے بلند موقف تک پہنچایا۔ مجاہد ملت کے اس دور میں جمعیۃ علماء ہند ایک سیاسی تحریک سے بڑھ کر جہد و عمل کا مرکز بن گئی۔ اور اس کی خدمات کا دائرہ زندگی کے تمام شعبوں تک پھیل گیا۔ ساتھ ہی دستوری اور تنظیمی لحاظ سے وہ ملک بھر کے مسلمانوں کی وسیع واحد نمائندہ تنظیم بن گئی' اور ہندوستان کے گوشے گوشے میں اس کی قیادت و اعتماد کے پرچم لہرانے لگے۔ وطن عزیز کے کتنے ہی علاقے ایسے تھے جہاں ۱۹۴۷ء تک جمعیۃ کے تنظیمی نشان قائم نہیں ہوئے تھے۔ لیکن ۴۷ء کے بعد سرزمین ہند کی کوئی ریاست' کوئی علاقہ اور کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں رہا جہاں جمعیۃ علماء کی مقبولیت و اعتماد نے اپنا اثر نہ قائم کیا ہو اور یہ سب کچھ نتیجہ مجاہد ملتؒ کی فکری اور عملی صلاحیتوں اور ان کی ان تھک جدوجہد کا۔

مرکزی دفتر:

جمعیۃ کی تاریخ میں مجاہد ملت کا دور ایک ایسے وقت سے شروع ہوتا ہے جب جمعیۃ اپنے سروسامان کے لحاظ سے کچھ بہت منظم اور مضبوط نہ تھی۔ تحریک آزادی کی دارو گیر اور سیاسی افکار کے تصادم نے اس کے پھولنے پھلنے کی راہیں بڑی حد تک مسدود رکھیں' جمعیۃ کا مرکزی دفتر اس وقت کرائے کے ایک مکان میں مالی لحاظ سے مقروض و زیر بار اور دفتری نظم کے لحاظ سے بہت محدود تھا۔ صرف ایک محرر اور ایک کارندہ ہی اس کی بساط تھی۔ نہ ٹیلی فون تھا' نہ ٹائپ مشین' عوام و خواص کے رجوع اور مشاغل کار کے لحاظ سے بھی اس کا دائرہ محدود تھا۔ لیکن مجاہد ملت کے دور میں اپنے ساز و سامان اور وسعت کار کے لحاظ سے اس کی مرکزی حیثیت اتنی نمایاں ہوئی کہ بجا طور پر وہ ایک ملک گیر تحریک کا مرکزی دفتر معلوم ہونے لگا۔ آج حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کے تخمینہ کے مطابق مرکزی دفتر کا اثاثہ لاکھوں کی مالیت کا ہے۔

اس کی اپنی جائداد ہے۔ ٹیلی فون ہے' کئی کئی کاریں ہیں۔ مختلف شعبے ہیں اور وسیع اسٹاف ہے۔ پورے ملک سے مراسلت کا رابطہ ہے اور دسیوں انفرادی اور اجتماعی مسائل ہر روز اس کے مشاغل کار میں جگہ پاتے ہیں۔

اخبار:

آج کی دنیا میں کسی بھی زندہ جماعت اور تنظیم کی آواز اخبار ہی کے ذریعہ پھیلتی اور بڑھتی ہے۔ اسی خیال سے جمعیۃ علماء کا جماعتی آرگن الجمعیۃ ایک بار پہلے بھی جاری کیا تھا۔ مگر برطانوی دور حکومت اس کو برداشت نہ کرسکا۔ مجاہد ملتؒ نے اپنے دور نظامت میں سب سے پہلے جماعت کی جن ضرورتوں پر توجہ فرمائی وہ دفتر کا اپنا مکان اور الجمعیۃ کا دوبارہ اجراء ہی تھا۔ چنانچہ مولانا موصوف کے دور میں جمعیۃ کا سب سے پہلا اجلاس عام مئی ۴۵ء میں سہارن پور میں ہوا' اور وہیں تعمیر فنڈ اور اخبار فنڈ کی تجویزیں بروئے کار آئیں اور دو ہی سال کے بعد یعنی دسمبر ۴۷ء میں ایک طرف دفتر نے وہ مکان خرید لیا جہاں پہلے اس کی حیثیت کرایہ دار کی تھی اور دوسری طرف روزنامہ الجمعیۃ کا دوبارہ اجراء عمل میں آیا جو بحمد اللہ آج تک جاری ہے اور اسی کو عوامی اور سرکاری حلقوں میں مسلمانوں کی جماعتی آواز سمجھا جاتا ہے۔

میسج ویکلی:

روزنامہ الجمعیۃ کے کامیاب اجراء کے بعد مولانا مرحوم کی دوسری کوشش یہ تھی کہ مسلمانان ہند کی آواز کو زیادہ موثر اور مضبوط بنانے کے لیے جماعتی سطح پر ایک انگریزی اخبار بھی جاری کیا جائے۔ چنانچہ ملک کے ہنگامی حالات نے جوں ہی ان کو کچھ مہلت دی انہوں نے انگریزی اخبار کے لیے جدوجہد شروع کردی۔ نومبر ۵۰ء میں سب سے پہلے وہ اس کوشش میں بمبئی گئے۔ پھر جنوری ۵۱ء میں اپنے رفیق محترم مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کے ہمراہ بمبئی کا دوسرا سفر کیا۔ اور دس روز وہاں مقیم رہ کر مخیّر مسلمانوں کو اس اہم ملی اور جماعتی ضرورت پر متوجہ کیا۔ اسی سال میں مالی گاؤں' راندیر' ڈابھیل' سورت' وغیرہ اور بار بار بمبئی کے سفر کئے۔ یہاں تک کہ ان کی کوششیں بارآور ہوئیں اور تقریباً ایک لاکھ روپیہ کے سرمایہ سے ہفتہ وار میسج ۲۲/ دسمبر ۵۱ء سے جاری ہوگیا۔ اس کے اجراء میں بمبئی اور دیگر مقامات کے مسلمانوں نے فراخ دلی کے ساتھ مولانا مرحوم کی اپیل پر لبیک کہا۔ افسوس کہ مسلمانوں کی عام اقتصادی

زبوں حالی اس کی راہ میں حائل رہی اور میسج ویکلی تین سال سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔ پھر بھی مولانا مرحوم انگریزی اخبار کی فکر میں برابر رہے اور زندگی کے آخری دو برس تو انہوں نے برابر اس لگن میں گزارے کہ کس طرح مسلمانوں کی اس اہم خدمت کو بھی اپنے جیتے جی انجام دے جائیں۔

پریس، بک ڈپو اور لائبریری:

مرکزی دفتر کے دوسرے شعبے جو مولانا مرحوم کے دور میں قائم ہوئے اور بفضلہٖ تعالیٰ ترقی کر رہے ہیں وہ الجمعیۃ بک ڈپو، لائبریری (جس میں کم وبیش پانچ ہزار کتابیں اب تک فراہم ہو چکی ہیں) اور الجمعیۃ پریس ہے۔ ان میں خاص طور پر پریس کا قیام بڑی جدوجہد کا متقاضی تھا۔ لیکن ۵۲ء سے ۵۵ء تک مولانا مرحوم کی مسلسل کوششوں اور کاوشوں کے بعد ''الجمعیۃ پریس'' قائم ہو سکا جس کا افتتاح ۳۰ر مارچ ۵۵ء کو حضرت شیخ مدنیؒ نے فرمایا۔

مرکزی دفتر کی اس تمام ترقی اور تنظیم میں مولانا کے رفقاء کرام (مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اور مولانا سید محمد میاں صاحب) کی شبانہ روز جدوجہد اور مسلسل تعاون کو بھی بڑا دخل ہے۔ اگر یہ حضرات ہاتھ نہ بٹاتے تو مولانا کے رات دن کے ہنگامی مشاغل میں نہ جانے کب تک یہ سلسلہ تشنۂ تکمیل ہی رہتا۔

جمعیۃ علماء ہند کا نظام:

مرکزی دفتر کی توسیع اور تنظیم سے الگ خود جماعت کی وسیع تنظیم، ملک گیر پیانے پر اس کو روشناس اور مقبول بنانے، اس کے اغراض و مقاصد کو ایک تحریک کے طور پر ملک کے گوشے گوشے میں برپا کرنے اور اس کی سرگرمیوں کا وسیع تر دائرہ بنانے کے لیے مولانا مرحوم نے جس انہماک اور تندہی کے ساتھ جدوجہد فرمائی آج ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جمعیۃ علماء کا پھیلا ہوا نظام اس کی ہزاروں شاخیں، ان کے دفاتر اور مخلص کارکنوں کی دن رات خدمت گزاری یہ سب کچھ اسی جدوجہد کے روشن آثار اور ناقابل تردید شہادت ہیں۔

مسلمانوں میں نظم ووقار:

مولانا مرحوم کی اس لگن اور ان تمام کوششوں کا محرک صرف ان کے عہدہ اور منصب

(نظامت عامہ) کی ذمہ داریاں ہی نہیں تھیں۔ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ مولانا مرحوم کی نظر دین مبین کی سچی تعلیمات پر تھی۔۔ ایک روشن ضمیر اور صاحب بصیرت عالم دین کی حیثیت سے وہ ہمیشہ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کو ایک باوقار جماعتی زندگی سے مربوط دیکھنا چاہتے تھے۔ ملت اسلامیہ میں انفرادیت اور انتشار کے رجحانات سے وہ ہمیشہ نالاں رہے اور برابر اس کوشش میں رہے کہ چھوٹی چھوٹی گروہ بندیوں اور کش مکش سے بالاتر ہوکر ''وحدت کلمہ'' کی بنیاد پر ہندوستان کے مسلمان منظم ہوں اور صحیح ایجابی شعور کے ساتھ اپنی جماعتی زندگی بنائیں۔ ایک طرف پوری جرأت مندی اور استقامت کے ساتھ اپنے دین وایمان پر قائم رہیں اور دوسری طرف اپنے وطن اور پوری انسانیت کی خدمت اور خیر خواہی کے علمبردار ہوں کہ یہی ایک سچے مسلمان کا کردار ہوسکتا ہے۔ خاص طور پر آزاد ہندوستان کے اس نئے اور تعمیری دور اور بدلے ہوئے حالات میں یہ اور بھی زیادہ ضروری ہوگیا ہے کہ مسلمان تنگ نظری اور افتراق باہم کے سایہ سے بھی دور رہیں۔ تب ہی وہ اپنی وطنی زندگی میں آبرومندی اور عزت کا مقام حاصل کرسکتے ہیں۔

جمعیۃ علماء ہند کے دستور اور نظام میں توسیع:

اپنے اس بنیادی فکر اور پیغام کو لے کر وہ ہندوستان کی آخری سرحدوں اور ساحلوں تک گئے' عوام وخواص سے ملے اور مسلمانوں کے ہر اجتماع' ہر مجلس اور ہر طبقہ کو انہوں نے دعوت دی کہ جمعیۃ علماء کو اپنائیں' کیونکہ یہی ایک تحریک ہے جس کی مرکزیت پر آج کے حالات میں مسلمانان اپنی جماعتی زندگی کی بنیادیں استوار کرسکتے ہیں۔ پھر یہی بنیادی نقطہ نظر داعی تھا کہ تقسیم ہند کے فوراً بعد حضرت مولانا نے جمعیۃ کے دستوری اور تنظیمی دائرں کو بھی اتنا وسیع کرادیا کہ ہر مسلمان مرد وعورت اس کی ممبری قبول کرسکے اور اس کی تنظیم کسی مخصوص حلقہ تک محدود نہ رہے' چنانچہ آج جمعیۃ علماء اپنے دائرۂ تنظیم وکار سے تمام مسلمانان ہند کی ایک عام وسیع اور ہمہ گیر تحریک بن چکی ہے اور یہ تمام تر نتیجہ ہے حضرت مجاہد ملتؒ کی قائدانہ صلاحیتوں' دور اندیشیوں اور ان تھک کوششوں کا' اور یہی ان کی مجاہدانہ زندگی کا یادگار مشن اور آخری پیغام ہے۔

واقعتہً یہ بڑی بدقسمتی تھی کہ تقسیم ہند کے بعد ملک میں طبقاتی کش مکش اور جذباتی شورشوں

نے بڑی قوت کے ساتھ سر اٹھایا اور اس کے ہاتھوں نت نئے ہنگامی اور وقتی مسائل رونما ہوتے ہی رہے۔ اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جیسے اولوالعزم رہنما کی فکری اور عملی صلاحیتوں کا ایک بڑا حصہ اس دور کی ناگہانی آفات و مشکلات پر صرف ہوتا رہا۔ اگر یہ صورت حال رونما نہ ہوتی اور ہنگامی مسائل و مہمات سے ان کا وقت بچ سکتا تو وہ یقیناً اپنی پوری توجہات اور سرگرمیوں کے ساتھ اپنے اسی مشن کی آبیاری اور تکمیل میں مصروف رہتے اور ان حالات میں بھی جتنا کچھ کر سکے اس سے کہیں زیادہ مسلمانان ہند کی جماعتی زندگی کو منظم اور مستحکم کر جاتے۔ مولانا مرحوم کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد اب یہ ہمارا فرض ہے کہ اس مقدس نصب العین کو ہمیشہ سر بلند رکھنے کا عہد کریں کہ اس کی سر بلندی ہماری اپنی سر بلندی اور کامیابی ہے۔

آج ہندوستان کی جغرافیائی وسعتوں کا ایک حصہ تو وہ ہے جو ابتداء ہی سے جمعیۃ علماء ہند کی قومی اور ملی سرگرمیوں سے متعارف اور قریب رہا ہے اور تقسیم ہند سے پہلے بھی جمعیۃ کے نظام کار میں شریک و سہیم رہا ہے‘ لیکن متعدد ریاستیں اور علاقے ایسے ہیں جنہوں نے جمعیۃ علماء کو مجاہد ملت ؒ ہی کے ذریعہ پہچانا اور ان کی عظیم خدمات اور دردمندیوں نے جمعیۃ کے ساتھ وابستگی اور گرویدگی کی فضا پیدا کی۔ خاص طور پر ہندوستان کی نئی اور وسیع ریاست ”راجستھان‘ مدھیہ بھارت‘ مہا کوشل‘ وندھیہ پردیش‘ آندھرا‘ کرناٹک و میسور‘ بنگلور‘ کیرالا (مالابار) کورگ‘ کاٹھیا واڑ (اور ساتھ ہی گجرات و مہاراشٹر کے متعدد علاقے) ان تمام علاقوں اور ریاستوں میں جمعیۃ علماء کی تنظیم ۴۷ء کے اواخر سے شروع ہوئی۔ ان میں سے ہر جگہ مجاہد ملت ؒ خود بار بار تشریف لے گئے اور بڑی محنت اور تندہی کے ساتھ انہوں نے خدمت و عمل کا یہ سدا بہار چمن لگایا جو آج ”جمعیۃ علماء“ کے نام سے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہلہا رہا ہے۔

راجستھان میں:

وہ پہلی بار دسمبر ۴۸ء میں جے پور تشریف لے گئے اور وہاں شیخ محمد اسلام صاحب (مرحوم) عبدالغفار صاحب وکیل اور حاجی نہال احمد و حاجی محمد عثمان صاحب (مرحوم) نے مولانا کی جماعتی اپیل پر لبیک کہا۔ جنوری ۴۹ء میں جودھ پور کے احباب مرحوم مولانا حکیم محمد ابراہیم صصامی‘ مولانا حکیم محمد علی غوری‘ وکیل احمد بخش صاحب سندھی بیکانیری وغیرہ نے مولانا

کی دعوت کو اپنایا۔ ادھر ٹونک کے احباب خاص طور پر حکیم سید ظہیر احمد صاحب برکاتی اور مولانا سید قاضی الاسلام' ناگور کے وکیل رشید احمد صاحب' عبدالقیوم غوری صاحب' سوائے مادھو پور میں حکیم سید شاہد علی صاحب نگینوی اور سید عابد علی صاحب وکیل بھیل واڑہ کے عبدالشکور غوری صاحب' کوٹہ کے حافظ عبدالحلیم صاحب اور وکیل احمد بخش صاحب' جھاراواڑ کے حاجی جان محمد اور اعجاز محمد خاں صاحب' اجمیر میں مولانا عبدالشکور' دیوان سید عنایت حسین صاحب اور سید عباس علی صاحب وغیرہ الور سے مولوی ابراہیم صاحب غرضیکہ رفتہ رفتہ مخلص احباب کی ایک پوری جماعت سامنے آ گئی جس نے راجستھان کے گوشہ گوشہ میں جمعیۃ کی تنظیم قائم کی۔

جنوبی ہند میں:

جنوبی ہند میں بھی مولانا مرحوم کی آمد روفت ۴۸ء میں شروع ہوئی۔ کرناٹک' میسور' بنگلور' مالابار' کورگ وغیرہ کے دوروں کا ذکر کسی دوسری جگہ آ چکا ہے۔ اس وقت سے ان وسیع علاقوں میں جمعیۃ کی بنیادیں استوار ہوئیں۔

مدھیہ پردیش:

کے مختلف حصوں میں بھی مولانا مرحوم نے در در کی خاک چھان کر جماعتی نظام کو قائم کیا۔ خاص طور پر دسمبر ۵۳ء' نومبر ۵۴ اور پھر اپریل ۵۶ء میں محترم حافظ جمیل الرحمٰن صاحب' سید نور علی شاہ صاحب اور مولانا مسعود احمد صاحب صدیقی کے ہمراہ بہت تفصیلی دورے کیے اور ریاست کے چپہ چپہ پر جماعتی زندگی کی شمعیں روشن کیں۔

خدا کرے کہ مجاہد ملتؒ کا لگایا ہوا یہ چمن تا دیر سرسبز و شاداب رہے اور اس کی نفع بخشیوں سے ملک وملت مستفید ہوتے رہیں۔

مجاہد ملتؒ کے دور میں جمعیۃ کے سالانہ اجلاس:

☆ جمعیۃ علماء ہند کا تیرہواں سالانہ اجلاس ۲۰/تا ۲۲/مارچ ۱۹۴۲ء لاہور میں منعقد ہوا۔ اسی اجلاس میں مرکزی جمعیۃ کی نظامت عمومی حضرت مجاہد ملت کو تفویض ہوئی۔

☆ جمعیۃ علماء ہند کا چودہواں سالانہ اجلاس ماہ مئی ۱۹۴۵ء سہارن پور شہر میں ہوا۔ اجلاس حضرت شیخ الاسلامؒ اور صدر استقبالیہ خواجہ اطہر حسین تھے۔ کشمیر کے رہنما شیخ محمد عبداللہ

بھی اس اجلاس میں شریک تھے۔

☆ جمعیۃ علماء ہند کا پندرہواں سالانہ اجلاس زیر صدارت حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ ۲۶؍۲۷؍اپریل ۴۸ء بمبئی میں ہوا جس کا افتتاح مولانا آزاد نے کیا اور وزیراعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس میں شریک ہوئے۔

☆ جمعیۃ علماء ہند کا سولہواں سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنو ۱۶؍۱۷؍۱۸؍اپریل ۱۹۴۹ء زیر صدارت حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی ؒ ہوا۔ مولانا مصطفیٰ صاحب صدر استقبالیہ تھے۔

☆ جمعیۃ علماء ہند کا سترہواں سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۷؍۲۸؍۲۹؍اپریل ۱۹۵۱ء حیدر آباد دکن میں زیر صدارت شیخ الاسلام حضرت مدنی ؒ ہوا۔ مولانا حکیم مقصود جنگ مرحوم صدر استقبالیہ تھے۔

☆ جمعیۃ علماء ہند کا اٹھارہواں سالانہ اجلاس ۱۱؍۱۲؍۱۳؍فروری ۱۹۵۵ء کلکتہ زیر صدارت حضرت شیخ الاسلام ؒ مولانا مدنی ؒ

☆ جمعیۃ علماء ہند کا انیسواں سالانہ اجلاس ۲۷، ۲۸، ۲۹؍اکتوبر ۱۹۵۶ء سورت میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی ؒ کی صدارت میں منعقد ہوا، سیکریٹری استقبالیہ جناب محسن بھائی حضوری اور جمعیۃ علماء گجرات کے مخلص اور سرگرم رفیق سید عبدالحق قادری صاحب اور مولوی محمد میاں صاحب ابن مولانا مفتی مہدی حسن صاحب نے اس اجلاس کی کامیابی کے لیے بڑی ہی تندہی اور سرگرمی کے ساتھ کام کیا۔ مسٹر غلام رسول قریشی صدر استقبالیہ تھے۔

☆ جمعیۃ علماء ہند کا بیسواں سالانہ اجلاس ۹؍۱۰؍۱۱؍دسمبر ۱۹۶۰ء اجین میں زیر صدارت حضرت مولانا فخر الدین صاحب منعقد ہوا۔ صدر استقبالیہ حضرت مولانا مفتی محمود احمد صدیقی صاحب تھے۔

(۱۶)

اسفار

مولانا مرحوم نے زندگی کا ایک بڑا حصہ سفروں میں گزارا' عام طور پر ان کے سفر جمعیۃ علماء کے تنظیمی سلسلے' جلسوں' کانفرنسوں' وفود اور اہم ترین جماعتی مسائل و مہمات کے لیے ہوتے تھے۔ وعظ و تقریر اور خالص دینی تقریبات میں شرکت کے لیے یا کبھی کبھی کانگریس کے قومی مسائل اور انتخابی سرگرمیوں کے لیے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بے تکان سفر کرتے تھے۔ آج ہندوستان کی کوئی ریاست اور کوئی اہم شہر بلکہ قصبہ بھی ایسا نہیں ہے جہاں مولانا نہ گئے ہوں۔ زندگی کے آخری پندرہ برسوں میں تو ان کے مشاغل ومہمات کا بڑا حصہ سفروں میں طے ہوتا تھا۔ ریل' موٹر' ہوائی جہاز تو عام سواریاں ہیں ہی مولانا نے بسا اوقات بحری جہازوں' کشتیوں اور بیل گاڑیوں میں بھی سفر کیے۔ ایک مرتبہ سرپور کاغذنگر سے واپسی میں دوسرے روز مولانا کو بھوپال پہنچنا تھا۔ وقت اتنا تنگ ہو گیا تھا کہ صرف ایک ٹرین (جی' ٹی ایکسپریس) ہی باقی تھی۔ مگر وہ کاغذنگر ٹھہرتی نہ تھی۔ مولانا نے طے کیا کہ بلہارشاہ جا کر صبح سویرے جی' ٹی پکڑنا ہے' پھر بلہارشاہ تک کے لیے کوئی سواری نہیں تھی۔ بالآخر ایک میل گاڑی میں گارڈ کے ساتھ کھلے صحن پر آدھی رات سے صبح تک سفر کیا۔ میں اور حافظ جمیل الرحمٰن صاحب (جنرل سیکریٹری جمعیۃ مدھیہ پردیش) ساتھ تھے۔ مال گاڑی حسب معمول اسٹیشن سے ایک میل دور یارڈ میں پہنچ کر رک گئی۔ وہاں سے سامان سفر ہم لوگوں نے خود لادا کچھ مولانا نے سنبھالا' کچھ میں نے اور حافظ صاحب نے۔ صبح پانچ بجے کا وقت ہم لوگ رات بھر کی نیند آنکھوں میں لیے ہوئے۔ اندھیرے میں لائنوں اور سگنل کے تاروں سے الجھتے سنبھلتے بہ مشکل اسٹیشن پہنچ پائے۔ سفر کی ایسی صعوبتیں مولانا کے لیے رات دن کا معمول بن گئی تھیں۔ نہ کبھی اکتاتے نہ شکوہ سنج ہوتے۔

افریقہ وامریکا کا سفر:

اپنی زندگی میں دو مرتبہ (۴۴ء اور ۵۶ء) مولانا نے زیارت حرمین شریفین کے لیے حجاز مقدس کا سفر کیا۔ ۲۴ر دسمبر ۵۳ء کو سنٹرل مسلم ایسوسی ایشن آف ایسٹ افریقہ کی دعوت پر مشرقی افریقہ کے مشہور شہر نیروبی (کینیا) تشریف لے گئے۔ اور ۲۶، ۲۷ دسمبر کو وہاں مسلمانان افریقہ کے ایک نمائندہ اجتماع میں شرکت فرمائی اور اپنے قیمتی مشوروں سے اجتماع کی رہنمائی فرمائی۔ وہاں سے واپسی میں دارالسلام، یوگنڈا، ٹانگانیکا اور عدن میں چار ہفتے بغرض سیاحت گزارتے ہوئے ۲۸ر جنوری ۵۴ء کو دہلی واپس پہنچے۔

آخری دنوں اپنے علاج معالجہ کی غرض سے امریکہ کا سفر کیا۔ ۱۶ر اپریل ۱۹۶۲ء کو دہلی سے پرواز کی اور پونے تین ماہ میڈیسن میں زیر علاج رہ کر ۱۲ر جولائی کو علی الصباح دہلی واپس پہنچے۔ اگر صحت اور تندرستی مہلت دیتی تو امریکہ سے واپسی میں وہ امریکہ کے اہم مراکز اور پھر لندن، فرینک فورٹ اور قاہرہ ٹھہرتے ہوئے واپس آنا چاہتے تھے۔ افسوس کہ یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔

جنوبی ہند کا سفر:

یوپی، بہار، راجستھان، مدھیہ پردیش، گجرات و مہاراشٹر کی ریاستیں تو آئے دن ان کے اسفار کی گویا آماجگاہ تھیں۔ لیکن خاص طور پر ۵۲ء اور ۵۳ء میں مولانا نے جنوبی ہند کے جو دورے کیے۔ اپنی خصوصیات، بے پناہ مقبولیت، محبت سے بھرپور استقبال اور مولانا کے ساتھ عوام وخواص کی والہانہ عقیدت کے وہ یادگار مظاہرے تھے، جو مولانا کے رفیق سفر کی حیثیت سے مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ پہلے دورہ کرناٹک (اوونی، بیجاپور، باگل کوٹ، رایا درگ، بلاری، ہوسپیٹ، دھارواڑ، بلیگام، پاچھاپور، ہلیال، ہبلی، سرسی، جوگ فال) اور آخر میں بھٹکل کا اہتمام رفیق مکرم مولانا محی الدین منیری ایڈیٹر البلاغ بمبئی نے کیا تھا جو خود بھی بھٹکل کے رہنے والے ہیں۔

منیری صاحب نے بڑی سلیقہ مندی اور کمال نظم کے ساتھ پروگرام ترتیب دیا تھا۔ ایک ہفتہ میں ساڑھے تین ہزار میل کا سفر مکمل کر کے سفر کے حسن انتظام واہتمام سے مولانا بھی بے حد متاثر تھے اور ان مقامات میں عوام وخواص کو مولانا کی قائدانہ بصیرت سے استفادہ کا بھی

بہت موقع ملا۔

دوسرا سفر مولانا نے جنوبی ہند میں پہلی بار جمعیۃ کی تنظیم کے لیے فرمایا تھا۔ پونا' شولا پور' عیتالی' مدراس' میسور' بنگلور' کورگ' اور مالا بار تک تشریف لے گئے تھے۔ اس دورے کے تاثرات ان ہی دنوں حیدر آباد کے ایک اخبار نے ان الفاظ میں شائع کیے تھے:

''حیدر آباد ۲۳ر جنوری ۵۳ء ہندوستان ہمارا وطن ہے اور اس سرزمین پر بسنے والے ایک مسلمان کو بھی شہریت کے وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو کسی غیر مسلم کو' اپنے وطن کی تعمیر اور ترقی کے لیے ہمیں بھی اپنی پوری صلاحیتوں کو کام میں لانا ہے اور ملک کو خوش حال بنانا ہے۔ اس ملک میں ایک باعزت شہری اور سچا مسلمان بن کر اپنی زندگی گزارنی ہے اور اپنی نسلوں کے لیے بھی اسی احساس کا ترکہ و وراثت باقی چھوڑنا ہے۔ یہ ہے جمعیۃ علماء کا وہ پیغام جو حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند کے ذریعے جنوبی ہند کی فضا میں گونج اٹھا ہے اور جس نے مسلمانوں میں فکر و عمل کی نئی امنگیں پیدا کر دی ہیں۔''

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کی جنوبی ریاستوں کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی آواز نے مسلمانوں میں بیداری اور زندگی کی ایک نئی لہر پیدا کی اور تقسیم ملک کے بعد سے مسلمانان جنوبی ہند میں جو انتشار عام' احساس کمتری و بے نوائی پیدا ہو گیا تھا' مولانا موصوف کے اس دورے کے بعد وہ انتشار و احساس ختم ہو کر ان میں پھر اجتماعی زندگی اور اپنے وطن میں اپنے مقام و موقف کا احساس پیدا ہوا۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جو کئی سال سے مسلمانان جنوب کے پیہم اصرار پر اس کوشش میں تھے کہ وہ ملک کے نئے نئے حالات میں شمالی ہند کے بعد جنوبی ہند میں بھی مسلمانوں کو ان کا موقف و مقام بتلائیں۔ اور انہیں اجتماعی زندگی کی دعوت دیں یہاں موصول شدہ اطلاعات کے مطابق حضرت مولانا اپنے اس دورے میں بمبئی و حیدر آباد کے بعد آندھرا' مدراس' بنگلور اور میسور تک گئے۔

خاص طور سے آندھرا' مدراس اور بنگلور و میسور کے جن مقامات میں مولانا محترم تشریف لے گئے۔ ہر جگہ کے مسلمانوں نے انتہائی جوش و ولولہ کے ساتھ مولانا

کا استقبال کیا' اس لیے کہ انہیں کئی سال سے مولانا موصوف کی آمد کا شدید انتظار تھا اور ان کی آواز کو سننے کے لیے وہ بے چین تھے۔ یہ بات مستقبل کے لیے بہت ہی خوش آئندہ ہے کہ مسلمانان جنوبی ہند میں ملک کے بدلے ہوئے حالات اور وطن وملت کے جدید تقاضوں کا احساس پیدا ہوگیا ہے اور پچھلے تصورات اور خیالات ان کے ذہنوں سے عام طور پر دور ہوگئے ہیں۔ مدراس و آندھرا سے بھی بڑھ کر بنگلور و میسور کے مسلمانوں میں حالات کا احساس اور اجتماعیت کا جذبہ دیکھنے میں آیا جو قومی زندگی کی پہلی نشانی ہے۔

بنگلور شہر میں مولانا محترم نے دو روز گزارے لیکن ان دو روز میں بلا مبالغہ ایک ہفتہ کا کام انجام پایا۔ صبح سے شام تک ایک مشین کی طرح مصروف کار رہ کر مولانا محترم نے تقریباً پندرہ اداروں اور مرکزوں کا معائنہ کیا اور ان کے عمائدین سے تبادلۂ خیالات کیا۔ متعدد مقامات پر عام جلسوں میں مبسوط اور بصیرت افروز تقریریں فرمائیں' پریس کانفرنس میں شریک ہوکر جمعیۃ علماء ہند کے مقاصد و نصب العین کو روشناس کرایا۔ اور مختلف مسائل پر جمعیۃ کے نقطہ نظر کی وضاحت فرمائی۔ مسلمانوں نے کس طرح اس آواز پر دھیان دیا اور کس طرح مولانا موصوف کے پیغام کو سننے میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ پروگرام کے ایک ایک دن میں آٹھ آٹھ دس دس سپاس نامے مولانا کو پیش کیے گئے اور ان کے ذریعے مسلمانوں کے مختلف اداروں نے اپنے اپنے معاملات اور احوال کو مولانا کے سامنے پیش کیا۔ مولانا موصوف سے عام مسلمانوں کی محبت اور اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ بلا مبالغہ ایک ایک دن میں تیس تیس اور چالیس چالیس سیر پھولوں کے ہار مسلمانوں نے مولانا کے گلے میں ڈالے اور اپنی پر خلوص عقیدت ومحبت کا ثبوت دیا۔ مدراس اور اسی طرح بنگلور و میسور کے مسلمانوں نے مولانا موصوف کی آمد کے اس موقع پر اپنے نہایت کامیاب اور زیادہ سے زیادہ نمائندہ اجتماع بلائے۔ جن میں قدیم و جدید تعلیم یافتہ حضرات علماء' مشائخ' فضلا' ونمائندین' مختلف برادریوں کے نمائندے اور مزدور جماعتوں کے سرپنچ بھی شریک ہوئے۔''

(۱۷)

آخری نقوشِ حیات

یوں تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی فکر وعمل کی ممتاز صلاحیتیں ملک وملت کی خوش حالی کے لیے مسلسل جدوجہد اور عظیم الشان کارنامے بجائے خود انسانی تاریخ کا ایک سنہرا ورق ہیں اور ان کی یاد ہزاروں لاکھوں دلوں میں مدتوں باقی رہے گی۔ لیکن زندگی کے آخری چھ مہینے بھی جو انہوں نے بستر علالت پر گزارے اپنی سرگزشت اور کوائف کے لحاظ سے ایک عجیب یادگار بن گئے ہیں۔ جن میں ایک طرف مولانا کے ساتھ عوام وخواص کی بے اندازہ محبت وعقیدت کے نقش بھی بہت ابھر کر سامنے آئے اور دوسری خود مولانا مرحوم کی بے مثل استقامت وعزیمت' صبر ورضا اور زندگی کے آخری لمحات تک ملک وملت کی لگن اور دردمندیوں کے جوہر بھی بہت ہی نکھر کر دنیا کے سامنے آئے۔ یقیناً مولانا کے تذکرے اور سوانح حیات میں ان آخری نقوش کی آب وتاب اور دلآویزی بھی ہمیشہ نمایاں رہے گی۔ خاص طور پر مولانا کے آخری پارلیمنٹری الیکشن میں جب کہ وہ اپنی بیماری کے باعث آخر تک اپنے حلقے سے دور رہے نہ صرف ان کے حلقے کے ہندو مسلم عوام وخواص کا جوش محبت بلکہ دور دور سے مخلصین کی آمد اور کوششیں اور مشرق سے مغرب تک اردو صحافت کے وہ اداریے جن میں مولانا کی خدمات جلیلہ کو برملا سراہا گیا تھا اور مولانا کے الیکشن کو پورے ملک کی عزت ووقار کا سوال قرار دیا گیا تھا اور پھر الیکشن کے نتیجے میں سخت مقابلے کے باوجود مولانا کی شان دار کامیابی اور دوسری طرف ملک بھر میں مولانا کی علالت سے انتہائی تشویش اور صحت یابی کے لیے مسلسل بے تاب دعائیں' اس انتہائی قدر وقیمت کے مظاہرے تھے جو مجاہد ملتؒ کے لیے ہندوستان کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک لاکھوں کروڑوں انسانوں کے دلوں میں جاگزیں تھی۔

گزشتہ صفحات میں یہ ذکر آ ہی چکا ہے کہ شروع ۱۹۶۱ء میں جبل پور وغیرہ کے حوادث

نے جو وحشت ناک شکل اختیار کی' دل و دماغ پر اس کی چوٹ نے اتنا گہرا اثر کیا تھا کہ اسی وقت سے مولانا کی صحت کو گھن لگ گیا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا' وہ کاموں کے بے انتہا بوجھ کو سنبھالے ضرور رہے۔ مگر اندر ہی اندر ان کی تندرستی گھلتی جا رہی تھی اور اس کا پورا اندازہ اس وقت ہوا جب جنوری ۶۲ء میں وہ بیماری سے نڈھال ہو کر بالکل ہی گر گئے۔

اور تحقیق و معائنہ کے بعد ڈاکٹروں کو یقین ہو گیا کہ کینسر جیسا مہلک مرض ان پر قابو پا چکا ہے۔ ۲۴/۲۵ جنوری ۱۹۶۲ء کو جب وہ جوشی ہاسپٹل میں تھے اور کینسر کی تشخیص قطعی ہو گئی تھی اور بہت عجلت کے ساتھ ان کو بمبئی لے جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ کوشش یہ تھی کہ مولانا کو ڈاکٹروں کی اس تشخیص کا علم نہ ہو' لیکن اپنے خدام اور تیمارداروں کے چہروں پر تشویش کے آثار کو بالآخر انہوں نے پا ہی لیا۔ عصر کے بعد محترم حافظ ابراہیم صاحب پہنچ گئے اور مزاج پرسی کرنے لگے تو مولانا خود بول اٹھے کہ۔

''ان لوگوں کو کینسر کا اندیشہ ہے۔ ویسے تو مجھے کچھ سکون معلوم ہو رہا ہے اور بہرحال جو بھی کچھ ہو۔ اللہ کی مرضی! اگر بمبئی جانا طے ہے تو اس کا انتظام ہونا چاہیے۔''

مولانا کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے اور میں حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ اس بیماری کو جاننے کے بعد ذرا بھی ان کے چہرے پر گھبراہٹ یا فکرمندی کا کوئی نشان نہ تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ ان جیسا زیرک انسان اس مرض کے انجام سے ناواقف نہ تھا۔ اگلے مہینوں میں یہ تاثر ایک دو بار خود ان کی زبان پر آ بھی گیا۔ کہ تدبیر و علاج تو جاری رکھنا ہی ہے' مگر انجام بھی نامعلوم نہیں۔

ایک طرف اپنی مہلک بیماری کا یہ ادراک اور یقین اور دوسری طرف زندگی کی آخری ساعتوں تک ان کی استقامت اور صبر و تحمل کا یہ حال کہ بلاناغہ سیکڑوں ہی احباب و مخلصین، مسلم وغیر مسلم' امیر و غریب' اپنے بیگانے روزانہ اس پورے عرصے میں ان سے ملتے رہے مگر ایک لمحہ کے لیے بھی کسی ملنے والے نے ان میں مایوسی اور بے صبری کا کوئی اثر محسوس نہ کیا۔ اسی خندہ پیشانی اور محبت کے ساتھ ہر کسی سے ملنا جو زندگی میں ہمیشہ سے ان کا معمول تھا' آخر تک قائم رہا۔ بڑے انسانوں کے کردار میں بھی عزم و تحمل کی ایسی مثالیں کم ہی ملیں گی۔

یہی نہیں بلکہ قومی اور ملی مسائل کی فکر اور کاموں کی دھن جو تندرستی میں ان پر چھائی رہتی تھی۔ مہلک بیماری کے ان ایام میں بھی ان سے چھوٹ نہ سکی' بمبئی سے واپس آ کر جب تک دہلی میں رہے تمام ہی معاملات کی پرسش احوال کرتے رہے۔ خاص طور پر جمعیۃ علماء کی مہمات اس زمانے میں بھی انہیں عزیز رہیں' حضرت مولانا محمد میاں صاحب کو تاکید کر کے اپریل میں مجلس عاملہ کا اجلاس بلوایا جس میں وہ خود اپنے رفقاء جماعت کو اہم ہدایت دینے کے بے مضطرب تھے۔ (اگرچہ اجلاس کی تاریخ سے پہلے ہی سفر امریکہ کی تیاری ہو گئی اور وہ پروگرام پورا نہ ہو سکا) اور اسی لیے ۱۶/اپریل کو جس روز امریکہ جا رہے تھے' عصر کے وقت میں حاضر ہوا' تو سب سے پہلے مجھ سے (اپنی زندگی کا آخری) پیغام لکھوایا۔ جس میں جمعیۃ کی تنظیم اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے عامۃ المسلمین اور رفقاء جماعت کو پرزور نصیحت فرمائی تھی۔

امریکہ کے قیام میں اخبار الجمعیۃ جو ان کے پاس برابر پہنچتا رہتا تھا۔ برابر دیکھتے اور ہندوستان کے حالات معلوم کرتے رہے۔ اسی دوران انہوں نے چیف منسٹر یو' پی کو اردو زبان کے سلسلے میں خط لکھا تھا۔ امریکہ سے واپسی کے بعد ناتوانی اور تکلیف کی انتہائی شدت میں بھی اگر ان کے دماغ پر کوئی فکر تھا تو قومی اور ملی مسائل کا' یہ تھا ان کی فدائیت اور دردمندی کا عالم' افسوس کہ مولانا دنیا سے رخصت ہوئے تو خدمت و عمل کی پوری تاریخ بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ اب کون صاحبِ دل جس کی تنہا ذات خدمت خلق کی ہزار محفلوں پر بھاری ہو گی۔۔۔ کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

فما كان قيس هلكه هلك واحد ۔ ولكنه بنيان قوم تهدما

(۱۸)

زندگی کے آخری ایام

جبل پورہ، ساگر وغیرہ کے ان حوادث سے مولانا مرحوم کو جو قلبی اور ذہنی اذیت پہنچی تھی اور اصلاح حال کے لیے ان تھک جدوجہد کا جو بے پناہ بوجھ پڑا تھا۔ اس نے مولانا مرحوم کی بڑھاپے کی صحت اور توانائیوں کو بے حد مضمحل کر دیا۔ رمضان کا مہینہ تھا اور اپنے معمول میں وہ سال کے گیارہ مہینے برابر بھاگتے دوڑتے رہتے تھے۔ مگر رمضان میں دہلی سے باہر قدم نکالنا پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر ۱۹۶۱ء میں حالات کی سنگینی نے ان کے اس معمول کو بھی قائم نہ رہنے دیا۔ ۸ رفروری کو جب وہ آسام کے طویل سفر سے واپس آئے تو بے حد تھکے ہوئے تھے۔ بخار بھی تھا۔ یہاں آتے ہی انہیں جبل پور کی تشویش ناک خبروں سے واسطہ پڑا۔ اور پھر مسلسل کاموں میں لگا رہنا پڑا۔ رمضان ہی میں وہ جبل پور، ساگر وغیرہ گئے۔ پھر کنونیشن کی تیاریوں کا عظیم بوجھ بھی ان ہی پر پڑا۔ اس دوران میں بعض رفقائے کار نے بھی اپنی غلط روش سے مولانا کی قلبی اذیتوں میں اضافہ کیا اور ایسے نازک وقت میں ان کا دل دکھایا، شاید اسی وقت سے مولانا کے شعور پر مستقبل کی پرچھائیاں پڑنی شروع ہوگئی تھیں۔ چنانچہ مسلم کنونیشن سے چند روز پہلے مقامی مسلم ورکرز کی ایک میٹنگ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا کی زبان سے، وفات سے ایک سال قبل یہ کلمات بے اختیار نکلے:

''میں نے اپنے خدا سے معاملہ کر لیا ہے۔ میں نعرہ ہائے تحسین ونفرین سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔ دنیا کی عمر ہی کتنی ہے، میری تو بس یہی خواہش ہے کہ اللہ کے روبرو جاؤں تو سرخرو ہو کر۔''

مانا کہ غم و رنج نے مارا ہے مجھے
ہر تلخی و ترشی بھی گوارا ہے مجھے

للہ ذرا وقت کے نباض سمجھ
ملت کی تباہی نے پکارا ہے مجھے

میں وقت کی تنقید سے مرعوب نہیں
تنقید نے اے دوست سنوارا ہے مجھے
دنیا کے سہاروں کا میں قائل ہی نہیں
اللہ کی رحمت کا سہارا ہے مجھے

غرضیکہ یہ تمام اندرونی اور بیرونی عوامل آہستہ آہستہ ان کی صحت کی جڑیں کاٹ رہے تھے۔ تھوڑے ہی دن بعد رانچی میں (ستمبر کے تیسرے ہفتہ میں) شدید فساد ہوگیا۔ وہاں بھی مولانا فوراً ہی پہنچے اور ان کے پہنچ جانے سے حالات پر بہت ہی اچھا اثر پڑا۔ اور حکومت بہار نے بروقت مفید قدم اٹھائے۔ رانچی سے مولانا دہلی پہنچے ہی تھے کہ اکتوبر شروع ہوتے ہی علی گڑھ' میرٹھ' ہاپوڑ اور چندوسی میں شرپسندوں نے ایک طوفان بپا کر دیا۔ مولانا کی صحت رفتہ رفتہ اتنی بگڑ چکی تھی کہ مرض و اضمحلال ان کے چہرہ سے نمایاں ہونے لگا تھا' ویسے بھی بخار' نزلہ اور کھانسی کی گرفت میں تھے۔ ایک قابل مقامی معالج ''ڈاکٹر علیم'' نے مولانا کا معائنہ کیا تو بڑی تشویش محسوس کی اور تمام مشاغل چھوڑ کر کم از کم دس دن کے لیے مکمل آرام و علاج کا مشورہ دیا۔ لیکن مولانا کی طبیعت ان بندشوں کو گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ انہوں نے ڈاکٹر علیم سے صاف کہا کہ میرٹھ' علی گڑھ اور چندوسی میں لوگوں کی جان کے لالے پڑ رہے ہیں اور میں اپنی صحت کی خاطر گھر میں لیٹا رہوں۔ یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا اور پھر واقعتہً اسی شام مولانا علی گڑھ اور پھر میرٹھ وغیرہ پہنچ گئے۔ ان دنوں خاص طور پر محترم حافظ ابراہیم صاحب' جنرل شاہنواز صاحب چودھری چرن سنگھ وغیرہ جو بھی مولانا سے ملا چہرہ کی حالت دیکھ کر تشویش محسوس کی اور اصرار کیا کہ آپ اپنی صحت پر توجہ دیں۔ مگر مرض اپنی جڑیں پکڑتا رہا اور مولانا اپنے کاموں میں اسی تندہی کے ساتھ لگے رہے۔ چندوسی بھی گئے۔ دہلی میں پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی ملتے رہے۔ ۱۶/۱۵ نومبر کو (زندگی میں آخری بار) جبل پور' ساگر' بھوپال کا سفر بھی اسی حال میں کیا۔ دسمبر بھی زیادہ تر سفروں میں گزرا۔ جنوری میں میرٹھ' کان پور' امروہہ کے بعض جلسوں

میں شریک ہو کر اپنے حلقۂ انتخاب میں واپس آئے اور آٹھ دس روز سخت سردی کے عالم میں دیہات وقصبات کا گشت کیا۔ یہاں تک کہ مرض پوری قوت کے ساتھ مولانا کی صحت پر چھا گیا۔ ۲۳ر جنوری کو بمبئی جانے کے لیے دہلی واپس پہنچے اور ان کی حالت کو دیکھ کر ہم خدام نے زبردستی بمبئی کا سفر ملتوی کرایا۔ ۲۳ر جنوری ۱۹۶۲ء کی تاریخ تھی کہ مولانا زندگی بھر کی تھکن اور مرض جانکاہ کو ساتھ لے کر بستر علالت پر ایسے گرے کہ آخر کار اللہ کی رحمتوں نے انہیں بستر علالت سے نہیں' دنیا ہی سے اٹھالیا۔

علاج کے سلسلہ میں سب سے پہلے مولانا نے اپنے پرانے معالج ڈاکٹر پانڈے سے رجوع کیا اور پہلے ہی دن انہوں نے پھیپھڑوں سے جو پانی نکالا' اس میں خون کی گہری آمیزش دیکھ کر وہ کھٹک گئے۔

مزید تحقیق کے لیے خون ٹیسٹ کرایا گیا تو اس میں کینسر کے جراثیم پائے گئے۔ ڈاکٹر پانڈے نے فوراً ہی مولانا کو بمبئی لے جانے کی ہدایت کی۔ چنانچہ ۲۶ر جنوری کو صبح ہی ہوائی جہاز سے مولانا کو بمبئی لے جایا گیا۔ گورنر بمبئی شری سری پرکاش مولانا کے پرانے رفیق اور دوست تھے۔ انہوں نے پورے اہتمام کے ساتھ ٹاٹا ہاسپٹل میں مولانا کو داخل کرایا۔ ایک ماہ وہاں علاج ہوتا رہا اور ۲۶ر فروری ۱۹۶۲ء کو مولانا دہلی واپس پہنچے' یہاں بہترین اور ماہر ڈاکٹروں اور معالجوں سے رجوع رہا۔ مگر مولانا صحیح معنی میں مریض عشق تھے۔ ان کی حالت بھی یہ تھی کہ ع۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

علاج کی آخری کوششوں کے لیے یہ طے ہوا کہ مولانا کو امریکا لے جایا جائے۔ چنانچہ ۱۶ر اپریل ۱۹۶۲ء کو شام کے آٹھ بجے مولانا مرحوم عالمی ایروڈروم "پالم" سے امریکا روانہ ہوئے۔ مولانا کے داماد مسٹر عزیز الرحمٰن رفیق سفر رہے۔ امریکا کی ریاست "وسکونسن" کے مشہور شہر میڈیسن میں ڈھائی ماہ بغرض علاج مقیم رہ کر ۱۲ر جولائی کو علی الصباح دہلی واپس پہنچے۔ حالت بہت گر چکی تھی اتفاق سے ان دنوں دہلی میں گرمی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور بجلی کے تعطل نے اور بھی غضب ڈھا رکھا تھا۔ گرمی کی تکلیف سے مولانا بہت بے چین تھے' اور گلمرگ (کشمیر) جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ تیاری بھی ہو گئی تھی' مگر قضائے الٰہی ان کے لیے گلمرگ کی بجائے گلزار بہشت میں ابدی وسرمدی راحتوں کا اہتمام کر چکی تھی۔ اکیس دن اور قید حیات کے گزار کر۔

دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

۲/ اگست ۱۹۶۲ء مطابق یکم ربیع الاول ۸۲ھ کو صبح ساڑھے تین بجے بارگاہ ربی سے تقرب کی مخصوص ساعتوں میں وقت اور تاریخ کے طوفانوں سے کھیلنے والی پاکیزہ روح نے اس دیار فنا کو خیر باد کہا:

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد!

حضرت مولانا کی علالت نے پورے ملک کو اضطراب میں مبتلا کر رکھا تھا اور ان کی صحت و شفا کے لیے پورے ملک میں دعائیں ہو رہی تھیں مگر مشیت الٰہی کو ان سے جو کام لینا تھا وہ پورا ہو چکا تھا۔

کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم تو فارغ ہوئے شتابی سے

صبح ہوتے ہوتے یہ اندوہناک خبر ہندوستان و پاکستان کی وسعتوں میں پھیل گئی۔ ۱۱ بجے ہم خدام (راقم السطور' مولانا فقیہہ الدین' علی محمد صاحب' شیخ محمد ادریس صاحب میر محلہ حویلی حسام الدین دہلی' اور بسمل صاحب شاہجہان پوری) نے اپنے مخدوم مجاہد ملت ؒ کو غسل دیا۔ کھادی کا کفن پہنایا' عطر و کافور میں بسا کر سفر خلد برین کے لیے دولہا بنایا اور احباب و مخلصین کے آخری دیدار کے لیے ۴ بجے تک بنگلہ کے ایک کمرہ میں آرام سے لٹا دیا جہاں روش صدیقی صاحب اور دوسرے حضرات قرآن حکیم تلاوت کرتے رہے اور مولانا سے تعلق خاطر رکھنے والی بے شمار مخلوق خدا قطار در قطار اپنے محبوب رہنما کی آخری بار زیارت کرتی رہی۔ ان میں دہلی کے لاکھوں ہندو مسلم عوام و خواص بھی تھے اور باہر سے پہنچنے والے احباب کے قافلے بھی۔ مولانا کے پرانے رفیق وزیراعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو بھی آئے۔ دوسرے وزراء اور پارلیمنٹ کے سیکڑوں ممبر بھی' مسلم ممالک کے سفرا اور عمائدین بھی' صدر جمہوریۂ ہند' نائب صدر جمہوریہ' اسپیکر لوگ سبھا' آل انڈیا کانگریس کمیٹی' دہلی پردیش کانگریس کمیٹی' دہلی مونسپل کارپوریشن وغیرہ کی طرف سے ملک و وطن کے اس عظیم رہنما کے قدموں پر خراج عقیدت و محبت کے نشان ''پھولوں کے حلقے'' (ریتھ) نچھاور کیے گئے۔ ساڑھے چار بجے دو لاکھ

انسانوں کے بے حال و اشکبار ہجوم نے مجاہد ملتؒ کا جنازہ اپنے کاندھوں پر اٹھایا۔ دہلی دروازے کے بیرونی میدان میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے نماز جنازہ پڑھائی اور مغرب کے وقت ملک وملت کا یہ سرمایۂ عزیز پہلوے محدثین کرام میں آغوش رحمت کے سپرد کردیا گیا۔

فغفر الله له ونور مرقده و اکرم مثواه و اعلی درجاته فی جنة الخلد وجزاه عنا وعن سائر الامة احسن الجزاء۔

دل کو سکون روح کو آرام آ گیا
موت آ گئی کہ دوست کا پیغام آ گیا

بابِ چہارم

تصنیفات و تالیفات

مجاہد ملت کا تصنیفی درجہ

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ایڈیٹر معارف' اعظم گڑھ

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم کی شخصیت بڑی جامع تھی۔ ان کے کارنامے بڑے گونا گوں ہیں۔ وہ نامور سیاسی لیڈر بھی تھے اور ممتاز عالم دین بھی' پر جوش خطیب بھی تھے اور خوش بیان واعظ بھی' ماہر و تجربہ کار معلم و مدرس بھی تھے اور مشاق مصنف و صاحب قلم بھی' انہوں نے مختلف اوقات میں دارالعلوم دیوبند' مدرسہ اسلامیہ ڈابھیل اور مدرسہ کلکتہ میں تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دی۔ متعدد علمی کتابوں کے مصنف تھے۔ مگر ان کی طوفانی سیاسی زندگی نے ان کے ان کمالات کو اتنا چھپا دیا تھا کہ مخصوص طبقہ کے علاوہ شاید عام لوگوں کو اس کا علم بھی نہ ہوگا۔ اس مضمون کا مقصد ان کی علمی و تصنیفی حیثیت کا مختصر تعارف اور اس پر تبصرہ ہے۔

ندوۃ المصنفین:

ان کا اوران کے رفیق کار اور میرے محترم دوست مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کا سب سے بڑا علمی کارنامہ ندوۃ المصنفین دہلی کا قیام ہے۔ دارالمصنفین کے بعد یہ دوسرا ادارہ ہے جس نے مختلف علوم وفنون اسلامیات پر بڑا مفید اور وقیع ذخیرہ فراہم کر دیا ہے' جس کے ذریعے مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کا علمی فیض ہمیشہ جاری رہے گا۔ وہ خود بھی ایک اچھے اور ممتاز مصنف اور اہل قلم تھے۔ اگر وہ علمی زندگی اختیار کرتے تو ہندوستان کے مشہور مصنفین میں ان کا شمار ہوتا۔

قصص القرآن:

یہ بھی ان کا کمال ہے کہ اپنی طوفانی سیاسی زندگی کے باوجود انہوں نے متعدد اہم تصانیف بھی یادگار چھوڑیں' ان میں سب سے اہم ''قصص القرآن'' ہے۔

کلام اللہ میں عبرت و بصیرت کے لیے بہت سے انبیاء و رسل علیہم السلام اور ان کی امتوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ مگر ان کا مقصد تاریخ اور سوانح نگاری نہیں۔ بلکہ سبق

آموزی اور عبرت پذیری ہے۔ اس لیے ان میں تاریخی اور سوانحی ترتیب و تسلسل نہیں ہے اور نہ ان کی تفصیلات میں پڑا گیا ہے۔ بلکہ صرف عبرت و بصیرت کے پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اور موقع و محل کے لحاظ سے جہاں جن پیغمبروں اور ان کی امتوں کے جس قدر حالات کی ضرورت تھی' ان کو بیان کر دیا گیا ہے۔ اس لیے کلام مجید میں تاریخ و سوانح کی طرح ان کے مرتب اور مفصل حالات نہیں ملتے اور جس قدر ہیں وہ بھی یک جا نہیں ہیں۔ بلکہ مختلف سورتوں اور مختلف آیات میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان کے حالات کا دوسرا ماخذ احادیث نبوی' تیسری روایات عہد عتیق کے صحیفے' قدیم تاریخی کتابیں' تاریخی آثار' اور اسرائیلی روایات ہیں۔ جن کی مدد سے ان انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کے حالات مرتب کیے جا سکتے ہیں' مگر عہد عتیق کے صحیفے محرف ہیں' ان میں اور کلام مجید کے بیانات میں بعض اختلافات ہیں۔ اسرائیلیات میں خرافات کا حصہ بھی شامل ہے۔ اس لیے ان سے اخذ و استفادہ میں بڑی احتیاط اور تحقیق و تنقید کی ضرورت ہے۔ عربی میں تو اس نقطہ نظر سے ''قصص القرآن'' پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں مگر اردو میں قصص الانبیاء وغیرہ جیسی غیر معتبر اور افسانوی کتابوں کے علاوہ کوئی مستند کتاب نہیں تھی۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ''قصص القرآن'' لکھی۔ اس میں کلام مجید اور احادیث نبوی کی روشنی میں کلام مجید میں مذکور انبیاء علیہم السلام کے حالات لکھے ہیں اور جا بجا دوسرے ماخذوں سے بھی مدد لی ہے اور جہاں ان کے اور کلام مجید کے بیان میں اختلاف ہے وہاں دلائل سے کلام مجید کے بیانات کی صحت و صداقت ثابت کی ہے اور مستشرقین کے اعتراضات کے تحقیقی جوابات بھی دیئے ہیں۔ اور کلام مجید کے اصل مقصد عبرت و بصیرت کے پہلوؤں کو خاص طور سے نمایاں کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کی تاریخ بھی ہے اور عبرت و بصیرت کا صحیفہ بھی۔''

بلاغ مبین:

دوسری اہم تصنیف بلاغ مبین ہے۔ آنحضرت ﷺ پورے عالم انسانیت کے لیے سراج منیر اور رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے گئے تھے اور آپ کی بعثت کا مقصد ساری دنیا کو اسلام کے نور سے منور کرنا تھا۔ اس لیے جزیرۃ العرب میں اسلام کے فروغ کے ساتھ ہی آپ نے عرب کے قرب و جوار کے حکمرانوں اور امراء و حکام کو اسلام کی دعوت دی اور ان کے نام تبلیغی

خطوط ارسال فرمائے۔ اس دعوت پر بعضوں نے اسلام قبول کر لیا۔ بعض نے انکار کیا اور بعض عناد اور مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔ یہ تبلیغی مکاتیب اور ان کے نتائج احادیث وسیر اور تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں اور عہد رسالت میں دعوت اسلام کی اہم کڑی ہیں۔ اس لیے سیرت کی تمام کتابوں میں ان کا ذکر ہے۔ مگر کسی ایک کتاب میں (یک جگہ جمع نہیں ہیں۔ بلکہ مختلف کتابوں اور مختلف جگہوں پر بکھرے ہوئے ہیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ان کو جمع کر کے "بلاغ مبین" کے نام سے ان کا مجموعہ مرتب کر دیا ہے۔ مگر یہ محض مکاتیب کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس میں اور بہت سی ضروری بحثیں بھی آ گئی ہیں۔ چنانچہ یہ مجموعہ تین حصوں میں تقسیم ہے'۔

پہلے حصہ میں کلام مجید اور احادیث نبویؐ کی روشنی میں بڑی تفصیل سے تبلیغ اسلام کے اصول تحریر کیے گئے ہیں جن کی حیثیت دعوت وتبلیغ کے نصاب کی ہے۔

دوسرے حصہ میں مکاتیب مبارکہ ہیں۔ ہر مکتوب کے ضمن میں مکتوب الیہ کے ضروری حالات اور اس کی دعوت کے سلسلے میں جو واقعات پیش آئے ان کی تفصیل ہے۔

تیسرے حصہ میں نتائج کے عنوان سے اس تبلیغ کے اثرات ونتائج کی تفصیل اور تبلیغ اسلام کے متعلق بعض اصولی باتیں تحریر کی گئی ہیں اور اس سلسلہ میں جو شکوک وسوالات پیدا ہوتے ہیں ان کا جواب دیا گیا ہے۔

دوسرے اور تیسرے حصے میں تبلیغ اسلام کے سلسلے میں مخالفین اسلام کے اعتراضات اور ان کے جوابات کا خاص طور سے لحاظ کیا گیا ہے اور ان کی مدلل تردید کی گئی ہے۔ اس لیے یہ کتاب تنہا مکاتیب کا مجموعہ نہیں ہے۔ بلکہ دعوت وتبلیغ کا نصاب بھی ہے' عہد رسالت میں دوسری اقوام و مذاہب میں اس کی تاریخ بھی ہے اور تبلیغ اسلام پر مخالفین اسلام کے اعتراضات کا محققانہ جواب بھی ان مسائل سے متعلق بعض اور ضروری مباحث بھی آ گئے ہیں' جن کا اندازہ کتاب کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔

اسلام کا اقتصادی نظام:

تیسری کتاب اسلام کا اقتصادی نظام ہے۔ اس دور کا سب سے بڑا مسئلہ اقتصادیات اور مختلف طبقوں میں دولت کی تقسیم کا ہے' جس نے دنیا کو مختلف گروہوں اور مختلف نظاموں میں تقسیم کر دیا ہے اور سرمایہ ومحنت میں ایک مستقل کش مکش برپا ہے۔ اسلام نے صدیوں پہلے اس

مسئلے کو حل کر دیا تھا اس کا اقتصادی نظام اس قدر متوازن ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو سرمایہ داری اور غربت کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ نہ کوئی اتنا بڑا سرمایہ دار بن سکتا کہ قارون بن جائے اور نہ کوئی مفلس و محتاج باقی رہ سکتا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اسلام کے اقتصادی نظام پر ایک مستقل کتاب لکھی اس میں بڑی تفصیل کے ساتھ اسلام کے اقتصادی نظام کو پیش کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ یہ نظام اتنا متوازن ہے اور اس میں تقسیم دولت کے اصول اتنے عادلانہ ہیں کہ اس سے سرمایہ داری اور غربت و افلاس کے سارے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ نہ اس کے لیے کسی سوشلزم کی ضرورت رہتی ہے اور نہ کمیونزم کی۔

رسول کریمؐ:

یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے سیرت نبویؐ پر اوسط استعداد کے طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس میں سوانح نبویؐ کے ساتھ آپ کے خصائص و شمائل، اخلاق اور اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا مختصر مگر موثر انداز میں ذکر ہے۔ ہر بحث کے خاتمے پر اس کا خلاصہ اور اس کے متعلق سوالات دیدیے ہیں۔ طلبہ کے لیے سیرت پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں یہ کتاب ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

مجاہد ملت ایک مصنف کی حیثیت سے

مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

یوں تو قرآن کریم کو خدا کی آخری کتاب اور محمد رسول اللہ ﷺ کو آخری نبی تسلیم کرنے کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہی ہے کہ اسلام تاریخ عالم کے ہر موڑ پر بہترین رہنما ہے اور اسلام کی تعلیمات سیاسی' اقتصادی و معاشی انقلابات کی اندھیریوں کے ہر طوفان میں شمع فروزاں بن کر انسانیت کے قافلے کو منزل مقصود تک پہنچانے کی ضامن ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ ایک عقیدہ ہے جسے ایک مسلمان اپنے سینے سے لگا کر اپنی انفرادی حیثیت میں اپنی نجات کا وسیلہ بنا سکتا ہے۔ جب اسے دنیا کے سامنے دعویٰ کی صورت میں پیش کیا جائے گا تو اس کا ثبوت بھی پیش کرنا ہو گا۔

سائنس کے اس دور میں جب کسی بات کی واقعیت اور صحت کو تسلیم کرنے کے لیے اس کا مشاہدہ اس میں آ جانا ضروری سمجھا جاتا ہے یہاں تک کہ خدا' ملائکہ اور عالم غیب کے دوسرے حقائق کا بھی اس لیے انکار کر دیا جاتا ہے کہ خوردبینوں اور دوربینوں سے ابھی تک ان کا نظارہ نہیں کیا جا سکا' یہ کس طرح ممکن ہے کہ آپ یہ دعویٰ کرتے رہیں کہ اسلام ہر زمانے میں دین و دنیا کی صلاح و فلاح کا بہترین ضامن ہے' مگر نہ دنیا کے نقشے پر انگلی رکھ کر آنکھوں سے مشاہدہ کرا سکیں کہ اس ملک میں اسلام کا نظام جاری ہے اور یہاں سیاسیات' اقتصادیات و اجتماعیات کے جو نظریات بروئے کار لائے جا رہے ہیں' انہوں نے اس ملک کو رشک جنت بنا دیا ہے اور اس سے نیچے اتر کر یہ سمجھا بھی نہ سکیں کہ اگرچہ مسلمانوں کی بدقسمتی سے اس وقت اسلام کی جامعیت و کاملیت و کفایت کا کوئی عملی نمونہ ہم پیش نہیں کر سکتے۔ مگر جہاں تک دلائل و براہین علمیہ کا تعلق ہے' ہم یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اگر دنیا آج محمد رسول ﷺ کے پرچم کے نیچے آ جائے اور اسلام کے بنائے ہوئے نقشے پر اس کی تعمیر کی جائے تو وہ طبقاتی و نسلی و لسانی جھگڑوں سے نجات پا سکتی ہے اور انسان اپنی اجتماعی و انفرادی زندگی میں امن و اطمینان کی دولت سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ:

رسول اکرم ﷺ کا یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ گزشتہ تیرہ صدیوں میں جب بھی دنیا کسی اہم انقلاب سے دوچار ہوئی' امت محمدیہ کی صفوں میں سے کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ اٹھا اور اس نے کتاب وسنت کی مشعل روشن کر کے ضروریات وقت کی پیچ در پیچ وادیوں میں انسانیت کے قافلے کو منزل مقصود کا راستہ دکھایا۔ ان میں سے بعض مجددیت کے منصب رفیع پر فائز ہوئے اور بعض نے یہ مقام بلند تو نہ پایا' مگر ان کے نقش قدم پر چلے اور ان کے شروع کیے ہوئے کام کو انجام تک پہنچایا۔

آج سے دو صدی قبل جب ہندوستان میں مسلم حکومت کا چراغ گل ہو رہا تھا' کفر وشرک و بدعت کی اندھیریاں ہر طرف چھا رہی تھیں' مسلمانوں کی اخلاقی و معاشرتی زندگی دم توڑ رہی تھی' کفر واسلام کے اختلاط سے فرق باطلہ کے نئے نئے بھیانک چہرے نمودار ہو رہے تھے دوسری طرف یورپ میں علوم جدیدہ کا غلغلہ بلند ہو رہا تھا' فلسفہ ومنطق ونفسیات و معاشیات و سیاسیات کی بنیادیں نئے انداز پر اٹھائی جا رہی تھیں' تحقیقات وانکشافات جدیدہ نے پرانے نظریات کی دنیا میں ہلچل ڈال دی تھی۔ ان علوم وفنون جدیدہ کی بنیادوں پر نئے نظام فکر وعمل مرتب ہو رہے تھے۔ جنہوں نے آگے چل کر دنیا کا نقشہ ہی بدل دیا۔

ایسے وقت میں شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) جیسا بالغ نظر حکیم الاسلام پیدا ہوا' جس نے ان خارجی وداخلی فتنوں کا گہری نگاہ سے جائزہ لیا۔ پھر اپنی خداداد فراست سے کام لے کر ملت کے ایک مرض کی نشان دہی کی اور اس کا علاج کتاب الٰہی کی کتاب شفا سے تجویز کیا۔

دوسری طرف حضرت شاہ صاحب نے اسلام کے اعتقادی' اخلاقی' اجتماعی اور فقہی نظام کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا اور ہر عقل سلیم پر اللہ تعالیٰ کی ''حجۃ بالغہ'' پوری کر دی۔

شاہ صاحبؒ کے پیش کیے ہوئے اسلام کے اس نقشے کو سامنے رکھ کر آج بھی اسلام کو ایک متحرک اور زمانہ حاضر کے مطالبات کو پورا کرنے والا مذہب ثابت کرنا مشکل نہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے بعد ان کے شروع کیے ہوئے کام کی تکمیل اپنے اپنے انداز پر ان کے علمی خانوادہ کے دوسرے محترم ارکان نے کی جن میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی' مولانا شاہ عبدالقادر' مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید اور مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب رحمہم اللہ

تعالیٰ ممتاز ہیں۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی:

حضرت شاہ صاحب کے تقریباً ایک صدی بعد وہ گھٹائیں برس چکی تھیں جو شاہ صاحب کے زمانے میں افق مغرب سے اٹھی تھیں۔ انگریزی حکومت کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ اسلامی اقتدار کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گل ہو چکا تھا۔ ہندوستانیوں کے جسموں کو برطانوی سنگینوں نے فتح کرلیا تھا، مگر دل و دماغ ابھی ان کی گرفت میں نہ آئے تھے۔ ان حالات میں اپنے اقتدار کی بنیادیں مستحکم کرنے کے لیے مدبرین انگلستان نے یہ تدبیر سوچی کہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنالیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے عیسائی مشنریوں کی کھیپ انگلستان سے ہندوستان آنے لگی اور جگہ جگہ مناظروں اور مباحثوں کے جلسے رچانے لگی۔ ان مشنریوں نے صرف تعلیمات اسلام ہی کو اعتراضات کا ہدف نہیں بنایا بلکہ پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات اطہر پر بھی ہر قسم کی گندگی اچھالی گئی۔ عیسائی مشنریوں کی پشت پر حکومت کی پوری طاقت ہوتی تھی اور صوبوں کے گورنر تک ان کی ہر قسم کی مدد کرتے تھے۔ چنانچہ سر ولیم میور نے اپنی مشہور کتاب ''لائف آف محمدؐ'' (Life of Mohammad) ایک پادری ہی کی فرمائش پر لکھی۔

عیسائیوں کی دیکھا دیکھی برادران وطن کے ایک گروہ نے جس نے ۵۷ء کے بعد ہندو دھرم کی تجدید کا بیڑا اٹھایا تھا، اسلام پر حملے شروع کردیئے۔

تاریخ کے اس نازک دور میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم ناناتویؒ (م ۱۲۹۷ء) میدان میں اترے اور آپ نے فریضۂ جہاد و تجدید انجام دیا۔ آپ نے جہاد بالسیف اور جہاد باللسان والقلم کے دوگونہ فرائض ادا کیے۔ معرکہ شاملی میں آپ نے انگریزی فوجوں کا مسلح مقابلہ کیا اور شاہ جہان پور اور دوسرے مقامات پر مذہبی معرکوں میں اسلام کا اس قوت سے دفاع کیا کہ مخالفین کے منہ پھیر دیئے۔

آپ نے اپنے مشن کو مستقل طور پر جاری رکھنے کے لیے ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی، ایشیا کی یہ سب سے بڑی دینی اسلامی درس گاہ بیک وقت مجاہدین ملت کا مضبوط قلعہ بنی رہی اور اسلامی علوم و فنون کا گہوارہ اور اسلامی ثقافت و روحانیت کا سرچشمہ بھی۔ دارالعلوم دیوبند نے گزشتہ سو سال میں جو فضلا پیدا کیے، ان میں سے اکثر نے بانی دارالعلوم کے اسوہ کی

تقلید میں سیاسی و دینی دونوں محاذوں پر کام کیا۔ ان میں شیخ الہندؒ حضرت مولانا محمود حسن اور ان کے ارشد تلامذہ مولانا عبیداللہ سندھی' مولانا مفتی محمد کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی رحمہم اللہ تعالیٰ بہت ممتاز ہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی:

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے تلامذہ کے تیسرے سلسلے میں دیوبند کی بساط سے جو اصحاب علم وقلم اٹھے ان میں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا نام سرعنوان ہے۔ مولانا مرحوم میں اپنے بزرگوں کے دونوں رنگ موجود تھے۔

آزادی وطن کے سلسلے میں ان کی خدمات کا ذکر سورج کو آئینہ دکھانا ہے۔ برطانوی حکومت کی قہرمانی کے خلاف جس جرأت و بے باکی کے ساتھ انہوں نے کلمۂ حق بلند کیا اور اس کی پاداش میں قید و بند کی جیسی سختیاں برداشت کیں وہ تاریخ آزادی وطن کا سنہری باب ہیں۔ وطن عزیز کی آزادی کے بعد بھی انہیں چین سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا' وہ مرتے دم تک ان اصولوں کی خاطر جنگ کرتے رہے جنہیں تحریک آزادی وطن کے رہنماؤں نے اپنی تحریک کا عنوان بنایا تھا اور اس جرم کی پاداش میں ہندوستان کی فرقہ پرست جماعتوں کی لعن وطعن کا ہدف بنے رہے۔

مولانا کی زندگی کا یہ رخ ان کے دوسرے اوصاف وکمالات میں خصوصی حیثیت رکھتا تھا اس لیے عوام وخواص میں وہ ''مجاہد ملت'' کے لقب سے مشہور ہوئے۔ مجھے مولانا کی زندگی کے اس پہلو سے بحث کرنا نہیں' یہ کام دوسرے اہل قلم انجام دے چکے اور دیں گے تاہم یہ عرض کرتا چلوں کہ ہندوستان کے ممتاز نقاد اور بلند پایہ مورخ' ڈاکٹر سید محمد حسین صاحب نے مولانا کی وفات کے دن مولانا کے فضائل کا ذکر کرتے ہوئے احقر کو مخاطب کر کے فرمایا:

> ''میری نظر ہندوستان کی گزشتہ نصف صدی کی سیاسی تاریخ پر ہے' میری رائے میں اس طویل مدت میں مسلمانان ہند پر کوئی عظیم شخصیت اس قدر اثر انداز نہیں ہوئی جس قدر مولانا حفظ الرحمٰن کی۔''

مجھے اس وقت مولانا کی زندگی کے اس پہلو پر ایک سرسری نظر ڈالنی ہے جو دب کر رہ گیا ہے۔ یعنی مولانا کی زندگی کا تصنیفی پہلو۔

دیوبند اور ڈابھیل کی تعلیمی زندگی:

مولانا حفظ الرحمٰن جب دیوبند آئے تو اس وقت یہ گلستان علم حضرت الاستاذ علامہ انور شاہ کاشمیریؒ کے نغموں سے گونج رہا تھا۔ دیوبند کے قدیم اساتذہ کا یہ طریقہ تھا کہ وہ طلبہ کی صلاحیتوں پر گہری نظر رکھتے تھے اور جسے جوہر قابل سمجھتے تھے اسے چمکانے اور جگمگانے کی کوشش کرتے تھے۔ علامہ کشمیری کی نگاہ انتخاب نے جلد ہی مولانا کو اپنی آغوش میں لے لیا اور وہ علامہ کشمیری کے منظور نظر طلبہ میں شامل ہو گئے۔

ہم طلبہ کو مولانا کے اس تقرب کا اندازہ اس وقت ہوا جب حضرتؒ نے بحیثیت صدر جمعیۃ علماء ہند اجلاس پشاور میں فارسی زبان میں خطبہ پڑھا اور اس کی اردو ترجمانی کا فرض اپنے اس ہونہار شاگرد کے کاندھوں پر ڈالا۔

اس کے بعد جب ۱۹۲۸ء میں دیوبند میں دارالعلوم کے انتظامی امور پر کشمکش ہوئی اور حضرت علامہ کشمیری، مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن دیوبندی اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے دیوبند چھوڑ کر ڈابھیل جانے کا فیصلہ کر لیا تو اس وقت ان بزرگوں کے ساتھ جن لوگوں نے رخت سفر باندھا ان میں مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی (صاحب فیض الباری) مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی دیوبندی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے علاوہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی بھی تھے۔ علامہ کشمیری کے یہ تلامذہ خاص اس وقت مدرسین کے زمرہ میں شامل ہو چکے تھے۔

ڈابھیل کے گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر مولانا حفظ الرحمٰن اور ان کے رفقا کو حضرت شاہ صاحب اور علامہ عثمانی رحمہما اللہ تعالیٰ کے فیض صحبت سے مستفیض ہونے کا بڑا موقعہ ملا اور اس زمانے میں یہ شیشے جلا پا کر آئینہ بن گئے۔

کچھ عرصے بعد ڈابھیل کی یہ مجلس علمی منتشر ہو گئی اور پھر غالباً مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو درس و تدریس کی بساط پر بیٹھنے کا موقع نہ ملا۔

مگر اب مولانا نے اپنی علمی سرگرمیوں کے لیے تحریر کا میدان انتخاب کیا۔

ندوۃ المصنفین کا تصنیفی دور:

۳۸ء میں فضلائے دیوبند کی اس نوجوان پارٹی نے قرول باغ (دہلی) میں ''ندوۃ

المصنفین'' کے نام سے ایک تصنیفی وتالیفی ادارہ قائم کیا۔ فضلاے دیوبند کے متعلق بعض حلقوں میں کہا جاتا تھا کہ وہ میدان تحریر میں پس ماندہ ہیں۔ درس وتدریس اور وعظ وتقریر کے ہی مرد میدان ہیں۔ یہ اعتراض اس لحاظ سے تو غلط تھا کہ بعض فضلاے دیوبند کا تنہا تصنیفی وتالیفی کام بڑے بڑے اداروں کے کام پر بھاری ہے۔ مگر اس پہلو سے یہ نکتہ چینی درست تھی کہ اکابر دیوبند کی سرپرستی میں کوئی اجتماعی کام اس سلسلے میں نہیں ہوا تھا۔

''ندوۃ المصنفین'' کے قیام سے دارالعلوم دیوبند کی علمی و دینی خدمات کا یہ پہلو بھی نمایاں ہوکر سامنے آ گیا۔

بہر حال ''ندوۃ المصنفین'' قائم ہوا اور حضرت حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہما اللہ تعالیٰ کے انداز فکر ونظر پر وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلام کے احکام کی تشریح وتعبیر اور مستشرقین مغرب ریسرچ ورک کے پردہ میں اسلامی علوم وروایات اور اسلامی تہذیب وتمدن پر جو ناروا حملے کرتے رہتے ہیں ان کی مدلل تردید اس کا مقصد قرار پایا۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اس مجلس کے رفیق اعلیٰ اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن ناظم اور مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور مولانا حامد الانصاری غازی کے ساتھ ساتھ اس خاکسار کو بھی رفاقت کی عزت حاصل ہوئی۔ مولانا سیوہاروی کو اس زمانے میں مجھے بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور ان کی علمی وعملی صلاحیتوں کا خوب اندازہ ہوا۔

مولانا کا قیام اس زمانے میں ''ندوۃ المصنفین'' کے دفتر کے قریب ہی شیدی پورہ کے ایک مکان میں تھا۔ متعلقین بھی ساتھ ہی رہتے تھے۔ مولانا صبح وشام باقاعدگی کے ساتھ دفتر میں آتے تھے۔

''ندوۃ المصنفین'' کا دفتر فیض روڈ (قرول باغ) پر ایک چھوٹی سی خوبصورت کوٹھی میں تھا۔ کوٹھی کے ہال میں بالکل وسط میں ایک خوشنما قالین پر ایک خوبصورت ڈیسک لگا رہتا تھا۔ یہ مولانا کی نشست گاہ تھی۔ اس کے دونوں پہلوؤں میں دوسرے رفقا کی نشستیں تھیں۔ ہال میں چاروں طرف دیوار سے لگی ہوئی شاندار الماریاں کھڑی تھیں، قیمتی اور نادر کتابیں جن کی جلدوں کے سیاہ پشتوں پر سنہری حروف میں ان کے ناموں کے ٹھپے جگمگاتے تھے، الماریوں کے شفاف شیشوں میں سے جھانک جھانک کر اصحاب ذوق کو دعوت نظارہ دیتی تھیں۔

مولانا اپنے مقررہ اوقات پر تشریف لاتے۔ اپنی کھدر کی صاف ستھری شیروانی اتار کر کھونٹی پر ٹانگ دیتے' اپنی نشست پر جاتے اور ضرورت کی کتابیں ارد گرد پھیلا کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔

کچھ عرصہ بعد تو مولانا کے کاندھوں پر جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ کے منصب جلیل کی گرانبار ذمہ داریاں پڑ گئی تھیں۔ مگر اس سے پہلے بھی وہ جمعیۃ علماء ہند کے صف اول کے لیڈر اور مجالس دینی کے سحر بیان خطیب ہونے کی حیثیت سے ہندوستان گیر شہرت و عظمت حاصل کر چکے تھے۔ اس لیے مولانا کو دور دراز شہروں کے سفر بھی کرنا پڑتے تھے اور قیام کے زمانے میں باہر سے آنے والے احباب و معتقدین ملنے کے لیے بھی برابر آتے رہتے تھے۔ کام کے ساتھ ساتھ یہ ملاقاتیں جاری رہتی تھیں۔ اسی طرح سفر کے دوران میں تصنیفی کام بھی جاری رہتا تھا۔ مولانا کے دوسرے اسباب کے ساتھ کتابیں بھی ضروری سامان سفر کی حیثیت سے ساتھ جاتی تھیں۔

مولانا نے اسی ''حلوت در انجمن'' میں ''قصص القرآن'' اور ''اسلام کا اقتصادی نظام'' جیسی معرکۃ الآرا علمی و تحقیقی کتابیں لکھیں جن پر اردو لٹریچر ہمیشہ نازاں رہے گا۔ اس مختصر گنجائش میں مولانا کی بلند پایہ تصنیفات پر سرسری نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔

قصص القرآن:

معاندین اسلام کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وحی الٰہی کے اس ماہ تاباں پر جو چودہ سو سال سے آسمان صداقت پر جگمگا رہا ہے کسی طرح خاک ڈال سکیں اور اس کی حقانیت کے چشمۂ صافی کو اپنی کلوخ اندازی سے گدلا کر کے اپنی عداوت کی پیاس بجھا سکیں۔ اسلام کے نکھرے اور ستھرے عقائد روح پرور اور نظر افروز عبادات اور دلکش دلآویز اخلاق کو تو ہدف اعتراض بنانا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ اگرچہ ان کی یہ کوششیں بھی ہمیشہ جاری رہی ہیں۔ مگر قرآن کریم کے بیان کردہ قصص و واقعات کو جدید تاریخی تحقیقات اور انکشافات کی آڑ میں غلط یا بے اصل ثابت کر دیا جائے۔

ان کی یہ کوشش اس لیے بھی ضروری تھی کہ قرآن کریم بیان قصص میں جابجا توریت وانجیل سے اختلاف کرتا ہے اور انبیاے کرام کی مقدس زندگیوں کو جن معصیتوں سے ان کتب

مقدسہ محرفہ میں ملوث کیا گیا ہے' ان سے ان کے دامان عصمت کو پاک قرار دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن کریم کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے۔ اس میں ملل و اقوام کے عروج و زوال کے جو واقعات اور اہل حق اور اصحاب باطل کے جو قصص و حکامات بیان کیے گئے ہیں' ان کا مقصد محض تذکیر و موعظمت ہے۔ تاہم جو واقعہ جس طرح کتاب الٰہی میں آ گیا ہے اس کا ایک ایک حرف صحیح ہے اور اس زمانے میں علمائے اسلام کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ ان واقعات کی صحت کو معترضین کے جدید تاریخی وجغرافیائی مسلمات کی روشنی میں ثابت کریں۔

مصر میں رشید رضا مصریؒ نے اپنی تفسیر ''المناد'' میں اور ہندوستان میں مولانا ابوالکلام آزادؒ مرحوم نے ''ترجمان القرآن'' میں ان گوشوں پر قلم اٹھایا ہے اور بعض بعض مقامات پر تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ مگر بدقسمتی سے یہ دونوں تفسیریں نصف قرآن سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ پھر جو کچھ ان میں ہے وہ ضمنی مباحث کے طور پر ہے۔ ضرورت تھی کہ ''قصص القرآن'' کو موضوع بنا کر' قرآن کریم کے تمام قصص و واقعات پر تحقیق وتنقید کی نظر ڈالی جائے اور قرآن کریم کے روشن چہرہ سے معترضین کی اڑائی ہوئی ہر گرد کو صاف کر دیا جائے اس موضوع پر سب سے پہلے تو علامہ عبدالوہاب النجار مصری نے قلم اٹھایا اور ''قصص الانبیاء'' کے نام سے ایک متوسط درجہ کی کتاب مرتب کی۔ یہ دراصل ان کے ان لکچروں کی کتابی صورت تھی جو انہوں نے ۳۰ء اور ۳۱ء میں جامع ازہر کے قسم تخصص کے طلبہ کو دیئے تھے۔

علامہ نجارؒ کا یہ علمی کام خاصہ اہم ہے۔ مگر بہرحال نقش اول' ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یوں تو اس کتاب میں صرف انبیائے کرام ہی کے واقعات سے تعرض کیا گیا ہے۔ تمام قصص قرآنی سے بحث نہیں کی گئی۔ دوم اس کتاب میں بحث ونظر کا دائرہ بہرحال محدود ہے۔ ساری کتاب (تیسرا ایڈیشن) بڑی تقطیع کے ۴۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

مصر میں اس موضوع پر ایک اور کتاب مولا بک جاد کے قلم سے ''قصص القرآن'' کے نام سے بھی شائع ہوئی ہے۔ مگر یہ کتاب صرف ادبی حیثیت رکھتی ہے علمی و تحقیقی قطعاً نہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن نے اس وادی میں قدم رکھا اور ''قصص القرآن'' کے نام سے اسے باغ و بہار بنا دیا۔ ان شاءاللہ تعالیٰ مولانا کی نجات کے لیے ان کی یہ قرآنی خدمت کافی ہے۔

کتاب بے حد مقبول ہوئی اور مصنف کی محنت آخرت ہی میں نہیں' دنیا میں بھی مشکور ہوئی۔ خود مصنفؒ نے اپنی اس محنت کو سرسبز ہوتے' دنیا میں دیکھا اور اب ان شاءاللہ تعالیٰ باغ

جنت میں اس کے ثمرات سے متمتع ہو رہے ہوں گے۔

مولانا کتاب کے تیسرے حصے کے مقدمہ میں ارقام فرماتے ہیں:

''قصص القرآن کی یہ تیسرا حصہ ہدیہء ناظرین ہے۔ پہلے اور دوسرے حصہ کی افادیت اور قدیم و جدید علمی طبقوں میں ان کی مقبولیت' خداے برتر کا وہ فضل و کرم ہے جس کے اظہار و شکر کے لیے میرے قلم و زبان دونوں قاصر ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ قصص القرآن کی اس جدید ترتیب و تدوین کے ساتھ اہل علم کا شغف' مصنف کی محنت و کاوش کا نتیجہ نہیں' بلکہ قرآن عزیز کی برکت و عظمت کا ثمرہ ہے۔ مسلمانوں کا کلام الٰہی کے ساتھ والہانہ ذوق اگر اس محنت کو مفید اور پسندیدہ سمجھتا اور اس کاوش کو بنظر استحسان دیکھتا ہے تو فالحمدللہ علی ذلک و ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

قصص القرآن کے چار حصے ہیں اور پوری کتاب بڑی تقطیع کے ۸۴۷ اصفحات میں سمائی ہے۔ مختلف حصوں کی تقسیم اس طرح ہے۔

حصہ اول:

حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت موسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاے کرام کے حالات و واقعات۔

حصہ دوم:

حضرت یوشعؑ سے حضرت یحییٰؑ تک تمام پیغمبروں کے مکمل سوانح حیات اور ان کی دعوت حق کی محققانہ تشریح و تفسیر۔

حصہ سوم:

بعض انبیاے کرام کے سوانح زندگی کے علاوہ دیگر قصص قرآنی' اصحاب الکہف والرقیم' اصحاب القریہ' اصحاب السبت اصحاب الرس' بیت المقدس اور قوم یہود' اصحاب الاخدود' اصحاب الفیل' اصحاب الجنہ' ذوالقرنین' سد سکندری' سبا اور سیل عرم وغیرہ کا مورخانہ و محققانہ انداز میں بیان۔

حصہ چہارم:

حضرت عیسیٰؑ اور خاتم الانبیا علیہما الصلوٰۃ والسلام کی مقدس سیرتوں کا بیان اور قرآن کریم کی روشنی میں اہم مباحث پر تبصرے۔

۱۔ بیان واقعات میں قرآن کریم کی تصریحات کو بنیاد و اساس قرار دیا گیا ہے۔ پھر صحیح احادیث اور معتبر تاریخی روایات سے ان کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔

۲۔ اہل کتاب کی کتب مقدسہ یا مغربی مورخین کی تحقیقات جدیدہ اور قرآن کریم میں جہاں تعارض نظر آیا ہے وہاں یا دلائل واضحہ سے دونوں کے درمیان تطبیق کی گئی ہے یا براہین قطعیہ سے قرآن کریم کی صداقت کو ثابت کیا گیا ہے۔

۳۔ اسرائیلی روایات کی خرافت اور معاندین اسلام کی باطلیت کو حقائق مسلمہ کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔

۴۔ تفسیری‘ حدیثی اور تاریخی مطالب و مباحث میں حتی الوسع سلف صالحین کے مسلک قدیم کو نہیں چھوڑا گیا اور آزادی فکر ورائے کے گھوڑے نہیں دوڑائے گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ قصص القرآن کی یہ آخری خصوصیت کتاب کی روح ہے اور اس کا وہ امتیاز ہے جو اسے دوسرے جدید مصنفین اسلام کی کتابوں سے ممتاز کرتا ہے۔

ہندوستان اور مصر میں جن اہل علم و قلم نے جدید معترضین اسلام کے رد میں قلم اٹھایا ہے اور قرآن کریم کے چہرہ روشن سے ان کے اڑائے ہوئے گرد و غبار کو صاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے بعض مواقع پر اس کے خدوخال کو ہی بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ حدیث صحیح حتیٰ کہ احادیث بخاری کی بھی ان کے ہاں خاص اہمیت نہیں۔ ان کا جچا تلا جواب ایسے مواقع پر یہ ہوتا ہے کہ:

”ایک روایت پر صحت کی کتنی ہی مہریں لگ چکی ہوں لیکن بہر حال غیر معصوم انسانوں کی ایک شہادت اور غیر معصوم ناقدوں کا ایک فیصلہ ہے۔ ایسا فیصلہ ہر بات کے لیے مفید و حجت ہوسکتا ہے مگر یقینیات و قطعیات کے خلاف نہیں ہوسکتا۔“

پھر وہ ”یقینیات وقطعیات“ سے اپنا فہم اور اپنی تعبیر و تفسیر مراد لے کر ہر روایت صحیحہ کو رد

کر دیتے ہیں۔

بے شک اس طرح وہ معترضین اسلام کے بعض حملوں کا دفاع کر دیتے ہیں اور ان کا یہ فعل بڑا مخلصانہ اور ہمدردانہ ہوتا ہے' مگر اس کا ایک خطرناک نتیجہ یہ نکلا رہا ہے کہ خود مدعیان اسلام میں ایسے گروہ پیدا ہو گئے ہیں' جنہوں نے اپنی فاسقانہ زندگی پر اس اصول سے قرآن کریم کی مہر تصدیق ثبت کر لی ہے اور احادیث صحیحہ کو جو اسلامی زندگی کی تشکیل کرتی ہیں نا قابل اعتبار قرار دے کر اس کی جکڑ بند سے آزاد ہو گئے ہیں۔

مولانا سیوہاروی' مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنا سیاسی رہنما سمجھتے تھے۔ اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مگر سلف صالحین اور قدماء مفسرین کی تصریحات کے مقابلے میں ان کی تحقیقات جدیدہ کو اس وقت تک قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے جب تک اسے علم و تحقیق کے کانٹے میں تول نہ لیں۔ مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں ذوالقرنین کی شخصیت اور سد یاجوج و ماجوج کے تعین کے سلسلے میں جو معرکۃ الآرا بحث کی ہے اس کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا سیوہاروی لکھتے ہیں:

''تفسیری مطالب کے سلسلے میں ہم کو موصوف کے ساتھ شدید اختلاف بھی رہتا ہے اور اتفاق بھی۔ لیکن اس خاص مسئلہ میں چونکہ ان کی رائے علمائے سلف سے بالکل مختلف تھی اس لیے کڑی تنقیدی نظر کی محتاج تھی چنانچہ کافی غور و خوض اور گہری نظر کے بعد اس کی صحت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے اور جب کہ یہ طے شدہ امر ہے کہ علمائے سلف کی جلالت قدر اور علمی عظمت و برتری کے باوجود علمی تحقیق کا دروازہ بند نہیں ہے اور قرآن و حدیث کی روشنی میں علمائے متاخرین نے علمائے متقدمین سے سیکڑوں مسائل علمی میں اختلاف رائے کا اظہار کیا ہے۔ خصوصاً تاریخی مباحث میں اور جدید معلومات نے ایسے اکتشافات کیے ہیں جن کے ذریعے ہم بہت سے ایسے مسائل کو بآسانی حل کر لیتے ہیں جو علمائے سلف کے زمانے میں لاینحل رہے ہیں تو ہم کو مولانا آزاد کی اس تحقیق کا (خواہ وہ تاریخی لحاظ سے کتنی ہی دقیع کیوں نہ ہو) محض اس لیے انکار نہیں کر دینا چاہیے کہ وہ ان کی اپنی تحقیق ہے۔''

پھر اسی کے ذیل میں بطور نوٹ لکھتے ہیں:

''اس مسئلہ کی پوری تحقیق میں ہم کو مولانا آزاد کے اس حصۂ بیان سے سخت اختلاف ہے جو انہوں نے علمائے سلف کے خلاف یاجوج و ماجوج کے آخری

خروج کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔ اس لیے یہ حصہ تحقیق بلا شبہ باطل ہے۔''

(قصص القرآن جلد سوم ص ۱۵۶)

افسوس ہے کہ اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ورنہ ہم مثالیں دے کر واضح کرتے کہ مولانا کا معیار ردو قبول علم و تحقیق رہا ہے' جہاں انہوں نے مولانا آزاد یا کسی اور جدید محقق کی رائے کو قبول کیا ہے تو تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر کس کر اور جہاں اسے رد کیا اور معترضین سابقین کی رائے سے اتفاق کیا ہے تو وہ بھی علم و تحقیق کی روشنی میں' نہ مفسرین قدیم کی آراے جلیلہ کو انہوں نے تقویم پارینہ قرار دیا ہے اور نہ محققین جدید کی تحقیقات حدیثہ کو شجر ممنوعہ۔

مولانا کی یہ کتاب چونکہ ان کی تمام کتابوں پر گل سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے اس پر ذرا تفصیل سے گفتگو کی گئی۔ اب مختصر طور پر دوسری کتابوں پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے۔

اسلام کا اقتصادی نظام:

محنت اور سرمایہ کی ہمارے زمانہ میں جو کشمکش جاری ہے اور اس سلسلے میں اقتصادی و سیاسی لائنوں پر جو گروہ بندیاں ہو رہی ہیں اس نے ساری دنیا کو میدان جنگ میں تبدیل کر دیا ہے۔ نئے نئے اقتصادی نظام' جاذب نظر عنوانات کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آ رہے ہیں اور دلفریب اور سامعہ نواز نعرے فضاؤں میں گونج رہے ہیں' مگر دنیا امن و راحت سے محروم ہے اور دلوں کو سکون نصیب نہیں۔

اسلام کو جو لوگ ہر دور میں انسانیت کی مشکلات کا حل اور امن و سلام کا پیغام قرار دیتے ہیں' ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے اس دعوے کو ثابت کریں اور بتائیں کہ فرعونیت اور قارونیت کے خنجروں سے تڑپتی ہوئی دنیا رحمۃ للعالمین ﷺ کے پرچم کے سایے میں ہی امن و اطمینان کی دولت پا سکتی ہے۔ غالباً مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے سب سے پہلے اس فرض کفایہ کو ادا کرنے کے لیے اردو زبان میں قلم اٹھایا اور ۱۹۳۹ء میں ان کی کتاب ''اسلام کا اقتصادی نظام'' کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ چھ سال بعد ۱۹۴۵ء میں اس کا دوسرا جامع ایڈیشن شائع ہوا اور اس طرح اس اہم موضوع پر جو عام طور پر ہمارے علماء کی نگاہوں سے اوجھل رہا ہے' ایک بلند پایہ کتاب سامنے آ گئی۔

مولانا اپنی اس مایہ ناز تصنیف کو پیش کرتے ہوئے اس کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''بہر حال میری اس نگارش میں نہ سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھنے والوں کو دست غیب کا کوئی نسخہ ہاتھ آ سکتا ہے اور نہ ان مذہب نما انسانوں کے لیے کوئی پیغام جاں فزا دستیاب ہو سکتا ہے جن کے نزدیک دنیا کے یہ موجودہ ظالمانہ نظام ہی خدا کی مرضی اور اس کا منشا ہیں۔

میری یہ محنت صرف ان ٹوٹے ہوئے دلوں کے لیے ہے' جو موجودہ ظالمانہ نظام کی دستبرد سے مایوس ہو کر حیرت سے چاروں طرف دیکھ رہے ہیں اور کسی عادلانہ نظام کے بروئے کار آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔

اور میری یہ پکار مذہب سے ناآشنا اور یورپ کے انقلاب سے مرعوب ان نوجوانوں کے لیے ہے' جو الحاد کے جھوٹے مگر چمکتے ہوئے نگینوں کو جوہر و گوہر جانتے اور دنیا کے اس ظالمانہ کردار کا ردعمل کبھی ہیگل اور کارل مارکس کے فلسفہء سوشلزم اور کمیونزم کو کعبہء مقصود یقین کرنے لگتے ہیں۔

وہ دیکھیں اور غور و انصاف کی نگاہ سے دیکھیں کہ رسول عربی ﷺ اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بتائے ہوئے اور سکھائے ہوئے نظام میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ظالمانہ نظام کے خلاف محنت و سرمایہ کی کشمکش اور طبقاتی جنگ سے نجات دلاتا ہے اور جس سے انسانوں کی آزادی اور عام خوش حالی کی ضمانت حاصل ہوتی ہے۔''

مولانا کی یہ محنت رائگاں اور یہ پکار بیکار نہ گئی۔ کتاب خاصی مقبول ہوئی اور اصحاب ذوق نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مگر ضرورت ہے کہ اس کا انگریزی ایڈیشن شائع کیا جائے تاکہ کتاب اپنے مقصد کو پورا کر سکے۔

مولانا کی اس کتاب کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں اور بھی کئی کتابیں اس موضوع پر لکھی گئیں۔ مثلاً مولانا گیلانی کی کتاب ''اسلامی معاشیات'' اور ڈاکٹر محمد یوسف کی کتاب ''اسلام کے معاشی نظریے'' ان کتابوں کا بھی اپنا اپنا مقام ہے مگر الفضل للمتقدم۔

مولانا کی اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن بڑے سائز کے چار سو صفحات پر مشتمل ہے اور مباحث ذیل پر داد تحقیق دی گئی ہے۔

۱۔ اقتصاد و علم الاقتصاد

۲۔ معاشیات کے جدید نظریے

۳۔ اصول معاشیات قرآن عزیز کی روشنی میں

۴۔ انفرادی معیشت

۵۔ اجتماعی نظام معیشت

۶۔ بیت المال اور اس کے مصارف

۷۔ زراعت' تجارت اور صنعت وحرفت

۸۔ مال گزاری' خراج اور عشر

۹۔ زمینداری

۱۰۔ ربوا اور اس کے اقسام واحکام

۱۱۔ بینک' کوآپریٹیو سوسائٹیاں اور مضاربت

۱۲۔ کانیں' اجارہ داری کی کمپنیاں' ملیں اور کارخانے

۱۳۔ زکوٰۃ' صدقات' وراثت اور اوقاف

۱۴۔ اسلامی نظام کا دیگر اقتصادی نظاموں سے موازنہ

۱۵۔ ہندوستان میں معاشی مسئلہ کا حل

یہ دراصل مختصر فہرست ابواب ہے' مفصل فہرست مضامین نہیں' تاہم اس سے کتاب کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اخلاق وفلسفہ اخلاق:

مولانا کی تیسری اہم علمی کتاب ''اخلاق وفلسفہء اخلاق'' ہے''اخلاقیات'' اسلام کے جامع نظام زندگی کا ایک اہم باب ہے۔ جملہ انبیاے کرام کا خاص مشن یہ رہا ہے کہ وہ انسانوں کو حسن عمل نیک کرداری اور نکوکاری کے زیورات سے آراستہ کریں اور دنیا کو محبت ورافت اور امن وراحت کا گھوارہ بنائیں۔ سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ نے تو اپنی بعثت کا مقصد اعلیٰ ہی یہ قرار دیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق

اس لیے قرآن کریم کے علاوہ جملہ کتب حدیث میں مسائل اخلاق کے گلشن کھلے ہوئے

ملتے ہیں۔

تاہم اخلاقیات کا تعلق دنیوی صلاح و فلاح کے لیے بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا آخرت کی سعادت و کرامت ہے اس لیے ہر دور میں فلاسفہ نے بھی اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے اور فلسفیانہ انداز میں مسائل اخلاق کی وضاحت کی ہے۔

حکماے اسلام امام رازی' امام غزالی' عارف رومی' شیخ سعدی' حافظ ابن قیم اور شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہم اللہ نے دونوں کے ڈانڈے ملا دیئے ہیں اور اخلاقیات اسلام کو فلسفیانہ انداز بیان میں اس شان سے پیش کیا ہے کہ بادہء ناب رنگیں ساغر بلوریں میں آ کر روح پرور ہونے کے علاوہ نظر افروز بھی ہو گئی ہے۔

پھر جدید تحقیقات علمیہ کے اس دور میں یہ موضوع بھی افکار جدیدہ سے سیراب ہو رہا ہے۔ ضرورت تھی کہ ان سرچشموں سے بھی موتی چن لیے جائیں اور ان سب کو ایک لڑی میں پرو دیا جائے تا کہ انبیاے کرام کی اخلاقی تعلیمات کے لعل و گوہر کی برتری و بہتری آفتاب کی کرنوں کی طرح عالم آشکارا ہو جائے۔ عالم اسلام میں اس طرف بہت کم توجہ کی گئی اور اردو زبان کا دامن تو اس گوہر مقصود سے بالکل خالی ہی تھا۔

مولانا سیوہارویؒ نے اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے قلم اٹھایا اور اس کا حق ادا کر دیا۔

مقدمہ کتاب میں مولانا فرماتے ہیں:

''اردو میں اس سلسلے میں جس قدر تالیفات موجود ہیں وہ جدا جدا نظریوں کے ماتحت تالیف کی گئی ہیں۔ جن حضرات کو مذہبی ذوق ہے' انہوں نے جدید نظریہ ہاے اخلاق سے جدا ہو کر اپنی معروضات کو ایک ہی طرز میں ادا کیا ہے اور جن ارباب قلم کو جدید علمی نظریوں سے شغف ہے' انہوں نے صرف ان ہی نظریوں کی تحقیق و تفتیش اور شرح و بسط کو اپنا منتہاے مقصد بنایا ہے۔ لیکن وقت کا تقاضا یہ تھا کہ اس سلسلے میں ایک ایسی کتاب مرتب کی جائے جس میں ایک جانب جدید اکتشافات علمی کا مفید ذخیرہ ہو اور زبردستی کے تعصب اور ہٹ دھرمی سے اس کے ساتھ معاندانہ روش اختیار نہ کی جائے اور دوسری جانب اسلامی اخلاقی تعلیم کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ صرف حسن ظن کی بنا پر نہیں بلکہ دلائل و براہین کی روشنی میں اسلام کے نظریہء اخلاق اور اسلامی تعلیمات کی برتری واضح ہو

جائے۔

جہاں تک بیان وترتیب کی اس نوعیت کا تعلق ہے ''علم اخلاق'' پر ایسی کوئی تالیف نظر نہ آئی۔ یہ دیکھ کر اپنی بے بضاعتی علم کے باوجود عزم وارادہ کی قوت نے ابھارا اور وجدان وضمیر نے پکارا:

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا''

یہ کتاب اپنی ترتیب کے لحاظ سے چار حصوں پر مشتمل ہے:

۱۔ پہلے حصے میں علم النفس اور نفسیاتی مباحث' ملکہ' وجدان' ارادہ وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔

۲۔ دوسرے حصے میں اخلاق کے معیاری نظریات اور ان کے متعلقات نیز علم الاخلاق کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

۳۔ تیسرے حصے میں اخلاق کے عملی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۴۔ چوتھے حصے میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی اس طرح وضاحت کی گئی ہے کہ علمی وعملی دونوں اعتبارات سے دلائل وبراہین کی روشنی میں ان کا کمال وتفوق ظاہر ہو جاتا ہے۔

بہرحال مولانا کی یہ تالیف بھی جو بڑی تقطیع کے تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل ہے' اردو زبان کے خزانے میں ایک متاع گراں بہا کا اضافہ کرتی ہے اور مولانا اس کی ترتیب وتدوین پر علمی دنیا کی طرف سے خراج تحسین وتبریک کے مستحق ہیں۔

مولانا سیوہاروی کی یہ تینوں معرکۃ الآرا کتابیں ندوۃ المصنفین کے تصنیفی وتالیفی پروگرام کے تحت مرتب ہو کر شائع ہوئیں اور ندوۃ المصنفین کے علمی ذخیرہ میں ان کو ''گل ہائے سرسبد'' کی حیثیت حاصل ہے۔

ان کے علاوہ مولانا کے قلم سے ندوۃ المصنفین کے وجود میں آنے سے قبل دو اور کتابیں بھی نکلیں۔

البلاغ المبین فی مکاتیب سید المرسلین:

اس کتاب میں رسول اکرم ﷺ کے ان خطوط وپیغامات کو جمع کر دیا گیا ہے جو آپ

نے اپنے عہد کے سلاطین وامراے عالم کے نام لکھے۔ ان کا پس منظر اور ضروری تشریحات بھی اس انداز سے پیش کر دی گئی ہیں کہ حضور ﷺ کا طریق تبلیغ و دعوت وضاحت کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آ جائے اور ہمارے علماء و مبلغین اس کو نمونہ واسوہ بنا سکیں۔

یہ کتاب اس وقت نایاب ہے۔ راقم الحروف نے بھی اس کی اشاعت کے زمانے میں اسے دیکھا تھا۔ بڑی تقطیع کے غالباً دو سو صفحات پر مشتمل ہوگی۔ ضرورت ہے کہ اسے پھر شائع کیا جائے۔

نور البصر فی سیرۃ خیر البشرؐ:

اس کا دوسرا نام ''سیرت رسول کریمؐ'' ہے اور اسی نام سے معروف ہے۔ یہ رسول اکرمؐ کی سیرۃ مبارکہ پر ۳۵۰ صفحات کی ضخامت کا رسالہ ہے جسے آپ نے ڈابھیل کے قیام کے زمانے میں اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کی نصابی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے تحریر فرمایا۔

انداز ترتیب یہ ہے کہ دلچسپ اور موثر انداز بیان اور مختصر الفاظ میں رحمۃ للعالمین ﷺ کی مقدس زندگی کی مکمل تصویر کھینچ دی گئی ہے۔ ہر عنوان کے تحت اس کے مناسب آیۃ قرآنیہ درج کر دی گئی ہے تاکہ واقعہ مذکورہ اس آیۃ کی تفسیر بن کر سامنے آ جائے۔ حیات طیبہ کے حسین وجمیل خدوخال کی عکاسی کے علاوہ نظام اسلامی کے نقش ونگار بھی واضح کیے گئے ہیں۔ یہ رسالہ آپ نے اپنے استاذ عالی مقام حضرت علامہ الاستاذ مولانا انور شاہ کشمیری کے ایما پر تالیف کیا۔ پہلے ایڈیشن کو حضرت ممدوح کی خدمت میں پیش کر کے ان کی رائے گرامی بھی حاصل کی جسے تبرکاً درج کیا جاتا ہے۔ وھو ھذا:

> ''نور البصر فی سیرۃ خیر البشر'' مولفہ جناب مستطاب مولوی حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی دام عزہ احقر کے اصرار پر تالیف ہوئی ہے۔ احقر کا خیال تھا کہ کوئی متوسط سیرت ایسی تالیف ہو کہ مدارس عربیہ اور مدارس قومیہ کے طلبہ اس سے بہ سہولت مستفید ہو سکیں اور حدیث شریف کے مشتغلین کو اجمالی بصیرت نصیب ہو اور کتب معتبرہ سے ماخوذ ہو اور اہل حق اور سلف کے طریقے کے خلاف نہ ہو۔ بحمد اللہ یہ مختصر کتاب ایسی ہی واقع ہوئی ہے حق تعالیٰ مولف کو جزاے خیر نصیب کرے اور ان کی یہ خدمت بارگاہ خداوندی اور بارگاہ نبوت میں قبول

ہو۔ آمین!

محمد انور شاہ کشمیری عفاء اللہ عنہ یکم جمادی الاخری ۱۳۵۱ھ

کتاب کافی مقبول ہوئی۔ اس کا آخری مکمل ایڈیشن گزشتہ سال شائع ہوا ہے۔ ٹائیٹل کے لیے ڈیزائن پر غور وخوض کے وقت راقم الحروف کو بھی شریک مشورہ ہونے کی عزت حاصل ہوئی تھی۔ اس ایڈیشن میں سرورق پر مختصر نام ''سیرۃ رسول کریم'' درج کیا گیا ہے۔ پہلے ایڈیشن پر صرف ''رسول کریم'' تھا۔ اس سلسلے میں مولانا مرحوم نے ایک لطیفہ بھی سنایا۔ فرمایا کہ ''جب کتاب پہلی مرتبہ چھپی اور میں نے اپنے بچپن کے ایک استاد کو پیش کی (جو غالباً سیوہاروی تھے) تو وہ سرورق پر ''رسول کریم'' دیکھ کر بہت بگڑے' فرمانے لگے کیا اب ''رسول کریم'' کو فروخت کرو گے؟ چنانچہ میں نے محض اپنے استاد کے تعمیل ارشاد میں دوسرے ایڈیشن میں ''سیرت'' کا لفظ اضافہ کردیا۔

میں نے عرض کیا یہ تو عام دستور ہے کہ سیرت کو صاحب سیرت کے نام سے موسوم کردیا جاتا ہے۔ چنانچہ احقر کی کتاب کا نام بھی ''نبی عربیؐ'' ہے جو ندوۃ المصنفین سے شائع ہوئی ہے۔ مولانا نے ہنس کر فرمایا' مگر میں اپنے استاد کو ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔

حفظ الرحمٰن لمذہب ابی حنیفۃ النعمان:

ان کتابوں کے علاوہ مولانا نے بالکل ابتدائی زمانے میں ایک کتاب مناظرانہ رنگ میں حفظ الرحمٰن لمذہب ابی حنیفۃ النعمان بھی لکھی تھی۔ اس کا علم مجھے حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی زبانی ہوا' مگر مولانا بہت جلد فرقہ وارانہ نزاعات کے مقام سے بلند ہو گئے اور مولانا کی یہ کتاب بھی نسیاً منسیاً ہو گئی۔

اختتام کلام:

مولانا سیوہاروی کی تصنیفی وتالیفی زندگی نے صرف دس سال کی مختصر مدت پائی۔ ۱۹۳۸ء (ندوۃ المصنفین کا سال تاسیس) سے یہ دور شروع ہوا اور ۱۹۴۷ء کے ہولناک انقلاب پر ختم ہو گیا۔ اسی مختصر مدت میں عظیم الشان تصنیفی کارنامے آپ نے انجام دیئے جن کو ہندوستان کے صف اول کے ادباء ومصنفین کی بہترین علمی خدمات کے مقابلہ پر بے تکلف پیش کیا جاسکتا ہے۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دوسرے ممتاز اصحاب قلم کی طرح اگر مولانا کو قومی

خدمات سے یکسو ہو کر اس میدان میں قلم کی جولانیاں دکھانے کا اور بھی موقع ملتا تو آپ کا مقام کیا ہوتا؟

انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد تو مولانا کی حالت یہ تھی کہ شعلۂ جوالہ بنے ہوئے ہندوستان کے ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک بھاگتے پھرتے تھے۔ ملی زندگی کا کون سا گوشہ ایسا تھا جہاں مولانا مصروف عمل نہ ہوں۔ مسلم یونیورسٹی میں مولانا یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد کے تحفظ کے لیے جان لڑا رہے تھے' جامعۂ ملیہ اسلامیہ میں اس کی انتظامی گتھیوں کو سلجھانے میں اپنی اصابت رائے کے جوہر دکھا رہے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کو سخت سے سخت مشکلات کے بھنور سے نکالنے میں اپنے اثر ورسوخ کو کام میں لا رہے تھے۔ حج کمیٹی میں حجاج کو آرام وآسائش پہنچانے کے لیے سرگرم عمل تھے۔ اصلاح اوقاف کے لیے' وقف بورڈوں میں مولانا کی رہنمائی نشانِ منزل تھی۔ انجمن ترقی اردو کے لیے مولانا کی قیادت خضر راہ تھی اور پارلیمنٹ کے ایوان میں آپ کا نعرہ حق ملت کے دکھے ہوئے دلوں کے لیے سرمایۂ سکون تھا۔

ان مسائل ملی کے سلسلے میں مولانا ہندوستان کے کونے کونے کی خاک چھانتے پھرتے تھے۔ پھر جب سفر کا یہ سلسلہ ٹوٹتا اور مولانا کا دہلی میں قیام ہوتا تو مولانا کا دربار عام خود مصروفیات کا خارزار ہوتا۔ وہ دیکھیے جمعیۃ علماء ہند کے دفتر کا صحن ہے۔ ایک طرف چبوترہ ہے جس پر چٹائی کا فرش بچھا ہوا ہے۔ ایک طرف مولانا کے رفقائے کرام حضرت مولانا محمد میاں اور حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن وغیرہ تشریف فرما ہیں۔ دوسری طرف ضرورت مندوں کا ہجوم ہے۔ برابر میں دو کرسیاں آمنے سامنے لگی ہوئی ہیں۔ ان پر معزز ملاقاتی بیٹھے ہیں چبوترے کے مقابل دوسری طرف ایک کھڑی چارپائی بچھی ہے جو کبھی بستر سے آشنا نہیں ہوئی۔ البتہ ایک گاؤ تکیہ ضرور ہے اور مولانا اس سے سہارا لگائے بیٹھے ہیں اور سب سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے ہیں۔

کوئی بنگال سے آیا ہے تو کوئی گجرات سے کوئی ہندو ہے کوئی مسلمان' پارلیمنٹ کے ممبر بھی ہیں اور ملوں کے مزدور بھی' مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی مولانا ہر ایک کی بات باری باری توجہ سے سن رہے ہیں' کسی کو تسلی دے رہے ہیں' کسی کے لیے سفارشی خط لکھوا رہے ہیں' کسی کے کام کے لیے حکام سے ٹیلی فون پر بات کر رہے ہیں سب مطمئن ہو کر واپس جا رہے ہیں۔ یہ لیجیے وہ ٹیلی فون آیا' فلاں مقام پر فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ بس اب مولانا کو قرار کہاں؟ بستر تو

بندھا ہوا رہتا ہی ہے، ٹکٹ کی پارلیمنٹ کی ممبری کی وجہ سے ضرورت ہی نہیں۔ اب مولانا ہیں اور فساد کا شعلہ عزار۔

گزشتہ سال اسی زمانے میں علی گڑھی کے بعد میرٹھ فساد کی بھٹی بنا ۱۶؍ اکتوبر کی صبح صبح قیامت بن کر نمودار ہوئی۔ شام ہوتے ہوتے کرفیو لگا دیا گیا اور سارا شہر، شہر خموشاں بن گیا۔ کرفیو کی مہیب خاموشی میں جو ''مرد مجاہد'' شہر کی خطرناک گلیوں کا چکر لگا رہا تھا۔ وہ یہی ''حفظ الرحمٰن'' تھا وہ واقعی ''حفظ الرحمٰن'' تھا جو مظلوموں کی دادرسی کر رہا تھا، اور مجروحوں کو تسلی و تشفی دے رہا تھا، حکام سے لڑ رہا تھا اور وزراء پر بگڑ رہا تھا۔

ان حالات میں کوئی بے وقوف ہی مولانا سے کہہ سکتا تھا کہ آپ اپنے قدم کی بجائے قلم کو گردش دیجئے۔ ہندوستان کے طول و عرض کو ناپنے کی بجائے ندوۃ المصنفین کے دفتر میں آ بیٹھیے۔ تاہم یہ بے وقوفی اس خاکسار نے کئی مرتبہ کی۔ مگر ہر مرتبہ مولانا نے آہ سرد بھر کر یہی جواب دیا۔

''قاضی صاحب! جی تو میرا بھی چاہتا ہے کہ کچھ وقت نکال کر ''ندوۃ المصنفین'' میں بیٹھا کروں اور لکھنے پڑھنے کے کام کا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑوں، مگر کیا کروں مجبور ہوں بات اپنے بس کی نہیں۔''

بے شک جس کے بس کی بات تھی اس کو مولانا سے وہ کام لینا تھا جو قسمت والوں ہی سے لیا جاتا ہے اور جس کا موقع تاریخ عالم میں صدیوں کے بعد ہی آتا ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

تغمده الله برضوانه ورحمته واسكنه باعلى منازل جنته۔

بابِ پنجم

خطبات وتحریرات

(الف)

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

عمومی دعوت کے نقطہ نظر سے

سیرت سرکار دو عالم ﷺ پر حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے یہ تقریر ۲۹ر نومبر ۱۹۵۹ء کو نانپارہ ضلع بہرائچ میں ارشاد فرمائی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج کے حالات میں وہ اسوۂ رسول کریمؐ کے مختلف پہلوؤں کو کس طرح پیش فرمایا کرتے تھے۔

صدر محترم!

بزرگو اور دوستو! سیرت پاک کے اس مقدس اجتماع میں آپ نے مجھے دوبارہ موقع دیا ہے۔ دو سال پہلے بھی میں آپ کی خدمت میں آ چکا ہوں۔ شاید آپ کو یاد ہو۔ میں نے کہا تھا کہ سیرت پاک بیان کرنے کے دو طریقے ہیں عقلی اور ایمانی۔ ذکر پاک سے نور ایمانی کو رونق بخشنے کا مقصد ایک بابرکت مقصد ہے لیکن جب میں یہ خیال کرتا ہوں کہ آپ نے اس اجتماع کو مسجد میں نہیں بلکہ میدان میں کیا ہے جسے منڈی کی اس سڑک پر آپ دیکھ رہے ہیں' آپ نے ہر شخص کو دعوت عام دی ہو گی' اس میں مسلمان بھی ہوں گے اور غیر مسلم بھی! سوال یہ ہے کہ اگر میں صرف رسول پاک کی عقیدت کا ذکر کروں تو غیر مسلم کیا فائدہ حاصل کر سکیں گے۔ ضرورت ہے کہ حسن عقیدت کے ذریعے سے نہیں بلکہ عقلی حیثیت سے سیرت پاک کو پیش کردں۔ عقل کے ذریعے دنیا کو سمجھاؤں تاکہ تمام دنیا کے لیے یکساں فائدہ بخش ہو۔

رسول اکرمؐ نے جس کتاب الٰہی کو دنیا کے سامنے پیش کیا اس کے صفحہ اول کا پہلا جملہ الحمد للہ رب العالمین پکار کر آواز دیتا ہے کہ اے دنیا کے لوگو! سب تعریفیں اس خدا کے لیے ہیں جو تمام عالم کا رب ہے۔ وہ تنہا مسلمانوں یا کسی قوم کا رب نہیں بلکہ اس کی ربوبیت ہمہ گیر و غیر محدود ہے۔ اس کے دائرہ ربوبیت سے کوئی باہر نہیں ہے۔ اس کتاب الٰہی کا یہ بھی اعلان ہے کہ رسول پاکؐ کی ذات رحمت للعالمین ہے' اس کی رحمت کا دائرہ بھی تمام عالم انسانیت کو

محیط ہے۔

اس بنا پر مجھے کہنے کا موقع دیجئے کہ اس انداز سے رسول پاکؐ کی سیرت مبارک کو پیش کردں تاکہ غیر مسلم بھی رحمت عالم کی سچائی کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکیں۔

رسول کریمؐ نے دنیا کے اندر جو انقلاب پیدا کیا اسے نماز اور روزے ہی میں مخصوص کر کے نہیں چھوڑ دیا بلکہ حیات انسانی اور دنیاوی زندگی کے جتنے بھی شعبے ہیں سبھی میں انقلاب برپا کیا۔ معاشی اور اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جس میں غیر معمولی انقلاب پیدا نہ کیا ہو۔

رسول کریمؐ نے دنیا کے سامنے اعلان کیا ''لا الہ الا اللہ'' خدا کے سوا کوئی قابل پرستش نہیں۔ اس اعلان کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ساری دنیا خدا کو ایک ہی مانتی ہے۔ وہ چاہے جس نام سے پکارے، نام مختلف ہیں، ذات واحد ہے میرا تو دعویٰ ہے کہ خدا کو ماننے میں صرف مذہب والے ہی نہیں بلکہ منکر خدا بھی خدا کو مانتے ہیں۔ اس بنا پر کہ آپ دیکھیں جب کوئی کہتا ہے کہ ''خدا کوئی چیز نہیں ہے۔'' کہنے پر اس کے دل میں کھٹک ضرور پیدا ہوتی ہے۔

ایک دیوار کو دیکھ کر جب یہ کہتا ہے کہ دیوار اندھی ہے اور دوسرا برخلاف اس کے کہتا ہے کہ اندھی نہیں ہے۔ پہلا ایک حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا لیکن دوسرا جب ایک بے حقیقت بات پیش کرتا ہے تو اس کے دل میں کھٹک کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح جب کوئی کہتا ہے کہ میں کسی طاقت کو نہیں مانتا تو اس کے دل پر ضرور چوٹ لگتی ہے۔

اکبر الہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے:

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا میں تیری پہچان یہی ہے

رسول اکرم ﷺ نے جس کلمے کو پیش کر کے انقلاب عظیم رونما کیا وہ کلمہ صرف مسلمانوں کا کلمہ نہیں بلکہ دنیائے انسانیت کے لیے ایک پیغام حیات ہے سارے عالم کو توجہ دلائی کہ اس کلمہ کا تعلق صرف اس بات سے نہیں کہ اسلام یا ایک مذہب یہ کہتا ہے، بلکہ یہ بتقاضائے فطرت انسانی اس خدا کی طرف سے پیش ہونے والا کلمہ ہے، جس خدا کا قانون قدرت دنیا میں مکمل طور پر کارفرما ہے۔ سب اس کے قانون قدرت سے بندھے ہوتے ہیں، مادی اور روحانی دونوں زندگی میں اس کی کارفرمائی ہیں۔

دنیا دیکھ سکتی ہے کہ ہر ایک کی فطرت بلندی سے پستی کی طرف مائل ہے۔

ڈھیلا' مٹی' پتھر' اینٹ' جن کا تعلق مادیات سے ہے کسی بھی قوت کا سہارا لیے بغیر ایک لمحے کے لیے بھی بلندی حاصل کرنے سے قاصر ہیں۔ میں صرف ایک ٹھیکر کو اوپر اچھالتا ہوں لیکن وہ اوپر جا کر فوراً نیچے واپس آ جائے گی۔ درخت سے لگا ہوا ناریل شاخ سے جب ٹوٹتا ہے تو اسے نیچے ہی آنا پڑتا ہے' اوپر نہیں جاتا جس کے بارے میں ساتویں آٹھویں کلاس کا ایک بچہ تک یہی کہے گا کہ زمین کی کشش کے سبب ایسا ہوتا ہے لیکن اس جواب سے خدا کے ماننے والے کو اطمینان نہیں ہوتا۔ یہ امر جب کہ مسلمہ ہے جس کی تصدیق سائنس بھی کرتی ہے کہ لاکھوں سیارے بے شمار سورج اور چاند جو کہ خلا میں موجود ہیں ان میں کافی کشش ہے' پھر یہ چیزیں اوپر کیوں نہیں جاتیں۔ اس کا جواب سائنس کے پاس نہیں ہے بلکہ مذہب جواب دیتا ہے کہ اے انسان دل کی آنکھ سے دیکھ! بلندی صرف خدائے واحد کو حاصل ہے حیوانات' جمادات اور نباتات کی ہر شے کا مشاہدہ کر یہ درخت جس کے پتے پھول اور پھل بلندی پر نظر آتے ہیں' ان سب کی زندگی کا دارومدار صرف اسی جڑ پر ہے جو نیچے ہے ہر پرندے کی جھکی ہوئی خوبصورت چونچ ظاہر کرتی ہے کہ درحقیقت میری فطرت پستی کی طرف مائل ہے۔ اے انسان! تو اپنے نفس کو ٹٹول! دیکھ تیرے ہاتھ میں تو پستی کی طرف جھکے ہوئے ہیں کہ جن کے ذریعے تو اپنی قوت کا مظاہرہ کرتا ہے تو اپنے قلب کو بلندی سے پستی کی طرف لٹکتا ہوا پائے گا کہ جس کی حرکت پر تیری زندگی کا وجود ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو بلندی سے پستی کی طرف مائل نہ ہو۔ اس لیے کہ یہ ہر ایک کی فطرت ہے اور کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے میں اپنی فطرت کی خلاف ورزی کرنے کی صلاحیت ہو۔

قدرت نے جو انسان کو پیشانی کو بلند بنایا ہے' اس میں ایک مصلحت ہے۔ جب آپ انانیت کے جذبے میں آتے ہیں تو کہہ اٹھتے ہیں کہ شہنشاہوں کے سامنے بھی میری پیشانی نہیں جھکتی۔ قدرت کا اعلان ہے کہ ساری چیزیں تیری خدمت گزار ہیں وہ سب تیرے لیے ہیں' مگر تیری پیشانی صرف خدا کے لیے ہے۔ اسے جو بلندی دی گئی ہے' اس لیے نہیں کہ مخلوق کے سامنے جھکے وہ اگر جھکے گی تو صرف خدا کے سامنے ہی جھکے گی۔ لا الہ الا اللہ کا یہی وہ تصور ہے جو رسول اکرم ﷺ نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

ہر شخص مانتا ہے کہ چھوٹا ہی بڑے کے سامنے جھکتا ہے' بڑا چھوٹے کے سامنے نہیں جھکتا۔

لیکن انسان مخلوق میں سب سے بڑا ہونے کے باوجود درخت، پتھر، چاند، سورج اور نہ جانے کتنے باطل اور خود ساختہ معبودوں کے سامنے جھکتا ہے۔ اے انسان تو کس قدر گراوٹ پر اتر آیا ہے۔ قدرت کہتی ہے کہ ساری کائنات تیری مٹھی میں ہے تو سائنس کی مدد سے خلا میں چاند میں اور دوسرے سیاروں میں پہنچ سکتا ہے، بلکہ سورج پر بھی فتح حاصل کر سکتا ہے۔

میں نے تیرے ہاتھ میں مخلوق کو مسخر کر رکھا ہے لیکن تو میرے سامنے سجدہ ریز نہیں ہوتا؟

رسول اکرمؐ کی بعثت سے قبل عرب کے لوگ خدا کو مانتے تھے۔ لیکن ان کا کہنا تھا کہ جنگ کی دیوی، صلح کا دیوتا، بارش کی دیوی اور رزق کا دیوتا الگ الگ ہے، یہ سب مل کر ایک خدا کی قوت بنتے ہیں اور ساری چیزیں اس کے قدرت میں مسخر ہیں وہ ہمہ گیر قوت اور طاقت کا مالک ہے۔

بالآخر رسول اکرمؐ نے دنیا کے سامنے جو نقطہ نظر پیش کیا دنیا کو ماننا پڑا۔

روح اس بات کی خواہش مند ہوئی کہ میرے جسم کو تو غذا اور پھلوں سے طاقت دی جاتی ہے، لیکن میں بھی ہوں مجھے معرفت کی غذا چاہیے۔ اس نے آنکھ پھاڑ کر دیکھا کہ متمدن ممالک میں ہندوستان، ایران اور رومۃ الکبریٰ کا طوطی بول رہا ہے۔ ان میں دانش ہے، اپنی غذا کی تلاش انہیں میں چل کر کرنی چاہیے۔ اس روح نے ہندوستان پہنچ کر اپنی غذا طلب کی۔ ہندوستان نے کہا کہ مختلف دیوی دیوتاؤں کی پوجا کیے بغیر نہ تو ایک خدا کی عبادت کر سکتی ہے اور نہ اس کی معرفت کی غذا حاصل کر سکتی ہے، روح نے منہ پھیر لیا اور کہا کہ جب ایک غلام دو مالک کا بیک وقت فرمانبردار نہیں بن سکتا تو میں ان سیکڑوں کی وفادار کیسے بن سکتی ہوں۔ وہ رومۃ الکبریٰ گئی۔ پاپائے روم نے کہا کہ اے روح تو اپنے صحیح متقصد تک پہنچی ہے، لیکن یاد رکھ پہلے تجھے باپ بیٹا اور روح القدس ان تینوں پر ایمان لانا ہوگا پھر انہیں میں تجھے خدا اور اس کی معرفت کی غذا ملے گی۔ روح نے انکار کیا اور کہا کہ ایک تین نہیں ہو سکتا۔ وہ ایران گئی فیثا غورث کے شاگرد زرتشت نے کہا کہ اے روح یاد رکھ یہاں خدا کی دو طاقتیں ہیں نیکی کا خدا یزدان اور بدی کا خدا اہرمن ہے ان کے بغیر تجھے خدا کی معرفت کی غذا نہیں مل سکتی۔ روح کو یہاں سے بھی ناامید ہونا پڑا۔ اس نے سوچا کہ جب دنیا کے متمدن ممالک میں جہاں عقل و دانش کے چراغ جل رہے ہیں، وہاں ہم کو اپنی غذا نہیں مل سکتی اور کہاں ملے گی۔ ایک پہاڑ کی بلند چوٹی پر گئی اور طے کیا کہ گر کر مر جانا چاہیے۔ گرنا ہی چاہتی تھی کہ ایک کمبل پوش نے جھلتے

ہوئے ریت کے تودوں سے نکل کر ایک تپتی ہوئی پہاڑ کی چٹان سے پکار کر کہا اے روح خود کشی نہ کر آ تیری غذا میرے پاس ہے۔ میری بات سن! روح نے کہا: متمدن ممالک سے تو خدا کی معرفت کی غذا ملی نہیں یہاں کہاں ملے گی؟ کملی والے نے کہا۔ قل ھو اللہ احد اللہ الصمد لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد۔ ہندوستان کی دیوی دیوتاؤں کا محتاج میرا خدا نہیں ہے کیونکہ ھو اللہ احد اللہ وہ اکیلا ہے۔ رومۃ الکبریٰ کے باپ بیٹا اور روح القدس کی تثلیث توحید کے منافی ہے' اس لیے کہ "لم یلد ولم یولد" نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔ ایران کے زرتشت نے بھی یزدان اور اہرمن دو متضاد صفات کے حامل اور برابر کی طاقت رکھنے والی خداؤں کی تھیوری غلط پیش کی "ولم یکن لہ کفواً احد" میرے خدائے واحد کی طاقت کے برابر کوئی خدا نہیں ہے۔ وہ قادر مطلق ہے' یہ نہ دیکھ کہ کہاں کا رہنے والا کہہ رہا ہے۔ یہ دیکھ کہ کیا کہہ رہا ہے۔ روح نے اس کملی والے کی بات کو سنتے ہی اطمینان کا سانس لیا اور پکار اٹھی کہ بے شک میری غذا تیرے ہی پاس ہے۔

قدرت نے اس ریگستانی پہاڑی اور غیر متمدن ملک میں رسول اکرمؐ کو اس لیے بھیجا تا کہ دنیا یہ نہ کہہ سکے کہ عقل و دانش کے چراغوں سے علم کی روشنی حاصل کر کے ضابطہ حیات انسانی پیش کیا ہے۔ خدا کو بیچ میں ڈال کر اعلان نبوت جو کیا ہے' فرضی ہے۔ ساری دنیا متحیر ہے اور جانتی ہے کہ یہ وہی ہستی ہے جس نے کسی کے سامنے زانوے ادب تہ نہیں کیا' لیکن پھر بھی دنیا میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔

رسول اکرمؐ نے عرب کی جاہل اور اجڈ قوم میں جب یہ اعلان کیا تھا کہ "ساری مخلوق صرف ایک کی ہے تو قوم نے زبردست بغاوت کا مظاہرہ کیا سارا عرب دشمن بن گیا۔ بہ بقول کارلائل کے کہ "جب تک اعلان نبوت نہیں کیا تھا سب دوست تھے اور اعلان نبوت پر سب دشمن ہو گئے۔ رسول اکرمؐ نے طائف کے میدان میں تین باتیں پیش کی تھیں:

۱۔ ایک خدا کی پرستش

۲۔ بیواؤں اور یتیموں کی سرپرستی

۳۔ اور عفت و عصمت کی حفاظت

لیکن طائف والوں نے زخمی کیا شکاری کتے پیچھے لگا دیئے۔ گالیاں سنائیں پتھروں کی بارش کی۔ مگر زبان مبارک سے احد احد کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ مورخ کہتا ہے کہ پتھراؤ

کے سبب جب آپ بیٹھ گئے تو حضرت زیدؓ ابن حارثہ پروردہ آغوش رحمت و پروانہ شمع رسالت اس حالت کو دیکھ کر بے قرار ہو گئے اور کہا کہ آپ ان کو جہنم سے جنت میں لانا چاہتے ہیں اور وہ آپ پر ایسا ظلم ڈھاتے ہیں بددعا کیجئے کہ یہ سب برباد ہو جائیں۔ ایک پادری کا کہنا ہے کہ چہرہ بدل گیا اور فرمایا اے زید تو نے کیا کہا کہ یہ لوگ مارتے ہیں تو میں بددعا دوں مجھے تو اللہ نے رحمت عالم بنا کر بھیجا ہے ہاتھ اٹھاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ ''اے میرے پروردگار! میری قوم کو ہدایت دے یہ مجھے نہیں جانتے اور پہچانتے۔ اے میرے خدا! تو ان کو سمجھا اور ان کو ہلاکت میں نہ ڈال' ممکن ہے کہ ان میں یا ان کی اولاد میں کوئی سعید روح پیدا ہو جو تیرا کلام سنے اور قبول کرے میرے مولا! تیرے ہی پاک چہرہ میں پناہ لینا چاہتا ہوں اگر تو میرے ساتھ ہے تو مجھے کچھ خطرہ نہیں۔''

دنیا کہتی تھی کیا رسول کیا پیغمبر ہماری عقل کافی ہے ہم رات دن روشنی اور تاریکی کی پہچان خود کر سکتے ہیں تو نبی کی ضرورت نہیں۔

فطرت کی طرف سے جواب ملا کہ عقل و دانش مجبور کرے تب تو ماننا ہی ہوگا۔ آنکھ میں روشنی موجود ہے لیکن بلب گل کر دیئے جائیں تو آنکھ کی روشنی جواب دے دے گی۔ انتہائی تاریکی میں جب ایک ہاتھ کو دوسرا ہاتھ سجھائی نہیں دیتا اگر کوئی کہے کہ آنکھ تو موجود ہے کیوں سجھائی نہیں دیتا؟ اس کا جواب یہی تو ہوگا کہ قانون قدرت کا یہی اصول ہے کہ روشنی ہی سے آنکھ کو روشنی حاصل ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مادی زندگی کے لیے جب یہ اصول ہے تو کیا روحانی زندگی کے لیے باہر کی روشنی کی ضرورت نہیں؟ ماننا ہوگا کہ نبی کی روشنی کے بغیر یہ زندگی نہیں بن سکتی اور نہ ہی خدا کی سچی معرفت حاصل ہو سکتی ہے۔

انسان کا عجیب عالم ہے گراوٹ پر آ جائے تو دنیا کی ہر چیز کو سجدہ کرنے لگے اور انانیت پر آ جائے تو ''انا ربکم الاعلی'' کا دعویٰ کرنے لگے لیکن رسول پاک نے جو دعوت پیش کی اور جو انقلاب رونما کیا وہ انقلاب انسان کو اس کے صحیح مقام پر پہنچاتا تھا۔ تعلیم دی کہ اے انسان نہ اتنا گھٹ کر کہ ہر چیز کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے اور نہ اتنا بڑھ کر خدا بن جائے۔ اے انسان تو ساری دنیا کا سردار اور تیرا سردار ساری دنیا کا خالق ہے۔ محمدؐ خدا کے پیغمبر اور بندے ہیں۔ یاد رکھ یہ نہ کہنا کہ رسول کی ضرورت نہیں ہے یہ بھی نہ کہنا کہ رسول خدا کا بیٹا ہے۔

نبی اور رسول کے لیے معصوم ہونا ضروری ہے اس لیے کہ جب دو متضاد چیزیں ہوتی ہیں

تو ان میں درمیانی ربط پیدا کرنے والی تیسری چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہڈی اور گوشت دو متضاد چیزیں ہیں ان کے تعلق کو پٹھے اور رگوں کے بغیر قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح روحانی قانون قدرت بھی یہ ہے کہ ایک طرف خدا کی ذات ہے اور دوسری طرف انسان درمیانی رشتہ کو قائم کرنے کے لیے کسی واسطے کی ضرورت ہے۔ اس کی سبیل یہ ہے کہ ایک انسان تمہاری طرح کا جو کہ تمہارے ساتھ کھاتا پیتا اور چلتا پھرتا ہو جس سے کہ تم مانوس ہو لیکن معصوم ہونے کی حیثیت سے امتیازی شان بھی رکھتا ہو وہی اس ربط کو قائم رکھ سکتا ہے چنانچہ رسول اکرم ﷺ کی معصوم ہستی خدا اور انسان کے درمیان رشتہ قائم کرنے والی ایک مضبوط کڑی ہے جسے ہم رسول، نبی یا پیغمبر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ دنیا قانون قدرت کی اس بات کو تسلیم کیے بغیر خدا سے کوئی رشتہ قائم نہیں کر سکتی۔

دنیا کی کوئی چیز تین حالتوں سے خالی نہیں ہے۔

۱۔ آغاز

۲۔ بتدریج ترقی کرنا

۳۔ درجہ کمال،

بچہ پیدا ہوتا ہے یہ اس کا آغاز ہے، پرورش پاتا ہے اور بڑھتا رہتا ہے یہ اس کے بتدریج ترقی کرنے کی حالت ہے۔ بچپنے میں اس کے لباس چھوٹے بنتے ہیں۔ اس کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ لباس بھی بتدریج بڑے بنتے رہتے ہیں۔ جب جوانی پر پہنچتا ہے تو باپ کہتا ہے کہ اب تو صاحبزادے کے جسم پر میرے کپڑے بالکل ٹھیک ہوتے ہیں۔ درجہ کمال تک پہونچنے کے بعد اس کا بڑھنا رک جاتا ہے ایسا نہیں ہوتا کہ بڑھتا ہی رہے اس لیے کہ یہی قانون قدرت ہے۔ تاریکی کو دور کرنے کے لیے چراغ وجود میں آیا پھر شمع کافوری اور موم بتیاں ایجاد ہوئیں۔ گیس آئی آخر میں بجلی نے آ کر اپنی روشنی کا ایسا سکہ جمایا کہ کوئی نہ ٹھہر سکا ستارے چمکتے ہیں۔ ہلال چاند کی پہلی رات کو نمودار ہو کر بتدریج ترقی کرتے کرتے چودھویں کی شب میں بدر کامل بن کر تمام عالم کو روشن کر دیتا ہے مگر دنیا کہتی ہے کہ ابھی رات ہے ان میں سے کسی نے رات کو ختم کر دینے والا انقلاب پیدا نہیں کیا۔ لیکن سورج کے نکلتے ہی دنیا بول اٹھتی ہے، انقلاب ہو گیا، دن نکل آیا ہے۔ یہ تو مادی دنیا کا 'انقلاب ہے' لیکن یاد رہے کہ روحانیت میں بھی یہی قانون

قدرت کارفرما ہے۔ انسانوں کی رہنمائی کے لیے آدم کا دیا جگمگایا نوح کی شمع کافوری روشن ہوئی۔ ابراہیمؑ، موسیٰؑ بتدریج ترقی کرتے کرتے بدر کامل بن کر چمکے۔ لیکن انسان کہتا رہا ابھی تو رات ہے یہ کب ختم ہوگی۔ روحانیت کا آفتاب کب نمودار ہوگا۔ قدرت آواز دیتی ہے دیکھ ذات محمدیؐ عالم وجود میں آ گئی' آفتاب رسالت نکل آیا' انقلاب رونما ہو گیا' اب نہ کہنا کہ رات ہے' اس آفتاب رسالت کے بعد اب کوئی ماہتاب یا آفتاب نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ یہی قانون قدرت ہے۔ لیکن یاد رکھ کہ آفتاب عالم تاب کی تمازت سے بچنے کے لیے مئی جون کے مہینوں میں گھر میں چھپ کر بیٹھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

لیکن آفتاب رسالت کو ہم نے سراج منیر بنایا ہے یہ آفتاب نور ہے۔ آفتاب نار نہیں! اس میں کوئی ایسی تمازت نہ ہوگی کہ جس سے تجھے بچنے کی ضرورت ہو۔ اس سے جتنا بھی کسب نور کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔

رسول اکرمؐ جب دنیا میں تشریف لائے۔ تین قسم کی غلامی کارفرما تھی۔

۱۔ خرید و فروخت کی

۲۔ ذات و نسل کی

۳۔ اور اقتصادی زندگی کی۔

آپؐ نے ہندوستان' رومۃ الکبریٰ اور ایران کو دیکھا اعلان کیا کوئی غلام نہیں ہے۔ آقا سوائے خدا کے کوئی نہیں ہے۔ غلاموں کو برابری کے درجہ پر لانے کے لیے ہدایت کی کہ جو تم کھاؤ ان کو کھلاؤ۔ جو تم پیو وہ انہیں بھی پلاؤ۔ جو تم پہنو وہ انہیں بھی پہناؤ۔ غلامی کو ختم کرنے کے لیے یہ طریقہ ایجاد کیا کہ جب کوئی گناہ سرزد ہو تو غلام آزاد کرو۔

دوسرے قسم کی غلامی ذات و نسل کے لحاظ سے تھی' جسے اونچ اور نیچ کے نام سے ہم اور آپ ہندوستان میں دیکھ رہے ہیں۔ پیشہ ور نسلی طور پر ذلیل سمجھے جاتے' وہ چاہے جیسا نیک کام کریں' مگر اونچے خاندان میں جو پیدا ہوا ہے' حالانکہ بدکاری بھی کرتا ہے لیکن اونچا ہے۔ مگر رسول اکرمؐ نے کہا کوئی اونچ نیچ نسلی اعتبار سے نہیں ہے۔ برادریاں صرف جان پہچان کے لیے ہیں یہ امتیاز گھمنڈ کا اظہار کرنے کے لیے نہیں ہے۔ اللہ کے نزدیک وہی بندہ اونچا ہے جو پاک باز ہے' وہ چاہے جس نسل اور خاندان سے ہو۔ چودہ سو برس گزر گئے' آج ہم دیکھتے ہیں

کہ ہمارے ریفارمر اس اونچ نیچ کو ختم کرنے کے لیے قانون بناتے ہیں۔

گویا اتنے عرصہ کے بعد آج دنیا کو ماننا پڑ رہا ہے کہ رسول اکرمؐ نے اونچ نیچ کے بارے میں جو بات پیش کی تھی' وہ صحیح تھی۔ یورپ میں چرچ کے اندر انجیل کی تعلیم اگر کوئی کالا حاصل کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن مسلمان ہو کر اگر کوئی بھی مسجد کی اگلی صف میں آ کر بیٹھ جاتا ہے تو کسی سید کی بھی یہ مجال نہیں کہ اسے وہاں سے اٹھا سکے۔ آج اس امتیاز کو دور کرنے کے لیے پارلیمنٹ میں کوئی قانون بنتا ہے تو میں کہوں گا کہ ماننا ہوگا۔ رسول اکرمؐ کو جنہوں نے پہلے ہی فرما دیا تھا کہ ''اے لوگوں گواہ رہو کہ ساری دنیا کے انسان بھائی بھائی ہیں۔'' یہ درس ہمارے رسول نے دیا۔ دنیا میں انقلاب پیدا کیا اور غلامی کی نسل سے چھٹکارا دیا۔ ہر میدان میں ہر دولت مند کو غریب آدمی کے مار ڈالنے کا حق تھا۔ رسول اکرمؐ نے قیصر روم ہرکلیوس (ہرقل اعظم) کو خط لکھا کہ سلام ہے اس شخص پر جو ہدایت قبول کرلے۔ اے بادشاہ اسلام قبول کرلے تو محفوظ رہے گا اور اللہ تعالیٰ تجھ کو دگنا اجر دے گا ورنہ تیری رعایا کا گناہ بھی تیرے ذمے پڑے گا۔ اسی طرح ملک شام میں منذر بن حارث غانی' ایران کے بادشاہ خسرو پرویز' مصر کے والی مقوقس' حبش کے نجاشی اور فرماں روائے بحرین منذر بن سادی' الغرض بیشمار ممالک کے بادشاہوں تک اپنے خطوط بھیجے اور جہاں تک پیغام رسانی کا تعلق تھا اپنا فرض یوں انجام دیا تاکہ دنیا پیغام الٰہی سے آگاہ ہو کر اونچ نیچ اور طبقاتی جنگ کو ختم کر دے۔

عورتوں کی جو حالت تھی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ''کارلائل'' کا کہنا ہے کہ بعثت کے قریب پادریوں میں بحث تھی کہ عورت انسان ہے کہ نہیں؟ کئی دن کی بحث کے بعد انسان تو مانا لیکن یہ فیصلہ کیا کہ یہ مردوں کا کھلونا ہے۔ ایران میں زردشت کی تعلیم ختم ہو چکی تھی جب آپ کی بعثت ہوئی تو وہاں عورت نہ کسی کی ماں تھی نہ کسی کی بیٹی۔ صرف عورت مانی جاتی تھی گویا کوئی امتیاز نہیں تھا' عورت کی عرب میں کوئی عزت نہ تھی۔ لڑکی پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دی جاتی تھی۔ ہندوستان میں عورتوں کو اپنے مردہ شوہر کے ساتھ خواہ دو دن کی بیاہی کیوں نہ ہوتی ہو جانا پڑتا تھا۔ عورت کی جگہ جگہ ذلت تھی لیکن رسول اکرمؐ نے وراثت میں سب کو شریک کیا' مرد کا دوہرا اور عورت کا اکہرا حصہ اس لیے رکھا کہ باپ لڑکے کو پڑھاتا لکھاتا ہے تاکہ وہ خوشگوار زندگی گزار سکے اور میری خدمت بھی کر سکے کوئی باپ بیٹے کو مصیبت میں مبتلا ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ بیٹا باپ کی قوت بازو ہوتا ہے۔

لڑکا اپنی' اپنے والدین اور اپنے بیوی بچوں کی کفالت کرتا ہے اس لیے اس کا دوہرا حصہ رکھا اور لڑکی صرف اپنی ہی کفیل ہے اور شادی کر کے دوسرے کی کفالت میں جا سکتی ہے اس لیے از روئے انصاف اس کا اکہرا حصہ رکھا عورت اور مرد میں منصفانہ حقوق قائم کرنے کے ساتھ رسول اکرمؐ نے ہدایت فرمائی کہ عورت گھر کی زینت ہے' وہ ضرورت پر پردہ حیا کے ساتھ باہر بھی نکل سکتی ہے لیکن کلب کی رونق نہیں بن سکتی۔ اسی کا نام اعتدال کی راہ اور صراط مستقیم ہے۔ پہلے بیوہ کو نکاح کی اجازت نہ تھی۔ مرد کو دس گیارہ شادیاں کرنے کا حق ہوتا تھا۔ رسول پاک نے فرمایا فطرت انسانی کے بالکل خلاف ہے کہ مرد تو عورت کے مرنے پر شادی کرے اور عورت مرد کے مرنے پر نہ کر سکے۔ ہر مرتبہ بیوہ ہو جانے پر عورت کو نکاح کرنے کا حق ہے اور مرد بہ یک وقت اگر انصاف قائم نہیں رکھ سکتا ہے تو چار کا حق رکھتے ہوئے بھی ایک سے زائد شادی نہیں کر سکتا۔ طلاق کے مسئلے میں رسول اکرمؐ نے فرمایا۔ اگر آپس میں جھگڑا ہو جائے تو درگزر سے کام لو' طے نہ ہونے پر عزیز داروں کے فیصلہ کو تسلیم کرو۔ اگر پھر بھی مسئلہ حل ہوتے نظر نہ آئے تو طلاق دے دو مگر جو کچھ دے چکے ہو واپس نہ لو۔ بشرطیکہ وہ خوشی سے واپس نہ کر دے۔

دنیا نے طلاق کا مذاق اڑایا۔ لیکن سترہویں صدی میں یورپ نے وراثت اور اٹھارویں صدی میں طلاق کو قانونی حیثیت دے کر رسول اکرمؐ کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ آج بیسوی صدی میں ہندوستان بھی ہندو کوڈ بل پیش کر کے وراثت اور طلاق کو تسلیم کر چکا ہے۔ رسول اکرمؐ کے چودہ سو برس پہلے کا دیا ہوا درس آج دنیا کو دہرانا پڑ رہا ہے۔ درحقیقت رسول اکرمؐ نے منصفانہ انقلاب پیدا کیا۔ دنیا رفتہ رفتہ آپ ہی کے بتائے ہوئے راستہ پر آ رہی ہے۔

چاروں طرف بڑی بڑی حکومتیں ہیں' سرمایہ دار اور غریب دو طبقہ میں تقسیم ہے' سرمایہ دار عیش کر رہا ہے اور غریب نان شبینہ کو محتاج ہے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا اے سرمایہ دار' تجھے اپنی رقم کا چالیسواں اور کاشت کا دسواں حصہ غریب کو بلا کسی جھجک کے دینا پڑے گا اگر کوئی غریب نہیں ملتا ہے خلیفہ کے پاس جمع کر دینا ہو گا تا کہ غریب بھی جیتا رہے اور وراثت کے ذریعہ دولت قائم نہ رہ کر تقسیم ہوتی رہے۔۔ رسول اکرمؐ نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ پریشان حال کو قرض اگر دو تو احسان کر کے نہ دو' اس کی بیکسی سے فائدہ نہ اٹھاؤ۔ جو سود کھاتا ہے وہ خدا کو چیلنج کرتا ہے۔ جوے کو بھی حرام قرار دیا۔ جس کے نتائج سے دنیا واقف ہے۔

رسول اکرمؐ کو اپنا محبوب شہر مکہ چھوڑ کر مدینہ ہجرت کر جانا پڑا وہاں پہنچ کر تین قسم کے مخالفین کا مقابلہ کرنا پڑا۔

۱۔ یہود

۲۔ قریش

۳۔ مشترکہ فتنہ و فساد ظلم و بے انصافی

بدامنی اور بدی کو مٹانے کے لیے متعدد جنگیں لڑنی پڑیں ایک بار ایسی شرطوں پر بھی معاہدہ صلح کر لیا جو کھلے طور پر کمزوری کے مترادف تھیں مگر آپ کے ہم وطن ان شرطوں پر بھی قائم نہ رہے اور صلح کے برخلاف رسول اکرمؐ کی پناہ میں آئے ہوئے لوگوں کو قتل کر دیا گیا۔ خدا کے پیغمبر کو ان کے خلاف اقدام کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ دس ہزار کی فوج کے ساتھ مکہ پر چڑھائی ہوتی ہے ابوسفیان نے صلح کرنی چاہی' آپ نے فرمایا: ''اگر ایک ایک مسلمان کو قتل کر دیتے پھر بھی شاید انتقام نہ لیتا لیکن محمدؐ نے جن کو پناہ دی ان کو قتل کر دیا اسے برداشت نہیں کر سکتے۔''

حضرت سعد بن عبادہ انصار کی فوج کے علمبردار تھے۔ ابوسفیان کو دیکھ کر کہا کہ ''آج گھمسان کا دن ہے' حق و باطل کا فیصلہ ہوگا' آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا ابوسفیان نے رسول اکرمؐ کو توجہ دلائی تو جھنڈا لے کر ان کے بیٹے کو دے دیا اور کہا جاؤ ابن عبادہ جاؤ! کہو آج جنگ کا دن نہیں ہے' آج رحمت عام کا دن ہے' آج کعبہ میں جنگ نہ ہوگی' آج کعبہ کو غلاف چڑھایا جائے گا' آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے۔

رسول اکرمؐ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے' قلب مبارک اپنے خدا کے فضل و احسان کے بار سے جھک گیا یہاں تک کہ سراقدس اونٹ کے کجاوے سے جا لگا' اہل مکہ گرفتار ہو کر سامنے پیش ہوتے ہیں' پوچھا تمہارے ساتھ کیا معاملہ لیا جائے؟ جواب دیا کہ ہم بہادر ہیں! آپ کے ساتھی اگر ہماری گرفت میں آتے تو ہم سب کو قتل کر ڈالتے اور یہی آپ کو بھی حق ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا میں تمہیں قتل کروں؟ خدا نے تو اتنی بھی اجازت نہیں دی کہ تمہیں ملامت کروں۔

''آج تم پر کوئی الزام نہیں جاؤ تم ہر جرم و خطا سے بری ہو آج تم پر کوئی گرفت نہیں!''

مشکیں کھول دی گئیں اور سب آزاد کر دیئے گئے۔ یہ تھی رحمت عالم کی شفقت لا انتہا!

مورخ کہتا ہے کہ تین دن کے بعد اہل مکہ داخل ہوئے اور کہا کہ ہاتھ بڑھایئے تاکہ ہم اسلام لے آئیں۔ ارشاد ہوا کہ تین دن کے بعد کیوں آئے جواب دیا کہ مشکیں کھولنے کے

فوراً بعد ہی اسلام لے آتے تو دنیا کہتی مرعوب ہو کر ایسا کیا اور ہمیں یہ بھی دیکھنا تھا کہ دنیا کے دکھانے کے لیے تو درگز نہیں کیا گیا ہے۔ مبادا دھوکا ہی دیا گیا ہو۔ بعد میں پکڑ کر قتل کر دیا جائے۔ لیکن آج ہم مطمئن ہو کر آئے ہیں اور خوشی کے ساتھ اسلام قبول کر رہے ہیں۔

حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ نے بادشاہی کی اور حضرت موسیٰؑ نے فرعونی طاقت کے سامنے استقلال اور مردانگی کا مظاہرہ کیا اور حضرت عیسیٰؑ نے کہا (کہ ایک گال پر اگر کوئی تمہارے طمانچہ مارے تو دوسرا بھی پیش کر دو) رسول اکرمؐ نے دونوں چیزیں پیش کیں کہ بدلہ برابر کا لو۔ اگر معاف کر دو تو اللہ کے نزدیک سب سے محبوب کام ہے' لیکن زیادتی کسی حالت میں نہ کی جائے۔

آپ نے فرمایا کہ رہبانیت اور جوگی بننے کی اسلام میں ضرورت نہیں ہے۔ پہاڑ کی کھوہ میں عبادت کرنے والے سے وہ بہتر ہے جو بچوں میں رہ کر دنیاداری کے ساتھ خدا کو نہ بھولے۔ انسان کی تخلیق فطرت الٰہی پر ہوتی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا۔ اسلام نے جماعتی زندگی بخشی ہے۔ جماعت کے ساتھ نماز' ایک ہی مہینہ میں روزوں کی اجتماعی طور پر تکمیل' ایک ہی مہینہ میں فریضہ زکوٰۃ کی ادائیگی اور اسے اجتماعی طور پر بیت المال میں جمع کرنا' ایک ہی وقت میں اجتماعی طور پر حج کی ادائیگی۔ یہ سب اسلام کی بخشی ہوئی اجتماعی زندگی کے مظاہرے ہیں۔ میدان عرفات میں دنیا کے گوشے گوشے کے ہزاروں زبانیں بولنے والے آتے ہیں' لیکن وہاں ایک ہی زبان میں نماز پڑھتے ہیں۔ جس سے عالمگیر اجتماعیت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

اگر ہم جماعتی زندگی بنا لیں تو عزت ورنہ رسوائی۔ اللہ کی رسی ایک ساتھ مل کر پکڑنے سے یہی مراد ہے کہ جماعتی زندگی بناؤ!

کاش ہم سب رسول پاکؐ کی سیرۃ سے سبق لیں اور خدائے پاک ہم کو اور آپ کو اس کی توفیق مرحمت فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

یوم میلاد سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

آل انڈیا ریڈیو سے ایک تقریر:

انسان ہمیشہ اپنے بڑوں اور بزرگوں کی یادگار مناتا ہے۔ اپنی تاریخ کے اونچے سے اونچے رہنماؤں اور لیڈروں کی، بادشاہوں اور شہنشاہوں کی، بہادروں اور جرنیلوں کی، باکمال ہنرمندوں اور اپنے وقت کے ہیرو کہلانے والوں کی یاد مناتا ہے۔ ان کے نام پر دن منائے جاتے ہیں، مجلسیں اور محفلیں منعقد ہوتی ہیں، جلسے جلوس، تذکرے اور تقاریر کی رسوم ادا کی جاتی ہیں اور مرنے والوں کے اوصاف و کمالات کو یاد کر کے داد دی جاتی اور ان کے بقائے دوام کی سبیل پیدا کی جاتی ہے۔

آج کا دن بھی ایک تاریخی جشن مسرت اور دنیائے انسانی کی ایک عظیم الشان یادگار ہے لیکن ایسی ایسی یادگار جو اپنی آن اور شان میں دوسری یادگاروں سے نرالی اور انوکھی ہے۔

آج ہم اس برگزیدہ ہستی یعنی رسول خدا سرور کائنات محمد مصطفیٰ ﷺ کی یادگار منا رہے ہیں۔ جن کی اقدس و ارفع شخصیت، جن کی تعلیم و دعوت، قیادت و سیادت اور کمال انسانیت تاریخ عالم کی وہ زندہ جاوید یادگار ہے، جو اپنے کسی تذکرے یا یادگار کے منائے جانے کی محتاج نہیں ہے۔ اگرچہ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان کی یاد اور ان کا تذکرہ ہمارے لیے سرمایۂ سعادت اور آیۂ رحمت ہے۔

ابتدائے آفرینش سے آج تک دنیا میں بے شمار نامور انسان، ہزاروں ریفارمر اور مصلحین گزرے ہیں، لیکن ایک ریفارمر اور ایک سچے نبی و رسول کے درمیان جو سب سے بڑا امتیاز ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ کسی مصلح، ریفارمر، لیڈر یا رہنما کے بہترین کیریکٹر کے لیے یہ وصف کافی سمجھا جاتا ہے کہ جس شعبۂ حیات میں وہ رہنمائی کر رہا ہے، اس میں اس کی اخلاقی برتری اور کردار و گفتار کی صفائی قابل تقلید ہو، باقی دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں کتنی ہی خامی، کمی اور کوتاہی کیوں نہ ہو، اس پر انگشت نمائی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن نبوت و رسالت کا منصب اس سے

بالکل جدا اور بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ بالخصوص وہ مقدس ہستی جس کی رسالت و نبوت اپنی جلالت شان اور رفعت قدر کے لحاظ سے تمام انبیاء و رسل کے لیے بھی اسوہ اور معیار قرار پائی اس کے لیے ازبس ضروری تھا کہ اس کی خلوت و جلوت اور زندگی کا ہر شعبہ اس درجے صاف' روشن اور کامل و مکمل ہو کہ نقص و عیب یا خامی و کمزوری کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو سکے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سن و سال کے اعتبار سے اگرچہ پونے چودہ سو سال کی طویل مدت گزر چکی ہے لیکن رسول اکرم' سرور عالم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی حیات مقدس کا ایک ایک لمحہ اور ان کی زندگی کا ایک ایک ورق آج بھی ہمارے سامنے اسی طرح روشن ہے' جیسے آج ہی کی بات ہے۔ ان کی خلوت اور ان کی جلوت' خانگی اور نجی زندگی بھی اور بیرونی زندگی بھی۔ ان کے معاملات و اشغال بھی اور ان کا رہن سہن بھی' ان کا لین دین اور وضع قطع بھی اور ان کا قول و عمل یا اخلاق و کردار بھی' غرض زندگی کا ہر شعبہ دنیا کی رہنمائی کے لیے آج بھی آفتاب عالم تاب کی طرح چمک رہا ہے۔

ولادت باسعادت سے لے کر زندگی کے آخری لمحات تک آپ کی سیرت پاک **لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ** کا مرقع اور رشد و ہدایت کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔

آپ کے بچپن کی تاریخ دیکھئے تو دنیا کے عام بچوں کی طرح کھیل کود' سیر و تماشہ' لغویات اور بیہودگیوں اور طفلانہ حرکات و مشاغل کی جگہ سنجیدگی و متانت' کرامت نفس و شرافت' طہارت و لطافت اور برمحل افکار و اشغال کا ایک حیرت انگیز اور قابل تقلید نمونہ آپ کو ملے گا

آگے بڑھیے اور نبی کریم کے عہد شباب کا مطالعہ کیجئے۔ ایک انسان کی زندگی میں جوانی کا دور سب سے نازک دور ہوتا ہے لیکن جب آپ محمد عربی فداہ روحی ابی و امی کی سیرت کے اس دور کے ابواب پڑھیں گے تو حیرت ہوگی یہ دیکھ کر کہ وہاں بھی عام انسانی سطح سے بہت بلند' اور غلط جذبات و رجحانات سے بالکل الگ' حلم و بردباری' پیرانہ فراست و دانش مندی' ریاضت و تزکیۂ نفس اور مخلوق خدا کی خدمت کا ایک قیمتی سلسلہ ہے جو شب و روز کا عام مشغلہ اور صبح سے شام تک کا کاروبار ہے۔

اور سب سے آخر میں نبی کریمؐ کے عہد پیری کا مطالعہ کریں گے تو دیکھیں گے کہ سیرت پاک کے آخری تیئیس سال اس عظیم الشان انقلاب کی تاریخ ہیں' جو آپ کی حیات مقدسہ کا

مقصد و منتہا ہے۔

خاتم الانبیاء سرکار دو عالم رسول اکرم محمد مصطفیٰ ﷺ کی ولادت باسعادت ایک ایسی سرزمین، ایک ایسے گھرانے اور ایک ایسی قوم میں ہوئی جہاں تعلیم، تہذیب، تمدن غرض ارتقاۓ انسانی کے ذرائع مفقود و ناپید تھے۔ آپ کی ذات مبارک اس عالم میں وجود میں آئی کہ باپ کا دست شفقت شروع سے دیکھا ہی نہیں اور چند سال بعد ہی ماں کے آغوش محبت سے محروم ہو گئے۔ لیکن تاریخ ماضی کے اوراق شاہد ہیں کہ دنیوی اسباب و ذرائع سے یکسر محرومی کے باوجود آپ نے ایک بن کھیتی کی سرزمین میں رہ کر، نہ صرف ایک غیر مہذب اور غیر متمدن قوم کو انسانیت عظمیٰ کے بلند درجہ پر پہنچایا اور گلہ بانوں اور ساربانوں کو جہاں بانی اور انسانی قیادت وسیادت کے جوہر بخشے۔ بلکہ ٹھیک ایسے وقت میں جب کہ کفر و شرک، ظلم وعدوان، زیردستوں کی مظلومیت اور زبردستوں کا تشدد اور زندگی کی ہر شاخ میں افراط و تفریط کی تاریکیاں دنیا پر چھائی ہوئی تھیں، آپ نے عدل و انصاف، توحید الٰہی، خدمت خلق اور ہمدردی عالم کی روشنی دنیا کو دکھلائی۔ اور کائنات مذاہب و ملل میں ایک ایسا پاک اور عظیم الشان انقلاب پیدا کیا جس نے مذہب، سیاست، معیشت، معاشرت غرض دنیا کی چلتی پھرتی اور متحرک زندگی میں جہالت و تاریکی کو فنا کر کے روشن و تاباں آفتاب حقیقت کی طرف رہنمائی کی۔

آپ نے مذہب کی بنیاد خدا پرستی اور عقل و شعور کی افادیت پر رکھی انسانوں کو انسان کی غلامی سے نکال کر خدا کی دی ہوئی صداقت ''کلام الٰہی'' کی روشنی میں آزادی بخشی۔ آپ نے ظلم و تعدی کو عدل و انصاف سے، تحکم و استبداد کو جمہوریت و شورائیت سے، انسانوں کی باہمی کشمکش اور طبقاتی جنگ کو تعاون و مساوات اور اخوت و ہمدردی سے کفر و جہالت کو خدا پرستی و توحید الٰہی سے بدل کر دنیا کا نقشہ ہی کچھ سے کچھ بنا دیا۔

آپ نے ایک طرف اس دور کے پھیلے ہوئے فسق و فجور، ظلم و جور اور جوع الارض کی شخصی حکومتوں کے تختے الٹ کر انسانوں کو عدل و مساوات کی قدر و عظمت بخشی، اور دوسری طرف سادگی اور غربت و مسکنت کو اپنا طغراۓ امتیاز بنایا۔ چنانچہ آپ کی پوری زندگی میں آپ کا لباس پیوند لگے ہوئے کپڑے، آپ کا بستر پرانی کھال کا ایک نمدہ اور خدا کا بچھایا ہوا فرش زمین، آپ کا مکان و محل کھجور کی ٹٹیوں کا ایک چھوٹا سا حجرہ اور آپ کی غذا جو کی روٹی، کچھ کھجوریں اور پانی کا ایک پیالہ رہی۔ اسی سادگی اور مسکنت کے عالم میں آپ نے خدا کے

بھروسے اور اپنے دست بازو کے بل پر جائز و حلال روزی بھی کمائی' بکریاں بھی چرائیں اور شام کے بازاروں میں تجارت بھی کی اور دوسری طرف قوم وقبائل کے نزاعات کے وہ فیصلے بھی کیے جو عدل وانصاف کے نادر نمونے کہے جا سکتے ہیں۔ آپ کی دیانت وصداقت کا یہ عالم تھا کہ قوم نے امیں اور صادق کے لقب سے یاد کیا اور آپ کے دشمنوں نے بھی اپنی امانتوں کو محفوظ رکھنے کے لیے آپ ہی کی دیانت اور آپ کی ذات مقدس پر اطمینان کیا۔

آپ ہی کی ذات ستودہ صفات ہے جو انسانی عفت و پاکدامنی' اعتدال ومیانہ روی اخلاق وکردار کی صفائی اور محاسن انسانی کا مکمل ترین نمونہ اور انسانیت کے عروج وکمال کی سب سے اعلیٰ مثال ہے۔ خود لسان نبوت کا ارشاد ہے "بعثت لاتمم مکارم اخلاق" میں دنیا میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق کے حسن ومکارم کی تکمیل کر دوں اور مکارم اخلاق کی ایک زندہ جاوید یادگار دنیا کے سامنے چھوڑ جاؤں۔ چنانچہ آپ کا لایا ہوا وہ پیغام جو انسان کو حقیقت اور سچائی کی راہ دکھاتا ہے اسی اعلیٰ مشن کی تعبیر اور آپ کی سیرت پاک اور اس کی عملی تفسیر ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ نبی کریمؐ کی تعلیمات رشد وہدایت کے وہ سرچشمے ہیں جو ہمیں انسانیت اخوت ومحبت' حق گوئی وحق پرستی' ظلم سے درگزر اور مخلوق خدا کے ساتھ حسن سلوک' مواسات و بھائی چارہ اور ہمدردی وغم خواری' زبردست و بے نوا کی مدد اور تعدی دوست درازی کے انسداد کے وہ اعلیٰ اصول بتلاتی ہیں جو دنیا میں ہمیشہ انسانی سوسائٹی کی فلاح وبہبود کے لیے لازمی اور بنیادی اصول ہیں۔ ساڑھے تیرہ یا پونے چودہ سو سال گزر چکے ہیں کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے مکہ کی پہاڑیوں سے اپنی آواز دنیا کو سنائی تھی لیکن وہ آج بھی دنیا میں اسی طرح گونج رہی ہے۔ اس لیے کہ یہی حق وصداقت کی وہ آواز ہے جو کبھی فنا نہیں ہو سکتی اور یہی وہ پیغام ہے جو انسان کو انسانیت اور اخوت ومحبت کی راہ بتلاتا ہے۔

کوئی شبہ نہیں کہ اس پیغام رحمت کا لانے والا اور عالم انسانی کو فلاح وبہبودی کی راہ بتانے والا دنیائے انسانیت کا سب سے بڑا محسن تھا اور آج کا دن جب کہ ہم محسن اعظم کی یاد منا رہے ہیں تمام عالم کے لیے مسرت کا دن ہے۔

وما ارسلناک الارحمۃ للعالمین۔ اللھم صل علیہ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

(ب)

سیاسی وقومی مسائل

ہندوستان کی قومی زبان۔۔۔ایک تقریر

"تیس سال تک کانگریس کے پلیٹ فارم سے یہ کہا جاتا رہا ہے کہ اس ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی جو فرانٹیر تک شمالی ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور زبان کا رسم الخط ہندی اور اردو ہوگا۔ مہاتما گاندھی بھی آخر تک اسی زبان کے حامی رہے، لیکن آج میں یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ ہم نے کانگریس کے اور مہاتما گاندھی کے اس اصول کو ٹھکرا دیا اور صرف ہندی زبان کو ملک کی قومی زبان بنانے پر زور دینے لگے۔"

یہ تھے وہ الفاظ جو حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ممبر دستور ساز اسمبلی نے تقریر کرتے ہوئے فرمائے۔

شام کے اجلاس میں ہندوستان کی قومی زبان کا وہ مسئلہ پیش ہوا۔ جس پر پورے ملک کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں اور جس نے پچھلے دنوں میں خصوصی اہمیت حاصل کر لی تھی۔

مولانا سے قبل جن دوسرے ممبران نے تقریریں کیں ان میں سیٹھ گونداس ہندی ساہتیہ سمیلن کے ممبر بھی ہیں اور مسٹر نذیر الدین احمد کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ سیٹھ گونداس نے اردو کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کیا اور یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ وہ صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے کہا کہ اس زبان میں بھیم ارجن کے ذکر کے مقابلے میں سہراب اور رستم کا ذکر کیا گیا۔ مسٹر نذیر الدین احمد نے بنگالی یا سنسکرت کو قومی زبان بنانے پر زور دیا اور کہا کہ اگر سنسکرت زبان قومی زبان قرار پا گئی تو اسے سیکھنے میں ہندی اور غیر ہندی علاقوں والوں کو

یکساں دشواری پیش آئے گی اور کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہ ہوگی۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی ترمیم یہ تھی کہ ہندوستان کی قومی زبان ہندوستانی ہونی چاہیے۔ جو دیوناگری اور اردو رسم الخط میں لکھی جائے۔

مولانا نے فرمایا: ''زبان کا مسئلہ سارے ملک میں خاص اہمیت اختیار کر گیا ہے کانگریس کی تیس سالہ جنگ آزادی میں جب کبھی یہ مسئلہ زیر بحث آیا تو تمام کانگریس میں اس پر متفق تھے، لیکن میں یہ دیکھ کر حیران ہوں کہ جس مسئلے پر ہم کل تک متفق تھے۔ آج اس ایوان کے اندر بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آ رہی ہیں۔ مہاتما گاندھی کے نزدیک چار باتیں سب سے زیادہ اہم تھیں، ان میں سے ایک یہ زبان کا مسئلہ بھی تھا۔ ابتدا میں گاندھی جی ہندی ساہتیہ سمیلن کے ممبر رہے اور اس کو آگے بڑھانے کی کوشش کی، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ہندی سے مراد وہ زبان نہیں ہے جسے وہ خود چاہتے تھے بلکہ وہ ایک ایسی زبان ہے جو اپنے دائرہ کو وسیع نہیں بلکہ اسے تنگ کرتی ہے تو وہ اس سے الگ ہو گئے اور اعلان کیا کہ ہندی سے میرا مطلب اس زبان سے ہے جو شمالی ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور جسے ہندو مسلمان اور سب لوگ سمجھتے ہیں۔ مہاتما گاندھی نے اس کے بعد ہندی اتھوا ہندوستانی کی آواز بلند کی اور ''ہندوستانی پرچار سبھا'' کے ذریعے اس زبان کو فروغ دینے کی جدوجہد شروع کی کر دی۔

۳۰ رجنوری ۱۹۴۸ء کے بھیانک حادثہ سے جب مہاتما جی ہم سے چھین لے گئے تین روز قبل انہوں نے دوران گفتگو میں مجھ سے فرمایا تھا کہ اب امن و امان ہوتا جا رہا ہے جس طرح تم لوگوں نے قیام امن کے سلسلے میں میری امداد کی ہے۔ اسی طرح تمہیں ہندوستانی کے پرچار میں بھی ساتھ دینا ہوگا۔ اور ہم نے ان سے اس بات کا وعدہ کیا، مگر افسوس وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہو گئے۔

خیال تھا کہ مہاتما جی کی زبان کی خواہشات کا احترام کیا جائے گا۔ لیکن مجھے زبردست حیرانی ہے کہ کل تک جو لوگ ہندوستانی کا پرچار کر رہے تھے۔ انہوں نے گاندھی جی کے اصول کو پس پشت ڈال دیا۔ اور آج وہ صرف ہندی کو ملک کی قومی زبان بنانے پر زور دے رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس معاملے میں مہاتما گاندھی کا نام نہ لیا جائے۔ لیکن اس کے لیے میرا جواب یہ ہے کہ مہاتما گاندھی کے نزدیک زبان کا مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا تھا۔

مہاتما جی نے اس زبان کو کبھی ہندی نہیں کہا، بلکہ ہمیشہ انہوں نے ہندوستانی کہا، انہوں

نے بڑی جستجو اور غور وخوض کے بعد یہ نام پسند کیا تھا۔ یہ ایسی زبان ہے جسے قصبات اور دیہات تک میں رہنے والے تمام لوگ سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندی زبان وہ زبان ہے جس کے دائرے کو تنگ کی جاتا ہے۔ ہندی کے پریمی کبھی یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے کہ وہ اس زبان میں دوسری زبان کے الفاظ نہیں رکھیں گے۔ لیکن عملی طور پر کیا ہو رہا ہے اس کی مثال یوپی میں دیکھ لیجئے۔ جہاں ہندی کو سرکاری زبان تسلیم کرلیا گیا ہے۔ عام فہم الفاظ کو نکالا جا رہا ہے۔ جنہیں ہر کس و ناکس آسانی کے ساتھ سمجھتا ہے۔ وہ چن چن کر اردو کے الفاظ کو نکال رہے ہیں' اس کا ثبوت یوپی میں بلوں اور قراردادوں کے وہ مسودے ہیں' جو اسمبلی میں پیش کیے جاتے ہیں' لیکن یہ کوشش کتنی غیر حقیقی ہے۔ اس بات سے ظاہر ہے کہ جو ممبران بلوں کو ہندی کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ اپنی تقریروں میں ان الفاظ کو نہیں بولتے۔ فی الواقع آج یوپی میں وزیر اور عدالت جیسے الفاظ کا بولنا بھی ایک جرم سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ اردو زبان کوئی ایسی زبان نہیں ہے' جسے مسلمان اس ملک میں باہر سے لائے ہوں۔ وہ اسے نہ عرب سے لائے اور نہ ایران سے۔ وہ ہمارے پریم ومحبت اور باہمی میل کا نتیجہ ہے۔ سیٹھ گوند داس نے ابھی مجھ سے پہلے کہا کہ اردو میں ہندوستان کی چیزوں کے مقابلہ میں غیر ملکی چیزوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ یہ قطعی طور پر غلط ہے اور بے بنیاد الزام ہے۔ دنیاوی باتوں کو چھوڑیئے اردو شعر کہتے۔ وقت شاعروں نے اس ملک کو نظر انداز نہیں کیا:

نظیر اکبرآبادی کا شعر سنیئے۔

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
بادلوں پر لیے پھرتی ہے ہوا گنگا جل

اس شعر میں شاعر نے مکہ مدینہ یا آب زمزم کا ذکر نہیں کیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا میرے بھائی کے دماغ میں ایسی کون سی چیز ہے جو گاندھی جی کے اصول کو ٹھکرا رہے ہیں نظیر اکبرآبادی کا مصرعہ سنئے۔

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

موت تک کے اس ذکر میں بھی شاعر نے ہندوستانیت کو مدنظر رکھا ہے اور اس کی نظر غیر ملک پر نہیں گئی۔ اسی طرح خسرو نے جو شاعری کی اس میں ہندوستان ہی کی باتوں کو مدنظر رکھا۔

ہندی زبان کے متعلق میں یہ نہیں کہتا کہ اسے نہ سیکھا جائے۔ لیکن جس طریقے پر اس

زبان کو ایک ادبی زبان بنایا جا رہا ہے۔ وہ مخصوص طبقے کی زبان بن جائے گی اور اگر اس طرح اردو کو بھی ادبی زبان بنایا گیا تو وہ بھی ایک خاص طبقہ کی زبان ہو کے رہ جائے گی۔ صرف ''ہندوستانی'' ہی زبان وہ زبان ہے جو ہندوستان کے عوام کی زبان ہے۔ مہاتما گاندھی نے بھی اس لیے فرمایا تھا کہ ملک کی زبان ہندوستانی ہوسکتی ہے کیونکہ اس میں سب زبانوں کے الفاظ موجود ہیں۔

اس اصول میں کیوں تبدیلی ہوئی اس کا جواب مجھے نہیں مل سکا' جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ صرف تقسیم ملک کے اثرات ہیں۔ اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ ہندی زبان کو رائج کرنے میں فرقہ وارانہ جذبہ کارفرما نہیں ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ غیر ارادی طور پر فرقہ وارانہ جذبات سے متاثر ہو کر ہم قدم اٹھاتے ہیں۔ جس طور پر اس وقت زبان کا مسئلہ حل کیا جا رہا ہے۔ اس کا مقصد صرف ایک فرقہ کو مرعوب کرنا ہے۔

سنسکرت اور تہذیب:

سیٹھ گونداس نے ابھی تہذیب اور سنسکرت کا ذکر کیا اور کہا یہ ہے کہ آزادی کے بعد اس ملک کے اندر دو سنسکرتیاں اور تہذیبیں نہیں رہ سکتیں۔ اگر تہذیب اور سنسکرتی کی بنیاد زبان پر ہے تو ہندوستان میں ایک درجن سے زائد زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ایک سنسکرتی کے لیے ان سب زبانوں کو ملیا میٹ کر دینا چاہیے۔

حیرت ہے کہ ہم کس طرح تنگ نظری کی پالیسی پر چل رہے ہیں۔ سوئٹزرلینڈ ایک چھوٹا سا ملک ہے وہاں چار زبانوں کو سرکاری حیثیت حاصل ہے میرے بھائی نے روس کا ذکر کیا ہے کہ وہاں صرف ایک زبان اور ایک تہذیب اور ایک ہی جیسے نام بولے جاتے ہیں۔ یہ بالکل صحیح نہیں ہے۔ روس میں ساٹھ سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اور وہاں رہنے والے مسلمانوں کے نام آج بھی عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں۔ ان حالات میں ہندوستانی زبان کو ختم کرنا اور اس کی جگہ سخت ہندی رائج کرنا کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ صرف تقسیم ملک کے اثرات ہیں۔ اور اس ہندی کے جواز کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔

اس ملک کی سرکاری زبان اگر کوئی زبان بن سکتی ہے تو وہ صرف ہندوستانی ہے جسے اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں لکھا جائے۔ ہندی رسم الخط کو اول درجہ میں رکھا جاسکتا ہے۔ لیکن

ثانوی درجہ میں اردو رسم الخط ضرور ہونا چاہیے اور اسمبلی اور عدالتوں وغیرہ میں اس رسم الخط کو قانونی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔

جہاں تک انگریزی ہندسوں کا سوال ہے تو جب انگریزی کو پندرہ سال تک برقرار رکھا جا رہا ہے اس کے ہندسے سے بھی باقی رہیں گے اور اس سے ہمارے کام میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوگی۔ اگر ان کے ذریعے آسانی پیدا کرنی ہے تو انہیں ضرور رکھا جائے۔ علاقائی زبانوں کی جو فہرست بنائی گئی ہے۔ اس سے میں پوری طرح متفق ہوں۔

میں آخیر میں پھر اپیل کروں گا کہ ہماری قومی زبان ہندوستانی ہونی چاہیے کیوں کہ یہی ایک آسان زبان ہے جو ملک کی زبان ہوسکتی ہے۔ علاوہ ازیں ہمارا دعویٰ ہے کہ ہمارے ملک کی حکومت ایک غیر مذہبی اور سیکولر حکومت ہے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ ہم ہندوستانی ہی کو اپنی قومی زبان تسلیم کریں۔ اور اپنی زبان کو ایک تنگ دائرے میں محدود نہ کریں۔

مسئلہ قومی زبان

کانگریس کانسٹی ٹیوٹ پارٹی میٹنگ میں ایک احتجاجی تقریر

یکم ستمبر ۴۹ء کو دستور ساز اسمبلی کی کانگریس پارٹی میں قومی زبان کا مسئلہ زیر بحث آیا تھا' جس میں ہر دو فریق نے پوری سرگرمی سے حصہ لیا۔ اس وقت ڈاکٹر امبید کر کا مسودہ' تجویز زیر بحث تھا۔ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اس ڈرافٹ پر زبردست تنقید کی اور اسے قطعی طور پر غیر منصفانہ قرار دیا۔ آپ نے کہا کہ اس کے باوجود کہ ہم ہر موقع پر مہاتما گاندھی کا نام استعمال کرتے ہیں۔ اس مسودے میں گاندھی جی کے طے کردہ اصول کی قطعاً خلاف ورزی کی گئی ہے۔

یہ وہ اصول تھے جنہیں گاندھی جی آخر دم تک سچ سمجھتے رہے اور انہیں کا پرچار کرتے رہے۔ یونین کی زبان ہندی ہوگی اور رسم الخط دیوناگری ہوگا۔ یہ نہ صرف گاندھی جی کے اصول کو چیلنج ہے۔ بلکہ کانگریس کی اس تیس سالہ تاریخ کو بھی چیلنج ہے جس میں کانگریس بار بار یہ یقین دلاتی رہی ہے کہ ملک کی قومی زبان ''ہندوستانی'' ہوگی جو دیوناگری اور اردو دونوں رسم الخط میں لکھی جائے گی۔

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس ڈرافٹ میں زبان کے مسئلے کو زبان کی حیثیت میں نہیں دیکھا گیا۔ بلکہ پولیٹیکل نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور وہ بھی کچھ اس تنگ نظری اور تنگ دلی کے ساتھ کہ ہندوستان کے کروڑوں ہندو' مسلمان باشندوں کی مشکلات کو محض اس لیے نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ وہ ردعمل نمایاں طور پر ظاہر ہو جائے جو پارٹیشن اور تقسیم ہند سے پیدا ہو گیا ہے۔ میرے نزدیک انڈین کانگریس کی تاریخ میں یہ سب سے بڑا حادثہ ہے' جو آج پیش آیا ہے۔ سیکولر اسٹیٹ اور ون نیشن کے دعوے کے باوجود ہند یونین کے کروڑوں انسانوں کی مادری زبان کو جو بلا تفریق مذہب و ملت اور بلا امتیاز نسل و خاندان ملک کے گوشے گوشے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ نفرت اور حقارت سے ٹھکرا دیا گیا ہے' اگر ہندوستانی زبان کو ہند یونین

کی قومی زبان قرار دیا جاتا تو اس میں بلاشبہ ہندی اردو اور ہندیونین کی دوسری زبانیں بھی آسانی سے سما سکتی تھیں اور جنوبی ہند و شمالی ہند کا تفرقہ بھی بیچ میں سے ہٹ سکتا تھا جو اس وقت ''ہندوستانی'' کے ہٹ جانے کے باعث ہندی اور انگریزی کے مقابلے کی شکل میں نظر آتا ہے۔

''ہندوستانی'' زبان کا مطلب گاندھی جی کی نظر میں بھی یہی تھا کہ وہ سادہ اور سہل زبان جو اتری ہند میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس زبان کو اگر قومی زبان بنالیا جائے گا تو اس سے ہندیونین کے تمام باشندوں کے درمیان یک جہتی اور کلچرل یکسانیت پیدا ہوگی جس سے صحیح معنی میں متحدہ قومیت کے نشانات ابھر آئیں گے۔ اس کے برخلاف وہ اردو اور وہ ہندی جو اپنی اپنی جگہ ادبی ترقیاں کر رہی ہیں ان میں ہرگز یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ قومی زبان کی جگہ لے سکیں۔

مگر افسوس یہ ڈرافٹ جس کی پشت پر اکثریت کی جذباتی سیاست کار فرما ہے ایسے انتقامی جذبات کا آئینہ ہے جو معقولیت اور سنجیدگی کے تمام پردوں کو چاک کر چکے ہیں۔ اس لیے میں زبان کے مسئلے پر مزید تقریر کے بجائے اس ڈرافٹ کے خلاف سخت پروٹسٹ کرتا ہوں اور اس سے زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتا۔

قومی زبان کا مسئلہ

دہلی، یوپی اور بہار میں اردو کو علاقائی زبان کی حیثیت دینے کا مطالبہ

لوک سبھا میں ایک تقریر:

دسمبر ۵۵ء میں لوک سبھا میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے حد بندی کمیشن کی رپورٹ پر بحث میں حصہ لیتے ہوئے اردو زبان کے حق میں ایک مدلل تقریر کی اور اسے دہلی، یوپی اور بہار میں علاقائی زبان کی حیثیت دینے کا مطالبہ کیا۔ آپ نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ کمیشن نے جس طرح جنوبی ہند میں زبان کے مسئلے کو اہمیت دی، شمالی ہند کے معاملے میں اس نے اس کو پیش نظر نہیں رکھا۔ حضرت مولانا نے اپنی تقریر میں اس امر کی وضاحت کر دی کہ اردو زبان ہندی کی رقیب نہیں ہے۔ اور نہ ہی اردو کی ترقی سے ہندی کو نقصان پہنچے گا۔ حضرت مولانا نے اقلیتوں کے تحفظات کو سراہا۔ لیکن محض تحفظات کو ناکافی قرار دیتے ہوئے اقلیتوں کی شکایتوں پر خصوصی طور سے توجہ دینے کی اپیل کی۔ مولانا کی تقریر چوبیس منٹ تک جاری رہی پوری توجہ کے ساتھ سنی گئی۔ اور تالیوں کی گونج میں آپ نے تقریر کو ختم کیا۔

محترم چیئرمین صاحب! کئی روز سے حد بندی کمیشن کی رپورٹ پر بحث ہو رہی ہے۔ جس زمانے میں کمیشن کی رپورٹ کا چرچا ہوا تھا۔ اس وقت میرا خیال یہ تھا کہ یہ مسئلہ وقت سے کچھ پہلے ہے۔ بہتر ہوتا کہ ابھی ہم اپنے اقتصادی پنج سالہ پروگرام پر توجہ دیتے۔

محترم پنڈت جی نے حوالہ دیا تھا کہ جس طرح ایک بڑی شخصیت سردار ولبھ بھائی پٹیل نے ۶۰۰ ریاستوں کے مسئلے کو حل کر کے ہمارے ہندوستان کی یکجہتی پیدا کی ہے، اسی طرح ہم لوگوں کو اس مسئلے کو بھی دیکھنا چاہیے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بے شک اس عظیم شخصیت نے جس

طرح ۶۰۰ ریاستوں کو ختم کر کے ہمارے ہندوستان کی یکجہتی پیدا کی وہ معاملہ آج حد بندی کمیشن کے بارے میں مجھے نظر نہیں آتا۔ میں تو یہ محسوس کر رہا ہوں اور میرا یقین ہو گیا ہے کہ جو کچھ میں نے سوچا تھا' وہ ٹھیک تھا۔ اس لیے کہ جو بحث اس وقت تک ہماری لوک سبھا میں آئی اس پر میں نے تو یہ دیکھا کہ بعض دفعہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوک سبھا نہیں ہے بلکہ ایسی جنگی کونسل ہے جس میں ایک اسٹیٹ سے دوسری اسٹیٹ کو یا گورنمنٹ آف انڈیا کو الٹی میٹم دیا جا رہا ہے۔ اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ کاش اس وقت ہماری توجہ اس کے بجائے اقتصادی پروگرام کی طرف ہوتی تو زیادہ بہتر تھا۔ لیکن جب یہ مسئلہ سامنے آ گیا ہے تو مجھے بھی چند باتیں کہنی ہیں:

اردو کے لیے علاقے کا تعین:

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ حد بندی کمیشن کی رپورٹ ہمارے حد بندی یا باؤنڈری' کمیشن کے پاس سے سامنے آئی ہے۔ لیکن اس نے زبان پر بھی بہت مشکل اور کافی بحث کی ہے اور دکھنی ہندوستان کے اندر لنگویج یا زبان کے مسئلے پر اسٹیٹ بنانے میں بہت کافی مضبوط اور اہم حصہ لیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شمالی ہندوستان میں اس طرح سے اس مسئلے کو نہیں لیا گیا۔ ابھی کل ہمارے محبوب لیڈر پنڈت جواہر لال نے اردو کے بارے میں زبردست تقریر فرمائی تھی۔ لیکن میں ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اردو کے مسئلہ کو صرف لیکچر یا تقریروں کے ذریعے بیان کر دینے سے حل کیا جا سکتا ہے۔ شری ٹنڈن جی نے بھی جس طرح وضاحت کے ساتھ کل اردو کے بارے میں فرمایا تھا۔ اس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی' لیکن یہاں تو اگلے قدم کا سوال ہے جس میں شاید ان کو بھی اختلاف ہوگا۔ میں یہ کہتا ہوں زبانوں کے مسئلے کے بارے میں ایک اسٹیٹ ایک لنگویج کے اصول پر بہت توجہ دی گئی ہے۔ لیکن یہ کوئی چیز نہیں ہے۔ ہم اس پر چلنا نہیں چاہتے۔ اگر ایک اسٹیٹ میں دو یا تین زبانیں ہیں تو ہم اس کی سرکاری حیثیت کو تسلیم کریں۔ جب کہ ہم نے ہندی کو پورے ہندوستان کی سرکاری زبان تسلیم کر لیا۔ ''قومی زبان تسلیم کر لیا۔ تو کسی بھی زبان کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہ ہندی کا درجہ حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ٹھیک نہیں ہے۔ یہ سمجھنا کہ اردو ہندی کی رقیب ہے۔ اور اگر اردو کو کوئی علاقہ دیا جائے گا تو اس سے ہندی کو نقصان پہنچے گا۔ اس پر مجھے اختلاف ہے۔ ہماری چودہ زبانیں ہیں۔ جس طرح بنگلا' گجراتی' مراٹھی' تامل' ملیالم' وغیرہ کو اسٹیٹ لنگویج کی حیثیت دی جاتی ہے۔ اس طرح کیا وجہ

ہے کہ اردو کے مسئلے میں وہی پوزیشن اختیار نہیں کی گئی۔

میں ادھر توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ محض لیکچروں اور تقریروں میں عمدہ سے عمدہ الفاظ ادا کرنے سے کسی زبان کا مسئلہ سرکاری طور پر حل نہیں ہوسکتا۔ آج ایک مقام اور ایسا علاقہ بتلانا چاہیے۔ جیسے یوپی ہے' بہار ہے' دہلی ہے۔

جس طرح دوسری زبانوں کے علاقے ہیں۔ جن میں کہ وہ زبانیں سرکاری حیثیت پا کر پھلیں گی اور پھولیں گی' اسی طرح سے اردو بھی سرکاری حیثیت پا کر پھلے گی پھولے گی اور صحیح طور پر اپنے قدموں پر کھڑی ہو سکے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ رپورٹ میں اس کی طرف توجہ نہیں دی گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے آج اس ہاؤس کو اس طرف توجہ دینی چاہیے۔ اس لیے کہ اس کا کوئی علاقہ ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ تحفظات میں ضرور اس کا ذکر آتا ہے' جیسے کہ یہ کوئی اقلیت ہوگئی ہے۔ جیسے ہندوستان کی اور زبانیں ہیں' اسی طرح سے اردو بھی ہے۔ یہ ہندو مسلمان کا سوال نہیں۔ یہ بھارت کی زبان ہے۔ لیکن وہ کسی اسٹیٹ کی زبان نہیں ہے۔ جس طرح اور زبانوں کے پاس ان کے علاقہ ہیں اسی طرح سے اردو کے لیے بھی ایک علاقہ ہونا چاہیے۔

ایک آنریل ممبر' آپ کون علاقہ چاہتے ہیں؟

مولانا حفظ الرحمٰن: میں یوپی کا علاقہ چاہتا ہوں' دہلی اور یوپی میں اس کو سرکاری ریجنل لنگویج کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ صوبے میں بھی اس کو یہی جگہ ملنی چاہیے۔

اردو رسم الخط:

جناب کل بات کرتے کرتے ہمارے ٹنڈن جی نے توجہ دلائی تھی کہ اردو زبان تو ضرور ہندوستان کی ہے' لیکن ان کو اس سے اختلاف ہے کہ رسم الخط بھی ہندوستان کا ہے۔ میں بہت ادب سے ان کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ یہ ٹھیک ہے کہ اردو رسم الخط ہندوستان کا نہیں ہے وہ عربی سے لیا گیا ہے۔ فارسی سے لیا گیا ہے دونوں ہی رسم الخطوں سے وہ بنا ہے۔ لیکن میں ان کی توجہ اس طرف دلانا چاہتا ہوں کہ کسی زبان کے رسم الخط کا دوسری زبان کے رسم الخط سے فائدہ اٹھانا کوئی عیب نہیں۔ سندھی زبان نے دوسری زبانوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن جو رسم الخط آج ہم ہندوستان میں اردو کے لیے استعمال کر رہے ہیں وہ عربی رسم الخط نہیں ہے۔

عربی رسم الخط سے ہم نے فائدہ ضرور اٹھایا ہے۔ لیکن اس سے فرق کر دیا ہے جو عربی کا رسم الخط ہے اس کو نسخ کہتے ہیں اور جو اردو کا رسم الخط ہے اس کو نستعلیق کہتے ہیں۔ اس طرح سے اردو اور عربی رسم الخط میں کافی فرق ہے' اردو کو بھی ہندوستان کی ہی چیز سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے میں آپ کی اور ہاؤس کی توجہ دلاتا ہوں کہ اردو کا مسئلہ نہایت ضروری ہے۔ اور اس بات کو حل کرنا چاہیے کہ اردو کو کیوں کوئی علاقہ نہ دیا جائے۔

صرف تحفظات کافی نہیں:

جہاں تک دوسرے سوالات کا تعلق ہے ان میں اقلیت کا سوال بھی آیا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ اقلیت کو تحفظات دے کر امداد دی جاتی ہے لیکن بعض موقعے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ محض حفاظت یا تحفظات ہی سے اقلیت کا کام نہیں چلتا' اس کے مطالبہ پر غور کرنا چاہیے۔ کہ جو چیز مانگی جارہی ہے اور جو چیز طلب کی جارہی ہے وہ کیا ہے۔ اور اس کو کیا دقت اور کیا پریشانی ہے۔ اور اگر پریشانی ہے تو وہ چیز تحفظات سے حاصل ہو سکتی یا نہیں۔

بنگال میں گھروں سے بے گھر مسلمان:

اس مسئلے کے متعلق مان بھوم کشن گنج کی مثال پیش کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہاں ساڑھے تین لاکھ انسان ہیں' جن کا مطالبہ یہ ہے کہ ان کو بنگال کا حصہ نہ بنایا جائے۔ میرے نزدیک ایک ہی بڑی وجہ ہے کہ جس سے ان کی پریشانی ظاہر ہوتی ہے۔ ۱۹۵۱ء کے فسادات کے زمانہ میں بنگال میں جہاں بے چارے مظلوم پناہ گزیں آرہے تھے۔ یہاں کے مسلمان بھی فسادات کی بناء پر اکھڑ گئے تھے۔ اس وقت کچھ مسلمانوں کے بسانے کا سوال پیدا ہوا۔ حکومت نے اس پر توجہ دی اور وعدہ کیا کہ وہ مسلمان جو پاکستان نہیں گئے وہ ضرور وہاں بسائے جائیں گے اور ان کو ضرور مکان دیئے جائیں گے۔ لیکن آج آٹھ برس ہو گئے لیکن پھر بھی ہزاروں مسلمان ایسے موجود ہیں جن کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہوڑہ' دیناج پور' جلپائی گوری اور بہت سے ایسے مقامات میں پڑے ہیں جو کہ ہندوستان کے ہی رہنے والے ہیں' وہ یہاں کے ہی باشندے ہیں اور پاکستان بھی نہیں گئے۔ اس کے باوجود بھی وہ اپنے گھروں سے محروم ہیں۔ آج تک ان کو گھر نہیں ملے۔ ایک حکم بنگال گورنمنٹ نے نکالا۔ جس میں اس نے کہا کہ جب تک پناہ گزیں کا انتظام متبادل طور پر نہیں ہو جائے گا' اس وقت تک ان کو مکانات

نہیں ملیں گے۔ میں اس چیز کو صحیح نہیں مانتا ہوں۔ ان کو پناہ گزینوں کے ساتھ ملانا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہندوستان ہی میں رہ رہے ہیں اور پاکستان بھی نہیں گئے۔ یہ آدمی جو اپنے گھروں سے محروم کر دیئے گئے ہیں' یہ بیچارے اپنے گھروں کو دیکھ کر حیران ہوتے ہیں کہ اپنے ہی گھروں میں ان کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔' ایسی حالت کو دیکھ کر جو باہر کے بسنے والے ہیں وہ بھی حیران ہوں گے۔ کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ پھر یہی چیز ان کے سامنے آئے۔ ان پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ یہ سوچنے کی بات ہے۔ تحفظات سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

اقلیتوں کا مسئلہ:

اب میں کچھ دوسرے سوالوں کی طرف آتا ہوں۔ ان میں ایک مسئلہ اقلیتوں کا مسئلہ ہے۔ اگر کوئی شخص ایسی بات کہتا ہے جو فرقہ پرستی کی بات ہو' تو میں نہیں جانتا کہ وہ بات مان لی جائے۔ اس کو بالکل بھی نہیں مانا جانا چاہیے۔ اس کو پھینک دینا چاہیے اور اس کو پیروں تلے روند دینا چاہیے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اقلیت والے کوئی بھی بات کہیں اس کو فرقہ پرستی کی بات ہی آپ کہتے جائیں۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ اقلیتوں کو جو دقتیں ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پنجاب کا مسئلہ ہے وہ بھی ایک اقلیت کا مسئلہ ہے' ہما چل کو الگ رکھنا چاہیے اور پیپسو اور پنجاب کو ایک کر دینا چاہیے۔ فضل علی صاحب نے رپورٹ دی ہے اور جو کچھ انہوں نے کہا ہے یا تو وہی مان لیا جائے یا آپ دوسری طرح سے اسے حل کریں یہ آپ کی مرضی ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اقلیتوں کا جو مسئلہ ہے۔ اس کو اس طرح ٹالا نہیں جانا چاہیے' بلکہ ان کو جو تکالیف ہیں' ان کو جو دقتیں ہیں' جو پریشانیاں ہیں ان کو دور کرنا چاہیے۔ ان کو ہر طرح سے مطمئن کرنا چاہیے۔ ان کو مطمئن کرنے کی بات سوچنی چاہیے اور ایسا راستہ اختیار کرنا چاہیے' جس سے کہ ان کے دلوں میں بھروسا پیدا ہو۔ ہندوستان کے ایک ٹکڑے کو ادھر سے ادھر کر دینے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ دقت تب ہوتی ہے جب ان کی ہر بات کو فرقہ پرستی کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے۔

مسٹر جوکھم الو: کیا میں آنریبل ممبر کو متوجہ کر سکتا ہوں کہ اس ایوان میں بحث کا معیار بہت اعلیٰ رہا ہے۔ اور خواہ آنریبل ممبر کا کتنا ہی احترام میرے دل میں ہو' کیا میں ان سے درخواست کر سکتا ہوں کہ وہ کسی اور قسم کی باتیں درمیان میں نہ لائیں۔

مسٹر چیرمین (پنڈت ٹھاکر داس بھارگو): میں سمجھتا ہوں ہر آنریبل ممبر اس بات کو ذہن میں رکھتا ہے۔ جب کوئی ممبر تقریر کر رہا ہو اس سے یہ کہنا کہ وہ بحث کا معیار بلند رکھے اس پر بہتان لگانا ہے' یہ مناسب بات نہیں ہے۔

ایک آنریبل ممبر۔ ممبر موصوف نے جو کچھ کہا ہے اسے وہ واپس لیں۔

حفظ الرحمٰن: میں گزارش کر رہا تھا کہ درحقیقت ان مسئلوں کو اس طرح سے دیکھنا چاہیے اور اس طرح سے ان پر نظر رکھنی چاہیے۔ جس سے کہ اقلیتوں کو تسلی ہو کہ ان کی باتوں کی طرف بھی دھیان دیا جاتا ہے۔ اور ان میں بھروسا پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

تلنگانہ کا مسئلہ:

تلنگانہ کا مسئلہ بھی اس قسم کا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دشال آندھرا بنانا ٹھیک بات ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ تلنگانہ کو موقع ملنا چاہیے کہ وہ بھی ایک اسٹیٹ رہ سکے۔ اور ایک اسٹیٹ کی طرح سے ہی وہ چلے اور اس کے بعد آپ آہستہ آہستہ دشال آندھرا میں اس کو شامل کر سکتے ہیں' ابھی اس کو ایک اسٹیٹ کی شکل میں ہی رہنے دیا جانا چاہیے۔ بعد میں دشال آندھرا میں شامل کریں۔

یو پی کا مسئلہ:

یو پی کا جو مسئلہ ہے اس کے بارے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے خوشی ہے کہ آج یو پی کے ممبران اس بات کو سوچتے ہیں کہ جو بات سارے ہندوستان کے فائدے میں ہو' وہی کی جائے۔ بہت سے لوگ ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ اس کا پارٹیشن ہو۔ میں ان میں سے ہوں جو یہ بات چاہتے ہیں کہ پارٹیشن نہ ہو۔ ہم اس کو ''ایک اور مضبوط'' دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر یو پی کے پارٹیشن سے سارے ہندوستان کو فائدہ پہنچتا ہے تو اس کے لیے کوئی بھی قربانی ہمیں کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ لیکن اگر ہندوستان کو فائدہ نہیں پہنچتا ہے اور صرف اس لیے کہ چند ممبر یہ چاہتے ہیں کہ یو پی کا پارٹیشن ہو۔ ہم کو یہ نہیں کرنا چاہیے میں اس کو کوئی معقول بات نہیں مانتا۔

دہلی کا سوال:

جہاں تک دہلی کا سوال ہے مجھے اس میں بہت دلچسپی ہے۔ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی میں جب

لالہ دیش بندھو گپتا جی نے دہلی اسٹیٹ کے بارے میں آواز اٹھائی تھی' اس وقت میں نے ان کی تائید کی تھی میں نے ان کو متنبہ کیا تھا۔ جیسا کہ دوسرے آنریبل ممبر نے کہا ۱۸۹۸ء میں حکیم اجمل صاحب نے انٹرنیشنل کانگریس میں سب سے پہلے اس مسئلہ کو اٹھایا تھا۔ آج محض اس لیے کہ کچھ کانگریسی آپس میں لڑ رہے ہیں' اس واسطے آپ دلی کو الگ اسٹیٹ نہیں رکھ سکتے۔ میں اس کو مناسب خیال نہیں کرتا یہ چیز معقول نہیں ہے۔ اس طرح سے دلی کی حکومت کو افسران کے ہاتھ میں اور حکام کے ہاتھ میں سونپ دینا ٹھیک ہوگا۔ ۲۰ لاکھ لوگوں کو ان افسروں رحم پر چھوڑ دینا اچھی بات نہیں ہے' ان کو ترقی کرنے کا پورا موقع ملنا چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ دلی کو ضرور ایک مستقل اسٹیٹ کا درجہ دے دیا جائے اس کو ایک کارپوریشن کا درجہ دے کر ٹال نہیں دینا چاہیے۔ یہ اسٹیٹ جس جمہوری نظام کے قابل ہے وہی نظام اس کو ملنا چاہیے۔ مدھیہ پردیش کا جو صوبہ بنا ہے اس کا سواگت کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ پردیش اسی طرح سے بنایا جانا چاہیے تھا' جہاں تک گجرات اور مہاراشٹر کا تعلق ہے جس کے بارے میں یہاں پر بہت زبردست تقریریں ہوئیں ہیں۔ ان کو سن کر تو میں ڈر سا گیا تھا اور سوچنے لگا تھا کہ خدا جانے اب کیا ہوگا۔ یہاں پر چیلنج دیئے گئے اور الٹی میٹم دیئے گئے میں سمجھتا ہوں کہ جو حل کانگریس ورکنگ کمیٹی نے تجویز کیا ہے اس کو مان لینا چاہیے۔ وہ فیصلہ بالکل صحیح ہے۔ بمبئی اسٹیٹ کو الگ ہی رکھنا چاہیے۔ اسے الگ رہ کر ہی ترقی کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔

آخری گزارش:

یہ میرا خیال ہے جو میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔ اور میں چاہتا ہوں کہ ہاؤس ان پر غور کرے اور صحیح فیصلہ کرے۔ میں ایک بار پھر کہنا چاہتا ہوں کہ جہاں تک اردو کا تعلق ہے اس کو سرکاری علاقائی زبان کی حیثیت دی جائے جہاں تک اقلیتوں کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ تحفظات دے دینے سے کام نہیں چلے گا۔ اس طرح سے ان کے مسئلے حل نہیں ہو سکتے ان کو پوری طرح سے ہمیں مطمئن کرنا چاہیے ان چند لفظوں کے ساتھ میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ جو خیالات میں نے آپ کے سامنے رکھے ہیں ان پر ہاؤس غور کرے گا۔ اتنا کہہ کر میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اردو زبان‘ مسلمان اور اسلامی تمدن

مجاہد ملت نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے اپنی بیس منٹ کی تقریر میں مسٹر ٹنڈن اور سیٹھ گووند داس کے طرز عمل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور کہا کہ یہ حضرات دوسروں کو مرعوب کرنے کے لیے پاکستان‘ مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے بھوت کھڑے کر دیتے ہیں‘ میں یہ بتانے کے لیے کھڑا ہوا ہوں کہ حق کی آواز کو ٹنڈن جی کا یہ طریقہ ہرگز نہیں دبا سکتا اور ہمیں ایک منٹ کے لیے بھی مرعوب نہیں کر سکتا۔ ہماری قوم پروری پنڈت نہرو یا دوسرے چوٹی کے قوم پرور لیڈروں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

مولانا موصوف نے فرمایا کہ اردو کو دیس نکالا دینے کی کوششوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ پاکستان کی آڑ میں ایسی باتیں کہنا کسی طرح بھی مناسب نہیں‘ ناقابل برداشت ہے۔ کوئی خوددار اور محب وطن اس گمراہ کن طریقہء کار کو برداشت نہیں کر سکتا۔

آپ نے ٹنڈن جی کو چیلنج کیا اور کہا کہ اگر یہاں مسلمان موجود ہیں تو اسلامی تمدن زندہ رہے گا۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی پوری تقریر درج ذیل ہے

”ڈپٹی سپیکر صاحب! وزیر تعلیمات کے مطالبہء زر کے سلسلے میں بہت دیر سے مقررین کی تقریریں سن رہا ہوں۔ شری پرشوتم داس ٹنڈن اور سیٹھ گووند داس کی تقاریر سن کر میں حیران رہ گیا۔ ان حضرات نے اردو کے خلاف جو رنگ اختیار کیا‘ وہ نہ صرف میرے لیے بلکہ اس ایوان کے لیے بھی ضرور باعث تکلیف ہوا ہوگا۔

یہ عجیب بات ہے کہ لوگوں نے یہ ڈھنگ اختیار کر لیا ہے کہ ایسے معاملات جن کو پارلیمنٹری اصولوں پر سنجیدگی اور متانت کے ساتھ قوت دلیل سے سمجھایا جانا چاہیے‘ ان مسائل کو مشتعل جذبات کے ساتھ نہایت مکروہ رنگ میں پیش کیا جاتا ہے‘ اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری باتوں میں کوئی دلیل نہیں اور گمراہ کن جذبات کے سوائے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ ان مسائل کے دوسرے پہلو اور دوسرے رخ کو پیش کرنے کے لیے دوسروں کو مرعوب کرنے کا یہ ڈھنگ نکالا ہے کہ فوراً ہی پاکستان‘ مسٹر جناح اور مسلم

لیگ تین بھوت سامنے کھڑے کر دیئے جائیں۔ گویا دوسرا کوئی شخص اگر ٹنڈن جی یا سیٹھ گووند داس کے خلاف بولنا چاہے تو وہ مرعوب ہو کر جرأت ہی نہ کر سکے۔

اسپیکر صاحب! میں آج اس گمراہ کن طرز عمل کے خلاف پر زور احتجاج کرنے اور یہ بتانے کے لیے کھڑا ہوا ہوں کہ حق کی آواز کو ٹنڈن جی کا یہ طریقۂ کار ہرگز نہیں دبا سکتا اور ایک منٹ کے لیے بھی ہم کو مرعوب نہیں کر سکتا۔

ہم نہ پاکستان کے لفظ سے مرعوب ہو سکتے ہیں اور نہ مسلم لیگ اور مسٹر جناح کے نام سے‘ اس لیے کہ ہماری قوم پروری پنڈت نہرو اور دوسرے چوٹی کے قوم پرور لیڈروں سے کسی طرح کم نہیں ہے‘ اور ہم پر اس قسم کے گمراہ کن مرعوب کرنے والے الفاظ کارتی برابر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

اردو کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے‘ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کو تسلیم کر لینے کے باوجود کہ ہندی راشٹریہ بھاشا ہے۔ اور پورے ملک کی سرکاری زبان تسلیم کر لی گئی ہے۔ آیا اردو‘ زبان کو یا دوسری علاقائی زبانوں کو اس ملک میں پھلنے پھولنے کا حق ہے یا نہیں؟

اس میں مطلق دو رائیں نہیں ہیں کہ ہم سب یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ ملک کی سرکاری زبان ہندی ہے‘ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو کو جو اسی ملک کی پیداوار ہے‘ اور ہندو مسلمانوں کے باہمی پریم ساگر کا ایک بہترین نشان ہے‘ اس کو بھی تعلیمی اداروں اور سرکاری عدالتوں میں سرکاری حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ جو لوگ اردو کو پاکستان کے ساتھ جوڑتے ہیں‘ جیسا کہ ٹنڈن جی کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے یا جو لوگ اس کو انگریزی کی طرح دیس نکالا دینا چاہتے ہیں‘ جیسا کہ سیٹھ گووند داس کی تقریر سے ظاہر ہوتا ہے‘ یہ دونوں باتیں اس ملک میں نہیں ہونے دی جائیں گی‘ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا اور ان کی پوری مخالفت کی جائے گی۔

شری ٹنڈن اور سیٹھ گووند داس کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اردو کے خلاف یہ کہہ کر کہ ہم اردو کے مخالف نہیں ہیں زہر اگلنا اور خواہ مخواہ بیچ میں اسلامی تمدن بنام ہندو تمدن کی بحثیں لانا اور پاکستان کی آڑ میں ایسی باتیں کہنا جو کسی طرح بھی مناسب نہیں ہیں‘ ناقابل برداشت ہیں۔ اور کوئی خوددار اور محب وطن اس گمراہ کن طریقے کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ٹنڈن جی کا یہ فرمانا کہ یو‘ پی میں جو تحریک اردو کے بارے میں چلائی جا رہی ہے وہ بھارتیہ کلچر کے خلاف فرقہ پرستی کی تحریک ہے اور دوسرے پاکستان یا دوسرے مسلم لیگی نظریے کو زندہ کرنا ہے‘ میرے نزدیک ہی

نہیں بلکہ پورے ہاؤس کے نزدیک اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے' اس سے بڑا جھوٹ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ میں ٹنڈن جی اور سیٹھ جی دونوں سے گزارش کروں گا کہ اردو کی تحریک کو جس طرح ہم لوگ چلا رہے ہیں' وہ صرف مسلمانوں کی نہیں ہے۔ وہ ہندو مسلمان سکھ عیسائی اور یوپی کے بسنے والے ہر آدمی کی جو اردو سے تعلق رکھتا ہے' ملی جلی تحریک ہے۔ اس لیے یا تو ٹنڈن جی اور سیٹھ فرقہ پرستی کے مفہوم سے واقف ہی نہیں ہیں یا جان بوجھ کر غلط الزام لگانا چاہتے ہیں۔ اس لیے میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ اردو زبان کی تحریک جو یوپی میں چلائی گئی ہے' اس کی مخالفت کرنے والا خود فرقہ پرست ہے اور ملک کا آئین کے بہت بڑا مخالف اور دشمن ہے۔

ہم کو مرعوب کرنے کے لیے بار بار پاکستان مسلم لیگ اور مسٹر جناح کا نام نہ لیا جایا کرے۔ یہ توہین آمیز طریقہ ایک منٹ کے لیے بھی برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ پاکستان اردو نے نہیں بنوایا بلکہ سیاسی بے ایمانیوں اور دلوں کے کھوٹ' تنگ نظری اور تنگ دلی نے اس کو چار چاند لگائے ہیں۔ اگر مسٹر جناح اس کے مجرم ہیں تو وہ لوگ بھی ان سے کم مجرم نہیں' جن کے دلوں کا کھوٹ تنگ نظری اور تنگ دلی آج بھی نہیں جاتی۔ ہمیں پاکستان کا طعنہ کیا دیا جاتا ہے!

تاریخ بتاتی ہے کہ جب یہ مسئلہ کانگریس کے اجلاس میں زیر بحث آیا تھا تو اس وقت لیڈروں کی تقریروں کے بعد پہلا شخص میں تھا۔ جس نے پورے زور کے ساتھ یہ کہا تھا کہ بزدلانہ طریقہ پر انگریز کی کرائی ہوئی تقسیم کو قبول نہیں کرنا چاہیے اور تحریک آزادی کو آگے بڑھا کر اپنی قوت سے ملک کو آزاد کرانا چاہیے' آج اس بزدلی اور کھوٹ کو اردو کی مخالفت کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ انگریز نے اسی لیے کمپرومائز کیا کہ وہ ایک ٹکڑے کے ذریعے دوسرے حصے کو ہمیشہ خوف و ہراس میں مبتلا رکھے اور کبھی سچا پریم و محبت پیدا نہ ہونے دے۔

سیٹھ گووند داس صاحب کا یہ فرمانا کہ اگر آج اتر پردیش میں اردو کی تحریک کامیاب ہوئی تو کل یہی آواز ہمارے مدھیہ پردیش' مدھیہ بھارت اور دوسری مختلف ریاستوں سے اٹھے گی اور اس طرح بیسیوں پاکستان بن جائیں گے۔ میں نہیں سمجھتا کہ پاکستان کا یہ بھوت سیٹھ جی کو کیوں اس درجہ پریشان کیے ہوئے ہے۔ اگر آئین کے مطابق بہار' مدھیہ پردیش' مدھیہ

بھارت اور دوسری ریاستوں میں ہندو' سکھ' عیسائی اور پارسی اردو بولنے والوں کی اتنی بڑی تعداد ثابت ہو جائے جس کی بنا پر اردو کو سرکاری طور پر تعلیمی اداروں اور سرکاری عدالتوں میں سہولتیں حاصل ہوں تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی' کیا علاقائی زبانوں سے پاکستان بن جایا کرتے ہیں' اتنی لچر بات شاید اس ہاؤس میں کبھی نہیں کہی گئی ہو گی۔

ٹنڈن جی اور سیٹھ گووند داس جی کو یہ سخت صدمہ گزرا ہے کہ وزارت تعلیم نے شبلی اکیڈیمی' انجمن ترقی اردو' اور جامعہ ملیہ کو گرانٹیں کیوں دی ہیں۔ اس سے ان کے نزدیک بھارتیہ کلچر کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا' بلکہ ان کے الفاظ میں فرقہ پرستی کو فائدہ پہنچتا ہے۔ میں اس افسوسناک ذہنیت پر انتہائی اظہار افسوس کرتے ہوئے گزارش کروں گا کہ دلوں کا یہی چھپا ہوا چور ہے جو دراصل ملک میں فرقہ پرستی پیدا کر رہا ہے اور سچا پریم پیدا نہیں ہونے دیتا۔ جب بار بار کہا جا چکا ہے کہ ہندی سرکاری زبان ہے تو اس کے جس قدر بھی مختلف اداروں کو مدد دے کر قوت پہونچائی جائے۔ ہمیں اس کی خوشی ہے اور ہم اس کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ مرکزی وزارت تعلیم کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسی لچر اور پوچ باتوں کی پروا نہ کرتے ہوئے' نہ صرف اردو کو بلکہ دوسری تمام علاقائی زبانوں کی بھی جو اپنی ترقی میں کوشاں ہیں۔ پوری پوری مدد کرنے اور اس طرح ملک کی ہر علاقائی زبان اور ثانوی سرکاری زبانوں کو پھلنے پھولنے کے لیے مواقع بہم پہنچائے۔

میں ٹنڈن جی کو چیلنج کرتا ہوں کہ اگر یہاں مسلمان موجود ہیں تو اسلامی تمدن' اگر ہندو ہیں تو ہندو تمدن' اگر سکھ' عیسائی موجود ہیں تو سکھ' عیسائی تمدن' سب زندہ رہیں گے اور کوئی طاقت ان تمدنوں کو مٹا نہیں سکتی' اگر ٹنڈن جی اسلامی تمدن نہیں چاہتے تو یہ ان پر ٹھونسا نہیں جا سکتا۔ اگر انہیں ہندو تمدن نہیں چاہیے تو وہ بھی ان پر زبردستی لادا نہیں جا سکتا۔

کیا ٹنڈن جی بتا سکتے ہیں کہ کس چیز کا نام انہوں نے بھارتیہ سنسکرتی رکھا ہے؟ کیا وہ یک بارگی ہی آکاش سے پھٹ کر آ پڑی تھی یا دھرتی سے نکل کر سامنے آ گئی تھی؟ نہیں ایسا نہیں ہے! بلکہ اسلامی تمدن' ہندو' سکھ اور عیسائی تمدن سبھی نے اپنی امتیازی حیثیت باقی رکھتے ہوئے مل جل کر جو مشترک تمدن بنایا ہے' وہ بھارتیہ تمدن یا سنسکرتی کہلا سکتا ہے اور جس طرح باغ میں گلاب' چنبیلی' چمپا اور جوہی اپنی بہار دکھاتے ہوئے گلدستہ کی نمائش بنتے ہیں' اسی طرح یہ تمام تمدن اپنی اپنی جگہ زندہ اور مضبوط رہتے ہوئے' ہندوستان کے مشترکہ تمدن کا گلدستہ بناتے ہیں پس جو لوگ اردو زبان کے خلاف یا تمدن کی بحث اٹھا کر یا پاکستان کا غلط حوالہ دے کر گمراہ کن

جذبات ابھارتے ہیں، میں ان کے خلاف آواز بلند کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ایوان بھی اس بارے میں میرا پورا پورا ساتھ دے۔ مجھے تو مرکزی وزارت تعلیم سے یہ شکایت ہے کہ صوبائی وزرائے تعلیم کی میٹنگ میں جس کی صدارت مرکزی وزیر تعلیم نے کی تھی اردو کے متعلق جو تعلیمی پالیسی طے پائی تھی آج یوپی میں خصوصاً اور دوسرے صوبوں میں اس کی خلاف ورزی ہو رہی ہے، اس لیے مرکز کا فرض ہے کہ وہ تمام صوبوں میں اس پالیسی پر عمل کرائے اور اردو کو وہ مقام دے جو اس کا حق ہے۔

میں اپنی تقریر کو ان مسائل کے بارے میں ان الفاظ پر ختم کرتا ہوں میں ایک بار پھر یہ کہتا ہوں کہ اردو یا تمدن کے مسئلے پر یا ایسے ہی دوسرے مسائل پر پاکستان، مسلم لیگ اور مسٹر جناح کے حوالے دے کر آئندہ جذبات کو غلط طور پر ابھارنے کی کوشش نہ کی جائے۔ میرا تو یہ یقین ہے کہ حق کی یہ آواز کو اردو اسی دیش کے میل وملاپ کی بہترین زبان ہے اور اس کا مقام دلانے کی جو کوشش کی جا رہی ہے، وہ قطعاً قومی نقطہ نظر پر مبنی ہے، اس کو ہرگز اس قسم کی مرعوب کن باتیں دبا نہیں سکتیں اردو کی تاریخ میں جس طرح مسلمان شاعر نظر آتے ہیں، بالکل اسی طرح ہندو، سکھ اور عیسائی شاعر پیش پیش نظر آتے ہیں۔

تعلیم اور نصاب تعلیم

۵/مارچ ۱۹۶۰ء کو لوک سبھا میں وزارت تعلیم کے مطالبات زیر بحث کے دوران حضرت مولانا حفظ الرحمٰنؒ صاحب نے اپنی تقریر میں مرکزی وزیر تعلیم کو نصاب کی کتابوں میں ایک خاص مذہب کی پروپیگنڈے اور دوسرے مذاہب کی اہانت کے مضامین کی طرف خاص توجہ دلائی اور نصاب کی کتابوں کی تیاری کے موجودہ طریق کار پر شدید نکتہ چینی کی۔ ساتھ ہی نصاب کی کتابوں کو خالص سیکولر بنانے پر بھی زور دیا۔ آپ نے اپنی تقریر میں علی گڑھ یونیورسٹی کے بارے میں بھی کچھ ممبرون کے اعتراضات کا نوٹس لیا اور صاف صاف کہا کہ شاید کسی خاص مصلحت کے ماتحت یونیورسٹی کو بدنام کیا جارہا ہے۔ حضرت مولاناؒ کی یہ تقریر ذیل میں شائع کی جا رہی ہے۔

محترم ڈپٹی اسپیکر صاحب! میں آج ایک خاص بات کی طرف محترم ایجوکیشن منسٹر صاحب کو توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ ان پچھلے چند برسوں میں اس بات کی طرف مختلف موقعوں پر پارلیمنٹ میں توجہ بھی دلائی گئی ہے لیکن ابھی تک اس میں کامیابی نہیں ہورہی ہے۔

مذہبی تعلیم کی ذمہ داری:

ہمارا کانسٹی ٹیوشن بننے کے بعد یہ بات صاف کردی گئی ہے کہ جہاں تک تعلیم اور شکشا کا تعلق ہے گورنمنٹ صرف سیکولرازم اور نیشنلزم کے مطابق کتابوں کے کورس کو اپنی تعلیم کے اندر جذب کرے گی۔ کسی کے مذہب اور کسی کے دھرم کی تعلیم کی ذمہ داری حکومت پر نہیں ہے۔ یہ بات ہم نے بہت ہی مفید سمجھی اور یہ صحیح قدم ہے جو کہ یقیناً تعلیم کے سلسلے میں سیکولر اسٹیٹ میں ہونا چاہیے لیکن

غلط نصاب تعلیم:

بدقسمتی سے ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ذریعے جو کتابیں پرائمری ایجوکیشن میں اور مڈل کی تعلیم میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں جارہی ہیں، ان میں یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ بہت

واضح طور پران کتابوں میں خاص انداز سے اس طرح کے بیان اور اس طرح کے مضمون لائے جاتے ہیں جن میں خاص طور پر مسلمانوں یا اسلام کے بارے میں جتنا بھی خلاف لکھا جاسکے لکھا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ اگر یہ نہ بھی ہو تو کم سے کم اس طریقہ سے لکھا جائے، جس سے کسی ایک مذہب کا پروپیگنڈا ہو اور دوسرے مذہب پر اس کا برا اثر ہو۔

مولانا آزاد کا دور وزارت:

اس بارے میں پچھلے برسوں میں گورنمنٹ آف انڈیا کی ایجوکیشن منسٹری کے سامنے اور ایجوکیشن منسٹر مولانا آزاد مرحوم و مغفور کے سامنے بھی میں نے تقریباً ۲۵، ۳۰ کتابیں مختلف طور سے پیش کر کے ضبط کرائی تھیں۔ ان کی تحقیق کی تو معلوم ہوا اور اسٹیٹ گورنمنٹوں نے بھی تسلیم کیا کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ کس طرح وہ کتابیں داخل کی گئیں۔ اور آخر کار وہ ضبط کی گئیں۔ لیکن ۲۵، ۳۰ کتابیں ضبط ہونے کے باوجود آج تک یہ سلسلہ برابر سیلاب کے طریقے سے ہم دیکھ رہے ہیں۔ دانستہ یا نادانستہ جس طرح بھی ہو ایک سیلاب کی طرح کا سلسلہ جاری ہے اور کتابوں میں دونوں چیزیں برابر موجود ہیں۔ پچھلے زمانہ میں تقریباً ۶۵ کتابوں کے بارے میں ایک فہرست بنا کر بھیجی گئی۔ ہم نے یہ بتلایا کہ اس قسم کی کتابیں اس قابل نہیں ہیں جو کہ تعلیم میں رکھی جاسکیں۔ وہ بہت مضر ہیں اور اس سے دوسرے مذاہب کی ہانی بھی ہوتی ہے۔ اور سیکولرازم اور نیشنلزم کے خلاف بھی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں وہ سیلاب رکتا نظر نہیں آتا۔

جب ہم کبھی کبھی ایسی تقریریں کرتے ہیں تو کتابیں مانگی جاتی ہیں ہم وہ کتابیں مہیا کر دیتے ہیں، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محکمہ تعلیم یہ سمجھتا ہے کہ صرف ان چند کتابوں کے بارے میں شکایت تھی اور اس نے شکایت دور کر دی۔ حالانکہ صورت حال یہ نہیں ہے، صورت حال دو چار دس بیس یا پچیس کتابوں کو یہاں پیش کر دینے تک بھی نہیں۔ آج اگر کوئی کمیٹی بٹھلائی جائے اور اس بارے میں اہمیت کے ساتھ تحقیقات کرائی جائے تو بلا مبالغہ میں کہہ سکتا ہوں کہ پچاس فی صدی کتابیں پرائمری اور مڈل تعلیم کے کورس میں اس قسم کی داخل ہیں، جن میں سیکولرازم کے خلاف ایک خاص مذہب کا پروپیگنڈہ کسی نہ کسی طریقے سے ہے۔ یا کھلی ہوئی کسی دوسرے مذہب کی ہانی اور اس کے متعلق ایک قسم کی توہین موجود ہے۔ چاہے وہ الہامی کتاب کے بارے میں ہو مثلاً قرآن کریم یا پیغمبر ﷺ کے بارے میں یا مسلمان بادشاہوں کے خاص

واقعات کے بارے میں شری پرکاش ویر شاستری گوڑگاؤں: کوئی نمونہ پیش کیجئے۔

مولانا حفظ الرحمٰن! میں نمونے پیش کرنے کے لیے نہیں کھڑا ہوں' لیکن اس طرح کی ۲۵۔۳۰ کتابیں ضبط ہو چکی ہیں اور ۶۵ کتابوں کی فہرست دی جا چکی ہے۔ نمونہ کی ذمہ داری میں نہیں لے سکتا لیکن اس کے لیے چیلنج کرتا ہوں کہ اگر ہندوستان کی تمام اسٹیٹوں میں تحقیقات کرائی جائے اور تقریباً ۵۰ فی صدی کتابیں ایسی کورس کے اندر ثابت نہ ہوں تو اس سے زیادہ جرم میرے خلاف یا میری ذمہ داری کے خلاف کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ یہ چیز میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں یہاں پر کوئی دو چار کتابوں کا حوالہ نہیں دیتا۔ یہاں ایک وقت وہ بھی تھا جب کتابیں پیش کی گئیں' ان کے اقتباسات بھی پیش کیے گئے' لیکن آج میں اس بیماری کو دق کے درجہ کی سمجھ کر یہ گزارش کر رہا ہوں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کو خاص طور پر چیک کیا جائے۔

وزیر تعلیم کا اعتراف:

مختلف کانفرنسوں میں تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں' وہ تجاویز مختلف انجمنوں' جمعیۃ علماء ہند اور دوسری انجمنوں جیسے انجمن ترقی اردو کی طرف سے بھی آئی ہیں جن میں دو باتیں کہی گئیں' ایک بات یہ کہ ایک سب کمیٹی ہو جو اس قسم کی باتوں کو چیک کرے۔ ابھی ابھی ''کرانتی کی لہریں'' نام کی ایک کتاب ہم نے اپنے ایجوکیشن منسٹر محترم کو ۶ یا ۷ دن ہوئے دی تھی۔ انہوں نے خود ہی مجھ سے اقرار کیا کہ اس کے اندر بہت سخت اور قابل اعتراض مضمون اسلام کے خلاف ہیں اور وہ کئی برسوں سے اتر پردیش میں پڑھائی جا رہی ہے۔ اس کے خلاف آواز اٹھائی جاتی ہے' لیکن کوئی بات آگے نہیں بڑھتی۔ اس طرح کے واقعات بہار میں' راجستھان میں' یوپی میں' مدھیہ پردیش میں اور دوسری اسٹیٹوں میں برابر جاری ہیں۔ اس لیے میں تو دق کے درجہ کی بات کہہ رہا ہوں' لہٰذا اس بات کا لحاظ ہونا چاہیے۔ آج مسلمان عوام کہتے ہیں اور ہم کو طعنے دیتے ہیں کیوں صاحب یہ سیکولرازم ہے' یہ سیکولر اسٹیٹ کی کتابیں ہیں' جن میں کھل کر اسلام کے خلاف' قرآن کے خلاف' قومی اصول کے خلاف یہ باتیں موجود ہیں۔

ایک ضرورت:

معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہمارے اس تعلیمی سیکشن کو جو تعلیم ہی کا حصہ ہے' اس کو غالباً کسی ایک مذہب کے پروپیگنڈے کے تبلیغی ادارے کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ صورت حال

بہت نا قابل برداشت ہے اور تعلیم کے بارے میں تو بالکل ہی برداشت کے قابل نہیں ہے۔ اس لیے کہ تعلیم تو بچے کے دماغ کو شروع ہی سے ایک خاص طریقے پر کنٹرول کرنے کے لیے ہے۔ ضرورت دو باتوں کی ہے۔

ایک ایسی کمیٹی بنے جو کہ اس چیز کو مختلف ریاستوں میں چیک کرے اور اس قسم کی کتابیں جو ہوں ان سب کو خارج کرائے اور ان کو کورس سے نکال دیا جائے۔

دوسرے یہ کہ آئندہ جو ہماری ٹیکسٹ بک کمیٹی ہو اس میں دو باتیں ہونی چاہئیں۔ یا تو یہ کہ جو مضمون اور جو پیپر لکھا جائے وہ اس مذہب کے آدمی سے لکھوایا جائے۔

ایک سادہ دل مصنف:

اسی سال یہاں دہلی میں ایک کتاب اس قسم کی لکھی گئی۔ جب میں نے اس کی بابت مصنف صاحب سے جا کر بات چیت کی تو یہ پایا کہ واقعی مصنف صاحب بہت سیدھے سادھے آدمی تھے اور ان کا مقصد اسلام کی توہین کرنا نہیں تھا۔ انہوں نے معذرت میں کہا کہ میں کیا کروں مجھے اسلام مذہب کے بارے میں جو باتیں معلوم تھیں وہ میں نے اس میں لکھ دی ہیں۔ اور کوشش سے میری کتاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی کتابوں میں شامل ہو گئی۔

صحیح طریقہ کار:

بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہے کہ کوئی بھی کتاب ایرا غیرا لکھ مارے اور وہ یوں ہی مذاق کے طور پر ٹیکسٹ بک کمیٹی کی کتابوں میں شامل ہو جایا کرے۔ ایسے شخص سے جو نہ ایکسپرٹ ہو اور نہ جس میں تعلیمی مہارت ہو اس سے کتابیں لکھوانا کہاں تک واجب اور مناسب ہے۔ اس لیے ٹیکسٹ بک کمیٹی میں اگر ایسے ماہر جو کہ کسی طرح کا تعصب نہ رکھتے ہوں اور جو کہ اس مذہب کو صحیح طور پر سمجھتے ہوں۔ ان کے ذریعے اس طرح کی کتابوں کو لکھوا لیا جائے تو وہ بہتر طریقہ ہو سکتا ہے۔ لیکن میں چاہتا تو یہ ہوں کہ وہ کتابیں جو ہمارے اسکولوں میں ہوں ان میں سوائے سیکولرزم کے دوسری کوئی چیز نہ ہو۔ بیشک مسلمانوں کے نبیوں کا ان میں ذکر ہو بیشک بہتر سے بہتر جو ہمارے ہندوستان میں رشی منی گزرے ہیں ان کا ذکر کرو اور تواریخ کی حیثیت سے ان کا ذکر کرو لیکن ایسے آئیڈیا زنہ بیان کرو اور وہ طریقے نہ بتلاؤ جس سے کہ ایک مذہب کا تصادم دوسرے مذہب سے ہوتا ہو اور ایک مذہب کی توہین دوسرے مذہب کے ذریعہ ہوتی ہو۔

یہ کام ان مجلسوں کا ہے جو مناظرے ہندو مسلمانوں کے، سکھ مسلمانوں کے یا سکھ ہندوؤں کے کرا کران کو آپس میں لڑاتی رہیں۔ یہ کام ہمارا ہے، گورنمنٹ کا نہیں ہے اور ایک سیکولر اسٹیٹ کا نہیں ہے۔ اس بنا پر میں بہت دکھ سے یہ بات کہنے کو تیار ہوں کہ اس چیز کو بہت ہی معمولی سمجھا جاتا ہے اور وقتی تقریر کے ذریعے یہ چیز ختم کردی جاتی ہے، اس پر خاص توجہ دینی چاہیے۔

یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے یہ اصول کی بات ہے۔ میں جانتا ہوں کا سبجیکٹ ایسا ہے جس پر صوبوں کو اپنے اپنے طریقہ پر چلنے کا اختیار ہے لیکن اس بات کا خیال تو بہت ضروری ہے کہ تعلیم سیکولرازم کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہو، تمام ریاستوں کو اس کا خیال رکھنا چاہیے۔

شری سی، کے بھٹا چاریہ (مغربی دیناج پور): کیا میں آنریبل ممبر سے یہ معلوم کرسکتا ہوں کہ کیا وہ صرف ہندی کتابوں کا ذکر کر رہے ہیں یا دوسری زبانوں کی کتابوں کا بھی جن کتابوں کا وہ ذکر کر رہے ہیں۔ ان کے بارے میں انہیں صاف کرنا چاہیے کہ وہ کس زبان سے تعلق رکھتی ہیں؟

مولانا حفظ الرحمٰن! جی ہاں ایک نہیں کئی زبانوں میں ایسی کتابیں موجود ہیں۔

ڈپٹی اسپیکر انہوں نے بتایا کہ یہ کوئی ایک زبان نہیں ہے۔ بلکہ ایک سے زیادہ زبانیں ہیں۔

مسٹر بھٹا چاریہ: میرا آنریبل ممبر سے کہنا یہ ہے کہ ممبر موصوف ہندوستان کی سب زبانوں سے واقف نہیں ہیں۔ اس لیے جب وہ اس قسم کا الزام لگاتے ہیں، تو انہیں ان زبانوں کی وضاحت کرنی چاہیے جن کے بارے میں وہ کہنا چاہتے ہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن: میں نے ہندی زبان کو اس لیے مخصوص نہیں کیا، کیوں کہ جیسا میں نے کہا گجراتی زبان میں بھی ہیں۔ مدراسی و تامل میں بھی ہیں۔ میں نے کسی خاص زبان کے بارے میں نہیں کہا بلکہ میں نے تو کہا کہ دوسری زبانوں میں بھی اس طرح کی کتابیں ہیں۔

وزیر تعلیم کا وعدہ:

ڈاکٹر کے، ایل، شریمالی (وزیر تعلیم): آنریبل ممبر نے کچھ عرصہ قبل ایک خاص کتاب کی طرف توجہ مبذول کرائی تھی جس کو میں نے دیکھا۔ میں سمجھتا ہوں کتاب میں بعض قابل اعتراض حصے تھے میں متعلقہ حکام کو لکھ رہا ہوں کہ وہ اس کی طرف توجہ دیں۔ اگر آنریبل ممبر نے اس قسم کی دوسری کتابوں کی طرف دھیان دلایا تو میں یقیناً ان کی طرف توجہ دوں گا۔ اور

متعلقہ ذمہ داروں سے کہوں گا کہ وہ ان کتابوں میں سے قابل اعتراض حصے نکال دیں۔

مطالبہ:

مولانا حفظ الرحمٰن: جیسے کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ اس قسم کی بہت سی کتابیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ایسا سب زبانوں میں ہو رہا ہے۔ گجراتی زبان میں ہو رہا ہے' ہندی زبان میں ہو رہا ہے' اردو زبان میں ہو رہا ہے اور دوسری زبانوں میں ہو رہا ہے۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ پرائمری اور مڈل اسکولوں میں جو تعلیم دی جا رہی ہے' وہاں پر خاص طور سے دھیان رکھیں کہ ایسی کتابیں بچوں کو نہ پڑھائیں۔ اس بارے میں دو تجاویز ہیں۔ ایک تو یہ کہ ریاستوں میں ایک اس طرح کی سب کمیٹی ہو جو اس بات کی تحقیقات کرے کہ ایسی کون سی کتابیں ہیں' جن میں کسی مذہب کی توہین کی گئی ہے۔ یا جن میں کسی ایک خاص دھرم کے لیے کوئی ایسا پروپیگنڈا ہو رہا ہے جس کا دوسرے مذاہب پر اثر برا پڑتا ہے۔ دونوں باتوں میں سے اگر کوئی بھی چیز ہو تو ایسی کتابوں کو ٹیکسٹ بک میں سے نکال دیا جائے اور انہیں کورس میں قطعی طور پر شامل نہ کیا جائے۔ دوسرے ٹیکسٹ بک کمیٹی میں ایسے ارکان مستقل طور پر ہونے چاہئیں جو اس بات کی جانچ کریں کہ وہ کتاب جس کو ہم کورس میں شامل کر رہے ہیں' وہ دونوں چیزوں سے صاف اور نیشنلزم اور سیکولرازم کے مطابق ہے یا نہیں۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ:

یہاں ہاؤس میں مسلم یونیورسٹی کا بھی چرچا ہوا ہے۔ میں بھی اس کے بارے میں کچھ عرض کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ ایک خاص یونیورسٹی کے لیے کس طرح پر یہاں لوگوں نے اسے کریٹی سائز اور کنڈم کیا۔ شروع سے لے کر آخر تک میں نے دیکھا کہ وہ لوگ جن کی زندگی گاندھی جی کے دائیں اور بائیں گزری اور جن لوگوں نے اپنی زندگی ملک کے لیے تج دی' لاکھوں روپیہ برباد اور تباہ کر کے انہوں نے اپنے ملک اور وطن کی آزادی کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ بہت ہی معمولی طریقے سے گویا کوئی بات ہی نہیں ہے' ان کے نام لے لے کر یہاں ان پر نکتہ چینی کی گئی اور ان کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ یہ چیز بہت تکلیف دہ ہے۔ اس طرح اگر یہ چیزیں آتی ہیں تو یقیناً نامناسب ہے۔ اب اگر یہ سمجھا

جائے کہ کسی یونیورسٹی کا مالی انتظام یا تعلیمی نظام خراب ہے تو اس کو بہتر بنانے کی کوشش ہونی چاہیے۔ لیکن اس طرح کھلے طور پر نکتہ چینی نہیں ہونی چاہیے۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خاص پروپیگنڈا ہے، جو کسی خاص مصلحت کی بنا پر مسلم یونیورسٹی کو بدنام کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے بارے میں کہا گیا کہ ایک مکان جسے مسلم یونیورسٹی نے خریدا ہے غیر قومی سرگرمیوں کا اڈہ بنا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہاں طلبہ اور اساتذہ کے علاوہ کوئی بھی ایکٹی ویٹی نہیں ہے جو جاری ہو۔ یونیورسٹی میں بہتر طور پر پڑھائی کا کام چل رہا ہے، وہاں نیشنلزم اور سیکولرازم اتنی قوت سے جڑ پکڑ رہے ہیں کہ اس کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

مسٹر پرکاش ویر شاستری: کیا یہ سچ ہے کہ اس مکان میں ایک خاص نقطہ نظر رکھنے والے طلبہ اور اساتذہ جاتے ہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن! یہ جتنا بیان کیا گیا اس کی حقیقت وائس چانسلر نے بھی بیان کر دی ہے۔ یہ سراسر جھوٹ ہے۔ اس طرح کا جھوٹا اور غلط پروپیگنڈا ایک خاص مقصد کو لے کر مسلم یونیورسٹی کو بدنام کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ آج مسلم یونیورسٹی میں جو سرگرمیاں ہیں ان کے متعلق میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اینٹی کمیونل اور نیشنل ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں جو سیکولرازم اور نیشنلزم کی سرگرمیاں بڑھ رہی ہیں، اس کی کوئی تعریف نہیں کی گئی، بلکہ اس کو غلط طور پر کریٹسائز ہی کیا گیا۔

دلی میں اردو:

چوتھی بات آخری طور پر میں یہ عرض کرنی چاہتا ہوں کہ جہاں تک دلی کا تعلق ہے۔ منسٹر صاحب کو اردو کے بارے میں خاص طور سے توجہ دینی چاہیے لیکن اس بارے میں کسی دوسرے وقت گزارش کروں گا۔

اس وقت میں کتابوں کے بارے میں توجہ دلانا چاہتا ہوں، اور خاص کر کورس کے بارے میں میرے دل پر چوٹ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اسکولوں میں کتابیں منظور کرنے کا ایسا معقول اور مستقل انتظام کرنا چاہیے کہ کوئی شکایت پیدا نہ ہونے پائے۔

(ج)

مولانا حفظ الرحمٰن کا مجاہدانہ خطاب

چند یادگار تقاریر

لکھنو کی تاریخی کانفرنس منعقدہ دسمبر ۱۹۴۷ء کے آخری اجلاس میں جمعیۃ علماء ہند کے ترجمان مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے کانفرنس کی کارگذاری اور تجاویز پر تبصرہ کرتے ہوئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کی ولولہ انگیز تقریر میں فرمایا:

''جو حالات ہمارے سامنے ہیں کہ انسان خود انسان کے خون کا پیاسا ہے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ان کو کن الفاظ سے تعبیر کریں' وحشت اور درندگی کا لفظ بھی کافی نہیں ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ وحشت اور درندگی اس حالت سے شرم کر رہی ہے۔ شیر اور بھیڑیئے جو سب سے زیادہ وحشت ناک درندے مانے جاتے ہیں۔ وہ دوسرے جانوروں کا خون چوس کر درندگی کی پیاس بجھاتے ہیں لیکن اپنے بچوں کو وہ بھی نہیں پھاڑتے۔ یہ حضرت انسان ہیں کہ خود اپنے ہم جنس بچوں اور عورتوں اور کمزور انسانوں کو ذبح کرتے ہوئے نہیں شرماتے۔''

''عوام کی وحشت اور درندگی کا علاج حکومت کا فرض ہے لیکن اس کا کیا علاج جب خود معالج اور امن کے ذمہ دار وحشت زدہ ہو جائیں' آج ذبیحہ گاؤ یا ناجائز اسلحہ کا الزام لگا کر جس طرح مسلمانوں کو پریشان کیا جا رہا ہے وہ اسی وحشت زدگی کا نتیجہ ہے۔''

''جمہوریہ ہند مساوات' یکسانیت' آزادی رائے اور آزادی ضمیر کے اصول پر قائم کیا گیا ہے۔ کانگریس ان اصولوں کی علمبردار ہے آج یہ فرض کانگریس کا ہے کہ ان اصول کو ملک میں کامیاب کرنے کے لیے جان کی بازی لگادے۔ جس وقت مسلمانوں پر فرقہ واریت کا بھوت سوار تھا۔ ہم نے ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا۔ ہم خود اپنوں سے ٹکرائے آج مسلمانوں کی فرقہ واریت ختم ہو چکی ہے۔ آج جن سنگھ اور مہا سبھا کی فرقہ واریت ملک کو تباہ کر رہی ہے۔ ہم نے جس طرح مسلم فرقہ واریت کا مقابلہ کیا اسی طرح ہم ہندو فرقہ واریت کو بھی پیروں سے مسل کر

دم لیں گے۔ ہم ہندیونین کے رگ و ریشہ کو فرقہ واریت سے پاک کر کے دم لیں گے' ورنہ اس کوشش میں ختم ہو جائیں گے۔

"یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید"

آپ نے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"یہ کیا بزدلی ہے کہ تم در و دیوار سے وحشت زدہ ہو' تم خود اپنے سائے سے ڈر رہے ہو' اگر تم کل تک بہادر تھے تو آج بزدلی کیوں ہو گئے' اسلام اور بزدل ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔ مسلمان سب کچھ ہو سکتا ہے مگر بزدل نہیں ہو سکتا۔ مسلمان حق بات کہنے میں ہمیشہ دلیر ہوتا ہے' مسلمان ناانصافی برداشت نہیں کر سکتا۔ خوف و ہراس' بزدلی اور نامرادی کو دل سے نکال دو۔ یہاں سے یہ عہد کر کے جاؤ کہ ہر ایک ناانصافی کا مقابلہ ڈٹ کر کریں گے۔ بیشک ہم وفادار ہیں' مگر ہم مادر وطن کے وفادار ہیں۔ وفاداری کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم کسی کلکٹر یا کسی سرکاری افسر یا وزیر کے فعل پر کسی قسم کی نکتہ چینی نہیں کر سکتے۔ وہ زمانہ ختم ہو گیا کہ حکام کی چاپلوسی وفاداری ہوا کرتی تھی۔ حکومت' وزراء اور افسران حکومت کا پہلا فرض ہے کہ وہ ملک اور وطن کے وفادار ہوں اگر ہم وفاداری کے خلاف کوئی حرکت دیکھیں گے۔ تو یقیناً مقابلہ کریں گے۔ کانفرنس نے تمہیں مشورہ دیا ہے کہ مشترک سیاست میں حصہ لو۔ اور کسی سیاسی جماعت میں شرکت کرو۔ جو ہندو مسلمانوں کے لیے مشترک ہو۔ میں کہتا ہوں کہ کانگریس میں شرکت کرو۔ کیونکہ اس سے بہتر کوئی جماعت ہمارے سامنے نہیں ہے۔ مگر کسی خوف یا ڈر کی وجہ سے کانگریس میں ہرگز شریک نہ ہو' اگر تم پناہ ڈھونڈنے کے لیے کسی جماعت میں شریک ہوتے ہو اس سے نہ جماعت کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ نہ تمہاری یہ شرکت ملک کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ فرقہ وارانہ سیاسی پلیٹ فارم غلط ہے۔ اس غلطی کو ختم کرو اور مشترک پلیٹ فارم پر ملک کی مشترک سیاست میں حصہ لے کر ملک کی ترقی پذیر جماعت کی طاقت بڑھاؤ' ہمت بلند رکھو' خدمت وطن کے سچے جذبے ساتھ آگے بڑھو۔ تمہیں انصاف اور حق و صداقت کا سر بلند کرنا ہے۔ اگر تم نیک مقاصد کے لیے ڈٹ گئے تو خدا کی مدد تمہارے ساتھ ہو گی۔"

اخبارات میں یہ تقریر شائع ہوئی تو مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدیر صدق نے فوراً ایک کارڈ لکھا جس کے الفاظ بجنسہٖ یہ تھے:

"السلام علیکم! مسلم کانفرنس لکھنو میں آپ کی تقریر پڑھ کر" غازی جوتوئی روا ست کا فربودن

جزاک اللہ خیر الجزاء والسلام۔ دعا گو دعا خواہ

عبدالماجد یکم جنوری ۱۹۴۸ء

محکمہ کسٹوڈین کی ناانصافیاں

لوک سبھا میں مولانا کی ایک تقریر:

دہلی ۲۷ ستمبر ۱۹۵۴ء لوک سبھا میں مولانا نے اپنی تقریر میں جہاں نکاسی جائیداد ایکٹ سے مسلمانوں کو پیش آنے والی مشکلات پر ممبران پارلیمنٹ اور حکومت کو توجہ دلائی اور یہ مطالبہ کیا کہ اب کسی جائیداد کو نکاسی قرار نہ دیا جائے۔ وہاں یہ بھی اپیل کی کہ:

> ''جو جائیدادیں ٹیکنیکل وجوہ کی بنا پر نکاسی قرار دی گئی ہیں۔ ان کی بھی واگزاری ضروری ہے۔ حضرت مولانا نے مخصوص انداز میں اس امر کی وضاحت کی کہ وہ مسلمانوں کو صرف ان کا حق دلانا چاہتے ہیں۔ پرشارتھیوں سے ان کے حقوق چھیننا مقصود نہیں ہے' مولانا نے اس بات پر بھی زور دیا کہ پرشارتھیوں سے حکومت نے جو وعدے کر رکھے ہیں۔ ان کو پورا کرے۔''

مولانا کی اس مدلل اور پرزور تقریر کے باعث ایوان کی فضا بالکل بدل گئی جو ممبران' سلمانوں سے انصاف کے شاکی تھے۔ انہیں بھی تسلیم کرنا پڑا کہ مسلمانوں کو ان کے حقوق سے محروم نہ کیا جائے۔ اور کسی کو نکاسی نہ بنایا جائے۔

حضرت مولانا کی تقریر جو انہوں نے ۲۵ ستمبر کو حسب ذیل ہے:

صدر صاحب! میں وزیر داخلہ کے بل پر تائید کرنے کے لیے کھڑا ہوا ہوں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بل اس ہاؤس میں بروقت لایا گیا ہے۔ معاوضہ اور نکاسی جائیدادوں کے سلسلے میں جو دو بل ایک دوسرے کے آگے پیچھے لائے گئے ہیں وہ جیسا کہ ابھی ہمارے منسٹر صاحب نے فرمایا ایک دوسرے کے حصے نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ پاکستان نے وہ طرز عمل اختیار نہیں کیا جو اس مسئلے کو حل کرنے کے سلسلہ میں اختیار کرنا چاہیے تھا۔ ایسی صورت میں ہمارے پاس دو ہی راستے تھے

ایک راستہ یہ کہ دونوں حکومتوں کے درمیان کوئی اگریمنٹ ہو کہ جو جائیدادیں پاکستان میں ہمارے رفیوجی بھائیوں نے چھوڑیں ان کا اور یہاں کا مقابلہ کر کے ایک انصاف کے ساتھ لین دین ہو جائے۔ لیکن پاکستان اس بات کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ تب ہمارے لیے دوسرا راستہ یہ ہے کہ ایک طرف یہاں جتنی جائیدادیں چھوڑی گئی ہیں۔ ان کو ویسٹ کریں اور مالکانہ حیثیت سے اس پر قبضہ کریں تاکہ رفیوجیوں کو جس حد تک ہم معاوضہ دے سکتے ہیں دے سکیں۔ معاوضے کی بحث بل میں کافی آ چکی ہے۔ اس لیے اسے بار بار دوہرانے کی ضرورت نہیں۔ اس بات کو سب ہی تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستان سے آنے والے مصیبت زدوں کو جتنا معاوضہ ملنا چاہیے اس کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ نکاسی بل کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف مرحلوں پر ایسی صورتیں ہمارے سامنے آئی ہیں کہ ہزاروں وہ آدمی جو غیر نکاسی تھے نکاسی بنا دیئے گئے۔

مثلاً ہم نے دیکھا کہ شروع شروع میں یہ بات تھی کہ قانون کے اندر کوئی شخص بھی اگر اپنی جگہ سے ڈسپلیڈ ہو گیا اور وہ اس کا انتظام نہیں کر سکتا ہے۔ وہ نکاسی بن سکتا ہے۔ حالانکہ وہ ہندوستان میں ہی ہے۔ صرف ایک جگہ سے اکھڑ کر دوسری جگہ چلا گیا۔ لیکن اس وقت قانون کے پیش نظر یہ بات ضروری تھی اس وجہ سے سیکڑوں اور ہزاروں آدمیوں کو نقصان پہنچا اور وہ تمام جائیدادیں کسٹوڈین کے قبضے میں آ گئیں۔ اسی طرح ٹیکنیکل گراؤنڈ کی بناء پر دوسری مشکلات پیش آئیں۔ مثلاً یہ کہ اگر کسی شخص نے واجبات ادا نہیں کیے تو صرف نوٹس بورڈ پر یہ لکھنا کافی سمجھا گیا کہ فلاں جائداد کو ہم ویسٹ (قبضہ میں) کر رہے ہیں۔ ذاتی طور پر کسی نوٹس کی تعمیل کو ضروری نہیں سمجھا گیا۔ اس کی بناء پر جاہل ان پڑھے آدمی بلکہ میں تو کہوں گا کہ پڑھے لکھے آدمی جن کو نوٹس بورڈ وغیرہ دیکھنے کا موقع نہیں ملتا وہ اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ اگر انہوں نے اپنے لیے کوئی چارہ بھی تلاش کر لیا تو بعض دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ ان کو یہ پتہ نہیں چلا کہ ہماری جائیداد کب

ویسٹ کر دی گئی کب نکلی اور کب نکاسی بنادی گئی۔میرا ارادہ نہیں ہے پاکستان جانے کا ایک منٹ اور سیکنڈ کے لیے بھی لیکن میری جائیداد' نوٹس بورڈ پر نکاسی' بنا دی گئی اور مجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں اور دومہینہ کی مدت گزر گئی اور اس کی اپیل کا وقت بھی نکل گیا۔ایسی تمام باتوں کو دیکھ کر ایسی سہولتیں بہم پہونچانے کی کوشش کی گئی کہ کسی طریقے سے ٹیکنیکل گراؤنڈ پر یا کسٹوڈین کے آرڈر کے مطابق ہزار ہا آدمی جو غیر نکاسی ہیں' وہ نکاسی نہ بنا دیئے جائیں۔ یہ ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔ ان کو بھی یہیں رہنا ہے' وہ بھی یہاں کے باشندے ہیں۔ جیسا کہ ابھی ایک ممبر نے کہا کہ یہاں کے بسنے والے کسی شخص کو کوئی تکلیف نہیں پہنچانا چاہیے اور کوئی اس کے ساتھ ظلم نہیں ہونا چاہیے۔لیکن عمل ایسا رہا ہے کہ اس میں ہزاروں آدمی اس ظلم کے نیچے آئے ہیں۔ کس طرح غیر نکاسیوں کو نکاسی بنانے کی کوشش کی گئی۔اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت مولانا احمد سعید صاحب جیسے قومی رہنما پر جو ان لوگوں میں سے ہیں۔ جنھوں نے پاکستان بننے کی مخالفت کی۔نوٹس تعمیل ہوتا ہے کہ آپ کی جائیداد نکاسی بنائی جا رہی ہے۔اس لیے کہ آپ پاکستان جارہے ہیں۔ مجھے اس پر ہنسی بھی آئی اور افسوس بھی ہوا۔اور اس کے بعد میں نے جا کر کسٹوڈین کے دفتر میں دریافت کیا اور کہا کہ ایک ایسا آدمی جو صبح شام تک حکومت کے تمام معاملات سے تعلق رکھتا ہے جس کو پاکستان میں جگہ ملنا دشوار ہے اور جس کا ارادہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ وہ پاکستان جائے۔آپ نے اس کو اویکوئی بنا دیا تو جواب ملا ہے کہ ہم نے جو کچھ کیا ہے وہ قانون کے مطابق کیا ہے۔اور قانون کے مطابق ون ٹو آل ہر مسلمان پاکستان جانے والوں میں شمار ہے۔ اب یہ بوجھ اس مسلمان پر ہے کہ وہ اس بات کا جواب دے کہ وہ پاکستان جانے کے قابل ہے یا نہیں۔ یا وہ پاکستان جائے گا یا نہیں جائے گا؟

''میں پرائم منسٹر کی نالج میں دیر سے لایا اور انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ کاش تم اسے وقت پر لاتے۔ایک اور مثال مسٹر آصف علی کی ہے کہ ان کی جائیداد بھی نکاسی بنادی گئی ہے۔روشن آرا گارڈن کی ایک پارٹی میں مرحوم آصف علی نے

جب وہ اڑیسہ کے گورنر تھے مسٹر اچھرورام (سابق کسٹوڈین جنرل) سے جو وہاں موجود تھے اور میں بھی وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ ہنس کر کہا کہ میری جائیداد بھی نکاسی ہوگئی۔ آپ غور کیجئے کہ کس کس طریقے سے حالات پیش آئے اور ان حالات کے ہوتے ہوئے بھی انصاف کا تقاضہ تھا کہ کل کو جب حالات نارمل ہوں گے۔ تو آج جو ہماری جائیدادیں کسٹوڈین نے غلط طور پر لی ہیں وہ واپس کی جائیں۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ منسٹر صاحب ایک پارٹ سامنے لائے جس میں کہا گیا کہ ہم مالکانہ قبضہ کرنے کے بعد کمپن سیشن پول میں ان تمام جائیدادوں کو دے رہے ہیں۔ تو اس صورت میں قدرتی طور پر ان لوگوں کو جو یہاں کے رہنے والے ہیں اور جو ایک منٹ کو بھی پاکستان جانا نہیں چاہتے' ان کا یہ محسوس کرنا قدرتی ہے کہ اب ہم پر پابندی کیوں لگائی جاتی ہے۔ اور اب ہم پر اس قسم کی پابندی کیوں عائد کی جارہی ہے۔ آخر ہمیں بھی تو کبھی نہ کبھی نجات ملنی چاہیے۔ ساڑھے چار کروڑ کے قریب مسلمان آج اس دیش میں رہ رہے ہیں۔ وہ بھی تو محسوس کریں۔ دستور میں جو ایک برابری کا حق دیا گیا ہے۔ وہ محض ایک کتاب میں لکھی ہوئی چیز ہی نہیں رہ جانی چاہیے۔ بلکہ چلتے پھرتے روزانہ زندگی میں اور بازار میں وہ ہمارا حق نظر آنا چاہیے۔ ہم بھی اس طریقے سے آزاد ہیں۔ جس طرح ہمارے بھائی دیش پانڈے جی آزاد ہیں۔ اپنی جائیداد کو بیچنے میں ان پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اسی طرح سے حفظ الرحمٰن کو بھی پوری آزادی ہونی چاہیے اور دونوں میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔

کسٹوڈین کی ستم رانیاں

لوک سبھا میں وزارت بحالیات کے مطالبات زر کی بحث میں مجاہد ملت کی ایک تقریر

۱۱ر اپریل ۵۸ء کو لوک سبھا میں وزارت بحالیات سے متعلق مطالبات زر کی بحث میں حصہ لیتے ہوئے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ان مسلمانوں کے معاملے کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا۔ جنہیں وزارت بحالیات نے نکاسی ایکٹ کی دفعہ ۱۶ کے استفادے سے محروم کر دیا ہے۔ آپ نے اسے ناانصافی قرار دیا اور وزیر بحالیات سے اپیل کی کہ اس سوال پر غور کریں اور دیکھیں کہ محض اصطلاحی بنا پر کسی کے ساتھ بے انصافی نہ ہو۔ حضرت مولانا نے ان مسلمانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے جو اپنے ہی وطن میں بے گھر ہو کر رہ گئے ہیں۔ دہرہ دون اور گنگانگر (راجستھان) کے مسلمانوں کے معاملے پر توجہ دینے کی اپیل کی۔ حضرت مولانا نے یہ بھی کہا کہ کسٹوڈین جنرل کا دفتر مسوری منتقل نہ کیا جائے۔ اگر منتقل کیا ہی جاتا ہے تو اسے لکھنو میں منتقل کیا جانا چاہیے۔ حضرت مولانا نے تقریر شروع کرتے ہوئے کہا پراپرٹی ایکٹ دفعہ ۱۶ کا مفاد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی جائیداد کے متعلق جس کو کسٹوڈین نے گزٹ کر دیا ہو' کسٹوڈین اور چیف کسٹوڈین کے یہاں ناکام ہو جائے اور منسٹری میں شکایت کرے کہ جائیداد میری ہے تو وہ کیس قابل سماعت ہوتا تھا اور منسٹری اس پر غور کرتی تھی۔ اس طرح اگرچہ ناانصافی بھی ہو جائے تو اطمینان رہتا تھا کہ ہمارے کیس پر پھر سے غور کیا جا سکتا ہے لیکن گذشتہ آٹھ دس ماہ سے اس دفعہ کی نئی تعبیر منسٹری کی جانب سے کر دی گئی ہے۔ جس سے میں حیران ہوں اور اس پر سخت احتجاج کرتا ہوں کہ اب بغیر سماعت کیے منسٹری سے یہ کہہ کر درخواست مسترد کر دی جاتی ہے کہ ہم نے چونکہ تمہاری جائیداد گزٹ نہیں کی ہے۔ بلکہ پاکستان جانے والے کی جائیداد گزٹ کی ہے' اس لیے تمہیں اس کی شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

محترم اسپیکر صاحب! غور فرمائیے کہ یہ کتنی ناانصافی کی بات ہے کہ ایک شخص ہندوستان ہی کا باشندہ ہے۔ کبھی پاکستان نہیں گیا۔ اس کے باوجود کسٹوڈین نے اس کی جائیداد کو اپنے

قبضہ میں کرلیا ہے اور اگر یہ شخص ہندوستانی شہری کی حیثیت سے اپنی فریاد کرتا ہے تو داد رسی کے بجائے یہ جواب مل جاتا ہے کہ تم کو دفعہ ۱۶ کے تحت درخواست دینے کا حق نہیں ہے۔ میں نے تحریری اور زبانی بھی محترم وزیر بحالیات کو اس ناانصافی کی طرف توجہ دلائی تھی اور وزیر موصوف نے ہمدردانہ غور کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک سیکڑوں درخواستیں مسترد کی جاچکی ہیں اور دفعہ ۱۶ کے تحت متذکرہ کارروائی کرنے کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔

محترم اسپیکر صاحب! آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جو اپنے ہی ملک میں بے گھر ہوگئے ہیں۔ لیکن ان کی بدقسمتی ہے کہ نکاسی ایکٹ کے پیش نظر وہ پناہ گزینوں کی طرح گھروں میں نہیں آسکے۔ اب اس بارے میں کوئی بحث کرنا بے کار ہے۔ جب کہ یہ مسئلہ ہی قریب الختم ہے۔ لیکن کیا یہ انصاف کا تقاضہ نہیں ہے کہ اگر اسی ہندوستان میں چند سو مسلمان ایسے موجود ہوں جو اس قابل نہیں کہ وکیلوں کی فیس دے کر اپنی جگہ سے دلی میں دوڑ کر اور آ آ کر مقدمے کرسکیں تو ایک استثنائی طور پر ان کے ساتھ بھی رفیوجیوں جیسا معاملہ کیا جائے اور ان کو بسانے کا انتظام کیا جائے۔ لیکن سخت افسوس ہے کہ اس طرف توجہ نہیں دی گئی۔

حوادث جبل پور وساگر

۲۱رفروری ۱۹۶۱ءکو ہند پارلیمنٹ میں مجاہد ملت کی حقیقت افروز تقریر

''میں کہتا ہوں کہ جو کچھ آج میں یہاں کہہ رہا ہوں وہی جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس (اجین) میں کہا گیا' میں اس باڈی کا ذمہ دار ہوں' میں ان تجویزوں اور تقریروں کے لیے ذمہ دار ہوں' ان میں کوئی بات نیشنلٹی کے خلاف یا سیکولرازم کے خلاف نہیں کہی گئی' وہاں یہ شکایت کی گئی کہ مسلم اقلیت کو دبایا جارہا ہے' فرقہ پرستی ابھرتی آرہی ہے۔ جو کچھ کہا گیا ٹھیک کہا گیا ہے۔ اگر آج ان باتوں کے حق میں سیٹھ گوند داس جی یا دوسرے ہندو بھائی نہیں بولتے تو پھر مجبور ہو کر حفظ الرحمٰن کو بولنا پڑتا ہے۔ اس میں اعتراض کی کیا بات ہے؟

فرقہ پرستی ابھر رہی ہے اور حکومت بے بس ہے!

درسی کتابوں میں عقائد کی توہین برداشت نہیں کی جاسکتی!''

جناب ڈپٹی سپیکر صاحب!

پریسیڈنٹ کے ایڈریس پر کل سے بات چیت ہو رہی ہے' ملی جلی چند باتیں ہیں جن کو اپنے اپنے خیال کے مطابق ہر ایک پیش کر رہا ہے۔

چین کا رویہ:

جہاں تک چین کا معاملہ ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس کے متعلق مختلف طریقوں سے ہاؤس میں دوسرے وقت میں بھی بحث ہوئی ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے' جس میں دورایوں کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ چین جس کے متعلق ہندوستان نے ہر موقف پر ٹھہراؤ اور ہر موقع پر پورے طریقوں سے اس کا ساتھ دیا۔ اس چین نے' چین کی حکومت نے' موجودہ چین کی کمیونسٹ حکومت نے ہندوستان کے ساتھ بہت بے وفائی کی اور انتہائی شرافت سے گری ہوئی زندگی کا ثبوت دیا۔

ہندوستانی سرحدات کا تنازعہ:

جہاں تک بارڈر کا مسئلہ ہے ہماری حد ایک لمبی لکیر ہے۔ میکما ہن لائن اور اس طرف کشمیر کی وہ حدود ہیں' جو کہ اس ملک کی سرحد تک ہیں۔ چین کی طرف سے بار بار ان کے بارے میں چھیڑ کی جاتی ہے۔ ایسے قدم اٹھائے جاتے ہیں جن سے ہندوستان کے مقصد اور کاز کو نقصان پہنچے۔ ان حدود کو مغلوں کے زمانے سے آج تک بغیر کسی اختلاف کے ہندوستان کی حدود مانا گیا ہے۔ آج ان کے بارے میں بحث کرنا اور ہندوستان کی زمین پر ناجائز قبضہ کی کوشش کرنا اور جس حصہ پر اس نے ناجائز قبضہ کیا ہوا ہے' اس کو اپنے ملک کا حصہ بتانا' یہ ایسی چیزیں ہیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ دنیا میں' دنیا کی زندگی میں جب اخلاق نہ ہو' روحانیت نہ ہو۔ صرف مادیت پیش نظر ہو تو جتنا بھی کچھ ہو وہ کم ہے۔

حکومت ہند کی پالیسی:

ایسے موقع پر اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلے کو حل کرنے کے دو ہی طریقے ہیں یا تو ہم جنگ کریں یا دوسرے طریقوں سے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ آج ہمارے پرائم منسٹر اور ہر ایک عقل مند آدمی یہ سوچتا ہے کہ آج کے زمانے میں یہ جنگ ساری دنیا کی جنگ ہو سکتی ہے اور بڑی بڑی تہذیبیں برباد ہو سکتی ہیں۔ اس لیے ایک دوسرے طریقے سے اس کو حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ گورنمنٹ کی اس پالیسی کو ہم سپورٹ کرتے ہیں اور پورے طریقے سے اتفاق رائے کرتے ہیں کہ ایک طرف وہ مضبوط ہے کہ ایک انچ زمین بھی کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہیں جانے دے گی اور دوسری طرف اس نے ارادہ کر رکھا ہے کہ اگر کسی ملک کی طرف سے کوئی جارحانہ کارروائیاں ہوئیں تو ان کا سامنا کیا جائے اور جو کارروائیاں اس سلسلے میں ہو چکی ہیں ان کو حل کرنے کی کوشش کی جائے گی' اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

کانگو کا مسئلہ:

باہر کے معاملات کے سلسلے میں کانگو پر بحث ہوئی ہے۔ بیشک وہ ایک مظلوم قوم ہے اور مظلوموں کا ساتھ دینا ہمارا شیوہ' ہمارا شعار اور ہماری عادت ہے۔ ہم برابر ایسا کرتے رہے

ہیں اور آج بھی کانگو کے معاملے میں ہم اسی طرف ہیں' جہاں پبلک کا رجحان ہے' وہاں پر بیلجیم کی طرف سے کالونیلزم کا جو غلط' بھیانک اور گھناؤنا مظاہرہ کیا جا رہا ہے وہ ناقابل برداشت ہے۔ وہاں پر ایک فارن (بیرونی) طاقت نے ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصہ کو تباہ کروانے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں مسٹر لومبا اور ان کے کچھ ساتھیوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔

مدھیہ پردیش کے واقعات:

ان باتوں کے متعلق فائیو ایر پلان (پنج سالہ منصوبہ) کے متعلق اور پنچایت راج کے متعلق کہنے کے لیے بہت سے موقع ہیں' کہا جاتا رہا ہے اور کہا جاتا رہے گا۔ لیکن ایک بحث خود بخود ہاؤس کے سامنے آ گئی ہے اور آنی چاہیے تھی۔ میں بھی اس پر کچھ کہنا چاہتا ہوں' مجھے اس بات پر مایوسی ہوئی کہ ۳ر تاریخ سے لے کر ۹ر تاریخ تک جبل پور' کٹنی' ساگر' دموہ' نرسنگھ پور' سروپا اور کتنے ہی مقامات پر فساد ہوئے' اور بربادی ہوئی' آگیں لگیں' مکان برباد ہوئے اور دوکانیں جلائی گئیں اور جان و مال کا نقصان ہوا۔ لیکن ۱۴ر تاریخ کو پریذیڈنٹ صاحب کا جو ایڈریس آتا ہے اس میں ایک لائن بھی اس سلسلے میں ہمارے سامنے نہیں آئی ہے اس میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا کہ اس بارے میں کیا طریقہء کار اختیار کیا جائے گا' جس سے اس قسم کے واقعات پھر نہ ہوں۔ کیوں کہ کسی سیکولر اسٹیٹ کے لیے اس سے زیادہ ندامت اور شرمندگی کی کوئی بات نہیں ہوسکتی کہ وہاں سامپروائیکتا (فرقہ پرستی) اس طرح منہ کھولے کھڑی رہے اور شروع سے آخر تک اس کا سلسلہ کہیں نہ کہیں جاری رہے اور ہم اس کو روک نہ سکیں۔

جبل پور میں ایک واقعہ ہوا ایک انڈیو جول واقعہ۔ ایک انتہائی شرمناک واقعہ ہوا جس کی سزا ذمہ دار کو ملنی چاہیے تھی۔ لیکن ایکش اور ری ایکشن کا یہ مطلب کبھی نہیں ہوسکتا کہ ایک انڈیو جول نے ایک بات کی ہو تو پوری کمیونٹی کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ یہ طریقہء کار کسی طریق سے ملک کے مفاد میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ انتہائی نقصان دہ ہے۔ اس بنا پر یہ بات بہت قابل توجہ ہے کہ پچھلے دنوں میں اسی مدھیہ پردیش میں' بھوپال میں جو فساد ہوا تھا وہاں پر کسی کو سزا نہیں ملی۔ کسی مجرم کو اس کی خطا پر پکڑا گیا۔ کسی غنڈے اور شرارت پسند کو سزا نہیں دی گئی۔ ان حالات میں مختلف مقامات میں فسادات ہوئے ہیں' اور وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم کھلے دل سے من

مانی کر سکتے ہیں' جو کچھ چاہیں کر سکتے ہیں۔ حکومت ہمارے مقابلے میں بے بس ہے اور کچھ نہیں کر سکتی۔ اس کے سوا دوسری کوئی بات نہیں ہے۔

غنڈوں اور شرارت پسندوں کی اسکیم:

میں ایمان داری سے کہہ سکتا ہوں کہ ان فسادات کو ہندو مسلم فسادات کہنا ہندوؤں اور مسلمانوں کی توہین کرنا ہے۔ یہ فساد ہندو اور مسلمان نہیں کرتے ہیں۔ میں آپ سے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہاں کی پبلک جس میں ہندو مسلمان دونوں شامل ہیں۔ آج بھی کانوں پر ہاتھ دھر رہی ہے کہ یہ بلا' یہ مصیبت' یہ عذاب کہیں سے نازل ہوا؟ یہ ہندو مسلم فساد نہیں ہے اور ان کو فرقہ وارانہ فساد کہنا بھی غلط ہے۔ غنڈوں اور شرارت پسندوں نے ایک اسکیم بنائی ہے اور اس اسکیم کے ماتحت وہ جب چاہے تب فساد کرتے ہیں۔ درحقیقت اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جب انکوائری ہوگی تو اس میں یہ بات صاف ہو جائے گی۔

انتظامیہ کی مجرمانہ چشم پوشی:

ایڈمنسٹریشن نے جان بوجھ کر اس میں چشم پوشی کی یا ماتحت پولیس کے افراد نے ساتھ دے کر بربادی کرانے کی کوشش کی۔ اس وقت حکام نے کل حکام نے ایڈمنسٹریشن نے اپنی کمزوری بھی دکھائی اور اس سازش میں ان کا حصہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ بقول سیٹھ جی (سیٹھ گوند داس) کے ۳/۴ تاریخ کو یہ واقعہ پیش آیا تھا اور اس کی روک تھام ہو سکتی تھی! لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اسپیشل پولیس کے جو دستے بلائے گئے تھے وہ کیوں واپس چلے گئے تھے۔ جس کے نتیجے میں ۷/اور ۸/تاریخ کی درمیان رات کو اس قدر ہولناک بربادی ہوئی۔ جان بوجھ کر ایک سائڈ کی اس طریقے سے بربادی کرائی جائے' یہ کسی طریقے سے بھی ہندوستان کے لیے زیبا نہیں ہے۔ ہم پاکستان اور ایوب کے خلاف اعتراض کریں' وہ ہمارا حق ہے کوئی ہمارے معاملے میں دخل نہ دے۔ ہم میں اتنی طاقت ہے کہ ہم اپنے ہندوستان میں اپنے معاملات کو حل کر سکتے ہیں' جنہوں نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں جان کی بازی لگا کر' ساتھ ساتھ شریک ہو کر ملک کو آزاد کرایا ہے' جنہوں نے ''ون نیشن تھیوری'' کو ماننے کے لیے جان کی بازی لگائی ہے' اپنوں سے گالیاں کھائی ہیں' جیلیں بھگتی ہیں' چاقو کھائے ہیں' ان کو آج ان باتوں سے کوئی ڈر نہیں ہو سکتا کہ جب بھی کوئی ایسی فساد کی من مانی بات کی جائے۔ مسلم اقلیت

کی تکلیف کی بات آئے تو اخباروں یا تقریروں میں فوراً پاکستان کے حوالے دے دیئے جائیں۔ پاکستان ریڈیو کے حوالے دیئے جائیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے کہ اس کا پاکستان سے جوڑ تھا۔ اس کا فلاں چیز سے جوڑ تھا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس طریقے سے حقیقت کو دبایا نہیں جاسکتا اور اگر اس طریقے سے حقیقت کو دبانے کی کوشش کی جائے گی تو اس سے ملک کو کوئی لابھ اور فائدہ نہیں ہوسکتا بلکہ ملک کو انتہائی نقصان ہوسکتا ہے۔

یک طرفہ بربادی:

اس حالت میں ہمیں اس بات کا کیا خوف ہے کہ کوئی کہتا ہے اور پاکستان کے ساتھ جوڑنے کا تیکنک کیوں اپنایا جاتا ہے' ہم اس کے خلاف ضرور آواز اٹھائیں گے۔ کیا ہر جگہ ظلم اور بربادی ہوتی رہے گی اور اس کے بارے میں مسلمان اقلیت کسی بات کو کہے گی تو یہ کہہ کر اس کا منہ بند کردیا جائے گا کہ پاکستان سے جوڑ ہے' پاکستان ریڈیو سے جوڑ ہے؟ اس طریقہ سے حقیقت کو دبایا نہیں جاسکتا ہے۔ یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی کہ اس طریقے سے ایک اقلیت کو دبانے کی کوشش کی جائے۔ یہ دیکھنے کی بات ہے کہ جبل پور میں ایک سائڈ کی اس طرح بربادی کیوں ہوئی۔ جبل پور میں دو جانب سے کوئی بات ہوئی ہو مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ پھر یہ بھی بتایا جائے کہ کس طرح ۹ر تاریخ کو ساگر' کٹنی' دموہ' نرسنگھ پور' سروپا اور تمام دیگر مقامات پر ۱۲ سے ۴ بجے تک سازش سے سیکڑوں مکان جلا کر خاک کردیئے گئے۔ کیا پولیس اور ایڈمنسٹریشن کے موجود ہوتے ہوئے کوئی اس طریقے سے بربادی کرسکتا ہے۔ اطمینان کے ساتھ پٹرول چھڑکا گیا' اطمینان کے ساتھ آگ لگائی گئی بڑی بڑی قلعہ نما عمارتیں خاک سیاہ کردی گئیں۔

اقتصادی مار:

ایک ایک انسان کا دس دس بارہ بارہ لاکھ کا نقصان ہوا۔ کالے خاں محمد حنیف کی کوئی معمولی فرم نہیں تھی۔ دس بارہ لاکھ کا اس کا نقصان ہوگیا۔ اس کی بیڑی کی تجارت تھی وہ مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس کو اقتصادی مار مار کر برباد کردیا گیا۔

فیروز آباد میں چوڑیوں کی تجارت تھی۔ وہاں مسلمانوں کی صنعت وحرفت کو تباہ کیا گیا۔ کیا کچھ فرقہ پرست عناصر نے یہ طے کرلیا ہے کہ اس طریقے سے مسلمانوں کو جو موجودہ اکانومکس اور اقتصادیات میں خود بدحال ہیں' اس ملک میں بالکل تباہ کرکے بھکاری اور فقیر بنا

کر چھوڑ دیں اور یہ حکومت بے بس ہو' بے چارہ ہو اور کچھ کر نہ سکے۔ سب کچھ ہو جائے تو پھر اس کی انکوائری ہوتی پھرے اور اس کے بعد یہ کرو' وہ کرو' آخر اتنا بڑا واقعہ ہو کیسے گیا۔ تین ضلعوں میں بارہ جگہ ایسے واقعات کیسے ہو گئے۔ حکومت کو اس پر غور کرنا چاہیے۔

دلی کا واقعہ

مجھے اس کا احساس ہو رہا ہے کہ ان معاملات میں کب تک تسلسل جاری رہے گا۔ کیا پورے ہندوستان کو اس میں لپیٹ دیا جائے گا۔ ابھی دو تین دن پہلے دہلی میں بھی یہی تکنیک چلی تھی۔ لیکن وہاں کے ہندو اور مسلمان' ہم لوگ جو وہاں رہتے ہیں ۱۱ بجے رات کو وہاں پہنچ کر تین بجے تک رہے اور ہندو لیڈروں کے ساتھ جو وہاں موجود تھے اس بات کی کوشش کی کہ اس کو کسی طریقے سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جن کے پاس طاقت' شکتی اور مادی پاور نہیں ہے۔ جب وہ اس طریقے سے اس معاملے کو حل کر سکتے ہیں' تو ایڈمنسٹریشن حکومت کے افراد' لوکل اتھارٹیز اگر چاہیں تو کیا امن قائم نہیں ہو سکتا؟

شر پسندوں کی حوصلہ افزائی:

مگر حکومت بے بس نظر آتی ہے اور شرارت پسند لوگ جو کچھ چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔ آج سب معاملوں میں ان کی مخالفت کرنے کے بجائے ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ زور شور کے ساتھ پارلیمنٹ میں یہ تو کہا جاتا ہے کہ فرقہ پرستی کو کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کیا جائے گا۔ لیکن ہو کیا رہا ہے؟ مسلم اقلیت تباہ بھی ہو رہی ہے اور برباد بھی ہو رہی ہے اور ایکشن اور ری ایکشن کے نام پر شرارت پسند لوگ جو چاہتے ہیں کرتے جا رہے ہیں۔ اس طرح کی باتیں ہونے دینا کسی بھی سیکولر اسٹیٹ کے لیے مناسب نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

مسلم اقلیت کا حال:

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ مسلم اقلیت کا ملازمتوں میں کیا حال ہے۔ کیا آپ نے کبھی اس کی انکوائری کی ہے کہ ان میں اقلیتوں کو کیوں نہیں لیا جا رہا ہے۔ کیا اقلیتوں کے جتنے بھی بچے ہیں۔ مسلمانوں' سکھوں اور عیسائیوں کے جتنے بھی بچے ہیں وہ اتنے نالائق ہو گئے ہیں کہ ان

کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔ اسٹیٹ گورنمنٹس کے گزٹ چھپے ہوئے ہیں' گورنمنٹ آف انڈیا کے گزٹ چھپے ہوئے ہیں' بتایا جائے کہ ان پچھلے چودہ برسوں میں اقلیتوں کے کتنے لڑکے نوکریوں میں لیے گئے ہیں۔ پہلے تو ان کو انٹرویو میں ہی نہیں بلایا جاتا ہے اور اگر بلا بھی لیا جاتا ہے تو ان کو جگہ نصیب نہیں ہوتی ہے۔ وہ تباہ اور برباد ہو رہے ہیں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ یہ ریزرویشن کا سوال نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسے حالات میں ریزرویشن کی بات کہتا ہے یا ریزرویشن کی بات کو اٹھاتا ہے تو اسے فرقہ پرست کہا جاتا ہے اور اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ اس نے ریزرویشن کا لفظ کیوں کہہ دیا۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ سیکولر اسٹیٹ کے وہ لوگ کیا فرقہ پرست نہیں ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو ملازمت میں نہ لیا جائے اور ان کو تباہ اور برباد کیا جائے ان کی اقتصادیات اور ان کے طریقہء زندگی کو ختم کیا جائے۔ آج مسلم اقلیت کو بھی یعنی ایک کمیونٹی کو دبانے کے لیے نہ ملازمت میں لیا جاتا ہے' نہ تجارت کرنے دیا جاتا ہے۔ روزمرہ کی جو شہری زندگی ہے' جو امن کی زندگی ہے' اس تک کو بھی دینے کے لیے وہ تیار نہیں ہیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس سے زیادہ بھی کوئی فرقہ پرستی دوسری ہو سکتی ہے' اس کا کیا مطلب ہے؟ میں یہ نہیں کہتا کہ اکثریت کے سب لوگ برے ہیں۔ ان میں سے تھوڑے برے ہیں۔ اس میں ہندو مسلمان کا کوئی سوال نہیں ہے۔ ہندو مسلمان کا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ دونوں گلے ملنے کو تیار ہیں۔ لیکن چند شرارت پسند لوگ اکثریت میں ایسے ہیں جو کہ اقلیتوں کو اس طرح سے دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ان کی ہاؤس میں بھی مختلف طریقوں سے حوصلہ افزائی کی جائے تو کیا ہوگا' کیسے کام چلے گا' کیسے ہماری اسٹیٹ سیکرلر اسٹیٹ بن سکے گی' آخر سیکولر اسٹیٹ کا مطلب کیا ہے؟ صرف سیکولر اسٹیٹ کہہ دینے سے تو وہ سیکولر اسٹیٹ نہیں بن جاتی! اس کا مطلب یہ ہے کہ روزمرہ کی جو زندگی ہے اس کو بسر کرنے کا سبھی کو حق حاصل ہو۔ ملازمت سبھی کو پانے کا حق حاصل ہو۔ تجارت کرنے کا سبھی کو حق حاصل ہو۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ اقلیتوں کو آج نوکریاں نہین ملتی ہیں' ملک کی اقتصادیات میں تجارت میں پرمٹ نہیں ملتے ہیں۔ فائیو ایر پلاہن میں کوآپریٹو سوسائٹیز کو جو جگہ ملی ہوئی ہے۔ ان کے بارے میں ان کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

نصاب کی کتابیں:

اسی طرح ٹیکسٹ بک کی بات ہے۔ اس کے بارے میں ہم نے ایک شکایت کی تھی اور وزیر تعلیم کو ایک کتاب دکھائی تھی اور انہوں نے ہماری بات کو صحیح تسلیم کیا تھا اور کہا تھا کہ اس قسم کی کتابیں نہیں پڑھانی چاہئیں۔ سوال یہ نہیں ہے کہ تیوہاروں کا ان میں کیوں ذکر کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ دوالی ہی کا' دسہرہ ہی کا کیوں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سب ہندوستان کے تیوہار ہیں۔ کسی کو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ لیکن جہاں اکثریت کے تیوہار کا ذکر ہے وہاں مسلمانوں کے جو تیوہار ہیں' عید ہے' بقرعید ہے' شب برات کیا ہے' محرم کیا ہے؟ یا سکھوں کے تیوہار ہیں' عیسائیوں کے تیوہار ہیں ان کا بھی ان میں ذکر ہونا چاہیے تھا' اگر یہ کیا گیا ہوتا تو سیکولر اسٹیٹ کے اصولوں کے عین مطابق ہوتا۔ لیکن اس کے برخلاف اس طرح کی باتیں ان کتابوں میں لکھی ہوئی ملتی ہیں کہ آ ؤ بچو بھگوان کرشن کی پوجا کریں۔ آپ بتائیں کہ مسلمان بچے یہ کیسے کریں گے؟ بھگوان کرشن کی پوجا ہندو کر سکتے ہیں' لیکن مسلمان سکھ' عیسائی کیسے کر سکتے ہیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس طرح کی چیزیں پڑھانے کا اقلیتوں کے بچوں کو آپ کو کس نے حق دیا ہے؟ مسلمان اپنے خداوند قدوس کی عبادت کرتے ہیں' سکھ اپنے طریقے سے کرتے ہیں۔ عیسائی اپنے طریقے سے' اور ان کو پورا حق حاصل ہے۔ آپ کو کس نے یہ حق دیا ہے کہ آپ دوسرے مذہبوں کی توہین کریں۔ خدا اور رسول کی توہین کریں اور یہ پرچار کریں کہ وہ سب اس طرح کی چیزوں کو پڑھیں۔ آپ کو نہیں چاہیے تھا کہ آپ کتابوں میں اس طرح کے مضامین لکھواتے اور اس طرح کی کتابوں کو ٹیکسٹ بکس میں جگہ دیتے۔ مگر ٹیکسٹ بک کمیٹی نے یہ ارادہ کیا اور اس نے اس طرح کی کتابوں کو چنا' ہمیں معلوم ہے کہ محض بعض رشتہ داروں سے' بعض جاننے والوں سے' اس طرح کی چیزیں لکھوادیں جو اگرچہ تعصب کی بنا پر نہیں لکھی گئیں' تنگ نظری کی بنا پر بھی نہیں لکھی گئی ہوں گی' بلکہ ناواقفیت کی بنا پر لکھی گئی ہیں۔ میں نے ایک لکھنے والے سے اس کے بارے میں پوچھا اس نے بتایا کہ میں اسلام کے بارے میں جانتا نہیں تھا' اس لیے ایسا ہی لکھ دیا ہے۔ چونکہ ٹیکسٹ بک کمیٹی میں کسی کا کوئی رشتہ دار آ گیا تو اس کی سفارش سے یہ کتاب ٹیکسٹ بک میں آ گئی۔ ایسی کتابیں نہیں آنی چاہئیں اور اس طرح کی چیزوں کو اس میں جگہ نہیں ملنی چاہیے۔ اس طرح کی چیزوں کے خلاف ہم بولیں گے۔

سیکولر اسٹیٹ کے اندر اس قسم کی کتابیں، خاص طور پر بیسک ایجوکیشن کے اندر اور پرائمری تعلیم کے اندر ہرگز ہرگز نہیں لگنی چاہئیں، نہیں پڑھائی جانی چاہئیں۔

جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس اجین:

سیٹھ جی نے جمعیۃ علماء کے بارے میں کہا کہ وہ بہترین باڈی ہے اور اس نے ہندوستان کی آزادی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ لیکن اجین میں ایسی تقریریں ہوئی ہیں جن کو پڑھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو کچھ میں آج یہاں کہہ رہا ہوں، وہی سب کچھ وہاں کہا گیا ہے۔ میں اس باڈی کے لیے ذمہ دار ہوں۔ میں اس کی تجویزوں اور اس کی تقریروں کے لیے ذمہ دار ہوں۔ ان میں کوئی بات نیشنلٹی کے خلاف نہیں کہی گئی ہے وہاں پر یہ شکایت کی گئی ہے کہ مسلم اقلیت کو دبایا جا رہا ہے۔ فرقہ پرستی ابھرتی جا رہی ہے اور حکومت بے بس ہوتی جا رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کی باتیں کہنے میں کون سی اعتراض کی بات ہو سکتی ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے ٹھیک کہا گیا ہے۔ ان باتوں کے لیے اقلیت کے حق میں اگر آج سیٹھ جی نہیں بولتے ہیں یا رگھوناتھ سنگھ جی نہیں بولتے ہیں، یا دوسرے ہندوستانی نہیں بولتے ہیں تو پھر مجبور ہو کر حفظ الرحمٰن کو بولنا پڑتا ہے۔ تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اکثریت خود ان چیزوں کو کہتی۔ لیکن اگر وہ نہیں کہتی ہے اور ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ اقلیتیں تکلیف میں ہیں، ان کی یہ مجبوریاں ہیں، وہ بے بس ہیں، تو پھر اس پر کیوں اعتراض ہوتا ہے۔ بہر حال اس طرح کی چیزوں کو برداشت نہیں کیا جا سکتا ہے۔

انکوائری کا مطالبہ:

بیشک اس کی ضرورت ہے کہ انکوائری ہو اور ہائی لیول انکوائری ہو۔ اگر ایڈمنسٹریشن میں کچھ لوگ اس کے لیے ذمہ دار ہیں، انہوں نے کوتاہی کی ہے تو ان کو سزا ملنی چاہیے۔ آج مدھیہ پردیش کی سرکار فیلیور رہوئی ہے۔ بھوپال سے لے کر آج تک کے جو واقعات ہوئے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا چاہیے کہ اسے کوئی حق حاصل نہیں ہے، حکومت کرنے کا۔ اس طریقے سے تباہ کر کے، کرش کر کے، برباد کر کے ہمیں یہاں رکھا جائے گا تو یقینی طور پر اس کے نتائج اچھے نہیں نکلیں گے۔ میں اسپیکر صاحب اور ڈپٹی اسپیکر صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ کوئی قانونی پوزیشن ایسی لائیں۔ جس طرح سے آسام اور بنگال کے معاملات پر لسانی فسادات کی

بنا پر جب یہاں بحث ہوسکتی ہے۔ پارلیمنٹری ڈیلی گیشن وہاں جاسکتا ہے' ویسے ہی مدھیہ پردیش کے فسادات کے بارے میں بھی بحث ہو۔ پی ایس پی نے' جمعیۃ علماء نے' کیمونسٹ پارٹی نے' کانگریس کے افراد نے سبھی نے مانا ہے کہ بہت بڑی تباہی آئی ہے۔ تین ضلعوں کے مختلف حصوں میں۔ اس پر بحث ہونی چاہیے اور کھل کر بحث ہونی چاہیے اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا اور اگر بحث ہو تو صفائی کے ساتھ سارے معاملات سامنے آئیں گے۔

پاکستان کا حوالہ بے معنی:

جو تجویز بھگت درشن جی نے پیش کی ہے اس کی تو میں تائید کرتا ہوں' لیکن جن معاملات کا میں نے ذکر کیا ہے' ان کے بارے میں پھر سے کہتا ہوں کہ پاکستان کا حوالہ دے کر آپ بچ نہیں سکتے ہیں۔ یہ کہہ کر کہ پاکستان کے ساتھ ان کا تعلق ہے' کام چل نہیں سکتا ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ ناگپور ٹائمز میں یہ لکھا ہے' مگر کیا آپ نے اسٹیٹسمین میں جو چھپا ہے اس کو پڑھا ہے' ہندوستان ٹائمز میں جو چھپا ہے۔ اس کو پڑھا ہے' ٹائمز آف انڈیا میں جو چھپا ہے اس کو پڑھا ہے۔ آپ کو چاہیے تھا کہ آپ اس کو بھی پڑھتے جنھوں نے کہا ہے کہ صرف ایک سائڈ ہی کو برباد کیا گیا ہے۔ جو کچھ ہوا ہے اس کا تقاضا تھا کہ وہاں الیکٹو فائنز (اجتماعی جرمانے) لگتے۔ جس طرح کی وارداتیں ہوئی ہیں' ان کو کوئی بھی برداشت نہیں کرسکتا ہے۔ یہ طریقہ زندگی کا نہیں ہے۔ اس طرح کے طریقوں کو بدلنا ہوگا اور صحیح معنوں میں سیکولرازم کو لانا ہوگا۔ گاندھی جی کے بنائے ہوئے اخلاقی معیار اور نیشنلزم کو لانا ہوگا۔ میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ اکثریت میں سبھی لوگ برے ہیں۔ اکثریت میں جو فرقہ پرست ہیں وہ جو کارروائی چاہے کریں' من مانی کریں' خوش رہیں اور جو مسلمان اقلیت میں ہیں یا دوسری اقلیتیں ہیں' ان کو ہمیشہ ہی دبانے کی کوشش کریں اور پاکستان کا حوالہ دے کر اس کو ایک تکنیک کے طور پر استعمال کرکے۔ اس قسم کی حرکتیں وہ کرتے جائیں۔ اس کو کبھی برداشت نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ہم اس کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں' ہاؤس برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے' ممبر صاحبان برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ سب ہی کو اس کے خلاف آواز بلند کرنی ہے اور یہ کوشش کرنی ہے کہ صحیح معنی میں یہاں پر سیکولرازم قائم ہو۔

(۲۱ر فروری ۱۹۶۱ء/۵ رمضان ۱۳۸۱ھ)

امن وامان کا قیام

کانگریسی وزارتوں کی اخلاقی ذمہ داری

پارلیمنٹ میں ۲۹ / مارچ ۱۹۴۱ء کی ایک اہم تقریر

محترم اسپیکر صاحب!

منسٹری آف ہوم افیرز کے بارے میں کئی دن سے بحث جاری ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا یہ محکمہ بہت ہی اہم ہے۔ ملک کے امن وامان کا تعلق اسی سے ہے اور لوگوں کی معاشی زندگی اور سروسز کا تعلق بھی اسی سے ہے۔ میں بہت افسوس کے ساتھ مجبور ہوں' چند ایسی باتیں گزارش کرنے پر جن کے بارے میں جی چاہتا تھا کہ وہ باتیں اگر پیش نہ آتیں تو آج مجھ کو ہاؤس میں نہ کہنی پڑتیں۔

عام بدانتظامی اور لاقانونیت:

جہاں تک لا اینڈ آرڈر کا تعلق ہے' جہاں تک ملک کے امن وامان کا تعلق ہے' جہاں تک لوگوں کے جان ومال اور آبرو کا تعلق ہے' اس معاملے میں ۱۹۴۷ء سے لے کر اس وقت تک ہم محسوس کررہے ہیں کہ ایک لاء لیس نیس (لاقانونیت) پیدا ہو چکی ہے اور ملک میں صحیح معنوں میں مضبوطی اور قوت کے ساتھ لاء اینڈ آرڈر پر عمل نہیں کیا جارہا ہے اس میں کسی ایک فرقے کا سوال نہیں ہے۔ ہندو' مسلمان' سکھ' عیسائی' پارسی جتنے بھی بستے ہیں۔ آج کل ایسی زندگی ہوگئی ہے کہ ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ ملک میں ایک چیونٹی کی قیمت تو ہو سکتی ہے لیکن انسان کے جان ومال اور آبرو کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ یہ بات بہت خطرناک اور تکلیف دہ ہے اور اس بارے میں یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ اسٹیٹ گورنمنٹوں کا کام ہے کہ وہ اپنے اپنے مقاموں پر ان چیزوں کا لحاظ کریں۔ گورنمنٹ آف انڈیا کی منسٹری آف ہوم افیرز کی ذمہ داری یہ نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سب سے بڑی ذمہ داری منسٹری آف ہوم افیرز کی ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اسٹیٹس

کی ہوم منسٹریوں کے کام کو خاص طور سے چیک کرے۔ وہ دیکھے کہ وہاں کس طرح سے کام ہو رہا ہے اور لوگ اپنے جان و مال اور آبرو کے بارے میں کیوں یہ محسوس کرتے ہیں کہ آج ہم آزاد اور محفوظ نہیں ہیں۔ میں حفظ الرحمٰن ہونے کی حیثیت سے یہ گناؤں کو پچھلے تیرہ برسوں میں کتنے فسادات ہوئے ہیں۔ ان فسادات میں اقلیتوں اور خاص طور پر مسلم اقلیت کا کتنا نقصان ہوا ہے۔ کتنی تباہی ہوئی ہے۔ تو یہ ایسی چیز ہے کہ جبل پور اور ساگر نے اس کو بالکل ننگا کر دیا ہے۔ واقعات اس طرح ہوئے ہیں کہ آج ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری خواہش ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہاؤس کی بھی یہی خواہش ہے کہ کم سے کم لاء اینڈ آرڈر کے بارے میں ایسی مضبوط پالیسی اختیار کی جائے کہ جس سے اسٹیٹس گورنمنٹس بھی اگر ہٹنے کی کوشش کریں تو ہٹ نہ سکیں۔ اسٹیٹس گورنمنٹ میں خاص طور پر جتنے بھی حضرات ہوم منسٹر ہیں اگر ان میں کوئی ایسی کمزوری ہے کہ وہ اس طرح کی چیزوں کو سنبھال نہیں سکتے ہیں تو یہ ان کا فرض ہے' ان کی ڈیوٹی ہے ان کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ مستعفی ہو جائیں اور اگر وہ ناکام ثابت ہوئے ہیں تو اس طرح کرسیوں پر بیٹھے نہ رہیں۔

ہمارے سامنے شری لال بہادر شاستری جی کی مثال موجود ہے۔ جب وہ ریلوے وزیر تھے تو کئی بار ایکسیڈنٹس ہوئے تھے جس طرح سے کہ اور منسٹریوں کے بارے میں ہوتے رہتے تھے لیکن ایک سخت ایکسڈنٹ ہو جانے کے بعد انہوں نے اپنے آپ استعفیٰ دے دیا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ میں ذمہ داری کے ساتھ کام کرنے کی کوشش کروں اور اگر عام طور پر کامیاب نہیں ہوں تو مجھے اس جگہ پر نہیں بیٹھے رہنا چاہیے۔ لیکن بڑے بڑے فسادات ساگر میں' دموہ میں' کٹنی میں' جبل پور میں ہو جائیں اور جو منسٹر ہیں وہ اسی طرح بیٹھے رہیں۔ کرسیوں پر قائم رہیں اور لوگوں کی جان و مال اور آبرو برباد ہوتے دیکھتے رہیں' یہ ان کے لیے کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ چاہے یہ اقلیتوں کا سوال ہو یا اکثریت کا۔ ہمیں سبھی کی حفاظت کرنی ہے اور خاص طور پر اقلیتوں کی تو پوری قوت اور مضبوطی کے ساتھ کرنی ہے۔ میں یہ ایمان داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ پورے ملک کا سوال ہے۔ ملک کی آزادی کا سوال ہے' ملک کے وقار کا سوال ہے' ملک کی شانتی کا سوال ہے ملک کی سالمیت کا سوال ہے' میں چاہتا ہوں کہ اس طرف خاص طور پر توجہ دی جائے۔

سرکاری ملازمین اور مسلمانوں کا تناسب:

سروسز کا جہاں تک تعلق ہے میری گزارش ہے کہ میں نے پچھلی تقریر میں بھی اس طرف توجہ دلائی تھی کہ آپ مجھ سے فیگرز (اعداد و شمار) نہ مانگیں۔ بلکہ آپ کو اس بات کا پتہ ہونا چاہیے کہ ان چودہ سالوں میں گزٹیڈ پوسٹس اور نان گزٹیڈ پوسٹس میں اقلیتوں کے لوگ اور خاص طور پر مسلمان کس حد تک لیے گئے ہیں۔ مسلمانوں کے بارے میں کہہ چکا ہوں کہ ان کو ان کا حق نہیں ملا ہے' ان کے ساتھ بالکل بھی انصاف نہیں کیا گیا ہے۔ ان کو بالکل اگنور کر دیا گیا ہے۔ بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ آپ اپنے گزٹ اٹھا کر دیکھیں کہ کتنے مسلمان ملازمتوں میں لیے گئے ہیں۔ بجائے اس کے آپ مجھ سے مطالبہ کریں کہ میں فیگرز آپ کو دوں! یہ سرکاری گزٹ موجود ہیں' ان سے سارے فیگرز آپ کو مل جائیں گے۔ ہزاروں کی تعداد میں جگہیں نکلتی ہیں اور میں جاننا چاہتا ہوں ان میں کتنے مسلمان لیے جاتے ہیں۔ میں نے پچھلی بار کہا تھا کہ آپ یہ نہیں فرما سکتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے بعد تمام مسلمان نا قابل ہو گئے ہیں' نا اہل ہو گئے ہیں۔ اگر ایسی بات نہیں ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان کو ملازمتوں میں نہیں لیا جاتا اور کیا وجہ ہے کہ ان کے ساتھ تعصب برتا جاتا ہے؟ آخر انہیں اسی ملک میں رہنا ہے یہیں جینا ہے اور یہیں مرنا ہے تو وہ کہاں روزی پائیں اور ان کے نوجوان کہاں جائیں اور کس طرح سے اپنے آپ کو برباد ہوتے دیکھتے رہیں۔ قابل سے قابل نوجوان مسلمان ہوتے ہیں۔ فرسٹ ڈویژن میں وہ آتے ہیں۔ فرسٹ ڈویژن یونیورسٹی میں ان کی آتی ہے' لیکن کوئی ان کو دوکوڑی کو نہیں پوچھتا ہے اور جب اس طرح کی کوئی شکایت کی جائے تو ہم سے فیگرز مانگتے ہیں' یہ کہاں تک مناسب ہے' کیا یہ ممکن ہے کہ میں تمام ہندوستان میں گھوم کر تمام گزٹ جمع کروں اور آپ کو فیگرز بتاؤں؟ گورنمنٹ آف انڈیا کے آفس میں اس کا سکریٹریٹ ہے۔ صوبوں میں اسٹیٹس میں سکریٹریٹ ہیں آپ ان کا ریکارڈ ملاحظہ فرمائیں تو آپ کو پتہ چل جائے گا۔

ایک الزام اور اس کا جواب:

مسلمانوں کی نسبت یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ وہ ملازمتوں کے لیے درخواستیں نہیں دیتے ہیں۔ انٹرویو میں نہیں آتے ہیں۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اگر کبھی ایسا ہوا ہے کہ کوئی انٹرویو میں نہیں آتے ہیں۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اگر کبھی ایسا ہوا ہے کہ کوئی انٹرویو میں نہیں گیا ہے تو وہ مجبوری کی وجہ سے نہیں گیا ہے۔ اس لیے کہ بہتر سے بہتر پوزیشن کے باوجود چودہ چودہ مرتبہ

درخواستیں دینے کے باوجود اگر اس کو انٹرویو تک میں نہیں بلایا گیا اور وہ مایوس ہو گیا ہے تو یہ ایک نیچرل سی بات ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس طرف خاص طور سے آپ کی توجہ جائے۔

ایک اور بات میں مختصر طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں! ایک وقت تھا' جب ریلوے ملازموں کے بارے میں اور ساتھ ہی دوسرے ملازمتوں کے لیے کچھ ایسے احکام ہوئے تھے اگر سی آئی ڈی ان کی رپورٹ کر دے تو ان کو ملازمت سے الگ کر دیا جائے۔ اگر کسی کی ایکٹوٹیز خراب ہوں تو اس کے بارے میں ایسا کیا جاتا تھا لیکن جب سی آئی ڈی نے اس کا غلط استعمال شروع کیا تو ہم نے ایسے معاملے سردار پٹیل کے سامنے پیش کے اور ان سے خاص طور پر کہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے کہ سی آئی ڈی جس کے بارے میں چاہے اس کے بارے میں بے دلیل کوئی چیز لکھ دے اور اس کو نوکری سے برطرف کر دیا جائے کیا یہ کوئی مسئلے کا ٹھیک حل ہے۔ اس وقت سردار پٹیل نے کہا تھا کہ کیبنٹ نے متفقہ طور پر طے کر دیا ہے کہ سی آئی ڈی کا لکھ دینا کافی نہیں ہو گا۔ جب تک کہ وہ برابر اس کے بارے میں ریزنز اور دلیلیں نہ دے کہ فلاں فلاں ایکٹوٹیز اس نے دیکھی ہیں جو قومی نقطہ نظر کے لیے مضر ہیں اور جب تک یہ نہیں ہو گا ان کے خلاف کارروائی نہیں کی جائے گی۔ لیکن پچھلے دنوں سے ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ یہی طریقہ چل رہا ہے کہ مسلمانوں کو جماعت اسلامی کا ممبر بتا کر اور کبھی فرقہ پرست ایکٹوٹیز بتا کر تنہا سی آئی ڈی کی رپورٹ پر جس میں کوئی ریزن اور دلیل نہیں دی گئی ان کو الگ کر دیا گیا۔

شری تیاگی (دہرہ دون) کیا ایسا ہوا ہے؟

مولانا حفظ الرحمٰن: سات کیسز میرے پاس ہیں۔ جن میں تین کیس بڑی مشکل سے ٹھیک کرا سکا ہوں چار کیسز ابھی بھی جاری ہیں۔ خدا جانے اور ہندوستان میں اس طرح کے کتنے کیسز ہوں گے یہ تو وہ کیسز ہیں جو میری نظر میں آئے ہیں۔ بہار میں عتیق کا معاملہ تھا جو کہ ڈیڑھ پونے دو سال کے بعد بڑی جدوجہد کے بعد ٹھیک ہوا۔ کوئی ناجائز کارروائی اس نے نہیں کی تھی' لیکن ایک لفظ سی آئی ڈی نے لکھ دیا کہ وہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھتا ہے اور وہ برخاست کر دیا گیا۔ راجستھان کا کیس موجود ہے اور وہ چل رہا ہے اور اس طرح سے خدا جانے اور کتنے کیس ہوں گے۔ ایک پلان کہیے یا ایک ٹکنیک کہیے جب چاہتے ہیں کسی کو جماعت اسلامی کا ممبر بتا کر یا کسی اور بنا پر برطرف کر دیا جاتا ہے۔ باقی سارے کے سارے چاہے وہ جن سنگھ سے تعلق رکھتے ہوں یا ہندو مہا سبھا سے ان کو برداشت کر لیا جاتا ہے۔ اور ان

پر کوئی الزام نہیں لگایا جاتا۔

یہ پہلا موقع ہے جب مسلم اقلیت کی تباہی کے بارے میں جبل پور' ساگر وغیرہ کے واقعات سے متاثر ہو کر اس ہاؤس کے ہندو' مسلم' سکھ' پارسی وغیرہ سبھی ممبر صاحبان نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ یہ بہت بھاری زیادتی ہوئی ہے اور بہت ہی برا ہوا ہے۔

الجمعیۃ کا اداریہ:

اور بہت سی جماعتوں نے اسٹیٹمنٹس (بیانات) دیئے بھی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہوتا کیا ہے کہ اس ہاؤس میں بعض بھائی ہیں جو چاہتے ہیں کہ اس کو ہلکا کرنے کے لیے الٹا مسلم اقلیت ہی کو مجرم قرار دیا جائے۔ کبھی جمعیۃ علماء کا نام لیا جاتا ہے کبھی الجمعیۃ اخبار پڑھ کر سنایا جاتا ہے۔ اس اخبار نے کیا لکھا ہے؟ ایک دھرم کا کوئی قصور نہیں' آرگنائزر کا کوئی قصور نہیں ہے' اس قسم کے اخبارات جو مسلمانوں کو انتہائی طور پر ذلیل کرتے رہتے ہیں ان کو پاکستانی بتاتے رہتے ہیں اور صاف لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے' ان کے رہنے کے لیے کوئی مقام نہیں ہے' ان کو یہاں نہیں رہنا چاہیے اور اسی طرح جن اخبارات میں قتل تک کی دھمکیاں لکھی جاتی رہی ہیں' ان کا کوئی جرم نہیں ہے' اس میں اتنا ہی تو لکھا ہے کہ جب تم تباہ و برباد ہو رہے ہو تو تم قانون کا احترام کرتے ہوئے ہر جگہ پر ڈٹ کر رہنے کے لیے جتنا مقابلہ کر سکتے ہو کرو۔ اس میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ قانون ہاتھ میں لے لو' قانون کا احترام مت کرو۔ لیکن یہ ضرور کہا گیا ہے کہ مایوس نہ ہو ڈیمورالائز نہ ہو ڈٹ کر ڈیفنس کرو۔ ایسا کرنا تمہارا حق ہے۔

فرقہ پرست صحافت کا رویہ:

میں پوچھتا ہوں کہ اس میں کون سی بری بات ہے جو لکھی گئی ہے یہاں پر الجمعیۃ کے تراشے پڑھے جاتے ہیں۔ میرے پاس بیسوں تراشے ہیں جن کو میں پڑھ کر سنا سکتا ہوں۔ وقت نہیں ہے کہ سبھی کو میں پڑھ کر سناؤں۔ لیکن ایک دو کٹنگ میں پڑھ کر سنانا چاہتا ہوں۔ پرتاپ میں جو یہ لکھا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کبھی مسلمانوں کو پاکستانی بنایا جاتا ہے اور کبھی اور کسی طرح سے اشتعال دلایا جاتا ہے۔ اس میں لکھا ہے:

"رہ گیا سوال مسلمانوں کی وفاداری کا۔ اس کا جواب ہندوستان کے

مسلمان خود دے سکتے ہیں اور افسوس سے کہا جائے گا کہ ان کے دل میں آج بھی پاکستان کے لیے ہمدردی ہے۔''

آگے چل کر اس نے لکھا ہے:

''پچھلے دنوں بیدر کے شہر میں مسلمانوں نے کھلے بندوں پاکستانی جھنڈا لہرایا اور پاکستان کے حق میں نعرے لگائے' اس سے پہلے ایسا ایک واقعہ مدراس میں بھی ہو چکا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی سوال کی جائے گا کہ کیوں مسلمانوں پر شک کیا جا رہا ہے''

حالانکہ یہ سب الزامات غلط ثابت ہو چکے ہیں' ایک جگہ وہ فرماتے ہیں:

''مولانا صاحب نے یہ بھی مطالبہ کر دیا کہ نوکریوں میں مسلمانوں کے لیے جگہ مخصوص ہونی چاہیے' گویا کہ مولانا صاحب بھی اپنے آپ کو ہندوستانیوں کا نمائندہ تصور نہیں کرتے بلکہ صرف مسلمانوں کا' ایسی حالت میں اگر فرقہ پرستی زور پکڑ جائے تو کیا تعجب ہے''

آگے چل کر لکھا ہے۔

''کیا یہ واحد واقعہ ہے اپنی قسم کا' کیا روزمرہ ایسے واقعات نہیں ہو رہے ہیں؟ ابھی پچھلے دنوں دہلی میں اس طرح کا ایک واقعہ ہوا کیا پردھان منتری بتائیں گے کہ یہ کیوں اور کیسے ہوا اور اس کی بابت سرکار نے کیا کیا؟ کیا یہ امر واقعہ ہے یا نہیں کہ جبل پور کے واقعے کے بعد ناگپور میں ایسا ہی واقعہ ہو اور شہر کی پولیس کے آشواسن پر پورا ایک ہفتہ اس واقعہ کو شائع نہ کیا گیا۔ کیا واقعہ ہے یا نہیں کہ پچھلے ری پبلک دوس پر ناسک ضلع کے مالی گاؤں کے مسلمانوں نے پاکستانی جھنڈا لہرایا۔ بیدر میں جو کچھ ہوا اس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ جب سرکار نے ان مسلمانوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی تو لوگوں کو ہڑتال کرنا پڑی۔ فیروز آباد میں ایک مسجد سے جنم اشٹمی کے جلوس پر پتھر پھینکے جاتے ہیں۔ جبل پور میں مسجد سے گولی چلائی جاتی ہے اور تیزاب سے بھرے بلب پھینکے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ ایک واقعہ ہو تو اسے نظر انداز کریں' لیکن جب یکے بعد دیگرے ایسے واقعات ہو رہے ہے

ہوں اور پولیس حرکت میں نہ آئے کیوں کہ اوپر بیٹھے کانگریسی وزیروں کو مسلمانوں کی دوٹیں چاہئیں اور اس لیے وہ مسلمان غنڈوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرسکتے۔''

ایک جگہ فرماتے ہیں:

''فرقہ پرستی اور پنڈت نہرو!
کانگریس ورکنگ کمیٹی اعلان کرتی ہے کہ جبل پور کے واقعات کی تحقیقات کی جائے گی۔ بے شک یہ ہونی چاہیے' لیکن یہ بھی تو بتادیا جائے کہ آسام کے حالیہ فسادات کی تحقیقات کیوں نہ کی گئی! کیا جبل پور کے واقعات کی تحقیقات اس لیے ہونی ہے کہ اس میں ہندوؤں کو بھی رگڑا جاسکے گا اور آسام کی اس لیے نہیں کہ وہاں کانگریس حکومت کی نالائقی اور کانگریسوں کی جانبداری منظر عام پر آئے گی۔ یہ دوعملی ہے جو کانگریس کو بدنام کرتی ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ آسام کے بدمعاشوں کو تو معاف کردیا جائے کیوں کہ وہ کانگریسی ہیں اور جبل پور میں لوگوں کو دھرلیا جائے کیوں کہ وہ کانگریسی نہیں؟ یہ نہیں ہوسکتا کہ بدمعاشوں کی تو حوصلہ افزائی کی جائے اور فرقہ پرستوں کو سزادی جائے' ملک کے کسی بھی کونے میں اگر ایک بھی قصوروار کو معاف کی جائے گا تو اس کا اثر ملک کے چالیس کروڑ باشندوں پر ہوگا۔ حکومت کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ پنڈت نہرو اور ان کے ساتھیوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے اپنے عمل سے فرقہ پرستی بڑھ رہی ہے اور یہ اس لیے بڑھ رہی ہے کہ فرقہ پرست یہ دیکھ رہے ہیں کہ نہرو حکومت میں ان بدمعاشوں کو کوئی پوچھنے والا نہیں جو کانگریسی ہیں یا کانگریسیوں سے وابستہ ہیں۔ تخریبی عناصر سب ایک ہیں چاہے یہ جبل پور میں رہتے ہوں اور چاہے آسام میں۔''

جمعیۃ علماء ہند پر الزام تراشی:

اس طرح کی اشتعال انگیز تحریریں مسلمانوں کے خلاف لکھنا کیا فرقہ پرستی نہیں ہے اور

کیا یہ ٹھیک ہے یہ کون سا طریقہ ہے' اس سے امن و امان کیا قائم رہ سکتا ہے' کس طرح اس کا تحفظ ہوسکتا ہے' یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جس جمعیۃ علماء کے لاکھوں آدمیوں نے اپنی جان و مال کی قربانیاں دے کر ہندوستان کو آزاد کرانے میں حصہ لیا ہو' سیکولرازم نیشنلٹی قائم کرنے کے لیے جدوجہد کی ہو' سیکولرازم کی خاطر ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور اپنا خون بہایا ہو' آج اسی کو بدنام کیا جائے؟

اگر ایک ایسے موقع پر جب مسلمانوں کی یہ بربادی ہوئی اس نے دو چار آرٹیکلس ایسے لکھ دیئے جس میں کہ مسلمان بالکل ڈیمورالائز نہ ہو جائیں۔ بے بس نہ ہو جائیں تو وہ فرقہ پرستی ہے اور صبح سے شام تک جو آگ ان کے خلاف برسائی جائے اسے کوئی فرقہ پرستی نہیں کہتا۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

سچ کہا ہے کسی شاعر نے:

جب کوئی فتنہ زمانے میں نیا اٹھتا ہے
وہ اشارے سے بتا دیتے ہیں تربت میری

مسلمانوں کو بدنام کرنے کا رویہ

سارا قصور جو ہے وہ مسلمان بیچارے کا ہے۔ اس ہندوستان میں جب سے پارٹیشن ہوا ہے' مسلمان سے زیادہ غنڈہ' مسلمان سے زیادہ بے ایمان اور غیر وفادار کوئی ہے ہی نہیں۔ یہ کس قدر افسوسناک پہلو ہے۔ لیکن اس میں ہماری ہوم منسٹری کی طرف سے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا گیا' جس سے اقلیتوں کو خاص طور پر مسلمان اقلیتوں کو یہ خیال پیدا ہو کہ ہم بھی اس ملک کے برابر کے باشندے ہیں' ہم سیکولر اسٹیٹ کو مانتے ہیں' ہم نے بھی اپنی جانیں دی ہیں۔ آج کسی فرقہ پرست کو اس ملک سے کیسے محبت ہوسکتی ہے۔ جب انگریز کی گولیاں چل رہی تھیں تو یہ سب کنڈی اور کواڑ بند کیے بیٹھے تھے۔ آج ہوسکتا ہے ان کو اپنے ملک سے محبت نہ ہو لیکن جنہوں نے ۳۲ء میں چاندنی چوک میں کھڑے ہو کر مسٹر علی سپرنٹنڈنٹ سے کہا تھا کہ گولی مار سکے تو مار دو مگر آزادی کا عہد نامہ ضرور پڑھا جائے گا۔ اور جو لوگ ملک کی خاطر جیلوں میں سڑ سکتے ہیں' ان سے زیادہ ملک کا دوست کون ہوسکتا ہے؟ مگر آج وہ سارے فرقہ پرست ہیں۔

ان کے اخبار فرقہ پرست ہیں اور وہ لوگ جو کانگریس یا نیشنلسٹ جماعتوں کے صدقے میں اس آزاد ملک میں بیٹھے ہیں اور ہمیشہ فرقہ پرستی برتتے رہے ہیں وہ الٹے دوسروں کو بدنام کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ مگر یہ سب کیوں ہے' مجھے اس سے شکایت نہیں ہے' مجھے ہوم منسٹری سے شکایت ہے' مجھ کو اس کی شکایت ہے کہ اسٹیٹو ں کے اندر جو ہوم منسٹر آپ مقرر کرتے ہیں ان کے کام کو دیکھا نہیں جاتا۔ اسٹیٹ کے اندر اگر آپ لا اینڈ آرڈر کی ذمہ داری کسی کو دیں تو آپ کو چیک کرنا ہوگا کہ وہ صحیح طور پر عمل کر رہا ہے یا نہیں۔ ساری ذمہ داری آپ کے اوپر ہے اسٹیٹ کے اوپر نہیں۔ اگر اسٹیٹ گورنمنٹس اس طرح کرتی ہیں تو وہاں کانگریس کی گورنمنٹیں ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اخلاقی طور پر وہاں سے مستعفی ہوں اور اگر استعفیٰ نہ دیں تو آپ ان کو اس کرسی سے ہٹا کر کہیں وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ذمہ داری لے سکیں۔

انکوائری انتظامیہ کی مسلمان کو دھمکیاں:

آج جبل پور میں جوڈیشل انکوائری ہو رہی ہے۔ ہمارے سامنے یہ آیا تھا کہ وہاں تین آدمی اس کے لیے رکھے جائیں گے ایک بنچ ہوگی جس میں کوئی نہ کوئی سپریم کورٹ کا جج ہونا چاہیے تھا' جس میں خود مدھیہ پردیش کا جج ہونا چاہیے تھا۔ ایک جج صاحب بیچارے آئے۔ میں ان کے خلاف کچھ نہیں کہتا وہ ٹھیک ہی ہوں گے لیکن ایک گوالیار کے جج صاحب مقرر کر دیئے گئے' وہ بھی اس حالت میں کہ جبل پور اور ساگر کے سارے حکام جنہوں نے ان مسلمانوں کو تباہ کرنے میں حصہ لیا ہے یا چشم پوشی برتی ہے' وہ سب وہاں موجود ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے' اپنے کانوں سے سنا ہے' آج بھی وہ حکام کہہ رہے ہیں کہ اگر ہمارے موافق مسلمانوں نے گواہی نہ دی تو ان کا وارنٹ کاٹ دیا جائے گا اور وہ جیل میں بھیج دیئے جائیں گے۔ آج ان میں سے کسی کا تبادلہ نہیں ہوا ہے۔ ایسی حالت میں لوگوں کو کیسے انصاف ملے گا۔ اگر جوڈیشل انکوائری ہو تو اس میں مہربانی کر کے باہر کے جج رکھے جائیں۔ ایک سپریم کورٹ کا جج ہونا چاہیے۔ ایک ساؤتھ کا جج ہونا چاہیے۔ گوالیا کے جو صاحب موجود ہیں' وہ بھی رہیں لیکن تمام احکام کا ٹرانسفر لازمی ہے۔ ورنہ یقینی طور پر اس انکوائری سے کبھی بھی انصاف نہیں ہو سکتا اور ہم کبھی مطمئن نہیں ہو سکتے اور کوئی بھی انصاف پسند ہندو مسلمان مطمئن نہیں ہو سکتا۔ یہ میں ہی نہیں کہتا بلکہ انصاف پسند ہندو کہتے ہیں' سکھ کہتے ہیں کہ یہ کیا انکوائری

ہے، جس کے اندر ایک آدمی گوالیار سے اٹھا کر بٹھلا دیا گیا اور تمام کے تمام حکام پولیس اور ایڈمنسٹریشن وہی جما بیٹھا ہوا ہے جو کہ لوگوں کو ہیریس کر رہا ہے اور مسلمانوں کو دھمکاتا ہے کہ تمہارے اوپر مقدمہ چلا دیں گے اور تمہارا یہ کر دیں گے، وہ کر دیں گے آخر اس طرح سے کیسے انصاف ملے گا اور کیسے صحیح گواہ لائے جاسکتے ہیں۔ اس کا انتظام نہیں ہوا تو کیسے کام ہوگا؟

شری تیاگی: کیا آج بھی وہ کام کرتے ہیں؟

مولانا حفظ الرحمٰن: جی ہاں! وہی لوگ ہیں۔

شری ایس ایم بنرجی (کانپور): کیا کسی کا تبادلہ نہیں ہوا ہے؟

مولانا حفظ الرحمٰن! سب اسی طریقے سے قائم ہیں۔ جب تک جبل پور سے وہ نہیں ہٹیں گے، تب تک کسی طرح کا انصاف ملنا ناممکن ہے۔ اگر میں اس چیز کو یہاں نہ کہوں، ہاؤس میں نہ کہوں، اپنے ہوم منسٹر سے نہ کہوں، جن کا ہم احترام کرتے ہیں، جو ہمارے معاملات کو صحیح کرنے میں کوشش کرتے ہیں۔ تو کس سے کہوں۔ ہم ان سے ضرور کہیں گے۔ میں اس موجودہ پوزیشن سے مطمئن نہیں ہوں۔ میں ہاؤس کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر یہی طریقہ جاری رہے گا تو اس طرح سے اطمینان نہیں مل سکتا۔ بھلے ہی آپ اپنا ڈھنڈوا پیٹے رہیں کہ ہم سیکولرازم اسٹیٹ ہیں! کوئی عقل منداس بارے میں مطمئن نہیں ہوسکتا۔

ہم جان دینے کے لیے تیار ہیں۔ اگر ہندوستان سے باہر کا کوئی ملک آنکھ بدل کر ہندوستان کو دیکھے۔ گولیوں کے سامنے بھی ہم سینہ تانے رہیں گے، لیکن ان کے برعکس ہم اس طریقے سے مسلمان اقلیت کو برباد اور تباہ نہیں دیکھ سکتے۔ یہ طریقہ آپ کو بدلنا ہوگا۔ انصاف دینا ہوگا۔ صحیح طور پر انتظام کرنا ہوگا اور مجھ جیسے بولنے والے کو یہ کہہ کر چپ نہیں کیا جاسکتا کہ ایسی باتیں کرنا فرقہ پرستی ہے۔ اگر مجھ پر ہزاروں فرقہ پرستیوں کا لیبل بھی لگا دیا جائے تو وہ میری قوم پرستی کو خاک میں نہیں ملاسکتی بلکہ میری قوم پرستی کی آگ میں خود ہی بھسم ہو جائے گی۔

جمیعۃ العلماء ہند کی ضرورت اور اس کی خدمات

جمیعۃ علماء ضلع گڑگانوہ کی مجلس عاملہ کے اجلاس سے مجاہد ملت کا خطاب

۹ / اکتوبر ۱۹۵۴ء کو فیروز پور میں جمیعۃ علماء کی مجلس منتظمہ کا ایک روزہ اجلاس ہوا۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی آمد سے فائدہ اٹھا کر مقامی کانگریس نے حضرت مولانا کی تشریف آوری کی خوشی میں ایک عصرانہ دیا۔ جس میں مولانا نے ایک تقریر بھی کی۔ مجلس منتظمہ کے جلسہ میں میوؤں کے متعلق کئی قراردادیں بھی منظور کی گئیں۔

تقریر شروع کرتے ہوئے حضرت مولانا نے جلسہ میں اپنی موجودگی پر اظہار مسرت کیا اور کہا کہ میرا جی چاہتا تھا کہ آج ۱۹۴۷ء سے اب تک کی ساری کہانی آپ کو سنا دوں کیوں کہ اس طرح ہم آنے والے زمانے کے لیے ایک راہ عمل متعین کر سکیں گے۔ تاریخ اسی کا نام ہے۔ قرآن نے پچھلے واقعات کو اسی نقطہ نظر سے بیان کیا۔ تاریخ اسی لیے بیان کی جاتی کہ انسان اس سے سبق حاصل کر کے اپنے مستقبل کو روشن کرے۔

مولانا نے فرمایا مجھے یاد ہے کہ سب سے پہلے جس وقت میں فیروز پور جھرکہ پہنچا اس وقت میں آپ میں سے بہت کم لوگوں سے واقف تھا۔ لیکن جب میں نے یہ سنا کہ میوات میں گولیاں چل رہی ہیں تو مجھ سے نہ رہا گیا اور ناواقفیت کے باوجود جیپ میں بیٹھ کر یہاں پہنچ گیا۔ میں نے اس وقت دیکھا کہ یہاں چاروں طرف لاشیں نظر آ رہی ہیں۔ اس وقت مجھے لوگوں نے یہاں آنے سے روکا تھا۔ لیکن میرا احساس فرض مجھے یہاں کھینچ لایا۔ یہ واقعات میں نے صرف اس لیے بیان کیے ہے کہ آپ مجھے نیا نہ سمجھیں کہ آپ کی حالت اور مشکلات سے واقف نہیں ہوں۔ آپ کی تمام مشکلات اور سارے حالات کا مجھے علم ہے اور ان کو دور کرنے میں میں اور میرے ساتھی برابر کوشش کرتے رہے ہیں' خدا کے فضل سے حالات پہلے سے بہتر ہو گئے ہیں۔ آپ نے میرے اور میرے ساتھیوں کی آمد پر سپاسنامہ پڑھا۔ اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ یہ بات میں رسمی طور پر نہیں کہتا بلکہ اپنے قلبی جذبات کا اظہار کرتا ہوں اور خدا سے دعا

کرتا ہوں کہ آپ نے میرے متعلق جس حسنِ ظن کا اظہار کا۔ وہ مجھے ویسا ہی بنا دے۔"

میری زندگی کا ایک مشن ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اپنی مشکلات بیان کرو۔ ان کو دور کرنے کے لیے میدان میں اتر جاؤ' شکایات کرو' اپنی مشکلات ضرور بیان کرو لیکن مایوس نہ ہو مایوسی کا تصور بھی نہ آنے دو۔ مایوسی موت ہے۔ مایوسی سے عملی زندگی معطل ہو جاتی ہے۔ لاتیئسو من روح الله. اللہ کی مہربانی سے مایوس نہ ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ دکھی ہیں۔"

سپاسنامہ میں چودھری صاحب وغیرہ نے جو کچھ کہا وہ سب سر آنکھوں پر ہے۔ مگر نا امید نہ ہو جیے۔ حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں۔ حالات بہت کچھ بدلے ہیں اور بہتر ہو گئے ہیں۔ خدا کے فضل سے ہم بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ ہم نے پچھلے حالات میں صرف کھانا پینا اور عیش کرنا سیکھا تھا۔ لیکن حالیہ واقعات سے ہمیں ایک جھٹکا سا لگا۔ ہماری آنکھیں کھل گئیں۔ ہم نے صبر و استقلال کی مثال پیش کی کہ آنے والی نسلیں ہمیں یاد رکھیں گی اور عزت و احترام سے ہمارا نام لیں گی۔

میو قوم۔ ہندوستان کی ریڑھ کی ہڈی:

مولانا نے ۱۹۴۷ء کے واقعات ذکر کرتے ہوئے میواتیوں کو یاد دلایا کہ گاندھی جی نے گھاسیڑے کے میدان میں گوپی چندر بھارگو سے کہا تھا کہ میو ہند کی ریڑھ کی ہڈی ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی اہمیت کو گاندھی جی نے بھی تسلیم کیا تھا۔ اور آپ کی امداد بحالی کو وہ بھی بہت اہم سمجھتے تھے۔ اور اس پر زور دیتے تھے۔ گاندھی کے اس قول نے جتنا اثر کیا وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ آج اسے آپ بھی محسوس کر رہے ہیں۔ گاندھی جی اور کانگریس کی خدمات کا اقرار کرنا چاہیے۔ بہت کچھ ہوا اور بہت کچھ ہونا باقی ہے' وہ ہو کر رہے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ مگر آپ ہمت نہ ہاریں کسی اور طرف نہ دیکھیں۔ پاکستان کی طرف نظر نہ اٹھائیں۔ حکومت ہماری مشکلات دور کرے گی۔ یہ بات صرف ہمارے لیے نہیں بلکہ سارے ملک کے لیے ضروری ہے۔ ہم بھیک نہیں مانگتے کوئی ہمارا آقا نہیں۔ ہم خود آقا ہیں۔ ہم اپنا حق مانگتے ہیں۔ حکومت مجبور ہو کر ہمیں ہمارے حق دے گی۔

مسجدوں کا مسئلہ:

آپ اپنی بات کہتے ہیں میں دہلی کے واقعات بتاتا ہوں وہ تو راج دھانی ہے' جہاں دنیا

بھر کے ملکوں کے سفیر بیٹھے ہیں۔ وہاں بھی بعض مساجد مقفل ہیں لیکن میں مایوس نہیں ہوں، نقشے میں بارہ آنے رنگ بھرا جا چکا ہے۔ چار آنے رنگ بھرنا باقی ہے۔ جب میں اس بات کو دیکھتا ہوں تو میری ڈھارس بندھ جاتی ہے۔ اور ہم خدا کے فضل پر بھروسا کرتے ہوئے اپنے وزیر اعظم اور اپنی سیکولر حکومت کے قانون کی بنا پر امید رکھتے ہیں کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب ہم اپنے حالات پر پورا قابو پالیں گے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی مشکلات کا احساس محکمہ بحالیات کو بھی ہے۔ اور وزیر اعظم کو بھی، لیکن جس طرح ہمیں کچھ مشکلات درپیش ہیں۔ اسی طرح حکومت کے راستے میں بھی مشکلات حائل ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ مشکلات بہت جلد دور ہو جائیں گی۔

جمعیۃ علماء کی تنظیم:

جمعیۃ علماء کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مولانا نے فرمایا ۱۹۴۷ء کے بعد ملک میں مختلف جماعتیں تھیں۔ میں نے جمعیۃ علماء کے سکریٹری کی حیثیت سے اور ایک مسلمان کی حیثیت سے کئی دن اور کئی راتیں اس فکر میں گزاریں کہ بدلے ہوئے حالات میں مسلمانان ہند کے لیے جمعیۃ علماء سے بہتر کوئی جماعت ہو سکتی ہے؟ میں دیانت داری کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچا کہ آج کل کے حالات میں مسلمانان ہند کے لیے جمعیۃ علماء سے بہتر کوئی جماعت نہیں ہو سکتی۔ غور کیجئے، اگر مسلمان کسی فرقہ پرست جماعت میں شامل ہوں گے۔ تو اکثریت میں فرقہ پرستی بڑھے گی۔ اور نئے نئے شبہات پیدا ہوں گے۔

بدلے ہوئے حالات میں فرقہ پرستی کی کوئی گنجائش نہیں۔ آج کے حالات میں ایسی کوئی جماعت کامیاب نہیں ہو سکتی جو فرقہ پرست ہو۔ اکثریت میں بعض فرقہ پرست جماعتیں ہیں لیکن اگر مسلمانوں نے بھی یہ راستہ اختیار کیا تو یہ جماعتیں زیادہ مضبوط ہو جائیں گی۔ غرض جس لحاظ سے بھی سوچیے سیاسی پارٹیاں سب فرقوں کی مشترک ہونی چاہئیں، البتہ مختلف فرقوں کی الگ الگ مذہبی اور ثقافتی جماعتیں بن سکتی ہیں۔ ہندوستان کے دستور نے ہمیں اس کی اجازت بھی دی ہے کہ مذہبی تعلیم کی حفاظت کے لیے اپنی علیحدہ مذہبی جماعتیں منظم کریں۔ ان حالات کے پیش نظر جمعیۃ علماء پر غور کیجئے۔ اس کا ایک شاندار ماضی ہے۔ زمانہء حال میں اس کے سامنے ایک جامع پروگرام ہے۔ جمعیۃ علماء نے جنگ آزادی میں حصہ لیا ہے۔ اس کا

ماضی بہت تابناک ہے۔ اس کی خدمات بہت درخشاں ہیں' اس پر فرقہ پرستی کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ اگر کوئی شخص ایسا کہتا ہے تو اسے حماقت سمجھنا چاہیے۔ سمجھدار آدمی جانتے ہیں کہ یہ جماعت جو کچھ کہتی ہے فرقہ پرستی کے جذبے سے نہیں کہتی بلکہ ملک کی تعمیر اور استحکام کے جذبہ سے کہتی ہے۔

وقف بل

اس کے بعد حضرت مولانا نے جمعیۃ علماء کی خدمات پر روشنی ڈالی اور ایک مبسوط اور مدلل تبصرہ میں بتایا کہ:

''وقف بل پارلیمنٹ میں منظور کرالیا گیا ہے جواب صدر جمہوریہ کی منظوری کے بعد ایکٹ بن چکا ہے۔ مشرقی پنجاب میں وقف بل کے نفاذ سے آپ کی تمام تعلیمی اور سماجی مشکلات دور ہو جائیں گی۔ اس کی آمدنی سے آپ کے بہت سے مسائل حل ہوں گے' اوقاف کی آمدنی بربادی سے محفوظ رہے گی۔ اور آپ کی تعلیمی اور دوسری ضروریات کے کام آئے گی۔ وقف بل کے نفاذ سے زمین کے مسئلے کے سوا مساجد اور اوقاف کے مسائل حل ہوجائیں گے۔''

آپ نے بڑھتی ہوئی پارٹی بازی کی مذمت کی۔ اور اس کے نقصانات پر روشنی ڈالی آپ نے فرمایا:

''صرف نکتہ چینی سے مشکلات دور نہیں ہوسکتیں اپنے دماغ کو صاف کر کے خلوص سے مذہبی اور قومی خدمت کرنے کی ضرورت ہے آپ جس مشترکہ سیاسی جماعت میں چاہیں شامل ہوں لیکن مذہبی تعلیم اور اوقاف کی تنظیم کے کام میں جمعیۃ علماء کا ساتھ دیں اور فرقہ پرست جماعتوں سے الگ رہیں۔ اس بات کا خیال رکھئے کہ ذاتی اغراض میں پھنس کر جماعتی زندگی کو نقصان نہ پہنچے آپ تعمیری نکتہ چینی کیجئے۔ اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ لیکن تخریب نہ کیجئے اور اسے ناقابل معافی جرم سمجھئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ حضرات نے سر جوڑ کر کام کیا تو آپ اپنی مشکلات پر قابو پالیں گے۔ لیکن اگر آپ پارٹی بندی کے جھگڑوں میں الجھے رہے تو آپ سخت نقصان اٹھائیں گے۔

میں آپ سے پھر کہتا ہوں کہ آپ اپنی مشکلات ضرور بیان کیجئے' ان کو دور کرنے کے لیے جدوجہد بھی کیجئے' مگر مایوسی سے بچئے' اور مشکلات سے مغلوب نہ ہوجیئے۔

سبق آموز ارشادات

مجاہد ملت کی ایک تقریر سے چند اقتباسات

ماضی کی تاریخ اس لیے سامنے لائی جاتی ہے کہ پچھلے واقعات کو سامنے رکھ کر مستقبل کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے۔ جو قومیں صرف پدرم سلطان بود کہہ کر زندہ رہنا چاہتی ہیں' وہ دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتیں۔ اسی طرح جو قومیں ماضی کے واقعات کے سامنے نہ رکھیں وہ بھی اپنا مستقبل بہتر نہیں بنا سکتیں۔ اس لیے ہمیں یہ بتانا ہے کہ ان تین دنوں میں اس پلیٹ فارم پر سے جو کچھ کہا جائے گا اور مسلمانوں کے جو معاملات اور حالات سامنے لائے جائیں گے ان کا فرقہ پرستی سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوسکتا۔ آج بہت سے آدمی خاص کر ہندو مہا سبھا اور جن سنگھ ایسے ہیں جو ہمارے اوپر فرقہ پرستی کا الزام لگاتے ہیں اور ایسا الزام لگانا بہت آسان ہے' لیکن ملک کے دستور اور انصاف کے تقاضوں کے لیے بہت ضروری ہے اور ملک کا قانون ہمیں اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ہم اپنی مشکلات کو بیان کریں اور ان کو دور کرنے کا مطالبہ کریں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ فرقہ پرستانہ بات ہے ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ ملک کی آزادی حاصل کرنے والوں نے جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے ہمیشہ بلالومتہ لائم جس بات کو حق سمجھا ہے کہا ہے اسی لیے آج انہیں حق ہے کہ وہ ان معاملات کو سامنے لائیں جن سے مسلمانوں کو تکلیف پہونچ رہی ہے آج جو ان کو فرقہ پرست کہتے ہیں ان سے زیادہ جاہل کوئی شخص نہیں ہے۔

اگر جمعیۃ العلماء ہند و مسلمانوں کے معاملات اس نظر سے دیکھتی ہے کہ قومی حکومت میں مسلمانوں کا کیا مقام ہونا چاہیے تو اس کو پورا حق ہے۔ ملک کا بٹوارہ ایک پولیٹکل بات تھی۔ بٹوارے کے لیے ہندو جماعتوں کو بھی دوش دیا جاسکتا ہے۔ مسلم لیگ اور ہندو مہا سبھا کو بھی دوش دیا جاسکتا ہے' لیکن اب جو لوگ ہندوستان میں بس رہے ہیں' یہاں کے چالیس کروڑ باشندے ہیں جو ایک بہتے ہوئے سمندر کی طرح ہیں' ان میں ہندو بھی ہیں' پارسی بھی ہیں' سکھ

بھی ہیں اور عیسائی بھی ہیں۔ ان سب کا یہ حق ہے کہ وہ یہاں امن اور عزت سے رہیں اور اگر مسلمان بھی یہ بات کہیں کہ وہ بھی اپنے اس ملک میں باعزت مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اسے فرقہ پرستی کہہ کر دبایا نہیں جاسکتا۔ جو تعلق اس ملک سے یہاں کی اکثریت کو ہے' وہی اقلیت کو بھی ہے۔ جہاں تک ملکی آزادی کا تعلق ہے' یہ فرقہ پرست کیا ہمارے مقابلے میں آسکتے ہیں' جمعیۃ کے خدام نے تو اس وقت انگریز کی گولیوں کا مقابلہ کیا جب فرقہ پرست بہت بزدلی اور گھبراہٹ کے ساتھ کنڈیاں بند کئے بیٹھے تھے آج ہماری قربانیوں سے ملک آزاد ہے' فرقہ پرست ہمیں طعنہ دیں' ان کی یہ بے وقوفی ہے۔

مساوی حقوق:

آج ملک آزاد ہے سب کو برابر کا حق ہے' لیکن ہم ان باتوں کو کہتے ہوئے ڈرتے ہیں خود دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں کو اس درجہ ڈی مورالائز کر دیا گیا ہے' اس درجہ احساس کمتری اور خوف میں مبتلا کر دیا گیا ہے کہ وہ ان باتوں کو کہتے ہوئے جھجکتے ہیں' چاروں طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے ہیں کہ ہماری اس بات سے ہندو خوش ہوگا یا نہیں۔

ہم اس ملک میں رہنے والے ساڑھے چار کروڑ مسلمان یہاں اس لیے نہیں ہیں کہ کسی کی چاپلوسی کریں یا یہ سمجھیں کہ اس سے ہندو خوش ہوگا یا پنڈت نہرو خوش ہوں گے' اگر جمعیۃ کے خدام کے دل میں ایک منٹ کے لیے بھی ایسا خیال گزرے تو میں کہوں گا کہ اس سے بڑی بزدلی اور نفاق کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ ہم کہتے ہیں کہ جس طرح یہ ملک اکثریت کا ہے' اسی طرح اقلیت کا بھی ہے۔ جس طرح ہندو کا ہے' اسی طرح مسلمان کا بھی ہے۔ جس طرح پنڈت نہرو کا ہے' اسی طرح حفظ الرحمٰن کا بھی ہے۔ یہ ایک جمہوری ملک ہے۔

سیکولرازم:

۱۴ برس گزر گئے کہ ہم نے اپنا سیکولر آئین بنایا۔ سیکولر کے معنی بہت سے لیے جاتے ہیں۔ کوئی اس کے معانی لادینی حکومت لیتا ہے۔ کوئی ایسی حکومت کے لیتا ہے جو تمام مذاہب کو ختم کر دے گی۔ لیکن ہم اس کی تعبیر یوں کرتے ہیں کہ مذہب کی بنیاد پر یہاں کا دستور اور قانون ملک کے بسنے والوں کے مابین کوئی تفریق نہیں کرے گا۔ اس ملک میں بسنے والی چھوٹی سی چھوٹی ۳ آدمیوں کی اقلیت کو بھی وہی حق حاصل ہوگا جو یہاں کی نوے فی صدی اکثریت کو

حاصل ہوگا۔ مذہب یا کسی اور بنیاد پر کسی کا حق نہیں دبایا جائے گا۔ ہم نے یہ دستور اپنے لیے بنایا ہے اور اسی دستور نے یہاں کے ہر بسنے والے کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنا دستوری حق طلب کرے۔ ہمیں اس بات کا طعنہ کیوں دیتے ہو کہ پاکستان میں تو سیکولر دستور نہیں ہے۔ ہم نے پاکستان بننے سے پہلے پاکستان کی مخالفت کی' ہم آخر تک تقسیم وطن کے خلاف رہے' لیکن جب کہ پاکستان ایک ملک بن گیا ہے' ہم بھی کہتے ہیں کہ پاکستان والے اپنے ملک میں خوش رہیں ان کے کسی فعل کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی۔ ہم پر تو صرف اپنے فعل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہم نے ایک سیکولر جمہوری نظام کو اپنایا ہے۔ یہاں کا ہر بسنے والا برابر کا حق رکھتا ہے۔ جب یہ حقیقت ہے تو ہم جائزہ لیں کہ پارلیمنٹ میں جو قانون بنایا وہ ہم پر کسی کا رحم وکرم نہیں ہے۔ وہ ہندوستان کی وہ تاریخ ہے جس کے پیچھے اگر جلیاں والہ باغ ہے تو قصہ خوانی بازار بھی ہے۔ جب بات یہ ہے تو کوئی طعنہ نہیں دے سکتا کہ مسلمان مطالبات کی بحث کیوں کرتا ہے۔ ہر شخص کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہوگا کہ ساڑھے چودہ فیصد تو بہت ہوتے ہیں اگر کوئی ساڑھے چار فی صد آدمیوں کا معمولی سا فرقہ بھی ہے تو اسے بھی حق ہے کہ وہ اپنے حق کے لیے آواز بلند کرے اور اسے اس کا حق دینا ہوگا۔

تاریخ دہرائی جارہی ہے:

وقت آ گیا ہے کہ تاریخ کے اس موڑ پر ہم کھل کر بحث کریں کہ ملک کی آزادی کو ۱۴ برس گزر گئے ہیں لیکن مسلمان اور مسلم اقلیت مسلسل پریشان ہے ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیوں؟

پریشانی کا علاج:

اس مسلسل پریشانی کو دور کیا جا سکتا ہے۔ آیئے غور کریں کہ کس طرح؟ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک بات کا تعلق آپ سے ہے اور دوسری بات کا تعلق برادران وطن سے ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کا اپنا ایک ذہن ہے اور وہ ذہن یہ ہے کہ یہ ہمارا بھی اسی طرح وطن ہے اور اس ملک پر ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کسی دوسرے کا۔ جس طرح ان کو رہنے کا حق ہے اسی طرح ہم کو رہنے کا حق ہے۔ اس سلسلے میں میں ایک مثال دیا کرتا ہوں اس سے پہلے بھی یہ مثال میں عرض کر چکا ہوں لیکن بات کو سمجھنے کے لیے یہ بات بہت ضروری ہے اس لیے عرض کرتا ہوں۔ یہ میرا جسم ہے اس کے بہت سے حصہ ہیں۔ پیر ہیں' ہاتھ ہیں' سر ہے'

دل ہے' دماغ ہے' جگر ہے۔ ہر ہر حصہ کا اپنا اپنا مقام ہے۔ بلاشبہ سر کو یہ حق ہے کہ وہ کہے میں سب سے اوپر ہوں۔ دل کو یہ حق ہے کہ وہ کہے کہ میرے دم سے خون کی گردش کا نظام باقی ہے۔ دماغ کو حق ہے کہ وہ دعویٰ کرے کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تو مجھی سے قائم ہے۔ ہاتھ پیروں کو حق ہے کہ وہ اپنا اپنا راگ گائیں' لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ سب خوبی اور بڑائیاں اسی وقت تک ہیں جب تک کہ یہ تمام اعضاء ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک جسم ہیں' پھر یہی نہیں بلکہ اس جسم کی حالت تو یہ ہے کہ ایک معمولی سے ناخن میں ایک پھانس چبھ جاتی ہے تو دیکھو کیا حال ہوتا ہے؟ نہ دل کو چین ہے' نہ دماغ کو سکون' نہ ہاتھ کو راحت ہے' نہ پیر کو آرام' سارا جسم ہی اس درد سے بے چین رہتا ہے۔ پس اس ملک کی مثال بھی ایک جسم کی مثال ہے اس میں رہنے بسنے والے اس کے ہاتھ پاؤں اور دل دماغ ہیں۔ ہمارے ہندو بھائی شوق سے اس جسم کا اپنے کو دل و دماغ کہہ لیں' اس کے ہاتھ پیر بن جائیں' لیکن یہ یاد رکھیں کہ اگر ناخن کے برابر بھی کسی اقلیت کے سینہ میں ذرا سی پھانس چبھنے لگی تو وہ بھی چین اور آرام محسوس نہ کریں گے۔ ہمیں یہ شوق نہیں کہ ہم اس جسم کے دل و دماغ کہلائیں۔ اپنی بڑائی جتائیں۔ لیکن ہم ضرور بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہم کو کیا ہم سے کم اقلیت کو بھی کوئی تکلیف پہونچے گی تو سارا جسم اس وقت تک درد میں مبتلا رہے گا' جب تک اس پھانس کو نکال نہ دیا جائے گا۔ آج ہم یہی کہہ رہے ہیں کہ ہمیں ان ۱۴ سالوں میں مسلسل پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہے' ان پریشانیوں کو دور کیا جائے ورنہ سارا جسم درد اور بے چینیوں میں مبتلا رہے گا۔ اس درد کا علاج ڈھونڈنا ہوگا۔ اس تکلیف کو دور کرنا ہوگا۔

حب وطن:

یہ دیش ہمارا دیش ہے' یہ ملک ہمارا ملک ہے' اس کے ذرے ذرے سے ہم کو محبت ہے۔ اس وجہ سے محبت ہے کہ وطن کی محبت ہمارا مذہبی فریضہ ہے' میرا مذہب مجھے بتاتا ہے کہ وطن کی محبت ایمان کا جز ہے۔ ایک حدیث میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب ہجرت فرما رہے تھے تو شہر مکہ معظمہ کی طرف بار بار دیکھتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ اے مکہ تو مجھے اتنا عزیز ہے کہ اگر میری قوم مجھے نہ نکالتی تو میں تجھے ہرگز نہ چھوڑتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وطن سے محبت رکھنا ایمان کی علامت ہے' اس لیے میں کہتا ہوں کہ ہمیں سوچنے کا

ڈھنگ بدلنا ہے' ہمارا ملک آزاد ہے۔ آج اقلیت کی درخواست رحم و کرم کی درخواست نہیں ہے۔ ہم کسی سے بھیک نہیں مانگ رہے ہیں ہم اپنا حق مانگ رہے ہیں۔ ہر شہری کو ہر ایک چھوٹے بڑے کو ہر افسر کو یہ حق ہے کہ وہ اپنا جائز حق مانگے۔ ہمیں اپنے حق کو حاصل کرنے کے لیے کچھ طاقت بنانی ہے' وہ طاقت توپ اور بندوق کی طاقت نہیں ہے۔ وہ ایٹم بم اور راکٹ یا میزائل کی طاقت نہیں ہے۔ وہ طاقت ہے اس دل کی' یاد رکھیں! جس کے پاس دل کی طاقت ہے اسے کوئی طاقت نہیں دبا سکتی۔

اس طاقت سے ہمیں اپنے حقوق کے لیے لڑائی لڑنی ہے۔ اس ملک کے تمام معاملات کا ہم سے تعلق ہے۔ اس ملک میں اگر کوئی کمزوری ہے تو ہم اسے دور کریں گے۔

ہم تماشائی بن کر اس کا تماشا نہیں دیکھیں گے۔

شیخ الاسلام کے خلاف لیگیوں کا توہین آمیز رویہ

چند تاریخی بیانات

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا احتجاج

میں سفر میں تھا کہ لیگی اخبارات میں اس توہین آمیز سلوک کی تفصیلات پڑھیں، جو صدر جمعیۃ علماء شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی کے ساتھ لیگیوں نے روا رکھا۔ یہ غیر اسلامی، قابل نفرت و حقارت اور یہ بداخلاقی کے مظاہرے ناقابل برداشت ہیں اور ہمارے صبر وضبط کے لیے بڑی آزمائش ہے۔

سیاسیات سے جدا بھی حضرت مدنی کے لاکھوں عقیدت مندوں میں اس طرز عمل کے خلاف نفرت اور بے چینی کے جذبات مشتعل ہو رہے ہیں۔ میں جمعیۃ علمائے ہند کی ذمہ دارانہ پوزیشن میں مسٹر جینا اور لیگ کی ہائی کمانڈ کو وارننگ دیتا ہوں کہ وہ جلد از جلد اس مذموم طریق عمل کے خلاف لیگی حلقوں کو تنبیہ کر دیں، ورنہ اس کے نتائج بد کی تمام تر ذمہ داری مسٹر جینا اور لیگ کی ہائی کمانڈ پر ہوگی۔

چوں کہ الیکشن کا زمانہ قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے اور تمام جماعتیں اپنے نمائندگان کے لیے پروپیگنڈا کرنے میں مصروف ہیں۔ اس لیے میں حکومت ہند اور گورنر جنرل کو بھی متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ اس قسم کی ناپاک غنڈہ گردی کے خلاف اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں، ورنہ من جملہ دیگر امور کے یہ صورت حال بھی اس حقیقت کے لیے روشن دلیل سمجھی جائے گی کہ حکومت آزادی خواہ جماعتوں کے خلاف لیگ کی غنڈا گردی کی حمایت کو اپنے مقاصد کے لیے مفید سمجھتی ہے۔

(کاروان احرار) مرتبہ جانباز مرزا (جلد ۶)، لاہور، ۱۹۸۲ء ص ۳۶۸)

نوٹ: اکتوبر کے آغاز میں سید پور کے سفر کے دوران لیگیوں نے حضرت شیخ الاسلام کے ساتھ نہایت توہین آمیز رویہ اختیار کیا تھا اور قتل کر ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اس موقع پر مجاہد ملت نے یہ بیان دیا تھا (ا۔س۔ش)

دہلی میں فرقہ پرستوں کی سرگرمیاں

ایک سوال:

کیا میں یہ پوچھنے کا حق رکھتا ہوں کہ جب انڈین نیشنل کانگریس اور حکومت ہند نے کسی پس وپیش کے بغیر یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ انڈین یونین کی حکومت ایک سیکولر (غیر مذہبی) اسٹیٹ ہوگی تو اگر میں سچا کانگریس مین اور قوم پرور خادم ہوں تو کیا میرا یہ فرض نہیں ہے کہ میں اس کو عملی شکل دینے میں حکومت اور قومی جماعت کا پورا پورا ساتھ دوں۔ اگر حکومت ہند اور کانگریس کے اس صاف فیصلہ کے بعد کسی فرقہ کے فرقہ پرست افراد اپنی عددی اکثریت کے بل بوتے پر دوسرے کسی فرقہ کو مرعوب' خوف زدہ اور پامال کرنے کے لیے ایک ہی قسم کے حیلے بہانے تراش کر اس ملک میں ظلم کا رواج کرنا چاہیں تو کیا مجھ کو اس لیے خاموش ہو جانا چاہیے کہ یہ زیادتی ایک ایسے فرقہ پر ہو رہی ہے جو میرا ہم مذہب ہے؟

ایک اور پتہ کی بات:

میں تو ہندوستان میں اس ہندو راج کو بھی خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہوں' جو ہندو دھرم کے صحیح اصولوں کے مطابق قائم کیا جائے۔ اس لیے کہ میرا یقین ہے کہ ہندو دھرم کے صحیح اصول کبھی بھی اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ محض اس بنا پر کہ مسلمان اقلیت میں ہیں' دوسرا مذہب رکھتے ہیں یا ان کے ہم مذہبوں نے دوسرے ملک میں ہندو' سکھوں پر زیادتی کی ہے اس لیے ہندو سکھ یہاں کے بے قصور مسلمانوں پر طرح طرح کی زیادتیاں کر کے ان میں خوف وہراس پیدا کریں۔ ان کو مرعوب کرنے کی کوشش کریں اور جھوٹے الزامات کا بہانہ بنا کر ان کی عزت وآبرو کو مٹائیں اور اس پر فخر کریں! (جولائی ۱۹۴۹ء)

بھوپال کے فسادات

مدھیہ پردیش کی راجدھانی بھوپال میں پچھلے ہفتہ جوافسوسناک حوادث پیش آئے ان کو سرسری یا اتفاقی واقعہ کہہ کر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ چند ہی روز پہلے مبارک پور اور بعض دوسرے مقامات میں فرقہ پرستی اور لاقانونیت کے کھیل کھیلے جا چکے تھے۔ ان سے متصل ہی بھوپال بھی فتنہ وفساد کا اکھاڑہ بن گیا اور وہاں بھی وہ سب کچھ ہوا جس کا اعادہ و بیان نہایت تکلیف دہ اور شرمناک ہے۔

اخبارات میں کچھ خبریں دیکھنے کے بعد مجھے اس کا موقع بھی ملا کہ ۴؍اپریل کو خود بھوپال پہنچ کر وہاں کے عوام وخواص اور مختلف حلقوں سے پیش آمدہ واقعات کی تحقیق کی اور ان کے پس منظر میں ان اسباب ومحرکات کا بھی کچھ ادراک کرلیا جنہوں نے کسی سوجھے بوجھے مقصد کی خاطر فتنہ وفساد کی آگ بھڑکائی اور بے گناہ عوام کی زندگی اجیرن کردی۔

فسادات کی وجوہ:

مدھیہ پردیش میں سیاسی اقتدار کے لیے مختلف گروپوں کی باہم کش مکش کسی وقت بھی ایسے حادثات کو جنم دے سکتی تھی۔

اس کے ساتھ بھوپال میں ''تہوار سبھا'' کے گزشتہ انتخابات سے فرقہ پرست عناصر کی بے اطمینانی اور بیزاری بھی ایک بڑا سبب تھی کہ بھوپال کو یہ روز سیاہ نصیب ہوا۔

اسباب وعوامل کے سلسلے کی تیسری کڑی افسوس کہ خود لاینڈ آرڈر کے ذمہ دار یا حکومت کی مشنری بھی ہے جس کے پرزوں پر ابھی تک احساس وفرض منصب کا نکھار پوری طرح روشن نہیں ہوسکا ہے۔ یا جن میں فرقہ واریت کا پٹرول ابھی تک خشک نہیں ہوا ہے کہ ہر آنچ کے ساتھ وہ خود بھی تیزی کے ساتھ بھڑکنے لگتے ہیں۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ پرسٹیج کا معاملہ بھی آج کی دنیا میں اہمیت رکھتا ہے۔ حکومت کے لیے یہ آسان نہیں ہے کہ وہ اس پوائنٹ کو برملا تسلیم کرے۔ لیکن بھوپال کے درو دیوار کی

خاموش گواہی کو جھٹلانا بھی دشوار ہے۔ افسوس کہ واقعات کی ترتیب اور ہنگاموں کی نوعیت صاف بتاتی ہے کہ مقامی حکام اور پولیس اسٹاف کی یک طرفہ دل چسپیاں ہنگاموں میں برابر شریک رہی ہیں۔

شرمناک اور اندوہناک:

جس ملک میں اقلیت واکثریت کا چولی دامن کا ساتھ ہو' وہاں حکومت کی مشنری فرقہ واریت کے زہریلے جراثیم سے پاک نہ ہو تو امن وانصاف کا نظام آخر کب تک قائم اور محفوظ رہ سکے گا۔

پس اخباری بیان میں واقعات کی تفصیل پیش کر کے کوئی مفید مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے تفصیلات تک جائے بغیر میں صرف اسی پر اکتفا کروں گا کہ بھوپال میں جو کچھ ہوا وہ بہت اندوہناک اور مدھیہ پردیش کی حکومت کے لیے انتہائی شرم وندامت کا ایک داغ ہے۔ ان ہنگاموں میں اقلیتی فرقے کو جس طرح برباد اور مرعوب کیا گیا وہ ہماری اخلاقی گراوٹ اور دماغی افلاس وپستی کا ایک افسوسناک مظاہرہ تھا' جس سے اس عظیم ملک کی نیک نامی اور وقار کو صدمہ پہنچا۔ ہم سب ہی کو اپنی اپنی جگہ سوچنا چاہیے کہ آج آزادی کے بارھویں سال میں بھی اگر ہمارے اخلاق وکردار کا یہی ریکارڈ رہا اور فرقہ پرستی کا بھوت اب بھی ہمارے سروں سے دور نہ ہوا تو ہمارے مخلص رہنماؤں کی وہ تمام کوششیں جو وہ اس عظیم دیش کو خوش حال اور دنیا میں سربلند ونیک نام بنانے کے لیے مسلسل انجام دے رہے ہیں' رائیگاں رہیں گی اور انسانیت کے کنبے میں ہم کبھی بھی کوئی عزت کی جگہ نہ پا سکیں گے۔

نقصانات اور پولیس کا جابرانہ رویہ:

میں نے دہلی واپس پہنچ کر بعض اخبارات میں دیکھا کہ بھوپال کے مالی نقصانات کا اندازہ ایک ارب یا ایک کروڑ روپے تک ہے۔ یقیناً یہ بہت ہی مبالغہ اور واقعہ کے خلاف ہے جو صحیح واقعات پر برا اثر ڈال سکتا ہے۔ مالی نقصان کتنا بھی ہو اس درجے تک نہیں پہنچ سکتا اور اس پر بھوپال کے مسلمانوں کو اپنے مالی نقصانات اور بربادیوں کا اتنا احساس نہیں ہے جتنا انہوں نے مقامی پولیس کی لاقانونیت اور جابرانہ تشدد وتوہین کی چوٹ کو محسوس کیا ہے۔ اس لیے بھی کہ یہ رمضان المبارک کے ایام تھے اور پولیس کی تمام زیادتیوں کا شکار بھوکے پیاسے

روزہ دار ہوئے۔

ہتھیاروں کی برآمد کا افسانہ:

اس بیان کو ختم کرتے ہوئے ایک جملہ ان ہتھیاروں کے متلق بھی کہوں گا جو مسلمانوں کے قبضے سے برآمد ہوئے اور سرکاری اعلانات کے تحت پریس میں ان کا ڈھنڈورا پیٹا گیا۔ یہ کچھ دستور سا ہو گیا ہے کہ ہر ایسے موقع پر مسلمانوں کو جرم وقصور کے گھیرے میں کھینچنے کے لیے ان کے قبضے سے ہتھیار برآمد کر لیے جاتے ہیں۔ بھوپال میں بھی یہی ہوا۔ لیکن آپ حیران نہ ہوں یہ سن کر کہ اس ایٹمی دور میں یہ ہتھیار چاقوؤں اور گھریلو استعمال کی چھریوں سے زیادہ کچھ نہ تھے۔

اسی قسم کے ہتھیار ۴۷ء میں نئی دہلی کے سینٹرل سیکریٹریٹ میں ایک صاحب نے لارڈ مونٹ بیٹن کو دکھائے تھے۔ بھوپال میں یوں بھی رام پوری چاقوؤں کا عام رواج ہے۔ ان کا منشا کسی کی جان لینا اور خون کی ندیاں بہانا نہیں ہوتا' پھر بھی ایسے موقعوں پر اسلحہ یا ہتھیار کے نام سے پروپیگنڈہ کرنا اس پست ذہنیت کی طرف غمازی کرتا ہے جو یقیناً فرقہ پرستی اور ایسے ہنگاموں کی پرورش کرتی ہے۔ اور وہی دراصل ہمارے ملک کی سب سے بڑی مصیبت ہے۔

(اپریل ۱۹۵۹ء)

ملکی سالمیت اور قومی یک جہتی

جمعیۃ علماء ہند کا اہم کردار

ہندوستان کی جنگ آزادی کی تحریک میں جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ روشن اور شان دار رہی ہے۔ آزادی سے قبل کے دور میں جمعیۃ علماء نے قومی سالمیت کو برقرار رکھتے ہوئے بڑی جرأت و دلیری کے ساتھ جنگ کی۔ وہ ملک کی تقسیم کی برابر مخالف رہی اور اس نے پرانی مسلم لیگ کی دو قومی تھیوری کی شدت کے ساتھ مذمت اور مخالفت کی۔ وہ آزادی کی جنگ میں صف اول کی جماعتوں میں تھی۔ کانگریس کے ساتھ اس کا قریبی تعاون رہا اور اس کے کارکنان نے برطانیہ کے خلاف تمام دوسرے محبان وطن کے ساتھ قومی تحریکوں میں برابر کا حصہ لیا اور ان کی ایک بڑی تعداد نے اس تحریک میں اپنے جان و مال کی قربانی دی۔ آزادی کے بعد سے جمعیۃ علماء نے ہندوستانی دستور کے غیر مذہبی ڈھانچے کی پوری طرح حمایت کی اور قومی سالمیت کے حصول کے لیے نہایت تندہی سے کام کیا اور کر رہی ہے اس طرح ہم جمعیۃ علماء کی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک آزادی سے پہلے کی تاریخ اور دوسرے آزادی کے بعد کی تاریخ۔

آزادی کی تحریک میں عظیم رول:

آزادی کی تحریک میں اس نے جو عظیم الشان رول ادا کیا ہے۔ اس پر کوئی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ آزادی کے بعد ۴۸ء میں جمعیۃ علماء نے حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کی رہنمائی میں سیاسی سرگرمیوں سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا اور وہ قانون ساز اسمبلیوں اور دیگر اداروں کے انتخابات سے الگ ہوگئی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمان سیاست سے بالکل الگ رہیں۔ جمعیۃ کے ممبروں کو پوری آزادی حاصل ہے کہ وہ انفرادی حیثیت سے کسی بھی ایسی جماعت میں حصہ لے سکتے ہیں جو سیکولرازم پر یقین رکھتی ہو۔ البتہ ان کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی فرقہ پرست سیاسی جماعت یا ادارے میں حصہ لیں۔

قومی یک جہتی کا استحکام:

جمعیۃ علماء کی سرگرمیاں اگرچہ مذہبی' سیاسی' اور ثقافتی میدان تک محدود ہیں۔ لیکن اس نے اپنے اغراض و مقاصد میں قومی یک جہتی کے استحکام کا مقصد شامل رکھا اور اسے اہمیت دی ہے۔ جمعیۃ علماء کے دستور کی دفعہ ۵ میں اس بات کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ جمعیۃ علماء ہند ہندوستان کے مختلف فرقوں میں اتحاد و یک جہتی قائم رکھنے کا کام کرے گی۔ اپنی مذہبی' سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ جمعیۃ علماء نے ہمیشہ قومی یک جہتی کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا ہے۔ جمعیۃ علماء کے تمام ذمہ دار لیڈروں اور نمائندوں نے اپنے قول و فعل سے ہندوستانی دستور کی غیر مذہبی نوعیت کی حمایت و تائید کی ہے اور سیکولر عناصر کے استحکام کے لیے تمام قومی جماعتوں خاص طور پر کانگریس کے ساتھ پورا پورا اشتراک و تعاون کیا ہے۔ جمعیۃ علماء کی یہ قومی اور سیکولر پالیسی آفتاب کی طرح روشن ہے۔

جمعیۃ علماء مسلمانوں کی مذہبی' سیاسی اور ثقافتی جماعت ہے۔ لیکن وہ ان کوششوں سے الگ نہیں ہے جو عوام کی یک جہتی اور قومی سالمیت کے لیے کی جارہی ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند ان تمام طاقتوں کی تائید و حمایت کرتی ہے' جو قومی یکجہتی کے لیے کام کر رہی ہیں۔ جمعیۃ علماء کا یہ کردار ایک بے داغ کردار ہے' جسے ان تمام ہندوؤں اور مسلمانوں نے سراہا ہے' جو اپنے اندر قومی احساس رکھتے ہیں۔

واقعات کی وضاحت

۱۹۶۱ء کا ایک بیان

۱۱ اکتوبر ۶۱ء کو حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ؒ نے اپنے ایک مدلل بیان میں وزیر داخلہ یو،پی مسٹر چرن سنگھ کے ان الزامات کی پرزور تردید کی کہ جمعیۃ علماء نے علیحدگی پسندی کا رویہ اختیار کیا ہے۔ ماعلی گڑھ، میرٹھ وغیرہ کے فساد مسلم کنونشن کے نتیجہ میں ہوئے ہیں۔ آپ نے اس ذہنیت پر اظہار افسوس کیا کہ ظالم گروہ کے ساتھ ساتھ مظلوم طبقہ پر بھی الزامات لگا کر ترازو کے پلڑوں کو برابر کیا جائے۔ بیان کا پورا متن یہ تھا۔

یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں صاحب اقتدار ہستیوں میں بہت کم ایسے ہیں اور انگلیوں پر گنے جانے کے قابل ہیں کہ جو جرات اور ہمت کے ساتھ حق وصداقت کی خاطر سچی بات ظاہر کرتے ہیں۔ ورنہ تو عام طور پر یہ ہو رہا ہے کہ اگر کوئی سچی بات کہتا ہے اور جرات کے ساتھ ظلم کو ظلم کہنے پر آمادہ ہوتا ہے تو ساتھ ہی ساتھ ترازو کے دونوں پلڑے برابر کرنے کے لیے مظلوم طبقہ پر بھی وہی الزامات عائد کر دیتا ہے جو ظلم کرنے والوں پر عائد ہوتے ہیں۔

کل ہی ہمارے چودھری چرن سنگھ صاحب ہوم منسٹر یو،پی نے ایک پریس کانفرنس میں موجودہ فسادات کی صحیح صورت حال ظاہر کرتے ہوئے ایک طبقہ کی مظلومیت کا اقرار کرتے ہوئے دو سوالوں کے جواب میں یہ فرمایا کہ ہاں ان فسادات کو مسلم کنونشن کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ اور یہ کہ جمعیۃ علماء بھی جو کلچرل، سوشل اور مذہبی جماعت ہے، مسلمانوں میں علیحدگی پسندی کے رجحانات پیدا کرتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس وقت جب کہ فسادات کے فرو کرنے میں چودھری صاحب سرگرمی سے مصروف عمل ہیں۔ ان کے بیان پر کچھ تبصرہ کروں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ ایسے نازک موقع سے ناجائز فائدہ اٹھا کر چودھری صاحب نے جو تمام مسلم

کنونشن اور جمعیۃ علماء پر لگایا ہے اس کے غلط ہونے پر حقیقی صورت حال واضح کردوں یہ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ مسلم یونیورسٹی الیکشن کا بہانہ بنا کر باہر کے طلباء جگہ جگہ فساد کریں اور فساد زدہ علاقوں کے اکثر و بیشتر حصوں میں اکثریت کی بھی عام پبلک اس میں دلچسپی نہ لے اور ایسی حالت میں اس فساد کو مسلم کنونشن کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔

عام طور پر یہ دیکھا جا رہا ہے کہ فساد سے ہندو مسلم پبلک کوئی دلچسپی نہیں لے رہی ہے۔ بلکہ صرف گمراہ طلباء اور ان کے ساتھ شر پسند عناصر یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ کنونشن کا اثر اگر ہوتا تو عام پبلک پر ہوتا اسی طرح جمعیۃ علماء ہند ۱۹۴۷ء سے قبل و بعد اپنے عمل و کردار میں ہمیشہ علیحدگی پسندی کی مخالف رہی۔ اور آج تک ہے اور ہندوستان میں سیکولرازم کی کامیابی اور قومی یک جہتی کی جدوجہد میں نمایاں طور پر سارے ہندوستان میں اپنا کیرکٹر پیش کر رہی ہے۔ اور اس کی شہادت آسانی کے ساتھ شمال و جنوب' مشرق و مغرب کے ہر کونے میں ہندو سکھ بھائیوں سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے جو جماعتی کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ہاں یہ بات الگ ہے کہ چودھری صاحب یا ان کے دوسرے دوستوں کو یہ بات بھی علیحدگی پسندی نظر آتی ہو کہ مسلمانوں کو امن زندگی کے تمام شعبوں میں نابرابری سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ اس کو دور کرنے کے لیے وہ بیبا کی اور جرات کے ساتھ کیوں جدوجہد کرتی ہے اور خاموش ہو کر اپنے آزاد ملک میں بے کسی و بے بسی کا مظاہرہ کیوں نہیں کرتی! یہ جرم بے شک ایسا ہے جس کے لیے جمعیۃ علماء اقبالی مجرم ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

کاش! کہ آج مہاتما گاندھی زندہ ہوتے تو وہ آپ کو بتاتے کہ جمعیۃ علماء ہند کے کارکنوں نے ۱۹۴۷ء میں ہندوستان میں امن قائم کرنے کے لیے اس کے کارکن کی حیثیت سے کیا کچھ کیا۔ اور ہندوستان میں امن قائم کرنے کے لیے کتنی محنت کی ہے یا ہندوستان کا مسلمہ لیڈر جواہر لال نہرو ان دونوں باتوں میں کیا فرق سمجھتا ہے اور دونوں کو جداجدا حقیقتیں جانتا ہے۔ میں پھر ایک بار کہوں گا کہ ایسے موقع پر اقتدار کے زعم میں چودھری صاحب کو ایسی باتیں نہ کہنی چاہئیں جو ان کے لیے موزوں نہیں ہیں اور وقت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرنا چاہیے کہ یہ بڑوں کے لیے پسندیدہ اور سزا وار نہیں ہے۔ جمعیۃ علماء میں سینکڑوں کی تعداد میں وہ لوگ شریک ہیں جن کا کردار و عمل قومی یک جہتی میں سب سے زیادہ نہیں تو ان سے کم بھی نہیں۔۔۔!

گاندھی جی کے آخری ایام

چند یادگار تحریرات

گاندھی جی کا حادثہ قتل آخری جنوری ۱۹۴۸ء میں پیش آیا۔ ان کی زندگی کے آخری ایام دہلی میں گزرے اور حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کو ان ایام میں گاندھی جی سے بہت قرب حاصل رہا۔ اسی لیے ہفتہ وار ''بیداری'' مالیگاؤں نے مولانا مرحوم سے فرمائش کی تھی کہ آپ اس عنوان پر کچھ تحریر فرمائیں۔ اس فرمائش کی تعمیل میں حضرت مولانا نے جو مختصر مقالہ مجھے املا کرایا تھا وہ بعد میں مدینہ اور الجمعیۃ میں بھی شائع ہوا۔ اس کی ایک نقل اب تک میرے پاس محفوظ تھی جو آج اس تالیف میں شائع کی جارہی ہے۔ اس لیے کہ اس سے ۱۹۴۷ء کی زندگی اور شب و روز کا نقشہ کچھ یاد آجاتا ہے۔ (سید انیس الحسن)

مہاتما گاندھی ایک انسان تھے۔ لیکن عام انسانوں کی سطح سے بہت بلند! قدرت نے ان کی طبیعت میں جو انمول خوبیاں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں آج دنیائے انسانیت ان کے بیان کی محتاج نہیں ہے۔

مہاتما گاندھی آج ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ وہ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کی زندگی کا کوئی گوشہ ہماری نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ان کا مقصد حیات اور وہ مشن جس کو انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیا تھا آج ہمارے سامنے پوری طرح روشن ہے۔

ان کی زندگی ایک ایسی کھلی کتاب ہے جس کا کوئی ورق، کوئی صفحہ کوئی سطر اور کوئی لفظ پوشیدہ اور مخفی نہیں۔ وہ جو کچھ بھی تھے اور جیسے کچھ بھی تھے، اچھے یا برے، کھرے یا کھوٹے، دنیا کے سامنے اپنی صاف اور صحیح شکل میں کھڑے ہیں، اور اب کوئی بھی لائف نگار بہت آسانی کے ساتھ فیصلہ کرسکتا ہے کہ گاندھی جی کیا اور کیسے تھے!

یوں تو گاندھی جی کی پوری زندگی ایک عظیم الشان مقصد اور ایک پاکیزہ مشن کو کامیاب بنانے میں گزری، لیکن ان کی زندگی کا سب سے بہتر اور قیمتی دور جو قربانی، خدمت، ایثار اور

فدا کاری کے اعتبار سے ان کی عمر بھر کی قربانیوں پر بھاری ہے' وہ ان کے آخری ایام زندگی ہیں جو انہوں نے دہلی میں گزارے! عمر و سن کے اعتبار سے ان کا یہ زمانہ اگرچہ بڑھاپے کا زمانہ تھا لیکن بڑھاپے کے ان ایام میں ان کی فطری اور طبعی صلاحیتیں اور خوبیاں اپنے پورے شباب پر آ گئی تھیں! عمر بھر اگر وہ اپنے مشن کے لیے سخت سے سخت آلام و مصائب کا مقابلہ کرتے رہے اور ہر دشوار گزار منزل سے گزرتے رہے تو ان آخری ایام میں انہوں نے ایک عظیم الشان مقصد حیات کو کامیاب بنانے کے لیے اپنے ترکش کا آخری تیر بھی چھوڑ دیا۔ یعنی اپنی جان عزیز کی بازی لگائی اور آخرکار جان دے کر اپنے مشن کو کامیاب بنایا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ گاندھی جی اپنی جان دے کر کروڑوں انسانوں کے لیے صلح و آشتی کی جیتی جاگتی تصویر چھوڑ گئے۔

کروڑوں نفوس پر مشتمل ایک قوم جو اپنے اعمال سے خودکشی کی تیاریاں کر چکی تھی' راہ بھول چکی تھی' اور بھٹک چکی تھی' اور ہر طرح تباہی کے کنارے پر پہنچ چکی تھی! گاندھی اپنی جان دے کر اس بڑی قوم کو انصاف اور سچی انسانیت کی راہ دکھلا گئے۔ انہیں زندہ رہنے کے گر بتا گئے اور زندگی کے اصول سمجھا گئے۔ آہ! جانے والے! خدا تجھے تیرے احسانات کا بدلہ دے!

مجھے یوں تو ۱۹۱۹ء سے کانگریس کے ناتے کے باعث گاندھی جی سے تعلق رہا ہے اور ان کی رہنمائی میں مسلسل کام کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ لیکن ان آخری ایام میں جب وہ دہلی میں رہے' حالات نے مجھے ان سے بہت ہی قریب رکھا تھا۔ ان دنوں روزانہ ان سے ملنے' ساتھ رہنے' گھنٹوں گفتگوئیں کرنے کا موقع ملا' اور خلوت و جلوت میں ان کی بلند اخلاقی' صاف دلی' اور ہندوستان کے تمام باشندوں سے یکساں محبت کی سچائی کا جو اثر مجھ پر اور میرے محترم ساتھی حضرت مولانا احمد سعید صاحب پر ہوا اس کے بیان و تشریح کے لیے بڑی وسعتیں درکار ہیں۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ مہاتما جی کی زندگی کا جو سب سے زیادہ بہترین اور قیمتی دور تھا وہی ہندوستان کی تاریخ کا سب سے بدتر اور شرمناک دور بھی تھا۔

ملک کی یہ حالت تھی کہ اچھے اچھے سنجیدہ دماغ وقت کی رو میں بہ چکے تھے' انسانی خون کی وہ ارزانی تھی جو دیکھنے اور سننے میں نہیں آئی۔ کشت و خون کا بازار اس قدر گرم تھا کہ کبھی نہ ہوا ہو گا۔ انسانوں کے دماغوں پر بربریت اور درندگی کا وہ بھوت سوار تھا کہ معصوم بچپن ہو' یا دلعزیز جوانی' قابل رحم اور ناتوان بڑھاپا ہو یا عصمت و پاک دامنی کا واسطہ دے کر امان و پناہ چاہتی ہوئی بے بس نسوانیت خوں خوار انسانوں کی تیغ تیز سب پر برابر چلتی چلی جاتی تھی۔ آناً فاناً چند

ہی دنوں میں سرزمین ہند کا ایک بڑا حصہ خون انسانیت سے لالہ زار ہو چکا تھا۔ اور کونسا گناہ تھا جوان دنوں ہندوستان کی زمین پر خدا اور خود کو بھولے ہوئے انسانوں سے سرزد نہیں ہوا۔ شاید انسانی جرأت دیدہ دلیری اور بے رحمی اس سے بھی زیادہ ترقی کبھی نہ کر سکے۔

گاندھی جی ان دنوں بنگال سے فارغ ہو کر بہار کے مظلوم ستم رسیدوں کی اشک شوئی و درماں کے لیے گاؤں گاؤں کی خاک چھان رہے تھے کہ یکا یک دہلی کی آہوں اور کراہٹ کی صدائیں ان کے کانوں تک پہنچ گئیں اور ان کے دل کو تڑپا گئیں اور وہ فوراً مضطرب ہو کر دہلی پہنچے۔

سب سے پہلے جب وہ اسٹیشن پر آئے تو خود ان کا بیان ہے کہ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ دہلی میں ایسا حادثہ پیش آیا ہے۔ سردار پٹیل مجھے لینے کے لیے اسٹیشن آئے تھے ان کا چہرہ اترا ہوا تھا اور خلاف معمول انہوں نے ملتے ہی اپنی ظرافت آمیز باتیں نہیں کیں! تب مجھے اندازہ ہوا۔

دہلی پہنچ کر گاندھی جی برلا ہاؤس میں ٹھہرے۔ اس قیام کے دوران میں سب سے پہلی ضرورت یہ تھی کہ گزرے ہوئے حوادث ان کو دکھائے جائیں اور واقعات کی پوری نوعیت ان کو بتائی جائے۔

میں پہنچا واقعات سنائے اور پھر ان کو وہ تمام پناہ گزین دکھلائے جو پہاڑ گنج قرول باغ' سبزی منڈی اور دوسری جگہوں سے ظلم وستم اور لوٹ مار کا شکار ہو کر اپنی جانیں بچا کر آ گئے تھے اور جامع مسجد' مدرسہ حسین بخش' عیدگاہ' بل بنگش' کوچہ چیلان' نظام پیلس میں پناہ گزین ہو گئے تھے اور زبان حال سے اپنی دردناک تباہی کی داستان سنا رہے تھے۔

پہاڑ گنج' سبزی منڈی قرول باغ وغیرہ کی المناک تباہی کے تمام مناظر دکھلائے' فساد کا باب تھا' بے گوروکفن لاشیں' خاکستر شدہ عظیم الشان' عمارتیں اور برباد شدہ عبادت گاہیں ان کو دکھلائیں۔

گاندھی جی صرف ایک بڑے لیڈر ہی نہیں تھے اور نہ انہوں نے ان تمام مناظر کو محض ایک بڑے لیڈر کی طرح دیکھ کر معاملہ کو یہیں تک ختم کر دیا بلکہ وہ تمام انسانیت کے ایک بہت بڑے ہمدرد بھی تھے' انہوں نے دل کی ایسی ہمدردی کے ساتھ ان تمام مناظر کو دیکھا اور واقعات کو سنا گویا تمام تباہی و بربادی خود ان کے گھر کی ہوئی ہے!

• چنانچہ واقعات کی یہ تصویریں ان کے دل پر نقش ہو گئیں! اور پھر انہوں نے اس کے

علاج کے لیے وہ سب کچھ کیا جو شاید ہزاروں اور لاکھوں انسانوں سے نہ ہوسکتا!

جہاں کہیں کوئی حادثہ ہوا' وہ خود پہنچے' ظالموں کو بھی سمجھایا اور انہیں ظلم سے رکنے کی تلقین کی اور دوسری طرف مظلوموں کی دادرسی کی۔ خود جاجا کر ان سے ملے۔ ان کی تکالیف معلوم کیں اور پھر بے چین ہوکر ان کا انتظام کرایا۔

گاندھی جی جب سے دہلی آئے تھے اس دن سے ان کی زندگی کے آخری دن تک حضرت مولانا احمد سعید صاحب نائب صدر جمعیۃ ہند' میں' مسٹر سید محمد جعفری رکن مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند اور حافظ محمد نسیم صاحب بٹن والے ان کے پاس جایا کرتے تھے۔ وہ ہم سے ہر روز نئے واقعات کی پوری تفصیل پوچھتے اور پھر ان کو نوٹ کر کے ضروری بندوبست کراتے۔

روزمرہ آمدورفت کے نتیجے میں انہوں نے ابتدائی دو ہفتوں کے بعد مجھ سے فرمایا کہ میں اگرچہ تم سے پہلے بھی واقف ہوں اور دوسرے ساتھیوں سے بھی کچھ نہ کچھ واقفیت ہے تاہم ان حالات مین دماغی توازن کو باقی رکھتے ہوئے جس طرح آپ حضرات نے معاملات میں مبالغہ اور رنگ آمیزی کے بغیر مجھ کو صحیح اطلاعات بہم پہنچائیں۔ بلکہ واقعات سے ایک حد تک کم۔ چونکہ مجھے اپنے دوسرے خصوصی ذرائع سے اس کا اندازہ ہوگیا ہے' اس لیے میں مجبور ہوں کہ دہلی کے حوادث سے متعلق آپ ہی لوگوں پر پورا بھروسا کروں۔

اور پھر (چونکہ ترجمانی اکثر میرے سپرد رہتی تھی) میری طرف ہنستے ہوئے مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ آپ کو روز کا حساب روز دینا پڑے گا اور دیکھیے یہ خیال کر کے کہ میرا دل دکھی ہوگا آپ کسی بات کو چھپایئے گا نہیں۔''

ہماری روزمرہ کی آمدرفت کے باعث گاندھی جی نے ہم پر سے ملاقات کی پابندیاں اٹھا لی تھیں اور پھر وقت' بے وقت ملاقات کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ گاندھی جی دن کے گیارہ بجے سے ۱بجے تک آرام کیا کرتے تھے۔ ہمارے جانے کا طریقہ یہ تھا کہ ہم اکثر آرام کے وقت سے قبل اور کبھی بعد میں جایا کرتے تھے۔

ان کی ان تمام ملاقاتوں میں یوں تو ہر دن ان کی بلند اخلاقی اور تمام انسانوں کے لیے خواہ وہ کسی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں' ان کی دلی ہمدردی و دل سوزی کے نظائر دل پر نقش ہوتے جاتے تھے لیکن یہ واقعہ عمر کے آخری حصہ تک بھی نہیں بھلایا جاسکتا کہ جب دہلی کے مسلمانوں پر گزرے ہوئے حوادث و واقعات کو انہوں نے دیکھا اور سنا تو ایک دفعہ ایک اہم

گفتگو کے بعد (جس میں پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور سردار پٹیل بھی شریک تھے) انہوں نے ہم سے فرمایا کہ آپ نہایت اطمینان سے لکھنو کانفرنس میں جایئے اور پھر آپ کی واپسی کے ایک آدھ ہفتہ بعد میں آپ کو کوئی صحیح جواب دے سکوں گا۔

لکھنو کانفرنس سے واپسی پر جب ہم پہلی مرتبہ پہنچے تو وہ بے حد خوش اور مسرور نظر آتے تھے اور بار بار کانفرنس کی کارروائیوں کو پوچھتے اور سن سن کر خوش ہوتے تھے۔ کانفرنس کی کامیابی پر مبارک باد دی اور فرمایا جو کچھ ہوا میری خوشی کے عین مطابق ہوا ہے!

غالباً اس کے بعد جب ایک اتوار کو ہم ملنے گئے تو کوئی خاص بات پیش نہ آئی اور حسب معمول ملاقات کے بعد واپس چلے آئے۔ پیر کا دن چونکہ مہاتما جی کی خاموشی کا دن ہوتا تھا، اس لیے ہم خاص صورتوں کے علاوہ پیر کو نہیں جاتے تھے۔ کہ اچانک اس پیر کو پرارتھنا سبھا میں سنا کہ مہاتما جی نے مرن برت رکھنے کا اعلان کر دیا ہے۔ اگلے روز جب ہم پہنچے اور مولانا آزاد کی موجودگی میں ہم نے گلہ شکوہ کیا کہ آپ نے ہمیں اطلاع کیے بغیر ایک ایسا اہم قدم اٹھایا ہے جس سے دوسری قسم کے خطرات بھی پیدا ہو سکتے ہیں اور پھر یہ کہ آپ کی زندگی تنہا آپ کی زندگی نہیں ہے۔ بلکہ آپ کی زندگی ہمارے اور انسانی خدمت و محبت کے لیے ایک بیش بہا زندگی ہو۔

اس پر انہوں نے بچشم پرنم فرمایا میں نے ہندوستان کے دونوں حصوں میں حیوانیت کا جو نقشہ دیکھا اور سنا اور پھر دہلی میں جو کچھ گزرا اس کو دیکھ کر آنکھیں شرم سے نیچی تھیں۔ میں سر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ہندوستان کے دونوں حصے اپنی حیوانیت سے ہندو دھرم اور اسلام کو جو نقصان پہنچا رہے ہیں دنیا کی آنکھیں اس کو بھلا نہیں سکتیں!

آج میں خوش ہوں، آنکھ اٹھانے کے قابل ہوں اور فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے پاس فقط ایک جان ہے۔ آج میں ہندو مسلمانوں میں محبت پیدا کرنے اور ان کے دلوں کو ملانے کے لیے اور فتنہ و فساد کے تمام رشتوں کو ختم کر دینے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا چکا تھا۔ میں یہی کر سکتا تھا۔ اس سے زیادہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔

گاندھی جی نے اپنی زندگی میں بار بار برت رکھا مگر اس دفعہ کے مرن برت کی شان سب سے ممتاز اور سب سے بڑھ کر تھی ہمارے علاوہ گاندھی جی کے تمام ہی مقربین اور مخلصین نے ان سے یہ سفارش کی کہ وہ اپنا ارادہ بدل دیں، لیکن گاندھی جی فرقہ واریت کے بڑھتے ہوئے

سیلاب کو اپنے جس مضبوط ارادے سے جان کی بازی لگا کر ختم کر دینے کا فیصلہ کر چکے تھے' کوئی شکایت اور سفارش ان کے اس ارادے میں تزلزل پیدا نہ کر سکی۔

چند روز گزر گئے اور ان کا مرن برت جاری رہا یہاں تک کہ ان کی قوت اور صحت خطرہ کی طرف جانے لگی اور ملک کے ہر فرقے اور ہر گوشے میں ان کی طرف سے تشویش پیدا ہو گئی۔ مسلمان بھی پریشان تھے اور غیر بھی!

اور آخر کار مولانا آزاد نے گاندھی جی کی خدمت میں پہنچ کر کہا کہ اگر ہم سب اور عام ہندو' مسلمان' سکھ مل کر اپنے دلوں میں یہ طے کر لیں اور آپ سے بھی یہ وعدہ کریں کہ ہم اس مشن کو پورا کر دیں گے جس کے لیے آپ نے برت رکھا ہے تو پھر آپ کو برت کھول دینا چاہیے۔

اس پر مہاتما جی نے کہا کہ ہاں! اگر میں یہ دیکھ لوں گا کہ میری جان کے خوف سے نہیں بلکہ واقع میں دلوں کی صفائی اور سینوں کی اصلاح کے بعد ہندو' مسلمان' سکھ' سب مجھ سے پختہ وعدہ کریں کہ آئندہ وہ سب بھائی بھائی کی طرح رہیں گے اور جو کچھ ہو چکا اس کو دہرایا نہ جائے گا تو میں برت کھول دوں گا۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے برت کو ختم کرنے کی سات شرطیں رکھیں کہ ان کو پورا کرنے کے لیے مجھے اطمینان دلایا جائے وہ ساتوں شرطیں اختصار کے ساتھ یہ ہیں!

۱۔ دہلی کے مسلمانوں کو آزادی اور حفاظت کے ساتھ رہنے سہنے اور چلنے پھرنے کی آزادی ہو۔

۲۔ پہاڑ گنج' قرول باغ' سبزی منڈی اور ان تمام علاقوں میں بھی ان کو آنے جانے کی آزادی ہو جہاں آج وہ نہیں جا سکتے۔

۳۔ دہلی کے جو مسلمان ان علاقوں سے برباد ہو کر چلے گئے ہیں' اگر وہ آئیں اور پھر اپنے گھروں میں بسنا چاہیں تو ان کو مکانات واپس کر دیے جائیں گے اور ان کو رہنے کی سہولتیں دی جائیں گی۔

۴۔ تمام مسجدیں اور عبادت گاہیں خالی اور محفوظ کر دی جائیں گی۔

۵۔ ریلوے اور دوسری سواریوں میں کشت و خون کا سلسلہ ختم کر دیا جائے گا۔

۶۔ اور پھر کسی پاداش میں ان کا اقتصادی یا کسی طرح کا بائی کاٹ بھی نہیں کیا جائے گا۔

۷۔ دہلی ونواح دہلی میں مسلمانوں کے جو مذہبی میلے ہوا کرتے تھے (جیسے قطب صاحب ' مہرولی کا عرس) وہ آئندہ بھی حسب دستور ہوسکیں گے۔

ان شرائط کو دیکھیے ہر شرط اور ہر ہر نکتہ گاندھی جی کے دل کی گہرائیوں سے ابھرنے والی اس عام ہمدردی' محبت اور سب کی بہتری کے لیے یکساں تڑپ اور بے چینی کی ترجمانی ہے جو آج کسی دوسرے انسان کا حصہ نہیں۔ آخر کار سب نے گاندھی جی سے مل کر وعدہ کیا کہ ہم ان شرائط کو پورا کریں گے اور پھر ان کا برت کھلوایا گیا۔

دنیا نے دیکھا کہ گاندھی جی کے اس برت نے وہ کام کیا جو بڑی بڑی طاقتیں نہیں کرسکتی تھی۔ دہلی کی فضا میں غیر معمولی تبدیلی ہوگئی۔ حالات کا رنگ بالکل ہی بدل گیا۔

اِدھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا!

انڈین مسلم کنونشن

انڈین مسلم کنونشن منعقدہ نئی دہلی جون ۱۹۶۱ء میں بحیثیت صدر استقبالیہ مجاہد ملتؒ کا خطبہ

حاضرین محترم! اس اجتماع میں شرکت کے لیے جو دعوت نامہ آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا اس پر داعی کی حیثیت سے متعدد معزز حضرات کے نام درج ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس اجتماع کے داعی صرف وہی حضرات نہیں ہیں بلکہ یہ دعوت ان کروڑوں انسانوں کے دلوں کی آواز ہے جو اس عظیم ملک کے شہری ہوتے ہوئے اور ایک جمہوری دستور کے سایہ میں رہتے ہوئے بھی خود کو زندگی کی راہوں میں پامال اور قدم قدم پر اپنے جائز حقوق سے مرحوم پارہے ہیں اور اس صورت حال کے تسلسل نے ان کے اس اضطراب کو اپنی انتہا تک پہنچا دیا ہے کہ کسی طرح ملک وملت کے سربراہ جمع ہوں اور ان کے درد کا کوئی علاج اور ان کے اضطراب ومشکلات کا کوئی حل تلاش کریں تاکہ کسی صورت' ان کی زندگی بھی سکون واطمینان سے آشنا ہوسکے۔

حضرات محترم! یہ وسیع اور عظیم الشان ملک جو ہمارا وطن عزیز ہے' صدیوں سے مختلف فرقوں اور ملتوں کا گہوارہ اور مختلف زبانوں اور عقائد ورسوم کا سنگم رہا ہے' وطنیت کے لازوال رشتہ نے اس ملک کی وسیع آبادیوں کو زبان' تہذیب اور رسوم ورواج کے تمام اختلافات کے باوجود ہمیشہ ایک اکائی بنائے رکھا ہے' یہی وحدت واتحاد باہمی تعلقات کی خوشگواری اور تعاون درحقیقت اس ملک کی سب سے بڑی قوت اور اس کے استحکام اور ترقی کی بنیاد ہے۔ یہی ''وحدت'' وہ عظیم طاقت تھی جس کے بل پر ہم نے برطانوی' اقتدار سے نجات پائی اور ملک کو آزادی کی نعمت نصیب ہوئی۔ افسوس کہ ملک کی تقسیم نے ہماری اس بے پناہ طاقت کو کمزور کیا اور ہمارے اندر خود پرستی' فرقہ پرستی' تنگ دلی وتنگ نظری کے وہ شگاف پیدا کیے' جن سے ہماری ''وحدت'' کا شیرازہ بکھرا اور دنیا نے ہمارے انتشار کا تماشا دیکھا۔ تقسیم وطن کے ساتھ ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں جو حوادث پیش آئے آج ان کی یاد بھی شریف اور سنجیدہ انسانوں کی نگاہیں شرم وندامت سے جھکا دیتی ہے۔ وہ سب کچھ تنگ دلی اور فرقہ وارانہ تنگ

نظری کا ایک وقتی بخار یا ایک ہنگامی سیلاب تھا جو اپنی پوری تباہ کاریوں کے ساتھ ملک کے ایک سرے سے اٹھا اور دوسرے سرے تک گزرتا چلا گیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس وقت بھی جمعیۃ العلمائے ہند نے ملک کو مہلک اثرات سے پاک وصاف کرنے کے لیے مرحوم ومغفور امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی رہنمائی میں پورے ملک کے اصحاب فکر وتدبیر کی ایک عظیم کانفرنس ''آزاد مسلم کانفرنس'' کے نام سے لکھنو میں بلائی تھی، جس نے ملک بھر میں ایک نئی فضا اور مفید نتائج پیدا کیے۔ کاش کہ وہ صورت حال اس وقت کے ساتھ ختم ہوگئی ہوتی، مگر افسوس کہ اس کے بعد سے اب تک ۱۳ سال کا جو ریکارڈ ہمارے سامنے ہے وہ اس حقیقت کی برملا شہادت ہے کہ تنگ نظری، فرقہ واریت اور جارحانہ حد بندیوں کے مہلک جذبات اس پورے عرصہ میں کارفرما رہے ہیں۔ پچھلے کچھ عرصہ میں زبان کے نام پر گجرات و مہاراشٹر اور آسام و بنگال میں اور مذہب کے نام پر یوپی، بہار اور مدھیہ پردیش وغیرہ کے مختلف شہروں اور دیہات بالخصوص جبل پور اور ساگر میں جو کچھ ہوا، اس کے بعد شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ اس صورت حال میں نہ صرف یہ کہ اختلاف زبان و مذہب کے نام پر لاکھوں باشندگان ملک کے لیے زندگی اجیرن بن رہی ہے بلکہ اس طرح خود ملک کی صحت وسالمیت بھی پنپ نہیں سکتی۔

پھر جو طبقہ اس فرقہ واریت، تنگ نظری اور مسموم جذبات کا سب سے زیادہ تختۂ مشق بنا ہے وہ اس ملک کی سب سے بڑی مذہبی اقلیت ''مسلمان'' ہیں۔ جن کو جمہوری دستور کے مطابق مساویانہ حقوق کے دلانے میں خود اکثریت کے شریف اور سنجیدہ اصحاب فکر ونظر کی مسلسل کوششیں بھی ابھی تک بارآور نہیں ہوسکیں۔

مسلم اقلیت کے خلاف یہ جارحانہ فرقہ واریت اور معاندانہ جذبات صرف عوامی زندگی ہی میں اثر انداز نہیں، بلکہ زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ حکومت کے دائروں میں بھی اس کی چھاپ بہت گہری ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ جابجا مسلم اقلیت آئے دن ایک شرپسند گروہ کے ہاتھوں جان ومال اور عزت وآبرو کی یک طرفہ بربادیوں کا شکار ہوتی رہتی ہے، پھر تماشہ یہ ہے کہ فرقہ وارانہ جارحیت اور غنڈہ گردی کی ان وارداتوں کو 'ہندو مسلم' فساد کہہ کر حقیقت حال پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے، حالانکہ واقعتاً (جیسا کہ میں نے ہند پارلیمنٹ میں بھی اور اس کے باہر بھی بار بار کہا ہے) ان واقعات کو ہندو مسلم فساد کہنا ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کے ساتھ ناانصافی، ان کی کھلی ہوئی توہین اور حقیقت کی غلط تعبیر ہے۔ ملک کے عوام، ہندو اور

مسلمان، عام طور پر فرقہ پرست عنصر کی ان حرکتوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان میں باہم یک جہتی کے رجحانات ابھر رہے ہیں۔ درحقیقت غنڈہ گردی کی یہ تمام وارداتیں اسی مسموم ذہنیت کی ابھاری ہوئی اسکیمیں ہوتی ہیں جو مختلف بہانوں اور تدبیروں کے ساتھ بروئے کار لائی جاتی ہیں اور اکثر و بیشتر مقامی ایڈمنسٹریشن کا تعاون اور پشت پناہی ان کو حاصل ہوتی ہے۔

ایک طرف ہماری شہری زندگی میں ان حوادث کا تسلسل اور دوسری طرف سرکاری ملازمتوں، تعلیمی اداروں، نصاب کی کتابوں، صنعت و حرفت کے مرکزوں، تجارت کے وسائل اور کاروباری میدانوں تک میں مسلم اقلیت کے ساتھ امتیازی سلوک، حق تلفی، ناانصافی، ملک کے مختلف حصوں میں مسلم اوقاف اور مساجد کی بربادی اور ویرانی نیز مجالس قانون ساز میں ناکافی نمائندگی کی شکایتوں نے جو افسوسناک شکل اختیار کر لی ہے اور پچھلے ۱۳ر سال کی سرگزشت نے اس کا جو ریکارڈ بنایا ہے اس سے آپ سب بخوبی واقف ہیں۔ آج اس کی تفصیلات کو دہرانا سراسر غیر ضروری ہے۔

یہ تشویشناک صورت حال نہ صرف یہ کہ مسلم اقلیت کے لیے انتہائی اضطراب کا باعث بن رہی ہے، بلکہ ساتھ ہی ملکی صحت و بحالیت کے لیے بھی کینسر سے زیادہ خطرناک اور تعمیر و ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج خود اکثریتی طبقے کے وہ تمام نیک نہاد افراد جو اس ذہنی گراوٹ اور تنگ دلی سے بالاتر ہو کر معاملات کو دیکھتے، سوچتے اور سمجھتے ہیں۔ اس صورت حال سے اسی قدر نالاں اور پریشان ہیں، جس قدر خود مسلم اقلیت بے چین و مضطرب ہے، انہیں بھی یقین ہے کہ اختلاف مذہب و مسلک کے نام پر ملک کی اتنی بڑی آبادی کو پامال اور برباد کرنے کی کوشش پورے ملک کے لیے خودکشی کے مترادف ہے، چنانچہ آج بیرونی خطرات سے پہلے جو اندرونی خطرہ وطن عزیز کے امن واستحکام کو چیلنج کر رہا ہے وہ یہی مسموم ذہنیت اور فرقہ پرستی کے مہلک جذبات ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جس طرح آج ہم وطن عزیز کے مستقبل میں سچی جمہوریت اور قومی یک جہتی کو کارفرما دیکھنے کے لیے مضطرب ہیں اور اسی جذبے کے ساتھ آج یہاں سر جوڑ کر بیٹھے ہیں۔ اسی طرح بلالحاظ مذہب و ملت، وہ تمام اصحاب فکر و تدبیر جن میں خود ملک کے وزیراعظم (پرائم منسٹر) کی شخصیت بھی شامل ہے، اس سنگین صورت حال سے بہت متاثر اور فکرمند ہیں اور پوری اہمیت کے ساتھ اس سوال پر غور کر رہے ہیں، کہ کیوں کر جذبات کے اس غلط بہاؤ کو روکا جائے اور ملکی سالمیت اور قومی یک جہتی

(نیشنل انٹی گریشن) کو برقرار رکھنے کے لیے ایڈمنسٹریشن اور عوام کے دائروں میں کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔

یقیناً ملک کے سچے رہنماؤں کی یہ توجہ ہماری تحسین وتصویب کی مستحق ہے اور ہماری آرزو ہے کہ ان کی کوششیں عملی زندگی میں بہتر نتائج پیدا کرسکیں۔

سامعین کرام! آج ہی نہیں بلکہ آج سے بارہ سال پہلے بھی انہی خطرات ونتائج پر نگاہ رکھتے ہوئے ملک کے تمام دور اندیش رہنماؤں نے دستور ساز اسمبلی میں بیٹھ کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس عظیم ملک کی فلاح وترقی کے تمام نقشے سیکولرازم اور جمہوریت کی بنیادوں پر ہی کامیاب ہوسکتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے ملک کے لیے وہ بہترین دستور (کانسٹی ٹیوشن) مرتب کیا جس کا بنیادی تصور ملک کی وحدت (اکائی) ہے اور جو اس ملک میں ایک ایسا ترقی پذیر معاشرہ (سوسائٹی) پیدا کرنا چاہتا ہے جس میں جمہوریت کی فراخ دلی کارفرما ہو اور مذہب وخیال کے اختلافات کے باوجود ملک کے تمام باشندے شہری زندگی میں مساویانہ حقوق سے بہرہ مند ہوں کہ ان کے باہمی تعلقات میں خوش گواری قائم رہ سکے اور وہ سب پوری خوش دلی کے ساتھ وطن عزیز کی تعمیر وترقی کے لیے کام کرسکیں' یقیناً یہی نقطہ نظر صحیح نقطہ نظر ہے اور آج جو تکلیف اور جو شکایت ہے وہ صرف یہ ہے کہ عملی زندگی میں اس نقطہ نظر سے مسلسل انحراف ہو رہا ہے۔

ہمارا موقف ومقام:

آج ہم اس لیے جمع ہو رہے ہیں کہ گزرے ہوئے تیرہ برسوں کی سرگزشت کو سامنے رکھتے ہوئے سوچیں اور غور کریں کہ وطن عزیز کی وسعتوں میں سیکولرازم اور جمہوریت کی حقیقی فضا پیدا کرنے اور دستور ہند کے تقاضوں کو بروئے کار لانے کے لیے آخر کیا تدابیر اختیار کی جائیں اور مسلم اقلیت کے ساتھ ہونے والے غیر دستوری' امتیازی سلوک' ناانصافیوں اور حق تلفیوں کا مداوا کیوں کر ہو اور کون سے وسائل کام میں لائے جائیں کہ ہمیں اس طبقاتی کشمکش' بدامنی' بے اطمینانی' اور پامالی کی زندگی سے نکل کر دوسرے باشندگان وطن کے ساتھ ساتھ آبرومندانہ اور مساویانہ زندگی میسر آسکے اور موقع مل سکے کہ ذہنی یک سوئی اور دلی اطمینان کے ساتھ ہم بھی وطن کی خوشحالی' ترقی اور سربلندی کے لیے اپنی بھرپور صلاحیتوں کے ساتھ کام کرسکیں۔

بفضلہٖ تعالیٰ ہمیں اعتماد ہے اپنی نیت اور اپنے عزائم پر جو وطن کی خیر خواہی اور خیر سگالی کی

راہ میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں، ساتھ ہی ہمیں اعتماد ہے کہ اپنی اس کوشش اور جستجو میں ہم تنہا نہیں ہیں بلکہ ایک خاص عنصر کو چھوڑ کر جو فرقہ پرستی، تنگ نظری اور تنگ دلی کی تاریکیوں میں بہت دور جا چکا ہے اور اپنی تمام ذہنی صلاحتیں کھو چکا ہے۔ اس عنصر کے علاوہ اس ملک کے سب ہی سنجیدہ اور شریف انسان (خواہ وہ کوئی بھی مذہب و مسلک رکھتے ہوں) ہمارے ساتھ ہیں۔ ہماری پریشانیوں اور اضطراب کا انہیں بھی احساس ہے۔ سیکولرازم اور جمہوریت کی پامالی سے وہ بھی نالاں ہیں۔

ان ہی احساسات وعزائم کے ساتھ آج ہم یہاں جمع ہوئے ہیں کہ پوری سنجیدگی، احتیاط اور سچے قومی وتعمیری جذبے کے ساتھ ان مسائل ومعاملات پر غور کریں جو ایجنڈے کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں۔

ہمیں اس وقت اس کا بھی پورا احساس ہے کہ نامساعد حالات میں یہ ایک نہایت اہم اور نزاکتوں سے بھرپور کام ہے، جس کا بیڑا ہم نے اٹھایا ہے، خدا کرے کہ ہم اس ذمہ داری کو خوبی وخوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے سکیں اور ہمارا یہ جرأت مندانہ اقدام ملک وملت کی راہ میں مفید اور کامیاب اقدام ثابت ہو۔

مسلمانوں سے گزارش:

حضرت محترم! مسلمانان ہند کے اس عظیم نمائندہ اجتماع کے موقع پر جو خصوصیت سے مسلم اقلیت کے ایک عام اور مسلسل اضطراب کے اظہار کے لیے یہاں منعقد ہو رہا ہے، بے جا نہ ہوگا کہ خود مسلمانان ہند کی خدمت میں بھی گزارش کروں کہ وہ اپنی اس پر آشوب زندگی میں ظاہری تدابیر و وسائل کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر اعتماد علی اللہ اور صبر واستقلال کی زیادہ سے زیادہ صلاحیتیں پیدا کریں۔ اسوہء رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو اپنا نصب العین بنائیں اور اسلام کی بنیادی تعلیمات سے سبق لیتے ہوئے اپنے اندر وہ اسپرٹ پیدا کریں کہ تکالیف ومصائب کے طوفانوں سے گزر کر بھی وہ احساس کہتری، پامالی اور مایوسی کا شکار نہ ہوں اور ان کے اس یقین میں کوئی تزلزل نہ آئے کہ اپنی وطنی زندگی میں ہمیں جو بھی حوادث ومشکلات درپیش ہیں وہ بہرحال وقتی اور دنیوی مصائب ہیں اور ہمارا حقیقی اعتماد کارساز حقیقی کی رحمت اور اس کی رضاجوئی پر ہی ہے۔ قرآن حکیم نے ہمیں بتایا ہے۔

انہ لا ییئس من روح اللہ الا القوم الکافرون. (۱۲: ۸۷)
خدا تعالیٰ کی رحمت سے وہی مایوس ہوتے ہیں جنہیں خدا پر ایمان اور بھروسا نہیں ہے۔

ان مع العسر یسراً (۹۴: ۶) ہر تنگی و پریشانی کے ساتھ آسائش و راحت بھی ضرور ہوتی ہے۔

اس عظیم الشان ملک میں جو ہماری طرح اور بھی متعدد مذاہب اور فرقوں کا پیارا وطن ہے "نبی رحمتؐ" کے نام لیواؤں اور اس رسول برحق کے امتیوں کا جس کی شان میں فرمایا گیا ہے۔ انک لعلی خلق عظیم (آپ محاسن اخلاق کا ایک بے مثال نمونہ ہیں)' فرض ہے کہ اپنی زندگی میں اخلاق و کردار کی وہ بلندیاں پیدا کریں کہ دنیا اس کے وجود کو امن و رحمت کا سایہ محسوس کرے۔ ان کی وطن دوستی' خیر اندیشی اور اخلاق کریمانہ کو نمونہ عمل قرار دے اور اس سے سبق حاصل کرے۔

آج پہلے سے زیادہ ضرورت ہے کہ ہمارے اندر اپنے موقف کا صحیح احساس اور شعور پیدا ہو۔ اس پیارے دیش کی ہزار سالہ تاریخ میں ہم برابر کے شریک و سہیم اور اس دعوت حق کے علمبردار رہے ہیں' جو پورے عالم انسانیت کے لیے امن و رحمت کا پیغام اور ہمدردی و خیر سگالی کا سرچشمہ ہے۔ ایک لمحہ کے لیے بھی اس ملک میں ہماری زندگی کسی اجنبی اور تماشائی کی زندگی نہیں ہوسکتی۔ اس کے بناؤ اور بگاڑ کے ساتھ ہمارا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لیے ملی جلی وطنی زندگی میں اپنے حقوق کے ساتھ ساتھ اپنے وطنی فرائض سے بھی کوئی غفلت ہمارے لیے جائز نہیں ہوسکتی۔ میرا تو یقین یہ ہے کہ اگر ہمارے اندر وطن کی سچی محبت اور اپنے ذہن و منصب کا صحیح احساس بیدار ہے تو کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی ہمیں اپنے حقوق سے دیر تک محروم نہیں رکھ سکتی۔ ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم المحسنون. (اللہ کی مدد ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتی ہے جو کردار و عمل کے کھرے اور نیکوکار ہوں۔)

عکس تحریر

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے ایک مکتوب کا عکس ملاحظہ فرمایئے:

یہ مکتوب حضرت مولانا نے ۱۵ر دسمبر ۱۹۴۰ء کو بحالت اسیری، راولپنڈی جیل سے حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب (موجودہ جنرل سیکرٹری جمعیۃ علماء ہند) کے نام ارسال فرمایا تھا۔ اس وقت کی قانونی پابندیوں اور حکومت کے تعاقب اور سخت گیری کے باعث اس مکتوب میں حضرت مولاناؒ نے اپنا مقصد کچھ اشاروں میں ظاہر فرمایا ہے ''الہ آباد کی کل ہند کمپنی'' سے مراد آل انڈیا کانگریس کمیٹی ہے جس کا صدر دفتر اس زمانہ میں الہ آباد میں تھا۔

''ایجنٹ'' سے مراد ممبر اور ''ڈیوٹی'' کا اشارہ گرفتاری کی طرف ہے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ان دنوں کسی اعلان کے ذریعہ اپنے تمام ممبران کی خواہ وہ اس وقت جیل میں ہوں یا پہلے سزایاب ہو چکے ہوں، فہرست اور حالات زندگی طلب کیے تھے۔ حضرت مولانا بھی اے آئی سی سی کے ایک سرگرم رکن تھے۔

۷۸۶

از راولپنڈی جیل

معظم و محترم مولانا محمد میاں صاحب زاد مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مزاج گرامی

امید کہ آپ مع متعلقین بخیر ہونگے، اور سب بزرگ احباب بھی حسب سابق خیریت سے ہونگے

اس وقت یہ عریضہ اسلئے لکھ رہا ہوں کہ اخبارات میں پڑھا تھا کہ آزاد ہند کی مرکزی کمیٹی نے یہ اعلان کیا ہے کہ جو ایجنٹ کمیٹی کے اعلان کے وقت سے ڈیوٹی پر لگے ہیں اُن کی بھی فہرست اور جو اس سے قبل ڈیوٹی پر جا چکے ہیں اُن کی بھی فہرست مع حالات زندگی صدر دفتر میں بھیجدی جائیگی۔ میں عرض کرتا ہوں کہ آپ کے ضلع سے کمیٹی کا ایجنٹ بنا کر بھیجا گیا ہوں اسلئے آپ براہ کرم بحیثیت انچارج مراد آباد میرے متعلق صدر دفتر کو اطلاع کر دیں۔ اگرچہ شخصی تعارف کے اعتبار سے اس کی اطلاع ضروری نہیں لیکن ضابطہ سے تو بہر حال آپ کے ضلع کے ایجنٹوں کی فہرست میں ضرور نام شمار کیا ہونا چاہیئے۔

امید کہ آپ بصورت ضرورت میری ملاقات کرنے کے قابل ہو سکیں گے

سب کو میرا سلام مسنون۔ خصوصاً قاری صاحب کو میرا نیازمندانہ سلام

۱۰ اکتوبر ۴۲ء محمد خدا بخش [illegible] خادم ملت

بگرامی خدمت معظم و محترم حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب [illegible] جامعہ قاسمیہ

مراد آباد شاہی مسجد (یو پی)

صدر آل انڈیا مسلم لیگ کے نام

ہم یہاں محمد ریاض درانی کے شکریے کے ساتھ قائداعظم پیپرز سے مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا ایک خط اور اس پر مسلم لیگ کے صدر اور مسلم پریس کے ایک نمائندہ اخبار مدینہ' بجنور کا ردعمل پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مرزا جانباز کی تالیف ''کاروان احرار'' سے ایک اقتباس اور مولانا شبیر احمد عثمانی کا ایک تاریخی انٹرویو بھی نقل کرتے ہیں۔ ان تحریرات کے مطالعے سے قائداعظم کی سیرت اور ذوق کے ایک خاص پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ جس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔

مجاہد ملت کا جو خط یہاں پیش کیا جارہا ہے' وہ ایک تاریخی خط ہے اور اس سے پہلے الجمعیۃ' دہلی' مدینہ' بجنور اور زمزم' لاہور میں بھی چھپا تھا۔ میرے سامنے ماہنامہ زندگی' الٰہ آباد (جون ۱۹۷۷ء' ص ۳۹۔۴۱) کی اشاعت ہے۔ اس کے ساتھ مکتوب الیہ کا جواب بھی ہے۔ زندگی میں مولانا کے خط کے ساتھ جمعیۃ علمائے ہند کی مجلس عاملہ کے اجلاس مورخہ ۱۳۔۱۵ مارچ ۱۹۲۷ء کی قرارداد شامل نہیں تھی۔ مکتوب الیہ کا جواب ''زندگی'' سے لے کر شامل کر دیا ہے۔

مولانا کا خط مذکورہ اخبارات کے علاوہ خواجہ رضی حیدر کی تالیف ''قائداعظم ۔۔ خطوط کے آئینے میں'' کراچی' ۱۹۸۵ء) میں بھی مکتوب الیہ کے جواب کے ساتھ شامل ہے جو ''زندگی الٰہ آباد'' سے اخذ کیا گیا ہے۔

اس خط کی تاریخی سیاسی اہمیت کے علاوہ دینی' فقہی لحاظ سے اس کا آخری پیراگراف بہت اہم ہے۔ مولانا نے چند آسان جملوں میں بہت بڑا دینی مسئلہ بیان فرمادیا ہے۔ مولانا کا یہ فرمانا:

> ''مسلمانوں کی کسی خاص سیاسی جماعت کا کوئی فیصلہ خواہ اس کی پشت پر وقتی طور پر عوام کی کتنی ہی زبردست اکثریت ہو' شرعی فیصلہ کہلانے کا مستحق

نہیں ہوسکتا۔ انعقاد شوریٰ کے بغیر کسی پارٹی کی ہنگامی اکثریت کو یقیناً یہ حیثیت نہیں دی جاسکتی کہ اس کے خاص قسم کے فیصلوں سے اختلاف رکھنے والے اصحاب رائے اور ارباب علم ملت کے اجتماعی فیصلوں کا خلاف کرنے والے سمجھے جائیں۔''

ایک مستند فتویٰ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اب آپ مولانا حفظ الرحمٰن سہوہاروی کا یہ خط اس پر مکتوب الیہ اور پریس کا ردعمل اور بعض دوسری اہم تحریرات ملاحظہ فرمائیں۔(ا۔س۔ش)

(۱)

مولانا حفظ الرحمٰن کا خط

الجمعیۃ المرکزیہ لعلماء الہند

دہلی

یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۶۶ھ ۲۵؍ مارچ ۱۹۴۷ء

صدر محترم آل انڈیا مسلم لیگ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ‘ مزاج گرامی!

جمعیۃ العلماء ہند متعدد مرتبہ مسلم لیگ کو دعوت دے چکی ہے کہ ہندوستان کے موجودہ نازک دور میں یہ طریق عمل مسلمانان ہند کے لیے انتہائی خطرناک ہے کہ ہر ایک مسلم جماعت‘ خواہ اسی کو مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ نمائندگی حاصل ہو یا کم سے کم اپنے نقطہ ہائے نظر کو جدا جدا حکومت کے سامنے اور دیگر اقوام ہند کے روبرو اور خود مسلمانوں میں پیش کرتے اور اس پر اصرار کرتے رہیں۔ اور حاصل یہ نکلے کہ کوئی نقطہ نظر بھی ثمر آور اور نتیجہ خیز نہ ہو سکے اور مسلمانوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑے۔

نقطہء نظر کا یہ اختلاف جمعیۃ علماء ہند اور مسلم لیگ کے درمیان فروعی ہوتا تو وحدت و اتحاد کی آسان شکل یہ تھی کہ اگر مسلم لیگ اپنے وقار کے نام پر پیش قدمی کو اپنی توہین سمجھتی تو جمعیۃ علماء ہند اس کو نظر انداز کر کے خود ہی پیش قدمی کرتی اور مسلم لیگ کے ساتھ اتحاد عمل کا اعلان کر دیتی۔ لیکن جب کہ اس مسئلہ میں کہ آزادی ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے بلند و باعزت مقام کیا ہو‘ جو ان کے دین اور دنیا دونوں کے تحفظ کا ضامن ہو؟ جمعیۃ علماء ہند اور آل انڈیا مسلم لیگ کے درمیان بنیادی اختلاف ہے اور وہ اختلاف مسلمانوں‘ ہندوستان کے سامنے جانبین سے ظاہر ہو چکا ہے تو ایسی صورت میں اسلامی احکام اور عقلی تقاضہ کے پیش نظر صرف ایک ہی طریق کار رہ جاتا ہو۔ اور وہ یہ کہ ممبروں کی تعداد اور مؤیدین کی کثرت و قلت سے قطع نظر ایک مرتبہ تمام مسلم جماعتوں کے اہل الرائے چیدہ بزرگ جمع ہو کر مجلس مشاورت کے ذریعہ ہر

ایک نقطۂ نگاہ پر جماعتیں تعصب سے بالاتر ہو کر وسیع النظری کے ساتھ تبادلہ خیالات کریں موجودہ نقطہ ہائے نظر میں سے کسی ایک کو یا بحث ومباحثہ سے پیدا شدہ کسی نئے نظریہ کو قبول کر کے اس کو متحدہ نظریہ بنالیں۔ اور متفقہ قربانیوں کے ذریعہ حکومت اور دیگر اقوام ہند سے اس کو تسلیم کرالیں۔

اس باہمی گفت وشنید کے نتیجہ میں یہ بات بھی بآسانی طے ہوسکتی ہے کہ اتحاد مسئلہ کی خاطر سیاسی پروگرام سے متعلق تمام جماعتوں کی آواز ایک ہی آواز بن جائے۔

آپ جیسے سیاسی مفکر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ جون ۱۹۴۸ء میں ہندوستان کو سیاسی طاقت منتقل کرنے کا جو اعلان برٹش حکومت کی جانب سے ہوا ہے اس سے ایک نئی صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔ اور اب وقت نہیں ہے کہ جماعت یا ذاتی اور جماعتی تفوق و برتری کی قربان گاہ پر مسلمانوں کی جماعتی زندگی کو قربان کر دیا جائے۔ اور یہ سمجھ کر کہ ہمارا فیصلہ الہامی ہے' دوسری جماعتوں کے مخلص رہنماؤں سے صرف اس لیے کنارہ کش رہا جائے کہ بعض خصوصی حالات کی بنا پر مسلم لیگ کو مسلمانوں کی آئینی اکثریت حاصل ہے۔ بلکہ اسلامی نقطۂ نظر سے اکثریت کی مدعی جماعت پر یہ فرض اور زیادہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اس اتحاد کے لیے اقدام کرے جس پر جمعیۃ علماء ہند اس وقت اقدام کر رہی ہے۔ اور اس سے قبل بھی متعدد مرتبہ پیشکش کر چکی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ اگر غیر لیگی جماعتوں کے نزدیک اسلامی احکام ہی کی روشنی میں ہندوستان کے اندر آئندہ مسلمانوں کو بلند اور باعزت مقام حاصل کرنے کے لیے لیگ کا فیصلہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ مضرت رساں ہے تو ایسی صورت میں مسلم جماعتوں اور ان کے فیصلوں کو نظر انداز کر کے محض یہ دعوت دینا کہ وہ بغیر چون وچرا اپنے ضمیر کے خلاف مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں' اسلامی اور قرآنی حکم "وشاورھم فی الامر" اور "وامرھم شوریٰ بینھم" کے قطعاً منافی ہے۔

اس کے لیے میں جمعیۃ علماء ہند کی مجلس شوریٰ کی حالیہ تجویز کے پیش نظر" جو اس مکتوب کے ساتھ منسلک ہے' مسلم لیگ اور صدر مسلم لیگ کو دعوت اتحاد کی پیش کش کرتا ہوں۔ اور اسلامی غیرت وحمیت کا واسطہ دے کر مخلصانہ اور دردمندانہ التجا کرتا ہوں کہ آپ اس پر لبیک کہیں تاکہ مسلمانوں کے لیے کوئی متفقہ لائحہ عمل بن سکے اور یہ انتشار دور ہو کر آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل روشن ہو سکے۔

میں جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے یقین دلاتا ہوں کہ مجلس مشاورت کے اس اسلامی اصول کو اگر مسلم لیگ نے تسلیم کر لیا اور مسلم جماعتوں کے نمائندوں سے مشاورت کو ضروری سمجھا تو اس کے انعقاد کے لیے مسلم لیگ کی جانب سے جو طریق کار بھی آپ تحریر فرمائیں گے جمعیۃ علماء ہند اس پر لبیک کہے گی۔

آخر میں مجھے یہ بھی ظاہر کر دینا چاہیے کہ جب تک آپ مجلس مشاورت ترتیب نہیں فرمائیں گے مسلمانوں کو کسی خاص سیاسی جماعت کا کوئی فیصلہ خواہ اس کی پشت پر وقتی طور پر عوام کی کتنی ہی زبردست اکثریت ہو ''شرعی فیصلہ'' کہلانے کا مستحق نہیں ہوسکتا۔ انعقاد شوریٰ کے بغیر پارٹی کی ہنگامی اکثریت کو یقیناً یہ حیثیت نہیں دی جاسکتی کہ اس کے خاص قسم کے فیصلوں سے اختلاف رکھنے والے اصحاب رائے اور ارباب علم ملت کے اجتماعی فیصلوں کے خلاف کرنے والے سمجھے جائیں۔ میں آپ کے جواب کا سختی کے ساتھ منتظر ہوں۔

آپ کا مخلص

محمد حفظ الرحمٰن

ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند

(۲)

تجویز نمبر ۳ منظور کردہ مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند

منعقدہ ۱۹/ تا ۲۱ ربیع الثانی ۱۳۶۶ھ / ۱۳/ تا ۱۵/ مارچ ۴۷ء

جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ ان نئے حالات کی بنا پر جو وزیر اعظم برطانیہ کے بیان سے پیش آ رہے ہیں اور ۱۹۴۸ء میں ہندوستان کی آزادی سے پیش آنے والے ہیں مسلمانوں کے باہمی اتحاد و اتفاق کو ان کے مذہبی تحفظات کے لیے ضروری و لازمی سمجھتا ہے۔ اور ہندوستان کے تمام مسلمانوں سے پرزور درخواست کرتا ہے کہ اس وقت تمام مسلم جماعتوں کے نمائندوں کا ایک جگہ جمع ہو کر اس بات پر غور کرنا نہایت ضروری ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے مذہبی و قومی تحفظات کے استحصال کی کیا صورت ہے۔ اور وہ کس طرح حاصل ہو سکتے ہیں۔

اگر اس وقت مسلمانوں نے اس کی طرف سے لا پروائی برتی اور ضد و منافست سے کام لیا تو آزاد ہندوستان میں ان کے لیے کوئی مناسب مقام نہ ہوگا۔ اور ان کو ناقابل تلافی نقصان پہونچے گا۔

الجمعیۃ المرکزیہ
لعلماء الہند
۱۳۳۸ھ۔ دہلی

(۳)

قائد لیگ مسٹر جناح کا جواب

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند کے مندرجہ بالا خط کے جواب میں مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ نے حسب ذیل مکتوب ارسال فرمایا:

ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ، مالا بارہل

بمبئی

۳/اپریل ۴۷ء

ڈیر سر!

مجھے آپ کی مرسلہ قرارداد اور آپ کا خط مورخہ ۲۵/مارچ ملا۔ میں اس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔ برطانوی حکومت کے قرطاس ابیض مورخہ ۲۰/فروری کے شائع ہو جانے کے بعد جو نئی صورت حال پیدا ہو چکی ہے اور اس نازک صورت حال کے پیش نظر جس سے ہم کو قریب ترین مستقبل میں دوچار ہونا ہے۔ میں آپ سے مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کے مسئلہ میں قطعی متفق ہوں۔ اور میں نے اس مسئلہ پر متعدد بار زور دیا ہے۔ خصوصاً دو باتیں گذشتہ ہفتوں کے درمیان میں نے ہر مسلمان سے اپیل کی ہے کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائے۔ ہمارے لیے اب یہ وقت نہیں ہے کہ ہم اپنے داخلی اختلافات کے متعلق کوئی مسئلہ کھڑا کر دیں۔ اور یہ صرف ہمارا ہی کام ہونا چاہیے کہ ہم ایک منظم جماعت کی حیثیت سے اپنے دستور اساسی اور اپنے قواعد وضوابط کی روشنی میں اس کو رفع کریں۔ یہ گھڑی وہ گھڑی نہیں کہ ہم اپنے گھریلو (اندرون خانہ) اختلافات میں الجھ جائیں حالانکہ ہمیں ایک شدید بیرونی خطرہ دھمکا رہا ہو۔ میں اس لیے آپ سے نہایت دردمندانہ درخواست (اپیل) کرتا ہوں کہ آپ بغیر کسی مزید تاخیر کے مسلم لیگ میں شریک ہو جائیں۔ اور مسلمانوں کے ملی مفاد کی حمایت فرمائیں۔ اور پاکستان کا محبوب نصب العین حاصل کر لیں۔ یہ ہمارے اتفاق واتحاد پر ہی منحصر ہے۔ اور مسلم لیگ کی وفادارانہ تائید پر موقوف ہے۔ جو مسلمانان ہند کی واحد بااختیار اور نمائندہ تنظیم ہے۔

میں نے واضح کر دیا ہے کہ ہر مسلمان جو مسلم لیگ میں شریک ہونے پر رضا مند ہے چاہے گذشتہ دور میں (اب سے پہلے) اس کے نظریات کچھ ہی رہے ہوں، خیر مقدم کا مستحق ہے۔ اور میں جمعیۃ علماء ہند کے ہر رکن کا خیر مقدم کرنے کو تیار ہوں۔

مجھے امید ہے کہ آپ اس صورت حال پر دردمندانہ غور کریں گے۔ میں تو جدید رفتار واقعات کی روشنی میں جو سرزد ہو رہے ہیں اور ہندوؤں کی اہم سیاسی جماعتوں کی روش دیکھتے ہوئے کوئی دشواری اس امر میں نہیں پاتا ہوں۔ کہ آپ میری استدعا پر لبیک فرمائیں۔ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ آپ نے بھی اس صورت حال کا پسندیدہ احساس کر کے اس امر پر زور دیا ہے کہ اس نازک مرحلہ پر ہمارے لیے دوش بدوش کھڑا ہونا کس قدر اہم ہے۔

(ایم۔ اے۔ جناح)

(۴)

ہندوستان کے مسلمانوں کا باہمی اتحاد

مولانا حفظ الرحمٰن اور محمد علی جناح کے درمیان پیغامات کا تبادلہ

مسلمانوں کے اتحاد کی سرگزشت:

اگر ہم ہندو مسلم اتحاد کے حامی ہیں اور اس سے ایک جماعت کو اختلاف ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ مسلمانوں کے باہمی اتحاد کی قدر و قیمت کو نظر انداز کر دیا جائے حالانکہ دس کروڑ مسلمانوں کا مسلمان ہونا خود اس امر کی دلیل ہے کہ ان کی ہستی ایک عالمگیر ملی اتحاد کا نمونہ کامل ہے۔ وہ لوگ جو سالہا سال سے اسلام اور آزادی کے محاذ پر کام کر رہے ہیں، کبھی مسلمانوں کے باہمی اتحاد سے غافل نہیں رہے۔ اگر کچھ مسلمانوں نے اس کے خلاف اپنی رائے قائم کر لی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حقیقت سے باخبر نہیں ہیں۔ اور انہیں یہ علم نہیں ہے کہ جمعیۃ علمائے ہند اور قوم پرور مسلمان بارہا اس راہ میں سچے دل سے قدم بڑھا چکے ہیں۔ اور اگر اس میں ناکامی ہوئی تو قصور ان کا نہیں بلکہ ان حالات کا ہے جن پر عبور حاصل نہیں کیا جا سکا۔

ہمیں خوشی ہے کہ گذشتہ ماہ جمعیۃ علماے ہند کی مجلس عاملہ نے مسلمانوں کے باہمی اتحاد کے متعلق ایک تجویز پاس کی اور تمام مسلم جماعتوں کو خلوص کے ساتھ، دردمندی کے ساتھ اور کھلے ہوئے دماغ اور سچے دل کے ساتھ پکارا۔ مولانا حفظ الرحمٰن جمعیۃ علماءِ ہند کے ناظم ہیں، اس تجویز کے بعد ان کا ایک فرض تھا اور انہوں نے اس کو پورا کرنے کے لیے قائد اعظم محمد علی جناح کے نام اتحاد کا پیغام بھیجنے میں پیش قدمی کی۔ قائد اعظم نے اس کا جواب دیا اور ہمارے علم کے مطابق پچھلے دس سال میں یہ پہلا جواب ہے جس میں شریفانہ طور پر سیاسی زبان

ا۔ یونائیٹڈ پارٹی خان بہادر اللہ بخش سومرو کی پارٹی تھی۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ کی پارٹی مسلم پولیٹکل پارٹی تھی۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں اس کے نام حصہ لیا تھا۔ لیکن اللہ بخش سومرو کے بعد جب انہیں وزارت بنانے کا موقع ملا اور غیر مسلم ممبران کے تعاون کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے ''ڈیموکریٹک پارٹی'' کے نام سے ایک نئی پارٹی بنا لی۔ سندھ میں مسلم لیگ اس وقت تھی ہی نہیں، نہ اس کے پلیٹ فارم سے کسی نے انتخاب لڑا تھا (ا۔س۔ش)

استعمال کی گئی ہے۔ دونوں رہنماؤں کے پیغام ہمارے سامنے ہیں۔ ہمیں انتظار تھا کہ واقعات کا رخ اس معاملے میں ترقی کی طرف ہوگا اور ہم زیادہ واضح ماحول میں اس مسئلے کی پرانی تصویر پیش کر کے نئی پیشکش پر اپنی رائے ظاہر کر سکیں گے۔ آج ہم انتظار کے بعد اپنے اس ارادے کو پورا کر رہے ہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ مسلمانوں کے افکار و آرا کا فرق دور کرنے کے لیے تمام مسلم جماعتوں کی ایک بڑی پارلیمنٹ (شوریٰ) کا جلسہ طلب کیا جائے۔ وقت کم ہے' صورت حال تاریک ہے' ہمارا فرض اہم اور ذمہ داری عظیم ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اختلافات سے بالاتر ہو کر اتفاق و اتحاد کو حاصل کرنے کے لیے ایک جگہ مل کر بیٹھیں' ایمانداری سے گفتگو کریں اور مسلمانوں کا آخری نصب العین طے کر کے اٹھیں۔ اور دس کروڑ مسلمان اس نصب العین کے لیے میدان میں اس طرح نکلیں کہ ان کی صفوں میں کوئی اختلاف نہ ہو۔ ان کے دلوں کا رخ ایک ہو' مقصد ایک ہو' ارادے ایک ہوں اور قول فعل کی رفتار ایک ہو۔ مولانا حفظ الرحمٰن کی اس پرخلوص اپیل کے جواب میں قائداعظم نے اپنے جواب میں کہا کہ مجھے آپ کے جذبے سے اتفاق ہے اور وقت کی نزاکت کا احساس ہے آیئے اور ایک قدم اور بڑھ کر لیگ میں شامل ہو جایئے۔ جو کام آپ مشورے سے لینا چاہتے ہیں وہ مسلم لیگ کے نئے قانون سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس جواب کے بعد دونوں جماعتوں کے تعلق کی رفتار اپنی جگہ باقی ہے اور اس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔

ہم مسلمانوں کے علم میں یہ بات لانا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے اتحاد کے لیے قوم پرور مسلمانوں کا یہ اقدام پہلا اقدام نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے بھی کئی قدم اٹھ چکے ہیں۔ اور تاریخ کے صفحات پر اپنی جگہ پیدا کر چکے ہیں یہاں ہم چند واقعات درج کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

(الف) ۱۹۳۶ء میں سر محمد شفیع اور مسٹر جناح کے درمیان شدید اختلاف تھا۔ مسلمان دو جتھوں میں تقسیم تھے ان دونوں رہنماؤں کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر ان کو ایک خیال اور ایک تجویز پر جمع کر دینا جمعیۃ علمائے ہند کے صدر ہی کا کام تھا۔

(ب) ۱۹۳۶ء سے پہلے مسٹر جناح اور سر آغا خان کی سیاست کا رخ الگ الگ تھا۔ سر آغا خان کی مسلم کانفرنس نے مسٹر جناح کی مسلم لیگ کو قبر کے کنارے پر پہنچا دیا تھا۔ سر آغا خان یورپ چلے گئے مسٹر جناح نے ۱۹۳۶ء میں اسی اپریل کے مہینے میں مسلم جماعتوں

اور رہنماؤں کو ایک اسلامی پارلیمنٹ میں طلب کیا' جمعیۃ علماء اور مجلس احرار کے رہنماؤں نے امپیریل ہوٹل میں ان سے مکمل گفتگو کی۔ مسٹر جناح نے فرمایا مجھے آپ کی امداد کی ضرورت ہے۔ گفتگو کے بعد ایک شریفانہ معاہدہ طے پایا گیا۔

۱۔ مسلم لیگ کو رجعت پسند طاقتوں سے پاک کر دیا جائے گا اور اصل طاقت آزادی پسند مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوگی۔

۲۔ اگر جناح صاحب ایسا نہ کر سکے تو وہ لیگ کو توڑ دیں گے یا چھوڑ دیں گے اور آزادی کی۔ حامی طاقتوں سے مل کر مسلمانوں کی قسمت بنائیں گے۔

۱۹۳۶ء کے باغیوں کی جماعت

اس معاہدے کے بعد جمعیۃ علمائے ہند نے مسٹر جناح کی لیڈر شپ میں تازہ روح ڈالی' مسلم لیگ کو زندہ کیا اور نئے الیکشن میں اتنا بے پناہ کام کیا کہ مسلم لیگ مسلم لیگ نام پانے کی مستحق ہوگئی۔ اسلام اور وطن کے وہ باغی جو آج قائداعظم کے تخت و تاج کو اٹھائے ہوئے ہیں' گورنروں کے حکم سے میدان میں آئے۔ ان باغی جماعتوں کا نقشہ یہ تھا۔

شمار	صوبہ	پارٹی	پارٹی لیڈر
۱۔	پنجاب	یونینسٹ پارٹی	سر سکندر حیات خاں
۲۔	سندھ	یونائیٹڈ پارٹی	سر غلام حسین ہدایت اللہ (۱)
۳۔	یوپی	نیشنل ایگریکلچر پارٹی	نواب چھتاری
۴۔	آسام	یونین پارٹی	سر سعد اللہ
۵۔	بنگال	کسان پرجا پارٹی	مسٹر فضل الحق

انتخاب کے نتیجے میں گورنر کانگریس کے مقابلے میں ناکام ہوگئے۔ اب ان لیڈروں کو لیگ پر قبضہ کرنے کا حکم ملا وہ آگے بڑھے۔ قائداعظم نے اپنے وفادار جرنیلوں کو دھکا دے دیا اور گورنروں کی منشا کے مطابق باغیوں کو فوج کی کمان سپرد کر دی۔ انہوں نے معاہدے کو توڑ دیا۔ مسلم لیگ کی خلیج میں جب گندہ پانی آ گیا تو صاف پانی خود بخود نکل گیا۔ مگر قائداعظم نے اس کی ذرا پروا نہ کی۔ وہ نئے آدمیوں سے اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے پرانے ساتھیوں کی طرف مڑ کر نہ دیکھا۔ اس طرح لیگ ۱۹۳۶ء کے باغیوں کی جماعت بن کر رہ گئی۔ بہر حال

جمعیۃ علماء نے ۱۹۳۶ء میں بھی مسلمانوں کے اتحاد کی خاطر مسٹر جناح کی دعوت کو قبول کیا مگر ملت کے مخلصین نے ۱۹۳۶ء میں مسلمانوں کا جو محاذ انتہائی قربانیوں کے بعد قائم کیا تھا وہ گورنروں اور ملت کے پرانے باغیوں کے اتحاد کی بنا پر ٹوٹ گیا۔

ج۔ ۱۹۳۷ء میں ابھی اختلاف ابتدائی منزل پر تھا کہ مولانا محمد سجاد نے مسٹر جناح کو تار دیا مسلمانوں کا اتحاد ضروری ہے۔ مسلم کنونیشن بلایئے۔ جواب ملا آپ کی تجویز عاجلانہ' لغو اور قبل از وقت ہے۔'' اتحاد کی خواہش کا یہ جواب دیکھئے اور جمعیۃ علماء کو الزام دیجئے کہ وہ مسلمانوں میں اختلاف پیدا کر رہی ہے۔

(د) مولانا احمد سعید صاحب نے مسلم لیگ ہائی کمانڈ سے مسلمانوں کے اتحاد کے لیے خط و کتابت کی مگر جواب انکار کی صورت میں ملا۔

(ہ) اگر دو آدمیوں میں اختلاف ہو تو اتحاد کی تین صورتیں ممکن ہیں۔ ان میں سے ایک اتحاد کی دعوت ہے۔ دوسرا اتحاد کے لیے بلائے' کوئی تیسرا دونوں کو جمع کر دے۔ جمعیۃ علماء نے اپنے اجلاس دہلی' لاہور' سہارن پور' میں مسٹر جناح کو شرکت کی دعوت دی۔ وہ نہیں آئے۔ خود انہوں نے کبھی اتحاد کی دعوت نہیں دی۔ خان بہادر جان محمد صاحب نے دونوں کو جمع کرنا چاہا۔ تو مسٹر جناح نے مولانا آزاد کے ساتھ ایک میز پر بیٹھنے اور اسلامی اتحاد کے مسئلے پر مشورہ کرنے سے انکار کر دیا۔ واقعات کی یہ تصویر ہماری سیاسی تاریخ کے صفحات پر موجود ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت کو حق ہے کہ وہ جس کو چاہے ملزم گردانے اور جس کو چاہے بری قرار دے۔

جمعیۃ علمائے ہند نے اب پھر ایک قدم بڑھایا ہے۔ اتحاد ہو سکتا ہے مگر اس کی صورت یہی ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن کی یہ تجویز منظور کر لی جائے کہ تمام مسلم جماعتیں خلوص کے ساتھ ایک جگہ جمع ہوں اور ایک دوسرے کے نظریوں کو سن کر ایک نصب العین مقرر کریں۔ ہم قائداعظم سے کہیں گے کہ انہوں نے جمعیۃ علماء کی تجویز کا کوئی جواب نہیں دیا۔ انہیں اس تجویز کو منظور کرنا چاہیے کیوں کہ یہی ایک تجویز ہے جو مسلمانوں کو ایک مرکز پر متحد کر سکتی ہے۔

(سہ روزہ مدینہ' بجنور۔ ۲۱ راپریل ۱۹۴۷ء)

(۵)

قائداعظم کا ذوق تشتت

قائداعظم محمد علی جناح کے بارے میں جمعیۃ علماے ہند' نیشنلسٹ مسلمانوں اور قوم پرور جماعتوں کو یہ شکایت رہی ہے کہ انہوں نے مسلم لیگ کی قیادت سنبھالنے کے بعد مسلمانوں کے اتحاد اور کسی متفقہ لائحہ عمل تلاش کرنے پر کبھی توجہ نہیں دی۔ بلکہ وہ خود اتحاد کے راستے کی رکاوٹ بنے رہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بنگال' پنجاب' سندھ وغیرہ اور خود آل انڈیا مسلم لیگ کے اندر سر شفیع اور علامہ اقبال اور سکندر حیات خضر حیات سے لے کر شوکت حیات تک کے جو حالات اور مسلم لیگ کی تاریخ جو ہمارے سامنے ہے اس کے مطالعے سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مسلم لیگ میں بھی دھڑے بندی کے قائل تھے اور انہوں نے ہمیشہ اپنے خاص مہروں کو آگے بڑھایا اور دوسروں کی ٹانگیں کھنچوائیں۔

مرزا غلام نبی جانباز'' کاروان احرار' جلد ۸ میں بعض ایسے واقعات جمع کر دیے ہیں جن سے قائداعظم کے ذوق تفرقہ اندازی پر روشنی پڑتی ہے (ا۔س۔ش)۔

اس کے علاوہ ہر صوبے میں دو دو اور تین تین کے گروپوں میں یہ لوگ (مسلم لیگی) تقسیم تھے۔ مثلاً آسام میں سر سعد اللہ خاں اور عبدالمتین چودھری مل کر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ بنگال میں پہلے تو مولوی فضل الحق شیر بنگال بن کر پروان چڑھے' لیکن جب قائداعظم ان سے ناراض ہوئے تو انہیں مسلم لیگ سے نکال دیا۔ پھر خواجہ ناظم الدین اور حسین شہید سہروردی میں مڈبھیڑ رہنے لگی۔ بمبئی میں یوں تو قائداعظم خود موجود تھے۔ تاہم مقامی سیاست میں مسٹر کریم بھائی اور ابراہیم چندریگر کے مابین جذبات کی دیوار حائل تھی۔ یوپی میں چودھری خلیق الزمان اور نواب اسماعیل میں بظاہر تو رائے میں اختلاف نہیں تھا لیکن اندر خانے اقتدار کی رقابت موجود تھی۔ پنجاب میں جہاں ملک خضر حیات یونینسٹ پارٹی کا لیڈر تھا' دوسری طرف یہاں ممتاز محمد خاں دولتانہ اور نواب افتخار حسین ممدوٹ ایک میز پر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ پنجاب کی سیاست میں خود

قائداعظم بھی دخیل تھے۔ اس موقع پر پنجاب مسلم لیگ کے معروف رہنما میاں امیرالدین کے ایک مضمون کا اقتباس جو ۲۵ر دسمبر ۱۹۷۶ء کے نوائے وقت میں شائع ہوا' قابل ذکر ہے۔ جس میں وہ کہتے ہیں:

''دسمبر ۱۹۴۵ء' ۱۹۴۶ء میں جب مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات نظریہء پاکستان کی بنیاد پر لڑے گئے ہیں تو اس وقت صوبہ مسلم لیگ نے پنجاب کے صوبائی انتخابات کا انچارج مجھے بنایا تھا۔ پنجاب میں ۸۶ نشستیں مسلمانوں کی تھیں' جن میں سے ۷۹ مسلم لیگ نے جیت لیں اور باقی ۷ یونینسٹ پارٹی کو ملیں۔ نتائج کے اعلان کے بعد ایک روز راقم الحروف' آئی یو خان' میاں امین الدین اور سردار شوکت حیات ایک جگہ جمع تھے کہ خضر حیات کی طرف سے یہ پیش کش آئی کہ اس کے ساتھی ارکان اسمبلی مسلم لیگ اسمبلی گروپ میں شامل ہو جانے پر آمادہ ہیں۔ صرف معمولی سے شرط یہ ہے کہ ان کے ساتھی ایک رکن اسمبلی مسٹر مظفر علی قزلباش کو وزارت میں شامل کر لیا جائے۔ میں نے یہ سن کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ چلو کیا حرج ہے' یہ ایک معمولی شرط ہے۔ چنانچہ سب نے کہا' ٹھیک ہے۔ اس میں قائداعظم سے بھی پوچھنے کی کیا بات ہے' وزارت بنالیں۔ اس فیصلے کے بعد ہم مسٹر دین محمد (جسٹس) کے پاس گئے۔ اور ان سے رائے طلب کی۔ انہوں نے بھی اس پر صاد کیا۔ میں اسی ادھیڑ پن میں تھا کہ شام کو مسٹر افتخار حسین ممدوٹ کا فون آ گیا کہ فلاں وقت قائداعظم کے پاس دہلی پہنچیں اور ان سے اس کی اجازت طلب کریں۔ میں اور سردار شوکت حیات وقت مقررہ پر دہلی پہنچے تو معلوم ہوا کہ میاں ممتاز دولتانہ اور راجہ غضنفر علی بھی دہلی آئے ہوئے ہیں اور وہ اس وقت نوابزدہ لیاقت علی کے ہاں ہیں۔ چنانچہ ہم پہلے ان کے پاس گئے۔ نوابزادہ لیاقت علی خان سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے سارا ماجرا ان سے کہا۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ ''ٹھیک ہے'' خضر حیات سے معاملہ کر لو۔ پھر راقم الحروف' نوابزدہ لیاقت علی خاں' سردار شوکت حیات اور راجہ غضنفر علی' قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو

صورت حال بتائی تو وہ ایک دم چونکے اور فرمایا کہ ”نہیں! اگر تم ایسا کرو گے تو میں لیگ سے استعفیٰ دے دوں گا۔“ ہم قائداعظم کی یہ بات سن کر اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔“

سندھ میں مسٹر جی ایم سید اور محمد ایوب کھوڑو کے درمیان دریائے سندھ کے کناروں جتنا بعد تھا۔ سرحد میں عبدالرب نشتر' سردار اورنگ زیب اور عبدالقیوم خاں (جن کا لیگ میں نیا جنم ہوا تھا) ہاتھا پائی تھی۔

ان حالات میں اکثریت کے باوجود مسلم لیگ بعض صوبوں میں اپنی حکومت قائم نہ کر سکی۔ آسام کے سر سعداللہ کانگریس کے رحم و کرم پر تھے۔ بنگال میں آپس کی کتا چھنی نے مولوی فضل الحق کو غیر مسلموں کی جھولی میں ڈال دیا۔ چنانچہ کرسچک سرمک پارٹی اور کانگریس کو کولیشن کرنا پڑی۔ پنجاب میں غالب اکثریت ہونے پر مسلم لیگ خضر حیات کی یونینسٹ پارٹی کو اپنے ساتھ نہ ملا سکی۔ آخر خضر حیات کو کانگریس سے سمجھوتہ کرنا پڑا۔ سرحد میں تو ڈاکٹر خاں صاحب ہی تھے' اگر یہاں بھی عبدالقیوم خاں کی حماقتوں سے سردار عبدالرب نشتر کو صوبائی الیکشن میں شکست نہ دلائی جاتی تو ممکن ہے' پوزیشن دوسری ہوتی۔ سندھ میں بنے بنائے کھیل کو وہاں کے حالات نے سدھرنے کی مہلت نہ دی۔ چنانچہ صدر مسلم لیگ نے خود مداخلت کر کے گزشتہ سال ۲۵ر فروری ۱۹۴۵ء میں مسٹر جی ایم سید اور ایم۔ ایچ گزدر کو لیگ سے نکال دیا اور ان کی جگہ سر غلام حسین ہدایت اللہ کو لیگ کی چودھراہٹ سونپ دی۔ یہ شخص ہمیشہ چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والا تھا۔

اس ضد کا یا باہم کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۱ر مارچ ۱۹۴۶ء کو ملک خضر حیات ٹوانہ نے پنجاب کانگریس سے کولیشن وزارت قائم کر لی اور اس کے تحت چار وزرا نے حلف اٹھا لیا۔ لاء اینڈ آرڈر کا محکمہ ملک خضر حیات وزیراعظم پنجاب نے اپنے پاس رکھا' فنانس اور جیل کے محکمے لالہ بھیم سین سچر کے سپرد ہوئے' سول سپلائز اور ترقیات سردار بلدیو سنگھ کے پاس رہے۔ سر مظفر علی قزلباش محکمہ تعلیم اور میڈیکل کے انچارج ٹھہرائے گئے۔ ریونیو کا محکمہ چودھری لہری سنگھ نے سنبھال لیا۔

اس طرح مسلم لیگ نے انتخاب جیت کر بھی بنیادی طور پر اپنی پوزیشن مشکوک کر لی۔ اس کے برعکس کانگریس نے ہر صوبے میں جہاں کہ اس کی اکثریت تھی۔ بے مہابہ اپنی حکومتیں قائم کیں۔ (کاروان احرار' جلد ۸' ص ۴۷۔۴۴)

(۶)

اتحاد اسلامیان ہند کی کہانی

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی زبانی

اردو کے مشہور ادیب اور صحافی خواجہ عبدالوحید (۱۹۰۱ء۔۱۹۷۹ء) نے مولانا شبیر احمد عثمانی کے ارشادات کو قلم بند کر کے چھپوا دیا تھا۔ ان ارشادات کا تعلق صرف اتحاد بین المسلمین فی الہند کے مسئلے سے ہے۔ حضرت علامہ نے اس میں ناکامی کی تمام تر ذمہ داری مسلم لیگ کے صدر پر ڈالی ہے۔ جہاں تک جمعیۃ علماء ہند کا تعلق ہے' اس نے مسلمانوں کے اتحاد کی ضرورت کو ہمیشہ محسوس کیا اور اس کے ساعی رہی' لیکن مسلم لیگ فرقہ پرستی کی جس راہ پر چل نکلی تھی اس نے نہ صرف ہندوستان میں خاص مسلمانوں کے مفاد کے نقطۂ نظر سے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کو نظر انداز کر دیا تھا۔ بلکہ مسلمانوں کے مابین اتحاد کی اہمیت سے بھی یکسر صرف نظر کر لیا تھا۔ اتحاد بین المسلمین کی کوششوں میں ناکامی اور صدر مسلم لیگ کی ذمہ داری کے بارے میں علامہ شبیر احمد عثمانی کی گواہی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ان ارشادات کی اشاعت کے بعد حضرت علامہ تین سال سے زیادہ عرصے تک زندہ رہے اور پورے تین سال کے شب و روز مسٹر محمد علی جناح نے اپنی حیاتِ مستعار کے گزارے تھے لیکن کسی نے ان ارشادات کے کسی جز کی بھی تردید نہیں کی۔ حضرت مفتی کفایت اللہ ۱۹۴۰ء کے وسط تک جمعیۃ علماء ہند کے صدر رہے تھے اور حضرت نے اسی حیثیت میں اتحاد کی گفتگو میں حصہ لیا تھا۔ اس لیے اتحاد کی ان کوششوں کا تعلق ۱۹۳۹ء یا ۱۹۴۰ء کے بالکل اوائل سے ہے۔ یہ ارشادات ''اتحاد اسلامیان ہند کی کہانی۔۔۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی زبانی'' کے عنوان سے زمزم' لاہور کی اشاعت مورخہ ۷ جولائی ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئے تھے۔ یہ ارشادات خواجہ عبدالوحید کے ابتدائی نوٹ کے ساتھ مِن و عَن شائع کیے جا رہے ہیں۔ (ا۔س۔ شیخ)

خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

"راقم السطور ان خوش نصیب مسلمانان پنجاب میں سے ہے جنہیں حال ہی میں لاہور میں متعدد مرتبہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی' مدظلہ العالی کے ارشادات عالیہ سے مستفیض ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ذیل میں آپ کے ارشادات جو ایک ہی مجلس میں سننے کا موقع ملا' سپرد قلم ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ حضرت علامہ کے ارشادات کو کامل دیانت داری کے ساتھ انہیں کے الفاظ میں دہرا دیا جائے۔ تاہم ممکن ہے کہ بعض جگہ الفاظ ان کے نہ ہوں۔ انشاء اللہ خیالات میں کچھ ردوبدل نہ ہوگا۔ اور اگر کہیں راقم کے سوء فہم نے معمولی سی غلطی ان بھی پیدا کر دی ہو تو حضرت علامہ اس کی تصحیح فرما سکتے ہیں۔ (خواجہ عبدالوحید)

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ۱۹۳۷ء کے انتخابات گزر چکے تھے اور مسلم لیگ کا لاہور کا ریزولیوشن ابھی پاس نہ ہوا تھا۔ میں اس زمانے میں جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا ایک رکن تھا۔

میرا اس زمانے میں خیال تھا کہ ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا حل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہندوستان کی دو بڑی قوموں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مفاہمت نہ ہو جائے اور ہندوؤں سے مفاہمت نہیں ہو سکتی جب تک خود مسلمان جماعتوں میں کامل یکجہتی اور مفاہمت نہ ہو جائے۔ اس زمانے میں اسلامیان ہند کی قابل ذکر تین جماعتیں تھیں۔ ایک مسلم لیگ' دوسری جمعیۃ علماء ہند اور تیسری مجلس احرار اسلام۔ ان جماعتوں میں مفاہمت کے لیے ضروری تھا کہ ان تینوں کے قائدین کے درمیان مفاہمت ہو۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ ان جماعتوں کے قائدین کو اکٹھا کر کے اور ان کے درمیان تبادلہ خیالات کا موقع پیدا کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کروں گا۔

چنانچہ میں نے مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند' مولانا حبیب الرحمٰن (لودھیانوی) صدر مجلس احرار اسلام اور مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ سے گفتگو شروع کی۔ اول الذکر دونوں اصحاب ثانی الذکر سے تبادلہ خیالات پر رضامند ہو گئے۔ ان کی رضامندی حاصل کرنے کے بعد میں نے مسٹر جناح سے ملاقات کا ارادہ کیا۔

مسٹر جناح سے ملاقات اور مقصد میں ناکامی:

میں اس کے بعد بمبئی میں مسٹر جناح سے ملا۔ جب میں نے ان کے سامنے تینوں مسلمان جماعتوں کے قائدین کی ملاقات کی تجویز پیش کی اور یہ بھی کہا کہ دوسری دونوں جماعتوں کے

قائدین گفتگو کے لیے آمادگی کا اظہار کر چکے ہیں تو مسٹر جناح نے کہا کہ مولانا یہ کیسے ہو سکتا ہے میں تو جمعیۃ العلماء، مجلس احرار یا کسی اور جماعت کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتا' اگر میں ان سے ملاقات کروں گا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ میں نے ان جماعتوں کی ہستی کو تسلیم کر لیا میں ایسا کبھی نہیں کروں گا۔

مسٹر جینا کا یہ جواب سن کر میں نے کہا کہ صاحب! یہ تو ناممکن ہے وہ جماعتیں تو اپنی اپنی جگہ قائم رہیں گی یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ مسلم لیگ میں مدغم ہو جائیں۔ اس لیے آپ کو ان سے علیحدہ جماعتوں کے قائدین کی حیثیت ہی سے گفتگو کرنی پڑے گی۔ جینا صاحب نے فرمایا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں کسی دوسری جماعت کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس گفتگو کے بعد میں بمبئی سے دیوبند کو لوٹ آیا۔

نئی کوشش

ایک زمانہ گزر گیا۔ دہلی میں مرکزی اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب صدر مجلس احرار اسلام کا ایک خط دہلی سے میرے نام پہنچا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ آج کل مجلس احرار کا ایک اجتماع یہاں ہو رہا ہے اور احرار کے سب ارکان موجود ہیں۔ جمعیۃ کا تو دہلی مرکز ہے اس لیے تمام بزرگان جمعیۃ یہاں موجود ہیں اور مرکزی اسمبلی کے اجلاس کی وجہ سے جینا صاحب بھی یہاں موجود ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ آپ اس وقت یہاں پہنچ جائیں اور مفاہمت کی گفتگو کرنے کی کوشش فرمائیں۔

اس خط کے ملنے پر میں فی الفور دہلی جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ جس وقت میں تانگہ میں سوار ہوا سخت طوفان باد و باراں جاری تھا اور ژالہ باری بھی ہو رہی تھی لیکن میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر اسلامیان ہند کو آپس میں ملانے کی کوشش کرتے ہوئے میری جان بھی چلی جائے تو بہت بڑی سعادت کا موجب ہوگا۔ چنانچہ میں سٹیشن پر پہنچ کر دہلی کی گاڑی میں سوار ہو گیا۔

مسٹر جینا سے دوبارہ ملاقات:

دہلی پہنچ کر میں ارکان جمعیۃ علماء ہند اور مجلس احرار اسلام سے ملا اور دونوں جماعتوں کے سر برآوردہ ارکان نے اس تجویز کو منظور کر لیا کہ مسٹر جینا سے ملاقات اور تبادلہ خیالات کی کوشش کی جائے۔ مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے یہ کہا کہ اگر وہ

یعنی جینا صاحب چاہیں کہ ہم ان سے ملیں تو وہ ہمیں دعوت نامہ بھیج دیں اور اگر وہ ہمارے پاس تشریف لانا چاہیں تو ہم انہیں دعوت نامہ بھیجنے کے لیے تیار ہیں۔

چنانچہ میں نے ٹیلی فون پر جینا صاحب سے ملاقات کے لیے وقت مانگا اور وقت معینہ پر ان کے ہاں پہنچ گیا۔ جاتے ہی میں نے انہیں بمبئی کی ملاقات اور اس وقت کی گفتگو کا ماحصل یاد دلایا اور اس کے بعد کہا کہ آج کل خوش قسمتی سے تینوں جماعتوں کے سربرآوردہ لوگ یہاں موجود ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ آپ لوگ مل بیٹھیں اور فلاح ملی وملکی کوئی تدبیر پیدا ہو جائے۔ مسٹر جینا نے وہی جواب دیا جو وہ بمبئی کی ملاقات میں دے چکے تھے میں نے اس پر پھر یہی کہا کہ یہ تو نہیں ہو سکتا۔ جمعیۃ علماء ہند اور مجلس احرار اسلام دونوں مسلم لیگ سے علیحدہ جماعتیں رہیں گی۔ اوران کے قائدین آپ سے اپنی جماعتوں کے نمائندوں کی حیثیت سے گفتگو کریں گے۔

جینا صاحب کی گفتگو کے لیے آمادگی:

خاصی ردوقدح کے بعد وہ ملاقات کے لیے آمادہ ہو گئے اس پر میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ جمعیۃ العلماء کے دفتر میں چلنا پسند کریں تو ان حضرات کی طرف سے آپ کی خدمت میں دعوت نامہ آ جائے گا اور اگر آپ یہ چاہیں کہ وہ یہاں آئیں تو آپ ان کی طرف دعوت نامہ بھیج دیں۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ میں وہاں نہیں جا سکتا وہ یہاں آ جائیں۔ میں نے کہا تو آپ ان کے نام ایک دعوت نامہ لکھ کر مجھے دے دیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں تحریری دعوت نامہ نہیں دے سکتا۔ کیا ان لوگوں کو آپ کے زبانی پیغام پر اعتماد نہ ہو گا؟

قائدین جمعیۃ ومجلس کی آمادگی:

میں واپس ناکام لوٹ کر پھر جمعیۃ العلماء ہند اور مجلس احرار اسلام کے قائدین سے ملا۔ اوران پر صورت حالات واضح کر دی۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو تحریری دعوت دینے کے لیے تیار ہیں۔ وہ تحریری دعوت نامہ کیوں نہیں دیتے۔ میرے اصرار پر وہ لوگ مسٹر جناح کے ہاں بغیر کسی تحریری دعوت نامہ کے جانے پر بالآخر رضامند ہو گئے۔

میں نے پھر مسٹر جناح سے وقت لیا اور وقت معینہ پر میں، مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مسٹر جناح کے دولت کدے پر پہنچ گئے۔ ملاقات کے شروع میں میں نے کہا کہ میرا منصب صرف آپ تینوں حضرات کو ملا دینا تھا اور الحمد للہ کہ وہ پورا ہو گیا۔

اب میرا کام ختم ہے اور اب میں خاموش بیٹھا رہوں گا۔ گفتگو آپ حضرات کے درمیان ہوگی۔ میں اس میں کوئی حصہ نہ لوں گا۔

مفاہمت کی گفتگو:

جناح صاحب نے فرمایا کہ میں دو باتیں ابتدائی طور پر کہنا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میرے ساتھ ایک اور شخص گفتگو میں اس لیے شامل کر لیا جائے کہ میں اردو زبان آسانی سے نہیں بول سکتا وہ صاحب میرا مفہوم آپ پر اچھی طرح واضح کر سکیں گے۔ مفتی صاحب اور مولوی صاحب نے اس کی اجازت دیدی۔ چنانچہ نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب کو ساتھ کے کمرے سے بلا لیا گیا اور اب ہم کل پانچ آدمی ہو گئے۔ دوسری بات جناح صاحب نے یہ فرمائی کہ جب تک۔۔ ہم لوگ کسی متفقہ فیصلے پر نہ پہنچ جائیں اس گفتگو کے متعلق کوئی اطلاع اخبارات میں شائع نہ کی جائے۔ اس پر بھی سب لوگوں کو اتفاق ہو گیا اور آج تک اس ملاقات کے حالات اور گفتگو کی تفصیل سے ہندوستان کے عوام بے خبر رہے ہیں۔

اتفاق رائے:

گفتگو شروع ہوئی تبادلہ، خیالات' ردوقدح' ترمیم و تنسیخ کا سلسلہ کم و بیش آٹھ بجے رات سے لے کر بارہ بجے رات تک جاری رہا۔ تمام بحث پانچ بنیادی امور پر مرتکز رہی اور الحمدللہ کہ بالآخر تینوں حضرات ان پانچوں بنیادی امور پر متفق ہو گئے اور وہ کام جو مدتوں کی کوششوں سے طے نہ پا سکا تھا اس عاجز کی کوشش سے بفضلہ تعالیٰ انجام پا گیا۔

نئی رکاوٹ:

جب ہم لوگ جناح صاحب سے رخصت لینے لگے تو انہوں نے کہا کہ دیکھئے مولانا آپ دونوں صاحبوں (یعنی مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو مسلم لیگ کا دو آنے دینے والا ممبر بننا ہوگا۔ ہم لوگ فیصلہ ہو جانے کے بعد اس نئی تجویز پر حیران ہوئے اور مفتی صاحب اور مولوی صاحب نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ نہ جناح صاحب اپنے مطالبہ سے دست بردار ہوئے اور نہ دوسرے دونوں اصحاب نے ان کی بات مانی اور ہم وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔ اور یوں ایک عظیم الشان معاملہ طے ہو جانے کے

بعد پھر غیر طے شدہ رہ گیا۔

قسمت کو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

میں آج تک نہ سمجھ سکا کہ اتحاد اسلامیان ہند ایسا اہم مسئلہ پورے طور پر طے ہو چکنے کے بعد ایک معمولی سی بات کے لیے کیوں ہمیشہ کے لیے کھٹائی میں ڈال دیا گیا۔ ایک طرف میں یہ نہیں سمجھ سکتا کہ مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولوی حبیب الرحمٰن صاحب نے دوسرے اہم اختلافات مٹا دینے کے بعد ایک معمولی سی بات ماننے سے کیوں انکار کر دیا۔ اور دوسری طرف یہ بات بھی میرے فہم سے بالا ہے کہ جناح صاحب نے تمام بنیادی امور طے پا جانے کے بعد ایک معمولی سی چیز کے لیے اتحاد اسلامی کی تمام امیدوں پر کیوں پانی پھیر دیا۔۔۔؟

مجاہد ملت کا ایک تاریخی مکتوب

وزیر بحالیات حکومت ہند کے جواب میں

وزیر بحالیات مسٹر کھنہ نے مسلم کنونشن میں بحالیات سے متعلق قرارداد کے جواب میں کنونشن کے صدر ڈاکٹر سید محمود کے نام پر دو مراسلات ارسال کیے تھے جن میں ان حقائق سے انکار تھا جن کا اظہار متذکرہ قرارداد میں کیا گیا تھا۔ حضرت مولانا نے ۴ ستمبر ۶۱ء کو کھنہ جی کے پہلے مراسلے کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ کھلی ہوئی حقیقتوں کو جھٹلایا نہیں جا سکتا اور نہ کسٹوڈین کے مظالم کی پردہ پوشی ہو سکتی ہے۔ ناجائز طور پر چھینی ہوئی املاک اور جائیدادیں سیکڑوں اور ہزاروں کی نہیں بلکہ کروڑوں روپے کی مالیت کی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی مقدس عبادت گاہیں، مذہبی اوقاف، امام باڑے، قبرستان اور درگاہیں سب ہی ان کی لپیٹ میں آ چکے ہیں۔

حضرت مولانا کا پورا بیان (خط) مندرجہ ذیل تھا:

''انڈین مسلم کنونشن کی تجاویز میں ایک تجویز وزارت بحالیات سے تعلق رکھتی تھی، جس میں کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کے ہاتھوں ہندوستان کے مسلم شہریوں کے ساتھ کی گئی مسلسل چیرہ دستیوں، زیادتیوں اور سخت گیرانہ پالیسیوں پر افسوس ظاہر کیا گیا تھا۔ یقیناً اس ڈپارٹمنٹ کی سخت گیری اور منتقمانہ کارروائیوں کے نتیجے میں مسلمانان ہند کو بے اندازہ پریشانیوں اور مسلسل مصیبتوں کا سامنا رہا ہے۔ نیک مقصد اور انصاف کے حصول کے لیے کنونشن نے جان بوجھ کر تلخ تفصیلات کو نظر انداز کرتے ہوئے اجمال و اختصار سے کام لیا تھا، تاکہ وزارت بحالیات میں ڈپارٹمنٹ کی مسلسل چیرہ دستیوں اور زیادتیوں پر غور کر کے ازخود نہیں تو کم از کم توجہ دلانے کے بعد منصفانہ رویہ اختیار کرے اور وزارت کے بااختیار اصحاب ہمدردی اور انصاف پسندی کے ساتھ ان غلط کاریوں کی تلافی کی کوئی راہ نکالیں جو کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کے پچھلے چودہ برس میں وسیع پیمانہ پر مسلمانان ہند کے ساتھ روا رکھی ہیں۔

بہت افسوس ہوا یہ دیکھ کر کہ وزیر بحالیات شری مہر چند کھنہ جی نے کنونشن کی اس تجویز کا ہمدردانہ مطالعہ نہیں فرمایا۔ بلکہ اس کے برعکس ڈپارٹمنٹ کی غلط کاریوں' دست درازیوں اور تلخ حقیقتوں پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اور پھر یہی نہیں بلکہ الٹا ان کو صحیح' حق بجانب اور مبنی بر انصاف قرار دینے کا بے محل اقدام کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں انہوں نے ایک طویل بیان جاری کیا ہے جس کی کافی اشاعت کی گئی ہے۔ شری کھنہ جی کے اس بیان نے نہ صرف یہ کہ اصلاح حال کی امیدوں کو پامال کیا ہے' بلکہ ان ہزاروں زخمی دلوں پر نمک پاشی کی ہے جو کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کی بے لگام چیرہ دستیوں سے پہلے ہی دکھے ہوئے تھے۔

بلاشبہ اس بیان نے ملک کی کوئی مفید خدمت انجام نہیں دی' کیونکہ نہ اس طرح کھلی ہوئی حقیقتوں کو جھٹلایا جا سکتا ہے اور نہ کسٹوڈین کے مظالم کی پردہ پوشی کی جا سکتی ہے۔ خصوصاً جب کہ ان بے پناہ زیادتیوں کی عمر چند روزہ نہیں ہے' بلکہ ان کا سلسلہ چودہ برس سے جاری ہے اور ان کی زد میں چند افراد ہی نہیں بلکہ ہزاروں مظلوموں تک ان کا دامن پھیلا ہوا ہے جو ملک کے کسی ایک آدھ مقام پر نہیں بلکہ جہاں تہاں پھیلے ہوئے ہیں۔ ناجائز طور پر ان سے چھینی ہوئی املاک اور جائیدادیں سیکڑوں اور ہزاروں نہیں بلکہ کروڑوں روپے کی مالیت کی ہیں۔ پھر یہ سب رسہ کشی مکانوں' شخصی جائیدادوں' زمینوں' باغوں اور کھیتوں ہی کی داستان نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی مقدس عبادت گاہیں مذہبی اوقاف اور امام باڑے' قبرستان اور درگاہیں' سب ہی ان کی لپیٹ میں آ چکے ہیں۔

منتقمانہ سلوک:

اس طویل مدت میں کھلے بندوں کسٹوڈین کے منتقمانہ سلوک نے جس وسیع پیمانے پر مسلمانان ہند کو برباد کیا ہے' آج اس کا نتیجہ نہ صرف ان کی اقتصادی اور معاشی بحران اور خستہ حالی کی شکل میں ان پر مسلط ہے۔ بلکہ وہ اپنے وطن عزیز میں رہتے ہوئے غریب الوطنی اور بے پناہی کے احساسات اور خطرات میں خود کو گھرا ہوا بھی پاتے ہیں۔

آج بھی سیکڑوں مسلمان ایسے موجود ہیں جو اپنے افلاس و غربت کی وجہ سے یا برسوں تک کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ میں کھنچتے رہنے کے بعد مایوس ہو کر خود ہی اپنی جائیدادیں چھوڑ بیٹھے ہیں اور بہت سے وہ ہیں جو آٹھ آٹھ' دس دس برس تک کسٹوڈین کے دفتروں کے چکر لگانے اور

روپیہ اور وقت ضائع کرنے کے بعد تھک کر بیٹھ گئے ہیں۔ اور جو سخت جان اس راہ میں ڈٹے بھی رہے تو ان کو بھی انتہائی جدو جہد اور صبر آزما محنت کشی کے بعد کہیں نجات مل سکی ہے۔

غرض کہ اس محکمے کی ایذا رسانیوں کی داستان اتنی دراز' اتنی طویل' اتنی وسیع اور اتنی واضح اور روشن ہے کہ آج کھنہ جی کے بیان کی بلند بانگی کسی طرح بھی ان کا احاطہ نہیں کرسکتی اور حد تو یہ ہے کہ کسٹوڈین محکمے کی رہی سہی کمی کا پیٹنٹ آفیسران نے پوری کر دی ہے کہ جو مسلمان کسٹوڈین کی زد سے بچ نکلا آخر کار کا پیٹنٹ آفیسر کے فیصلوں کا شکار ہو کر رہ گیا۔

لیپا پوتی:

بہتر یہ تھا کہ کھنہ جی اپنے اس بیان میں کسٹوڈین کی لیپا پوتی کرتے ہوئے اپنے ڈپارٹمنٹ کی شان میں قصیدہ پڑھتے ہوئے میرا نام نہ لیتے کہ مجھ جیسا باخبر انسان جو الف سے یا تک اس طلسم ہوشربا کا عینی شاہد رہا ہے' اگر اس کی نقاب کشائی کرنے لگے تو تلخ نوائی کا ایک مجلہ تیار ہو سکتا ہے!

کیا میں شری کھنہ جی کو یاد دلاؤں کہ آج انہوں نے وزارت بحالیات کی جن ہمدردیوں اور بخششوں کو شدومد کے ساتھ اپنے مضمون میں ابھارا ہے وہ خود ہی کسٹوڈین کی کارگزاریوں پر ایک لازوال شہادت ہیں۔ اس لیے کہ جب محکمہ مذکورہ کی منتقمانہ ذہنیت اپنی حد سے گزر گئی اور مسلم اقلیت کے لیے اس طرح وبال جان بن گئی کہ بلاتفریق مذہب و ملت ہر ایک شریف اور سنجیدہ انسان نے بلکہ ممبران پارلیمنٹ اور سرکاری ذمہ داران نے بھی ان سخت گیریوں کو محسوس کیا اور ملک کے کونے کونے سے عوام و خواص اور مسلم و غیر مسلم ممبران کے احتجاجات' وفود اور جمعیۃ علماء ہند کی مسلسل اپیلوں اور انتھک کوششوں کی بدولت بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ محترم وزیراعظم کی شخصی مداخلت کے نتیجے میں کسٹوڈین کی اس مطلق العنانی کو روکتے ہوئے ان ہندوستانی مسلمانوں کے لیے انصاف اور ہمدردی کی کچھ تدبیریں کی گئیں۔ جو کسٹوڈین کی سخت گیری کا بدترین شکار تھے۔ اگرچہ ان ہمدردانہ تدبیروں کا سلسلہ بھی کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کی مہربانیوں سے کچھ زیادہ دیر نہیں چل سکا اور اکثر بیشتر محکمے کی معاندانہ ذہنیت کی بھینٹ چڑھتا رہا ہے۔

یہی وہ ہمدردانہ تدبیریں تھیں جن کا نام لے کر آج شری کھنہ جی اپنے ڈپارٹمنٹ کی

عنایات اور بخششوں کے لمبے چوڑے دعوے کر رہے ہیں مگر ساتھ ہی ان تلخ حقیقتوں کو فراموش کر رہے ہیں جن کے پس منظر میں یہ صورت حال کچھ دنوں کے لیے پیدا کی جاتی رہی ہے۔

ان ہی تدبیروں میں سے ایک اقدام وہ بھی تھا جو ہماری جانب سے پیہم شکایتوں کے بعد محترم وزیر اعظم ہند کی ہدایت پر عمل میں لایا گیا تھا۔ یعنی سرکاری و غیر سرکاری نمائندوں پر مشتمل ایک ذمہ دار کمیٹی بنائی گئی تھی جو کسٹوڈین جنرل تک کے فیصلوں کے بعد انفرادی کیسوں کو انصاف کے نقطہ نظر سے جانچتی تھی اور ہندوستان کے شہری مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو چیک کرتی تھی۔ اس نے جتنے کیس چیک کیے اور غلط فیصلوں کی اصلاح کی اگر آج اس کا ریکارڈ دیکھا جائے تو بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس ڈپارٹمنٹ کے ذمہ دار اصحاب باستثنائے چند نیچے سے اوپر تک کس ذہنیت اور کن جذبات کے ساتھ کھلی ہوئی زیادتیاں کرتے رہے ہیں اور کس کس طرح غیر نکاسی مسلمانوں کو نکاسی بناتے رہے ہے۔ مگر افسوس کہ آخر کار وزارت بحالیات کی تنگ نظری اس کمیٹی کو زیادہ عرصے تک برداشت نہ کر سکی اور چھ سات ماہ سے زیادہ اس کی عمر نہ ہوئی۔

ہولناک ذہنیت:

اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ حکومت ہند کے انصاف پسند' ارباب اختیار نے یہ دیکھتے ہوئے کہ کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ نے آٹھ نو سال کے عرصے میں پوری تیزی کے ساتھ تخلیہ کنندگان کی جائیدادوں کو سمیٹ لیا ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے دست درازی فرمائی ہے۔ ایک اہم فیصلہ کرتے ہوئے یہ اعلان کر دیا کہ ۱۹۵۴ء کے بعد قانون تخلیہ کنندگان کے تحت جائیدادوں کو نکاسی قرار دینے کے لیے نوٹس جاری نہیں کیے گے۔ تاہم اس ڈپارٹمنٹ کی ہولناک ذہنیت نے پھر بھی قانون میں ایک ایسی دفعہ اپنے لیے مخصوص کر لی جس کے تحت یہ سوچا سمجھا ہوا بہترین فیصلہ زخمی ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس مخصوص دفعہ کی بدولت آج تک ہر مسلمان کے سر پر خواہ کتنی ہی مرتبہ انکوائری اور تحقیق و تفتیش کے بعد غیر نکاسی قرار دیا جا چکا ہو۔ از سر نو تحقیق اور انکوائری کا خطرہ قائم اور کسٹوڈین کی جارحانہ گرفت بدستور مسلط ہے۔ میعادو مدت کا چلتا ہوا ہتھیار اور بعض ٹیکنیکل حربے کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کے لیے اس پوری مدت میں بڑا سہارا بنے رہے۔ کتنے ہی ناواقف سیدھے سادھے اور دور دراز دیہات وقصبات کے

رہنے والے مسلمانوں کی جائیدادیں پوری چابکدستی کے ساتھ صرف اس لیے ہضم کر لی گئی کہ یہ یقین حاصل کر لینے کے باوجود کہ یہ مسلمان ہندوستان کے شہری ہیں اور بلاشبہ غیر نکاسی ہیں۔ لیکن ان کی درخواست یا اپیل چونکہ مقررہ میعاد کے بعد پیش ہوئی یا اس میں اور کوئی معمولی اصطلاحی خامی آ گئی ایسے صدہا کیسوں میں وزارت بحالیات نے انصاف کا منشاء یہی قرار دیا کہ ان کی جائیدادیں ہضم کر لی جائیں اور اپنے وطن عزیز ہی میں ان کو ان کے گھروں اور جائیدادوں سے محروم کر دیا جائے۔ میں شری کھنہ جی سے کیا یہ دریافت کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ جسٹس اور انصاف کا یہی تقاضہ ہے کہ دیدہ و دانستہ شہریوں کی جائیداد اور ملکیتوں کو ٹائم بارڈ کہہ کر یا ٹیکنیکل بنیاد بنا کر ہضم کر لیا جائے۔

شہر دہلی کے مسلم علاقوں میں مسلمان کرایہ داروں نے برسوں تک یہ التجائیں کیں کہ چونکہ ہمارے رہنے سہنے کے لیے اپنے مخصوص حلقوں کے سوا کہیں اور جگہ نصیب نہیں ہے۔ اس لیے نکاسی مکانوں کو کسٹوڈین کے پورے تخمینے پر ہمیں خریدنے کی اجازت دی جائے۔ اور ان کو نیلام نہ کیا جائے۔ لیکن برسوں تک ان کی اس جائز مانگ کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ البتہ دس بارہ برس گزرنے کے بعد جب کہ ان کی جائیدادوں کا بہت بڑا حصہ دوسرے لوگوں کو الاٹ یا نیلام کر دیا گیا یا کلیمز میں دے دیا گیا تب گنے چنے مکان کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ نے کرایہ داروں کے حق میں دینے کا فیصلہ کیا۔ مگر چند ہی مسلم کرایہ دار ایسے مکان خرید پائے تھے کہ کچھ ہی دنوں بعد یہ فیصلہ سنا دیا گیا کہ چونکہ یہ مسلم حلقے مسلم ایریا کے تحت ہیں۔ اس لیے تمام جائیدادوں کو کارپوریشن کو منتقل کر دیا گیا اور اس طرح مسلمان کرایہ داروں کی بڑی تعداد جو آج بھی خریداری پر آمادہ ہے خریداری سے محروم کر دی گئی۔ اور اس طرح دہلی کے باشندوں پر دہلی ہی کی سرزمین رہنے سہنے کے لیے تنگ کر دی گئی۔ ان حقائق سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے شہری مسلمانوں کے ساتھ انصاف و ہمدردی کی وہ تمام تدبیریں اور سہولتیں بھی جن کو آج شری کھنہ جی نے مسلم کنونشن کی تجویز کے خلاف شدومد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور اس طرح کسٹوڈین کے محکمے کے احسانات کو گنایا ہے۔ درحقیقت وہ وزارت بحالیات کی کوئی عنایت نہیں تھی بلکہ برسوں کی کاوشوں اور پیہم احتجاج اور اپیلوں کے بعد محترم وزیراعظم ہند کی انصاف پسندی اور مداخلت کا نتیجہ تھیں کہ جو بدقسمتی سے وزارت بحالیات کی معاندانہ روش کی بھینٹ چڑھ گئیں اور عملاً جو بھی سہولت یا ہمدردی ایک ہاتھ سے دی گئی کچھ ہی دنوں بعد وہ

دوسرے ہاتھ سے چھین لی گئی۔

جائیدادوں پر قبضہ مخالفانہ:

اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی پیش نظر رہے کہ پورے ملک میں صد ہا مسلمان ایسے ہیں جن کو مسلسل جدوجہد کے بعد کسٹوڈین نے ہندوستان کا شہری تسلیم کر لیا اور ان کے ہاتھوں میں آج بھی کسٹوڈین کے محکمہ کے وہ کاغذات موجود ہیں، جن میں ان کو ان کی جائیدادوں کی واگذاری کے حکامات دیئے گئے ہیں۔ مگر افسوس وہ احکامات شرمندہ تعمیل نہیں ہو رہے ہیں۔ کسٹوڈین کے دفتر میں جائیدادوں کی واپسی تسلیم ہے، مگر جائیدادوں پر قبضہ مخالفانہ بدستور موجود ہے۔ اگر محترم کھنہ جی اجازت دیں تو ایسے ایک دو نہیں دس بیس سیکڑوں مسلمان ان کی خدمت میں پیش کیے جاسکتے ہیں کہ کسٹوڈین کے کاغذات میں بحال ہو گئے ہیں۔ مگر حقیقت میں ابھی تک بے حال ہیں۔

وقف علی الاولاد جائیدادیں:

ایک خاص مسئلہ وقف علی الاولاد کا ہے جس کو کھنہ جی نے اپنے بیان میں ابھارا ہے۔ سو اس کی حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ چودہ برس تک وزارت بحالیات کا قبضہ اور مسلسل عمل یہی رہا کہ وقف علی الاولاد ذاتی جائیداد کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس کو وقف نہیں مانا جاسکتا۔ اور اس طرح چودہ برس تک پورے ملک میں تمام وہ جائیدادیں جو وقف علی الاولاد تھیں بے تامل ہضم کر لی گئیں البتہ گذشتہ چند ماہ میں ایک خاص کوشش اور اعلیٰ عدالت کے فیصلے کی بنا پر وزارت بحالیات نے مجبوراً چند وقف علی الاولاد جائیدادوں کو وقف تسلیم کر کے ان کے متولیوں کو واپس کرنے کا فیصلہ کیا۔ تاہم ان میں سے بھی بعض کیس ابھی تک زیر بحث ہیں۔

مساجد اور امام باڑے:

کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کی زیادتیوں اور چیرہ دستیوں کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ مسلمانوں کی شخصی املاک و جائیدادوں کے ساتھ ساتھ ان کی مسجدوں، امام باڑوں، درگاہوں اور قبرستانوں تک پر دست ستم دراز کیا گیا۔ ان میں سے بہتوں کو نکاسی قرار دے کر ہضم کر لیا گیا یا پاکستان سے آئے ہوئے مظلوم رفیوجیز کے ہاتھوں اس مال غنیمت کا سودا کیا

گیا۔ اور ان کو نیلام یا فروخت کر کے ان کی اصل حیثیت کو زائل کر دیا گیا اور اس طرح اس راہ میں عام اخلاقی تقاضوں اور انسانی روایات کو بھی پامال کیا گیا۔ لیکن کس قدر حیرت و افسوس کی بات ہے کہ ہمارے محترم کھنہ جی آج پوری جرأت کے ساتھ یہ اعلان فرما رہے ہیں کہ ایسا کسی جگہ نہیں ہوا۔

چونکہ محترم کھنہ جی کا یہ جرأت آمیز بیان حقائق کے لیے چیلنج کا انداز لیے ہوئے ہے تو ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے اس بیان کے ساتھ پورے ملک کی مساجد' مقابر' درگاہوں کی فہرستوں میں سے بطور نمونہ صرف شہر اور دہلی کی چند مساجد کے اسماء پیش کر دوں' جن کو کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ نے نیلام کر دیا ہے یا محکمہ کے ہاتھوں دیدہ و دانستہ بعض کی حیثیت عرفی کو زائل کر دیا گیا ہے اور جن کی واپسی و بحالی کے لیے ہماری جدوجہد اب بھی جاری ہے۔

مغربی بنگال کے مسئلے کو محترم کھنہ جی نے چونکہ اس بیان سے جدا رکھا ہے۔ اور حال ہی میں اس کے متعلق ان کا ایک بیان الگ سے شائع ہوا ہے۔ اس لیے میں بھی یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ مغربی بنگال کے مسئلے کو سردست زیر بحث نہ لاتے ہوئے اپنے دوسرے بیان میں اس کی حقیقت حال کو واضح کروں۔

بہرحال کھنہ جی کے حالیہ بیان کے پس منظر اور کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کی چودہ سالہ ستم کوشیوں اور ایذا رسانیوں کے اس مختصر تذکرے کے ساتھ مجھے برملا اعتراف ہے کہ اس سلسلے میں پیہم اور مسلسل جدوجہد اور اس کے مقابلے میں محکمہ کسٹوڈین کے حیلے بہانے اور عذر تراشیوں کے بعد محترم وزیر اعظم ہند کو یہ محسوس کرایا گیا کہ غیر نکاسی مسلمانوں کو ناجائز طور پر نکاسی کہہ کر وزارت بحالیات ان کو اپنا شکار بنا رہا ہے۔ ان کی توجہ اور مداخلت کے نتیجے میں قانون تخلیہ کنندگان میں ابھی اور کسٹوڈین کے طریقہ ہائے کار میں بھی بارہا ایسی ترمیمات اور تبدیلیاں پیدا ہوئیں جن کی بدولت ایک حد تک کسٹوڈین کی مطلق العنانی کا دائرہ تنگ ہوتا رہا اور انصاف کی بے جان امیدیں سانس لیتی رہیں۔ اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ محکمہ متعلقہ نے حقیقت پسندی کے ساتھ عام طور پر وہ پالیسی نہیں اپنائی جس سے وسیع پیمانے پر بے انصافیوں اور زیادتیوں کی تلافی اور روک تھام ہو سکتی۔

مجھ کو اس اقرار میں کوئی باک نہیں ہے کہ بعض انفرادی کیسوں میں وزارت بحالیات کی ابتدا سے لے کر آج تک گاہے گاہے اگر ہم نے پیہم جدوجہد کے ساتھ واضح کیا ہے کہ ان

کیسوں میں قانون کے خلاف کھلی ہوئی ناانصافی کی گئی ہے تو ذمہ دار افسران نے منت و احسان رکھتے ہوئے غریب غیر نکاسی مسلمانوں کو غیر نکاسی باقی رکھنے میں کبھی کبھی عزت افزائی فرمائی ہے، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ہزار ہا ناانصافیوں اور زیادتیوں کی تلافی چند آنسو پونچھ دینے سے کبھی نہیں ہو سکتی۔ پس اگر محترم کھنہ جی نے حقیقت پسندی کے پیش نظر اپنے بیان میں یہ جملہ تحریر فرمایا ہے۔

''اگر سہواً کچھ غلطیاں ہوئی ہیں تو ان کی تلافی کی جا سکتی ہے۔''

تو ایک بار پھر یہ گزارش ہے کہ معاملے کا ایماندارانہ اور حقیقت پسندانہ حل وہی ہے جو کنونشن کی تجویزوں میں کہا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ اس ڈیپارٹمنٹ کے ہاتھوں جو ناانصافیاں اور حق تلفی ہوئی ہے۔ اس کا عملاً تدارک کیا جائے۔ اور کاغذی سطح سے بڑھ کر اس کو عمل کے دائروں تک پہنچایا جائے۔ ان شخصی جائدادوں، عبادت گاہوں، امام باڑوں اور قبرستانوں کو حسب تقاضہ انصاف واپس کیا جائے۔ جو اپنے گھروں سے بے گھر کر دیئے گئے ہوں۔ خواہ مغربی بنگال میں ہوں یا دلی، پنجاب اور راجستھان میں، ان کو پھر سے بسایا جائے۔ اور اس طرح ان کی پریشانیوں کی تلافی کی جائے۔

آخر میں بہت ادب سے یہ گزارش کروں گا کہ ان معاملات کو حقیقت پسندانہ طور پر حل کرنے کا ایک اور صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ وزیر بحالیات ایک ایسی کمیٹی سرکاری حیثیت سے بنانے کی تجویز فرمائیں جن میں سرکاری، غیر سرکاری دونوں طرح کے افراد شامل ہوں اور اس کمیٹی کو یہ طاقت حاصل ہو کہ وہ گزشتہ ناانصافیوں کو چیک کر کے ان کی تلافی کر سکے اور حکومت اس کے فیصلوں کو تسلیم کرے، ورنہ ظاہر ہے کہ دونوں طرف سے بیانات اور ایک دوسرے کی تردید سے یہ مسئلہ کبھی حل نہیں ہو سکتا۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول پپری (بہار) کا خط

پیارے مولانا صاحب!

گاندھی جی کی پرارتھنا جو ذیل میں درج کی جا رہی ہے ہمارے ہوسٹل میں گائی جاتی ہے۔ پہلے ہندو مسلمان بچے مل کر اس کو گاتے تھے۔ لیکن اب مسلمان بچوں نے اپنی مذہبی بنیاد پر اعتراض شروع کر دیا ہے۔ اس لیے آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی اسلامی نقطہ نظر سے اس میں کوئی بات قابل اعتراض ہے؟

پرارتھنا

رگھوپتی رادھے راجا رام پتت پاون سیتارام

سیتارام سیتارام

ایشور اللہ تیرے نام بھج پیارے تو سیتارام

سب کو سمتی دے بھگوان رگھوپتی رادھے راجہ رام

پتت پاون سیتارام

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن کا جواب!

محترمی! آپ کا خط ملا، شکریہ

گاندھی جی کا یہ مشہور گیت اسلام کے بنیادی عقیدہء توحید کے بالکل خلاف ہے۔ اس لیے کہ اسلام کا سب سے بڑا اور بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اللہ۔ ایشور۔ خدا اس ذات کا نام ہے جو کسی کا باپ ہے نہ کسی کی اولاد، نہ کسی کا شوہر، نہ بیوی۔ وہ ان تمام رشتوں سے پاک ہے اور اس کا کوئی ہمسر اور برابر نہیں۔ (سورہء اخلاص۔ قرآن حکیم)

جس گیت میں رام، ایشور اور اللہ کو ایک ہی بتایا جا رہا ہے اور ساتھ ہی رام کو سیتا جی کا پتی

اور سیتا جی کو رام کی دھرم پتی کہا جارہا ہے" تو ظاہر ہے کہ اسلام اس کو قبول نہیں کرسکتا۔

مسلمان بچے اگر پہلے اس پر اعتراض نہ کرتے تھے تو ممکن ہے کہ وہ اس حقیقت سے ناواقف ہوں۔لیکن اب اگر واقف ہونے کے بعد ان کو اعتراض ہے تو بجا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ان کو اس گیت کے گانے پر مجبور کیا جائے۔اس لیے کہ ایک سیکولر اسٹیٹ میں یہ کبھی جائز نہیں ہوسکتا۔

آپ کو غلط فہمی نہ ہو۔گاندھی جی نے اس گیت کو کیوں پسند کیا۔اور اگر پسند کیا تو مسلمان جو گاندھی جی کو اپنا پیارا اور محبوب لیڈر مانتے ہیں۔ان کی اس پرارتھنا کو کیوں پسند نہیں کرتے۔ اس لیے کہ گاندھی جی خود اس اصول کے زبردست حامی تھے کہ ایک کے مذہبی عقائد کو دوسرے پر زبردستی نہیں ٹھونسا جاسکتا اور صحیح اصول بھی یہی ہے۔

رہی یہ بات کہ خود گاندھی جی اس پرارتھنا میں ان دونوں باتوں میں کیوں کر مطابقت کرتے تھے اور اس کو عقیدۂ توحید کے خلاف کیوں نہیں سمجھتے تھے۔یہ گاندھی جی ہی جان سکتے تھے۔ہم اس کے لیے مجبور نہیں ہیں۔اس لیے یہ ذہن ہرگز نہیں بننا چاہیے کہ ہر وہ بات جو گاندھی جی نے اپنے لیے پسند کی' ہر مذہب والا اس کو اپنے لیے ضرور روا رکھے' خواہ اس کے مذہب کے بنیادی اصول اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ والسلام

آپ کا مخلص

محمد حفیظ الرحمٰن کان اللہ لہٗ

(الجمعیۃ صدق جدید لکھنوئی ۱۹۵۶ء بہ حوالہ)

تصویر یا مجسمے پر ہار پھول چڑھانے کا سوال

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا مکتوب گرامی:

ماسٹر عزیز الٰہی ندوی صاحب کو اللہ جزائے خیر دے کہ ان کے برمحل اور ضروری سوالوں نے ناظم صاحب جمعیۃ العلماء ہند کو ذیل کا مکتوب لکھنے کا موقع دیدیا۔لیکن مولانا اور ان کی جمعیۃ کا فرض اسی مکتوب پر ختم نہیں ہوجاتا۔ان سے توقع اس سے کہیں آگے بڑھ کر میدان عمل میں آنے کی کی جاتی ہے۔اس تحریر کی حد تک تو کام گوشہ نشین مدیر صدق بھی کرسکتا ہے۔

(صدق جدید)

محترم عزیز الٰہی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا' آپ نے اپنے خط میں دو سوال کیے ہیں' جو یہ ہیں

۱۔ کیا یہ صحیح ہے کہ مذہب اسلام کی رو سے کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کی بھی تصویر یا مجسمہ پر ہار پھول وغیرہ چڑھائے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے مذہبی بزرگوں اور پیغمبروں کی تصویروں اور مجسموں پر بھی ہار پھول چڑھانا اسلامی شریعت کی رو سے قطعاً گناہ اور ناجائز ہے۔

۲۔ کیا ملک کا سیکولر آئین یا کانگریس کا دستور کسی شخص کے لیے یہ لازم قرار دیتا ہے کہ وہ ملک و وطن کے کسی لیڈر کی تصویر یا مجسمہ پر ضرور ہار پھول چڑھائے اور جو شخص ایسا کرنے سے اپنے مذہب کی پابندی کرتے ہوئے انکار کردے اس کو مجرم سمجھا جائے۔

آپ نے اس ضمن میں مسٹر معین الحق وزیر آسام کے جس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے اور جو سوالات تحریر فرمائے ہیں ان کا جواب درج ذیل ہے۔

۱۔ مسٹر معین الحق وزیر آسام نے جو عمل کیا وہ اسلام کے بنیادی عقیدے کے اعتبار سے قابل ستائش ہے۔ میں ان کو اس جرأت حق کی داد دیتا ہوں۔ اسلام کے عقیدہء توحید کا تقاضہ ہے کہ کوئی عمل مسلمان ایسا نہ کرے جس سے اس بنیادی عقیدے پر بالواسطہ یا بلاواسطہ زد پڑتی ہو۔ اسلام نے اس وجہ سے نبی اور پیغمبر کے ساتھ بھی اس طرح کے عمل کی اجازت نہیں دی۔ جس سے پرستش کا شائبہ یا واہمہ بھی پیدا ہوتا ہو۔ اسلام نے اسی بنا پر نبیوں اور پیغمبروں' حتیٰ کہ رسول پاک ﷺ کی تصویر بنانے کو حرام قرار دیا ہے۔ اور اسلام کی اور پیغمبر ﷺ کی توہین تسلیم کیا ہے۔ اس لیے گاندھی جی کی عظیم شخصیت کی عظمت اپنی جگہ قابل تسلیم رہتے ہوئے کسی مسلمان کو یہ جائز نہیں ہے کہ وہ گاندھی جی کی تصویر یا کسی بھی مسلم یا غیر مسلم رہنما کی تصویر یا مجسمے پر ہار پھول چڑھائے۔

۲۔ ہماری قومی حکومت کسی خاص مذہبی عقیدے کی حکومت نہیں ہے۔ بلکہ ملک کے عوام کی ملی جلی جمہوری حکومت ہے جس کو ہم سب سیکولر اسٹیٹ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ سیکولر اسٹیٹ کا جو بہترین دستور بنایا گیا ہے اس میں مذہب کی آزادی کو بنیادی حقوق میں اہم ترین حق تسلیم کیا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے اپنے عقیدے کے مطابق مذہبی آزادی حاصل ہو یعنی کوئی شخص یا کوئی کمیونٹی دوسرے کو اپنے مذہبی عقائد و اعمال زبردستی

منوانے کی مجاز نہ ہوگی۔ پس آسام صوبہ کانگریس کمیٹی کے بعض ارکان نے اگر مسٹر معین الحق صاحب کے اس عمل پر انڈین نیشنل کانگریس کے پریذیڈنٹ سے ایکشن لینے کی درخواست کی ہے تو ان کا یہ فعل قطعاً باطل اور دستور کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ ایک مسلمان ملک و وطن کے سب سے بڑے شخص اور موجودہ دنیا کی عظیم شخصیت مہاتما گاندھی کی ہر طرح کی عزت اور عظمت کرتا ہے لیکن اپنے اسلامی عقیدے کے خلاف کسی فعل یا عمل پر ہرگز ہرگز مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ اس سے گاندھی جی کی توہین لازم آتی ہے۔ مسٹر معین الحق کا قومی جھنڈے کا لہرانا خود اس کی دلیل ہے کہ جہاں تک وطن اور ملک کی محبت کا تعلق ہے۔ اور ملک کی آزادی اور آزاد دلانے والے کی شخصیت کی عظمت کا تعلق ہے۔ مسٹر معین کے دل میں دوسرے محبان وطن کے مقابلہ میں کسی سے کم نہیں ہے۔ اس لیے مسٹر معین الحق کا طرز عمل سرتا سر حق بجانب ہے۔

میں نے اس سلسلہ میں محترم شری دھیبر بھائی صدر انڈین نیشنل کانگریس کو بھی خط لکھا ہے۔

محمد حفیظ الرحمٰن

ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند

مجاہد ملتؒ کا ایک نادر تاریخی خط

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمہ اللہ کا یہ ایک نادر تاریخی خط ہے، جو انھوں نے اپنے کسی دوست معروف بہ ''خواجہ صاحب'' کو لکھا تھا اور سفارش کی تھی کہ وہ حامل خط امروہہ کے ایک ہونہار طالب علم محمد حسین صدیقی کو عربک کالج میں داخلہ دلوانے بلکہ فیس معاف کروانے اور قابلیت کا وظیفہ دلوانے کے لیے کوشش کریں۔ لیکن اس خط کو استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد صدیقی صاحب کراچی چلے آئے اور بی اے ایل ایل بی کرنے کے بعد فخر الدین جی ابراہیم اینڈ کمپنی سے وابستہ ہو گئے۔ وہ بہت ذہین ایڈووکیٹ ثابت ہوئے اور اس حلق میں انھوں نے جلد ہی اپنی خاص جگہ بنالی۔ فخر الدین جی ابراہیم کو ان کی صلاحیتوں پر بڑا اعتماد تھا اور وہ ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ افسوس! جوانی میں ان کا انتقال ہو گیا۔

صدیقی صاحب کچھ عرصہ مجاہد ملت کے سیکرٹری بھی رہے تھے۔ انگریزی خط و کتابت اور ترجمہ کی خاص ذمہ داری ان کے سپرد تھی۔ وہ ان کے اخلاص و اخلاق کے بہت قائل تھے۔ حضرت مجاہد ملت کے اس نادر خط کا عکس صدیقی صاحب مرحوم کے برادرِ محترم احمد حسین صدیقی امروہوی سابق ڈائریکٹر جنرل کراچی، ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے شکریے کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔

دفتر جمعیۃ علماء ہند دہلی

باسمہ تعالیٰ

جمعیۃ علماء ہند

یداللہ علی الجماعۃ

دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مکرم و محترم خواجہ صاحب! زید مجدکم   السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مزاج گرامی ۔ رسید کتاب پہنچ گئی ۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

آپ کا مخلص

محمد [illegible]

۲ شعبان المعظم ۶۰ھ

اِنسانی حقوق

معنف، محمد رحیم حقانی

جمعیت پبلیکیشنز

متصل مسجد پائیلٹ ہائی سکول، وحدت روڈ، لاہور۔ فون : ۷۵۶۱۰۲۵

مقالات سیمینار کراچی ۱۹۹۸ء

مفتی محمود

ایک قومی راہنما

ترتیب

محمد فاروق قریشی

جمعیۃ پبلیکیشنز

متصل مسجد پائیلٹ ہائی سکول، وحدت روڈ، لاہور۔ فون : ۷۵۶۱۰۲۵
E-Mail: juipak@brain.net.pk

جمعیة پبلیکیشنز